روسی ادب

(تلخیص ادبیات پښتو)

پروفیسر محمد اللہ طاهر

— ترجمه —

سید صمد شاه

پښتو اکیډمي پېښور یونیورسټي

روہی ادب

(تاریخ ادبیاتِ پشتو)

پروفیسر محمد نواز طائر

6206

— ترجمہ —

سیّد صفدر علیشاہ

پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

جملہ حقوق بحق پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی محفوظ

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۴۰۴

نگران ———— ڈائریکٹر پشتو اکیڈیمی

بسعی و اہتمام ———— یاسمین پرویز احمد خان

اشاعت اول ———— سنہ ۱۹۸۷ء

طابعہ ———— جدون پریس پشاور

ناشر ———— پشتو اکیڈیمی

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— .105.00

تشکر

اس کتاب کے اُردو ترجمہ اور اشاعت کی ضمن میں ہم
اکادمی ادبیاتِ پاکستان
کی مالی امداد و اعانت کے لئے بیحد ممنون ہیں اور
اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اکادمی ایسے کاموں کے لئے
ہمارے ساتھ اپنا بھرپور تعاون جاری
رکھے گی

انتسابؔ

نامور اہلِ علم مولانا عبدالقادر مرحوم
کے نام جنہوں نے مجھے اس کتاب کے
لکھنے پر آمادہ کیا۔

طاہر

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	روہی ادب ایک تعارف	۸	۱۶	ناقدین کی رائے کا خلاصہ	۵۵
۲	گذارشِ مترجم	۱۱	۱۷	ابو محمد ہاشم سروانڑی	۵۵
۳	حرفِ اول	۱۳	۱۸	عوامی ادب	۵۷
۴	روہی ادب	۱۵	۱۹	ضرب الامثال اور پشتو	۵۹
۵	روہ جغرافیائی پس منظر	۲۳	۲۰	پشتو کا کتابی ادب	۶۳
			۲۱	تخلیقی اور تقلیدی ادب	۶۳
۶	پشتونخوا کا نام	۳۰	۲۲	پشتونوں کی انفرادیت پسندی	۶۴
۷	پشتون اور پشتو	۳۶	۲۳	رندانہ شاعری اور شاہد بازی	۶۶
۸	پشتو کا ماحول	۳۹	۲۴	رباعی	۷۶
۹	درسی ادب اور اسلامی کتابیں	۴۲	۲۵	پشتو مثنوی	۷۹
۱۰	آشوگلاس کا خطہ	۴۳	۲۶	پشتو اسلام کی خدمت میں	۸۵
۱۱	پشتو کا قدیمی معیار	۴۵	۲۷	پشتو محاورے کی تشکیل	۸۶
۱۲	بے قرار زندگی	۴۶	۲۸	غنائیہ شاعری	۸۷
۱۳	پشتونوں کے تمدنی اقدار	۴۷	۲۹	پشتو ٹپہ	۸۸
۱۴	پشتو چودہ سو سال پہلے	۴۹	۳۰	قوال اور اخون	۹۱
۱۵	امیر کروڑ	۵۰	۳۱	ادباء اور شعراء کے دو گروہ	۹۵

۳۲	یونانی اثرات	۹۷
۳۳	عوامی کردار	۱۰۷
۳۴	اکبر بادشاہ اور پشتو کے رومانی کردار	۱۰۸
۳۵	قدیم مقبول رومان	۱۰۹
۳۶	زندہ اور فعال ادب	۱۱۲
۳۷	شیخ بیٹنؒ	۱۱۸
۳۸	پشتو میں اسلام کی ابتدائی تعلیم	۱۲۱
۳۹	عربی فارسی کے لئے پشتو کی قربانی	۱۲۲
۴۰	سرزمین روہ اور قدماء کی شاعری	۱۲۴
۴۱	پندو موعظت	۱۲۸
۴۲	تصوف رائج ہونے کی ابتداء	۱۳۰
۴۳	ایک تاریخی شخصیت جدِ اعلیٰ اور شاعر	۱۳۰
۴۴	پشتو میں مرثیہ	۱۳۲
۴۵	غاڑے ساندے	۱۳۹
۴۶	رومانی قصوں کا مرثیہ	۱۴۴
۴۷	مرثیہ کے بعض دوسرے پہلو	۱۴۷
۴۸	نئے اصناف	۱۵۳
۴۹	پشتو شعر پر فارسی کا اثر	۱۵۵
۵۰	تصوف پشتو شعر میں	۱۵۶
۵۱	شیخ متی کا تصوف	۱۵۸
۵۲	مختصر جائزہ	۱۶۰
۵۳	تصوف پشتو غزل میں	۱۶۱
۵۴	زوال کی پہلی لہر	۱۶۵
۵۵	اس انحطاط میں رجز و حماسہ	۱۷۰
۵۶	ملی آرزوؤں کا زمانہ	۱۷۱
۵۷	بایزید انصاری	۱۷۱
۵۸	پشتو ادب میں قومی حمیت	۱۷۳
۵۹	دو متحارب تحریکیں	۱۷۶
۶۰	بایزید کا علمی مقام	۱۷۷
۶۱	خیر البیان کے مطالب	۱۷۹
۶۲	بایزید کا مسلک	۱۷۹
۶۳	بایزید انصاری کی تصانیف	۱۸۰
۶۴	روشانیوں کا مسلک	۱۸۱
۶۵	روشانیوں کا ادب اور تعلیمات	۱۸۵
۶۶	روشانی اور سماع	۱۸۶
۶۷	روشانیوں کی ادبی خدمات	۱۹۱
۶۸	ذکر	۱۹۶
۶۹	توبہ	۱۹۷
۷۰	نفس کشی	۱۹۸
۷۱	اخون درویزہ"	۲۰۰
۷۲	مخزن میں کرو میداد کا حصہ	۲۰۵
۷۳	خوشحال خان اور متقدمین	۲۰۸
۷۴	ایک متنازعہ کتاب	۲۱۴
۷۵	تصوف میں عوام کی تربیت	۲۰۷
۷۶	ترک دنیا کے رجحانات کا سبب	۲۲۰
۷۷	انقلاب انگیز دور۔	۲۲۴

۷۸	پشتو نثر کا ارتقاء	۲۲۶
۷۹	خیر البیان کا نثری نمونہ	۲۳۰
۸۰	مخزن الاسلام کا نثری نمونہ	۲۳۱
۸۱	پشتو نثر متاخرین تک	۲۳۳
۸۲	افضل خان خٹک	۲۳۵
۸۳	تاریخ مرصع	۲۳۷
۸۴	علم خانہ دانش	۲۳۸
۸۵	میاں نعمان الدین کاکاخیل	۲۴۲
۸۶	دور متقدمین کا شفاہی ادب	۲۴۴
۸۷	ادب اپنے عصری تقاضوں کا آئینہ دار ہوتا ہے	۲۴۶
۸۸	دفتر شیخ ملی	۲۴۸
۸۹	اس عبوری دور پر سرسری نظر	۲۵۲
۹۰	خواجو مؤرخ	۲۵۵
۹۱	اس دور کے ادب میں خواتین کا حصہ	۲۵۷
۹۲	میرمن زرغونہ	۲۶۲
۹۳	میرمن رابعہ	۲۶۴
۹۴	میرمن نیک بختہ	۲۶۴
	حصہ دوم	
۹۵	پشتو ادب عالیہ	۲۶۸
۹۶	متقدمین پر خوشحال خان کی تنقید	۲۶۸
۹۷	صاحب بصیرت خوشحال خان	۲۷۰
۹۸	خان کا گھرانہ	۲۸۱
۹۹	شعر خوشحال	۲۸۲
۱۰۰	پشتو غزل کا عروج	۲۸۵
۱۰۱	عبدالرحمان بابا	۲۸۷
۱۰۲	ایک بحرانی دور	۲۹۶
۱۰۳	جاگیرداری نظام	۳۰۱
۱۰۴	گگیانی شاعر کمری خان	۳۱۳
۱۰۵	مہمند معزاللہ خان	۳۱۸
۱۰۶	اس دور کے پسندیدہ موضوعات	۳۱۹
۱۰۷	عبدالحمید نازک بیان	۳۲۴
۱۰۸	اخلاقی شاعری	۳۳۱
۱۰۹	شاعر بادشاہ احمد شاہ بابا	۳۶۵
۱۱۰	بلبل بلند کاظم خان شیدا	۳۷۲
۱۱۱	رومانی شاعر علی خان	۳۸۳
۱۱۲	اس درخشاں دور پر تبصرہ	۳۹۱
۱۱۳	پشتو میں قصیدہ	۳۹۴
۱۱۴	حافظ الپوری	۳۹۵
۱۱۵	عمومی انتشار کا زمانہ	۳۹۷
۱۱۶	عوامی ادب کا دور	۴۰۹
۱۱۷	چھاپہ خانے کی آمد	۴۱۹
۱۱۸	جدید پشتو نثر کا آغاز	۴۳۱
۱۱۹	مستشرقین	۴۳۸
۱۲۰	پشتو میں لغت سازی	۴۵۶
۱۲۱	پشتو کے علمی آثار	۴۷۹

روھی ادب ایک تعارف

ہر زبان جو زندہ اور ادبیات کے خزانے سے مالا مال ہو اُس میں زبان و ادب کی تاریخ کا موجود ہونا ایک لازمی امر ہے چونکہ پشتو زبان بھی ایک قدیم اور متحرک زبان ہے اسی لئے ہر کوئی یہ سمجھتا ہوگا کہ اس زبان کی بھی مستند تواریخ اور اُس کے اُدباء اور شعراء کے تذکرے تحریری شکل میں عرصہ دراز سے اسی زبان میں محفوظ ہوں گے۔

زبان کی تاریخ عموماً اس کے بولنے والوں کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ جتنی کوئی قوم قدیم ہوگی اتنی ہی اُس کی زبان کی تاریخ بھی قدیم ہوگی۔ مگر پشتو کے بارے میں یہ حقیقت کچھ ایسی ہے جو نہ صرف یہ کہ قابلِ افسوس ہے بلکہ اس ملت کے تغافل کی آئینہ دار بھی ہے۔ ملت افاغنہ جو عالمی سطح پر تاریخی اور جغرافیائی نقطہ نظر سے ایک قدیم اور پُر شکوہ پس منظر رکھتی ہے اور جس کے کارناموں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں اس قوم کی زبان و ادب کے بارے میں جس تغافل سے کام لیا گیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں اگر دو ایک مستشرقین اس اہم کام سے عہدہ برآ نہ ہوتے تو غالباً بیسویں صدی میں بھی اس جانب کوئی نظرِ التفات نہ برتا جاتا۔

پروفیسر برنرڈ ڈورن میجر راورٹی اور پادری ہیوز ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہی محققین کی بدولت پشتو زبان میں تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ خود پشتونوں میں صرف ایک شخصیت کا نام ایسا ہے جو قابل

ذکر حد تک اس میدان میں مشہور ہیں انکی کتاب "پٹہ خزانہ" اگرچہ کئی ایک زاویوں سے ایک متنازعہ کتاب ہے پھر بھی محمد ہوتک ابن داؤد کی یہ کتاب ہمارے لئے حوالے کی ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔

بیسویں صدی کے آغاز سے جب کہ پشتو زبان میں تحریر و تحقیق کا کام قدرے ٹھوس بنیادوں پر ہونے لگا تو چند ایک محققین ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اس اہم کام میں کافی حد تک پیش رفت کی انہیں محققین میں مرحوم عبدالحئی حبیبی ۔ محترم صدیق اللہ رشتین ، جناب قاضی عبدالحلیم اثر ، ہمیش گل ہمیش خلیل اور کئی ایک اور نام قابل ذکر ہیں ۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد پشتو زبان و ادب کی تاریخ اور پشتون اہل قلم کے تذکروں پر کئی ایک کتابیں منظر عام پر آئیں اپنی کتابوں کی بدولت پشتو زبان و ادب کا تدریجی ارتقاء اور اس کے شعراء اور اُدباء کے بارے میں عمدہ اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئیں زیر نظر کتاب بھی انہی کتب میں سے ایک ہے لیکن اس کے تحریر کرنے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ پشتو زبان ، جو اب تک ایک مربوط اور مسلسل تاریخ سے محروم رہی ہے کے بارے میں ایسی کتاب تحریر کی جائے جو جامع بھی ہو اور مستند بھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور نہ یہ ہر کسی کے بس کی بات تھی ۔ یہ بے حد ذمہ داری کا کام تھا جن حالات میں زیر نظر کتاب لکھی گئی ہے ان کا ذکر خود فاضل مؤلف جناب محمد نواز طائر ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی نے بالتفصیل کیا ہے جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر نامساعد حالات میں یہ کتاب تحریر کی گئی ہے ہم فاضل مؤلف جناب محمد نواز طائر کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی تمام دیگر مصروفیات کو پسِ پُشت ڈال کر پشتو زبان و ادب کی ایک ایسی مستند تاریخ لکھ ڈالی جو نہ صرف زبان و ادب کے طلباء کے لئے مفید ہے بلکہ محققین حضرات و خواتین بھی اس سے کما حقہ استفادہ کر سکتے ہیں ۔ کتاب کا نام پشتونوں کے آبائی مسکن روہ یا روہستان کی مناسبت سے "روہی ادب" رکھا گیا ہے ۔ کتاب دراصل دو جلدوں پر مشتمل ہے لیکن اسے قارئین کی سہولت کے لئے یکجا کر کے ایک ہی جلد میں شائع کیا گیا ہے ۔

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ کتاب پشتونوں میں بیحد مقبول ہو گئی ہے بلکہ اب تو دیگر زبانوں میں بھی اس کے تراجم کے تقاضے ہو رہے ہیں ۔ اس لئے کہ غیر اہل زبان اس

بات کا خواہشمند ہیں کہ وہ بھی پشتو زبان و ادب کے تاریخی پس منظر تک رسائی حاصل کر سکیں ۔
روھی ادب کے استناد کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہی کتاب پشتو ادبیات میں "ایم اے"۔ "ایم۔ فل"۔" اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں کے لیے" ایک درسی کتاب کے طور پر انکے نصاب میں شامل ہے ۔ میری رائے میں روھی ادب اگر ایک طرف محققین کے لیے "مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے تو دوسری طرف اس کے تراجم قومی یکجہتی اور لسانی روابط کے استحکام میں بھی ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں یہ کتاب اگر اس مقصد کے حصول میں کام آسکے تو میں سمجھونگی کہ فاضل محقق جناب محمد نواز طائر کی یہ تحقیقی کاوش بے سود نہیں تھی ۔

وما علینا الا البلاغ

میرمن یاسمین پرویز احمد خان
پبلیکیشن سپیشلسٹ
پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

گذارشِ مترجم

گفتی کہ چرا حالِ دلِ خویش نہ گوئی
من خود کنم آغاز بہ پایان کہ رساند

میری جنم بھومی موضع ادینار تحصیل صوابی۔ ضلع مردان) ہے۔ جہاں ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو عدم سے آیا اور تا این دم بقیدِ حیات ہوں میرا علمی گھرانہ متدیّن ہونیکے ساتھ ساتھ علوم متداولہ سے بھی مزیّن تھا۔ دادا جان صاحبزادہ غلام قادر اور والدِ مرحوم ومغفور، سید قمر علی شاہ قمؔر اردو، فارسی، اور پشتو کے قادر الکلام شاعر تھے اور مستند اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں والدِ مرحوم کو چمن (بلوچستان) جانا پڑا، اس لئے ادنیٰ اور پہلی جماعت کے لئے اپنے گاؤں کے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا،

۱۹۱۳ء میں سر سیدِ سرحد سر صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم نے مسلمانوں کو عموماً اور اہالیانِ سرحد کو خصوصاً جب زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہا تو اسلامیہ کالجیٹ اسکول کی نیو ڈالی۔ اس فلاحی اور رفاہی ادارے کو بطریقِ احسن چلانیکے لئے موصوف کو جامع الصفات مثالی اور شہرۂ آفاق اساتذہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چنانچہ دوسرے کئی مستند اساتذہ (جن میں بیشتر پنجابی نژاد تھے۔) کی طرح انہوں نے والدِ مرحوم کو بھی، درس وتدریس کے لئے اسلامیہ کالجیٹ سکول آنے کی دعوت دی۔ غریب الدّیاری اور نواب مرحوم کی مخلصانہ دعوت کے پیشِ نظر والدِ مرحوم نے کالجیٹ سکول آکر جب اورنیٹل ٹیچر کے فرائضِ منصبی سنبھالے تو ۱۹۳۲ء میں مجھے گاؤں سے لاکر دوسری جماعت میں داخل کیا۔ اسطرح میں نے ۱۹۴۰ میں میٹرک ۱۹۴۶ء میں بی اے کیا ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک " تراشیدم۔ پرستیدم۔ شکستم "کے مصداق کئی سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں

کو خیر باد کہا۔ ۱۹۵۵ء میں والدِ مرحوم کی خوشنودی طبع کیخاطر بی ٹی کیا اور تدریس میں اول رہا۔ تربیت پالینے کے بعد مفادِ عامہ کی خاطر کئی شہروں اور قصبوں کی خاک چھاننی پڑی۔

۱۹۶۲ء میں فارسی ایم اے کر کے تھانہ کے نوزائیدہ کالج میں تدریسِ فارسی کا پہلا لیکچرار مقرر ہوا۔ آخر کار ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج پشاور کے شعبۂ فارسی سے منسلک ہوا۔ یوں والدِ مرحوم کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔

علاوہ ازیں۔ ع "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"

۱۹۶۵ء میں اُردو ایم اے کر کے اپنے ذوق کی تشنگی بجھائی۔

میں پشتو اکیڈمی کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر محمد نواز طائرؔ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے ہیچمدان کو اپنی ایک گرانقدر پشتو تالیف "روھی ادب" (حصہ اول و دوم) کے اردو ترجمے کے لئے منتخب کیا۔

ایک زبان کو دوسری زبان میں کماحقہ منتقل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میں اس مفوضہ اہم فریضے سے کہاں تک عہدہ برآ ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر مجھے کہنے دیجئے کہ ؎

من طریق سعی می آرم بجا
لیس للانسان اِلّا ما سعیٰ
ور نہ شد مقصود من حاصل بکام
من درآں معذور باشم والسلام

احقر صفدر
15 - 10 - 84

پروفیسر سید صفدر علی شاہ ایم اے (فارسی) ایم اے (اُردو)
بی ٹی۔ پشتو آنرز
صدر شعبۂ فارسی اسلامیہ کالج پشاور

"حرفِ اوّل"

دنیا کی ہر زندہ زبان ادبی جواہر پاروں سے اٹی پڑی ہے۔ اس زمرے میں پشتو بھی اپنی ہمعصر زبانوں سے ہمسری کرتی نظر آتی ہے۔ قدامت کے لحاظ سے اگر پشتو کو ہمعصر زبانوں کی ماں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تاہم یہ امر حقائق پر مبنی ہے کہ ایک طویل ماضی کے باوصف اس زبان کی ادبی تاریخ ابھی تک پردۂ اخفا میں پڑی ہے۔ اِسکی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پشتو زبان نورِ اسلام پھیلنے سے قبل کسی اور رسم الخط میں لکھی جاتی رہی۔ ایک ایسا رسم الخط جس کا وجود اب تو روئے زمین پر موجود نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ قدیم آثار یا کتبوں میں محفوظ ہو۔ اسکی دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ پشتونوں نے ذاتی طور پر بھی یہ کوشش نہیں کی کہ اپنی زبان اور قدیم تاریخ کو ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں تلاش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے ادبی آثار اور تاریخ تو در کنار خود اس زبان اور اسکے بولنے والوں کی اپنی تاریخ بھی مبہم ہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پشتون بنی اسرائیل ہیں، کچھ انہیں آریہ نژاد بتاتے ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ یہ نہ تو بنی اسرائیل ہیں اور نہ آریہ، بلکہ اِن سے بھی قدیم ایک ایسی نسل ہے جس سے متعدد نسلوں اور قوموں نے جنم لیا ہے۔ اور چار دانگ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسے ایک درخت جڑ شاخوں اور ٹہنیوں کو بھی پھیلاتا ہے اور دور دور تک تخم پاشی بھی کرتا رہتا ہے۔ حقیقت جو بھی ہو اِس بات کی صفائی اور تصدیق وقت خود کریگا۔ کہ پشتون کون ہیں اور کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں! سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ پشتو کی موجودہ شکل کا آغاز کب سے ہوا؟ یہ کام علم الانسان کے ماہرین اور علماء کا ہے کہ وہ ماضی کے باقیماندہ آثار کی ریت کو علم اور حالیہ سائنٹیفک تحقیق کے غربال میں سے چھانیں اور اُن سنگریزوں کی نشاندہی کریں، جس سے عہد پارینہ کی اس عمارت کی رعنائی

اور پختگی کا کچھ جامد اور مثبت ثبوت ہاتھ آسکے۔

ہمارے ایک ساتھی جناب محمد نواز طائر نے (جو گذشتہ اُنیس بیس سالوں سے پشتو اکیڈیمی میں تحقیق و تدقیق کے کام میں منہمک ہیں اور پشتو کو بہت کچھ مرحمت فرمایا ہے) اِس زمرے میں دس بارہ سال کی سردردی اور کاوش کے بعد یہ ضرورت کسی حد تک پوری کردی ہے۔" روھی ادب " (جسے " روہ " کی مناسبت سے اس نام سے منسوب کیا گیا ہے) میں ادبی آثار کے سلسلے میں حوالے بھی ہیں اور اشارے بھی، اس کاوش کو ہم تحقیق بھی کہہ سکتے ہیں اور ترتیب و تکمیل بھی۔

طائر صاحب نے جس کام کا آغاز کیا ہے، جی چاہتا ہے کہ ہماری نثر اد نو اس طرف اپنی توجہ مبذول کرے اور اس نا تمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

کتاب دو جلدوں میں ہے۔ باقی تفصیل قارئین پر چھوڑتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام

پریشان خٹک

ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی۔ پشاور یونیورسٹی

۱۸ر جون ۱۹۷۷ء

روسی ادب

تواریخ ادبیات پشتو اور تاریخ تذکرہ نگاری کچھ اس قدر طویل نہیں۔ اس صنف میں پشتو کی پہلی کتاب محمد ہوتک کی "پٹہ خزانہ" خیال کی جاتی ہے۔ یہ کتاب بالائی پشتونخوا کے دانشور اور محقق جناب عبدالحئی حبیبی کی دریافت ہے۔ اور انہی کی تحقیق اور حواشی کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس کے متن کے بارے میں بعض ناقدین بڑی محتاط رائے رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں جناب قلندر مومند کا وہ مقالہ جو امسال مارچ کے ماہوار جریدہ "پشتو"[1] میں شائع ہوا ہے قابل لحاظ اہمیت کا حامل ہے۔ اسکے جواب میں صوبہ بلوچستان کے جواں سال محقق جناب سیال کاکڑ[2] کا مقالہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال کتاب "پٹہ خزانہ" اپنی جگہ ایک اہم کتاب ہے چاہے جتنی بھی متنازع فیہ حیثیت کی حامل کیوں نہ ہو پھر بھی پشتو ادبیات کی تواریخ اور تذکرہ نگاری کے سلسلے میں بطور سند و ماخذ ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے

ادبیات پشتو میں کرسٹومیتھی[3] (CHRESTOMETHY) کے مؤلف اور نامور روسی مستشرق پروفیسر برنرڈ ڈورن کے بعد برطانوی مستشرق میجر راورٹی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس میدان میں حقِ تحقیق ادا کیا ہے۔ اور پشتو شعراء اور ادباء کو مغربی دنیا کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اور اپنی صوابدید کے مطابق انکی مختصر سوانح حیات اور ادبی مقام کو بھی متعین کیا ہے۔

مستشرق راورٹی سے لیکر پروفیسر دودیانکوف تک جو اس وقت روس میں ادبیاتِ پشتو میں میدانِ تحقیق کے سرخیل ہیں بہت سے مستشرقین نے اپنے اپنے رنگ میں پشتو شعر و ادب کے تخلیق نگاروں اور پشتو زبان

---

[1] پٹہ خزانہ فی المیزان   [2] پٹہ خزانہ انصاف کے ترازو میں اولس کوئٹہ مئی جون ۱۹۷۶ء

[3] ڈورن کی کرسٹومیتھی پہلی دفعہ سال ۱۸۴۷ میں شائع ہوئی۔

کے ادبی انتقاد کا تذکرہ کیا ہے اور کلام شاعر کے محاسن اور معائب کی نشاندہی بھی کی ہے۔

بیسویں صدی سے قبل خود پشتونوں نے تاریخ ادبیات یا تذکرہ نگاری کو بہت کم درخور اعتنا خیال کیا ہے۔ اور غالباً محمد ہوتک کے علاوہ کسی دوسرے ایسے مستند شخص کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس نے اپنے عہد میں اسکی اہمیت محسوس کی ہو یا کبھی اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہو۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی میں جس طرح اس زبان میں ادب اور شاعری کے جدید رجحانات نے راہ پائی اور پشتو نے نئے اصناف اور ادبی طرزیں اپنائیں، اسی طرح تحقیق اور تدقیق کے میدان میں بھی دانشوروں نے قدم بڑھائے۔ ساتھ ساتھ اس بات کے احساس نے بھی انگڑائی لی کہ پشتو زبان کی تواریخ ادب اور شعراء اور ادباء کے تذکروں کے بارے میں بھی کچھ کام کیا جانا چاہئیے۔

بنیادی مواد نا پید ہونیکی وجہ سے یہ کام یقیناً کچھ اتنا سہل نہ تھا۔ اور نہ ہی اس قدر جلد پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے مبتدی ہمت نہ ہارے اور تھوڑا تھوڑا کرکے مواد جمع کرنے۔ ایک دوسرے سے استفادہ کرنے اور اپنے مشن کی اہمیت کے احساس اور انکی سعئ پیہم کے طفیل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، ادبیات پشتو کی تاریخ گم گشتہ نے پردہ نسیان سے باہر نکلنا شروع کیا۔ یوں کبھی تو تحقیقی مقالوں اور مضامین کے روپ میں اور کبھی کتابی انداز میں اس زبان کی تاریخ ادب اور ادیبوں اور شاعروں کی سوانح حیات کو ضبط تحریر میں لانیکی راہ ہموار ہوئی۔ بعض نامور ادباء اور محققین مثلاً دانشور حبیبی، پوہاند رشتین، جناب عبدالرؤف بینوا۔ محترم دوست محمد خان کامل مومند۔ مرحوم مولانا عبدالقادر، جناب عبدالحلیم اثر افغانی۔ ڈاکٹر عظیم شاہ خیال بخاری۔ پروفیسر مولانا عبدالقدوس قاسمی، محترم ہمیش خلیل۔ جناب نصراللہ خان نصر مرحوم۔ جناب ایچ ایس انوار الحق۔ پروفیسر پریشان خٹک، جناب سید رسول رسا۔ پروفیسر سید تقویم الحق کاکاخیل۔ مولانا عبدالقدوس۔ جناب سرفراز خان عقاب خٹک۔ پروفیسر محمد ادریس صاحبزادہ۔ موضع اکوڑہ خٹک کے جناب محمد اجمل خٹک، جناب میر عبدالصمد خان۔ جناب فقیر حسین ساحر۔ جناب فارغ بخاری اور رضا ہمدانی۔ پروفیسر محمد افضل رضا۔ پروفیسر سیال کاکڑ۔ جناب سلطان محمد بانی مرحوم۔ جناب سلطان محمد صابر۔ پروفیسر محمد اعظم اعظم جناب گل افضل خان۔ پروفیسر صاحبزادہ حمیداللہ۔ محترم محمد ایوب صابر، پروفیسر حبیب الرحمان ساحر یوسفزئی۔ اور جناب محمد مدنی عباسی اور کئی دوسرے محققین اس سلسلے میں محنت شاقہ اور کاوش بروئے کار لائے۔ ان میں بیشتر نے اپنے تحقیقی مواد کو کتابی شکل سے مزین کرکے شائع کیا ہے، اور کئی کی

تحقیقات بیحد مستند اور وقیع بھی ہیں جو کہ مستقبل کے محققین، تذکرہ نگاروں اور اس زبان کے ادب کے تاریخ نویسوں کے لئے بنیادی مواد فراہم کرنیکے سلسلے میں ممد اور معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

"روہی ادب" کو ضبط تحریر میں لانے کا خیال پہلی دفعہ اس وقت ہوا جب مرحوم مولانا عبدالقادر کو پشتو اکیڈیمی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا گیا۔ اُن دنوں میں بلاناغہ ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ ان سے ملنے جایا کرتا۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ تاریخ ادبیات پشتو کو نئی نہج پر لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ انکی یہ خواہش تھی کہ ہم دونوں مل کر فارغ وقت میں اس کام کو سرانجام دیں۔ آخر کچھ صلاح مشورے کے بعد اس بات کو ترجیح دی گئی کہ جس طرح سر اولف کیرو کی تاریخ دی پٹھان (THE PATHAN) کے اردو ترجمہ کا دیباچہ تحریر کرنے کے لئے بنیادی مواد فراہم کرنا اور ڈھانچہ تیار کرنا مجھے سونپا گیا تھا، اسی طرح اس کتاب کے لئے بھی میں ہی بنیادی مواد جمع کروں گا۔ اور اسکے لئے تحقیقی مطالعہ جاری رکھوں گا۔ خوش بختی سے میں نے بے چون و چرا اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور یہ ضروری سمجھا کہ ایک جدید تاریخ مرتب کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ دوسری مغربی اور مشرقی زبانوں کی تواریخ کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ اور اُن کتابوں کے اختیار کردہ لائحہ عمل اور طرز نگارش کے اسلوب کو پیش نظر رکھا جائے۔ اِس غرض کو مطمح نظر بنا کر میں نے جدید ایرانی، عربی، یونانی، فرانسیسی، انگریزی، اردو اور پشتو زبانوں کی ادبیات اور تواریخ کے مطالعہ کا آغاز کیا۔ اور بنیادی مواد کو یکجا کرنے میں سرگرم عمل رہا۔ رفتہ رفتہ میں نے لگ بھگ اٹھارہ سو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے اور کم و بیش چار سو قلمی نسخے اور شائع شدہ کتابیں ایک دوسرے کی اعانت اور امداد سے چھانیں اور فہرستیں مرتب کیں[1]۔ اس گرانقدر اور ضخیم ذخیرے سے جس قدر استفادہ ممکن تھا میں نے کیا اور یوں مجوزہ کتاب کی ترتیب کا ڈھانچہ مرتب کرنیکی راہ ہموار ہوگئی۔

یہ وہ ایام تھے جب مولانا مرحوم اُس وقت کے مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے دورے پر تھے اور وہیں پر ہی دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال فرمایا۔ وہ رحلت کر گئے مگر کتاب لکھنے کی خواہش عزم راسخ بن کر میرے دل میں اُبھری اور آخر کار "روہی ادب" کے لکھنے کا باعث بنی۔

---

[1] وہ فہرستیں انشاء اللہ قارئین کے علمی استفادے کے لئے موقع میسر آنے پر شائع کر دی جائیں گی۔

کچھ کہا نہیں جا سکتا، کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں زندہ رکھتا اور ہم مل بیٹھ کر مشترکہ طور پر پشتو ادب کی تاریخ لکھتے تو وہ کتاب اپنی موجودہ ہیئت سے کس قدر مختلف ہوتی۔ یہ امر یقینی ہے کہ اُس حالت میں اُس کی عبارت کا لطف، مزا اور ملاحت کچھ اور ہی ہوتی اور مولانا مرحوم کی علمیت، تجربے اور طرزِ بیان کی تزئین اور رعنائی نے اسے کچھ اور ہی روپ دیا ہوتا۔ لیکن۔

ع " وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے "

اس دنیائے ناتمام نے تو موصوف کو قرآن کریم کی تفسیر پورا کرنے کی مہلت بھی نہ دی۔ اور تاریخ ادبیات تحریر کرنے کی آرزو اُن کے جیتے جی پوری نہ ہو سکی۔ اُن کی خواہش تھی کہ جب یہ کتاب لکھی جائے تو پھر بالآخر دوسروں کے استفادے کی خاطر اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی کر دیا جائے گا۔

مولانا مرحوم کے بعد میاں سید رسول رسا اور بعد میں سید عظیم شاہ خیال بخاری پشتو اکیڈیمی میں ڈائرکٹری کے منصب پہ فائز ہوئے۔ ہر دو کی بھی یہی خواہش تھی کہ ادبیاتِ پشتو کی ایک مبسوط تاریخ تحریر کی جائے۔ رسا صاحب نے تو عملاً اس سلسلے میں بعض اقدامات بھی کئے۔ موصوف بھی یہی چاہتے تھے کہ راقم الحروف اس کام کا بیڑا اٹھائے۔ مگر اس انداز سے نہیں جیسے مولانا مرحوم کی خواہش تھی۔ مولانا علمی طرز کے متمنی تھے۔ اور رسا صاحب پبلسٹی کی طرز کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس لئے میں نے اُنکی مرضی کے مطابق ایک اور مسودہ تیار کرنے کے کام کی ابتدا کی جتنا جتنا مسودہ تیار ہوتا وہ نظرِ ثانی کیا کرتے۔

ابھی اس مسودے کا ابتدائی حصہ زیرِ تالیف تھا کہ بوجوہ رسا صاحب کی ڈائرکٹری کا دور اچانک اختتام پذیر ہوا۔ اور جناب سید عظیم شاہ خیال بخاری کی ڈائرکٹری کی باری آئی۔

موصوف مولانا مرحوم کے علمی انداز کے حق میں تھے اس لئے وہ مسودہ جو رسا صاحب کے دور میں لکھا گیا تھا جوں کا توں چھوڑ دیا گیا[ل]۔ اور ایک دفعہ پھر سارا کام از سرِ نو شروع کیا گیا۔ میں نے جس مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کی چھان بین کی تھی اُس کی مدد سے اور اپنی صوابدید کے مطابق ایک دوسرے مسودے کے کام کا آغاز کیا۔ لگ بھگ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں جب دو جلدوں پر مشتمل مسودہ انیسویں صدی کے اختتام تک کا کام مکمل ہو گیا۔ اور ڈائرکٹر صاحب موصوف

[ل] وہ نامکمل مسودہ ابھی تک میرے پاس ہے۔

کی خواہش کے مطابق انہیں پیش کیا گیا۔ تو چند روز بعد انہوں نے مجھے کہا کہ بجائے اسکے کہ یہ ہر دو جلدیں شائع کی جائیں، بہتر ہوگا کہ اشاعت کے لئے اِس کا خلاصہ مرتب کیا جائے۔ اُس وقت تو میں نے چپ سادھ لی اور ہر دو جلدیں ایک آدھ بار نظرِ ثانی کرنے کے بعد ایک طرف رکھدیں۔ لیکن جس وقت پشتو اکیڈمی اور شعبۂ پشتو کا آپس میں انضمام ہوا تو اُس عبوری دور میں جبکہ ابھی دوسرے ڈائرکٹر (سربراہ) کی تقرری معرض التوا میں پڑی تھی۔ میرے کہنے پر ہر دو جلدیں پشتو اکیڈمی کے ٹائپسٹ جناب انور خان نے ٹائپ کیں۔ یوں کتاب کی چار ٹائپ شدہ نقلیں تیار کی گئیں۔ اور جب پروفیسر پریشان خٹک صاحب ڈائرکٹر ہوئے تو طباعت کے لئے وہ مسوّد اُس کمیٹی ؎ کو پیش کیا گیا، جو موصوف کی سربراہی میں اسی مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی۔ مسودہ جانچنے کے بعد کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کتاب کا مسودہ اسی شکل میں شائع کیا جائے۔ اس کمیٹی نے موضوعاتِ کتاب میں معمولی ردو بدل کے لئے مجھے کہا جسے میں نے بہ طیب خاطر قبول کیا۔ اور یوں کتاب کی اشاعت کی راہ کھل گئی۔

کتاب ہذا کی تیسری جلد کی تجویز بھی زیرِ بحث رہی۔ لیکن بیسویں صدی میں پشتو ادبیات کی تاریخ تحریر کرنے میں جو مشکلات سدِ راہ ہیں، انکے پیش نظر اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس اثناء میں میں اپنی ایک کتاب ایڈٹ کرنے کی غرض سے امریکہ چلا گیا۔ وہاں بعض علمی، تحقیقی اور مطبوعاتی اداروں اور کتب خانوں کو دیکھنے اور تواریخ ادبیات کے موضوع پر بعض علماء اور محققین سے استفادے کا موقع ملا واپسی پر دو مہینے انگلستان میں بسر کئے اور برٹش میوزیم کے کتب خانے میں پشتو مخطوطات اور قلمی نوادرات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر ایسا کوئی مواد ہاتھ آجائے جو اس کتاب کے موضوعات سے مناسبت رکھتا ہو۔ تو قبل از اشاعت اُس میں شامل کیا جائے۔ اپنے اس مقصد کے حصول میں مجھے صرف اس قدر کامیابی نصیب ہوئی کہ پشتو کی ایسی قلمی کتابیں جو وہاں پر موجود تھیں، وہاں تک اُنکے پہنچانے والوں کے اسماء ادوار اور تاریخوں کا ان کے اصل مسودوں سے پتہ لگایا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم کیا کہ یہ کہاں سے دستیاب ہوئیں۔ اور برٹش میوزیم کے عجائب گھر کے کتب خانے

؎ پریشان صاحب کے علاوہ اس کمیٹی میں جناب فضل حق شیدا۔ پروفیسر سید تقویم الحق، پروفیسر ڈاکٹر اورنگزیب شاہ اور پروفیسر جہانزیب نیاز شامل تھے۔

کے لئے کیسے حاصل کی گئیں۔ ان تمام نوادرات میں صرف دیوان اکبر نامی ایک ایسی کتاب ہاتھ آئی جس کا تذکرہ ابھی تک کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا تھا۔ کتاب کا مصنف سوات کے موضع کوکارئی کا باسی، جید عالم اپنے دور کا روحانی پیشوا اور قاضی تھا۔ کلام بڑا پختہ اور شیریں ہے۔ انہوں نے فارسی اور عربی میں بھی شاعری کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کبھی اس کتاب کی نقل برٹش میوزیم سے حاصل کرلی جائے۔

جب میں چھ مہینے کے بعد وطن واپس لوٹا تو "روحِ ادب" کی دونوں جلدوں کی کتابت مکمل ہو چکی تھی۔ اور سوائے اس کے کہ کتابت شدہ پروف ایک نظر دیکھوں، کتاب میں مزید افراط تفریط کی گنجائش اور موقع نہ تھا۔ اس لئے تمام مسودے کو من وعن چھوڑ دیا۔

کتاب کے نفسِ مضمون کے بارے میں پروفیسر سید تقویم الحق کاکاخیل کی یہ رائے ہے کہ "یہ کتاب طلباء کو کئی کتابوں کے مطالعے کے تردد سے چھٹکارا دلادیگی"۔ واقعی طلباء کا وقت ویسے بھی قیمتی ہوتا ہے۔ لیکن خصوصاً ایسی حالت میں جب وہ مستند مواد کی خاطر سراسیمہ پھرتے ہیں اور انکی یہی تلاش وتجسس اکثر صرف تضیع اوقات پر منتج ہوتی ہے۔
اگر یہ کتاب کسی حد تک اس ضرورت کی تکمیل یا انکی رہنمائی کا باعث بن سکے تو پروفیسر موصوف کی یہ رائے میرے لئے یقیناً باعثِ تشفی ہوگی۔

یہ کتاب نہ تو محض شعراء اور ادباء کا تذکرہ ہے، اور نہ وقائع نگاری۔ اس لئے کہ کتاب لکھتے وقت میرے پیشِ نظر پشتو زبان وادب کے بارے میں ایسی بنیادی باتیں تھیں جن کی رُو سے تاریخ کے مختلف ادوار میں پشتو کی ادبی زیست متاثر ہوئی ہے خصوصاً وہ اسباب وعوامل جو کبھی اِنکی حرکت میں جمود، اور کبھی سرعت لائے ہیں۔ اِس سلسلے میں جو شخصیات اور حالات میرے خیال میں قابلِ ذکر ہیں۔ اِس لئے عین ممکن ہے کہ اگر بعض قارئین کسی موضوع کے بارے میں حسبِ منشاء کچھ نہ پاسکیں۔ یا کسی ادبی شخصیت یا شاعر کا تذکرہ اُن کی توقع کے مطابق اُنہیں دکھائی نہ دے تو یقیناً یہی کوتاہی اُن کی دل شکنی کا باعث بنے گی۔ لیکن اپنے مطمحِ نظر کی روسے میں ایسے افراد سے معذرت خواہ ہوں۔ اس لئے کہ، اگر اسی انداز کو برقرار رکھتا تو کتاب کی ضخامت بلا مبالغہ چار، یا چھ جلدوں سے بھی تجاوز کرجاتی اور وہ مقصد فوت ہوجاتا جس کی طرف پروفیسر کاکاخیل موصوف کے بیان کے مطابق اشارہ کیا گیا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ پشتو زبان کے شعراء اور ادبا کا ایک جامع تذکرہ لکھنے کی ضرورت جس قدر آج

محسوس کی جا رہی ہے۔ اس قدر اس سے قبل کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی بالغ نظر محقق اپنی کاوش بروئے کار لا کر اس ضرورت کی تکمیل کرے۔

ادبیات پشتو کے وسیع میدان میں "روحی ادب" محض مختصر نوٹس کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے نہ تو میں ایک ادبی کتاب کی حیثیت سے اسکی جامعیت کا دعویٰ دار ہوں اور نہ میں اسے کسی خاص شاعر یا دور کے نمائندہ تذکرے سے منسوب کرتا ہوں۔

خصوصاً اخون درویزہ صاحبؒ کے مکتبۂ فکر اور بعض دوسری صاحب طرز شخصیات یا ادبی ادوار کے ضمن میں جس کمی اور تشنگی کیطرف میری توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ یا میں نے خود محسوس کی ہے۔ اُسے شاید دوسرے قارئین بھی محسوس کریں۔ لیکن چونکہ کتاب کی کتابت میری عدم موجودگی میں مکمل ہوئی تھی۔ اس لئے اس سلسلے میں تھوڑی بہت مناسب اضافے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ تاہم اگر کوئی مزید معلومات کا متمنی ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ اخون درویزہ صاحب کے حالات کے لئے پشتو اکیڈیمی کی شائع شدہ کتاب مخزن کے دیباچے کی طرف رجوع کرے۔ تفصیلی مطالعہ کے سئے اس کتاب میں بعض موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اب پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ پشتو میں پی ایچ ڈی کرنے کے لئے تحقیقی مقالوں کی راہ کھل گئی ہے۔ اور اس قسم کے موضوعات اور مقالوں کے لئے خاص گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ اُمید واثق ہے کہ کوئی محنتی محقق بہت جلد اس ڈگر پر بھی گامزن ہو گا اور "روحی ادب" کی اس گنجی سے ہی پشتو ادب کے کسی خصوصی موضوع کے ایک جاذب نظر ایوان کی بنیاد ڈالے گا۔

میں جید عالم اور شاعر فضل حق شیدا کا بھی بہت ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی دونوں جلدوں پر بڑی عمیق نظر ڈالی ہے اور جہاں کہیں بھی اسکے مسودے میں زبان کا سقم دکھائی دیا۔ اُسکی تصحیح اور تہذیب کی زحمت اٹھائی۔

میں پشتو اکیڈیمی کے واجب الاحترام احباب سیف الرحمان سید، محمد انور خان، میاں سناء الدین صاحب کاکاخیل اور مولانا محمد اسحاق صاحب کی اعانت اور بھرپور تعاون کا بھی ممنون احسان ہوں جنہوں نے مواد یکجا کرتے، مسودے کو ٹائپ اور نقل کرنے، کتابت کی ترتیب و تدوین اور پروفوں کی تصحیح کرنے میں تا آخر میرا ہاتھ بٹایا ہے۔

میں پشتو اکیڈیمی کے ڈائریکٹر جناب پریشان خٹک کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے وقت کے ضیاع کے پردہ

جلدوں کی اشاعت کے واسطے پشاور یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد سے مالی منظوری حاصل کی۔ آخر میں میں اپنے دوسرے رفقائے کار خصوصاً فقیر محمد عباس قادریہ اور جناب فدا محمد کا بھی ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے اس ضمن میں تمام فنی کارروائی بغیر کسی حیل وحجت کے کماحقہ بروقت مکمل کر لی۔

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ اللہ پاک کتاب ہذا کو پشتو زبان وادب کی نشاۃ وارتقا میں ممد ومعاون بنا دے۔

محمد نواز طائر

روہ

جغرافیائی پس منظر

برصغیر پاکستان و ہند کے شمال مغرب میں دریائے سندھ کے دائیں کنارے کا علاقہ روہستان ہے۔ جسے یہاں کے مقامی باشندے پشتونخوا کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ پاکستان میں شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کوئٹہ ڈویژن اور افغانستان میں تمام جنوب مشرقی علاقے، اس علاقے کے دو بڑے حصے ہیں جو بالا اور زیرین پشتونخوا کے ناموں سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ اہل عرب اسے خراسان کہا کرتے تھے۔

یہ علاقہ اندازاً ۳۰ اور ۳۵ درجے عرض بلد شمال اور ۶۱ اور ۷۲ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ حافظ رحمت خان روہیلہ لکھتے ہیں کہ پشتونوں کے سبھی گھرانے ایران، توران، ہند اور سندھ کے مابین آباد ہیں۔[۲]

خوشحال خان نے پشتونوں کی جائے سکونت کا ذکر یوں کیا ہے۔

سرئے هوره قند هار بلئے دمغاره دے
تر دا مینځ همه میشته واړه عبث دی

"اس سرزمین کا ایک سرا قندھار اور دوسرا دمغار تک پھیلا ہوا ہے اور اسکے درمیان سبھی بیکار قیام پذیر ہیں"

قندھار پشتونخوا کے جنوب مغربی گوشے اور دمغار بالائی سوات میں اس خطے کے شمال مشرق کی طرف ہے۔ خوشحال بابا کے زمانے تک یوسفزئی، دمغار، چارباغ اور منگلور تک سوات میں قابض ہو چکے تھے۔[۱]

---

[۱] کلیات خوشحال خان ص ۳۴۱

(2) Phathan (hand book) Page 13

اس خطے میں کم و بیش پشتونوں کے سبھی گھرانے اور قبیلے عہد قدیم سے آباد ہیں۔ فاضل کیرو کہتے ہیں[۱] "پشتونوں کی جائے سکونت کو متعین کرنا اس قدر آسان نہیں۔" لیکن ایشیا کے نقشے پر اسے ایک ایسی فصیل یا دیوار سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے مغرب میں ایران کی بلند و بالا چراگاہیں اور شمال کی جانب پامیر کی سطح مرتفع اور ترچمیر کی چوٹیاں واقع ہیں۔ انکے ساتھ ساتھ کہیں ایک طرف اور کہیں دوسری طرف پشتون آباد ہیں۔ روہیلہ سردار اور کیرو دونوں نے ایک جیسے جغرافیائی علاقے کی نشاندہی کی ہے۔

پامیر اور سیستان کے درمیان اس وسیع و عریض علاقے میں دور تک پھیلے ہوئے سر بفلک پہاڑ، خشک اور بے آب و گیاہ صحرا، دلکش درے، مرغزار اور زرخیز میدان ہیں۔ زندگی کی آسائش اور سختی و تنگی کے سبھی پہلو اسکے ماحول میں یوں سموئے اور گوندھے گئے ہیں۔ کہ یہاں کے مکینوں کے بارے میں اس بات پر یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ سرزمین اس کے مکینوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ نہ کہ اس کے مکین اس سرزمین کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اسی لئے تاریخ بتلاتی ہے کہ اگر ایک طرف پشتون نے خود کو کبھی بھی اس ماحول کا پابند نہیں ٹھہرایا اور باوجودیکہ وہ صدیوں سے یہاں آباد ہے لیکن دنیا میں پھیلنے۔ اور اپنے لئے ہجرت کے راستے کو ہمیشہ کھلا رکھا ہے۔ تو دوسری طرف اس سرزمین پر آج تک ایسے کوئی بیرونی لوگ نہیں آئے جنہوں نے انہیں بالکل ملک بدر کر کے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہو اور انکی جگہ خود قیام پذیر ہو گئے ہوں۔ سیاسی مفکرین نے اس سرزمین کو ایشیائی محور کہا ہے[۲] اور بسا اوقات اسے اس براعظم کے دل کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس خطے کی اہمیت یوں اجاگر کی ہے[۳]

آسیا یک پیکرِ آب و گل است — ملّتِ افغان در آن پیکر دل است

از فسادِ او فسادِ آسیا — در کشادِ او کشادِ آسیا

---

(1) The pathan Page XVII.
"Geographically the Pathan is hard to be described

(2) Afghanistan land in transition, Page 235
Aisa by LD Stamp. Page 185.

(۳) جاوید نامہ

" ایشیا آب وگل کا ایک پیکر ہے اور افغان قوم اس پیکر میں دل کی طرح ہے اُس کا فساد اور اُسکا بگاڑ ایشیا بھر میں افراتفری کا موجب ہوتا ہے۔ اور اُس کی آزادی میں ایشیا بھر کی آزادی کا راز مضمر ہے"
ایک مشہور جغرافیہ دان ایل ڈی سٹمپ کہتے ہیں کہ" روس اور پاکستان کے درمیان وہ آزاد اور غیور قوم آباد ہے، جو ایشیا کے امن و آشتی اور جنگ و جدال میں ایک اہم کردار کا حامل رہی ہے"
ایک طرف تو جنوب کی جانب سے یہ سنگلاخ سرزمین برصغیر پاکستان و ہند کے میدانوں سے بلند ہے، اور دوسری طرف اس کے شمال میں واقع روسی ترکستان کے وسیع میدان جیسا تاریخی علاقہ ہے جس پر سے شمال مشرق کی طرف سے جنوبی ایشیا پر بے شمار حملہ آور گذرے ہیں۔
تاریخ کے ہر دور میں اس سرزمین کو خصوصی توجہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ مغربی اور مشرقی فاتحین کی راہ گذر تھی اور شمال کی جانب سے آنے والی مغل اور ترک افواج نے اسی سمت سے اپنی آمد و رفت جاری رکھی بعض دانشوروں نے پشتونخوا کو ایشیا کا چوراہا بھی کہا ہے۔ گذشتہ ادوار میں اقوام ایشیا نے جس طرف سے بھی خروج کیا ہے، سبھی نے اسی سرزمین سے اپنی آمدورفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور یہی علاقہ مقابلے، مجادلے اور کشمکش کا اصل میدان رہا وسطی ایشیا، شرق اوسط اور جنوبی ایشیا تو کیا یورپ کے حملہ آور اور فاتحین بھی اسی سرزمین پر برسرپیکار رہے اور ان میں سے کچھ تو قلیل عرصے کے لئے یہاں قیام پذیر بھی رہے ہیں۔
پشتون عرصۂ دراز سے بالائی اور زیرین پشتونخوا کے دو بڑے حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے مابین پہاڑوں میں بسنے والے وہ پشتون قبائل آباد ہیں جنہیں بعض علماء پشتونخوا کی شہ رگ خیال کرتے ہیں۔ ان قبائل میں بعض معروف قبیلے آفریدی، خٹک اورکزئی، بنگش، وزیر، محسود اور توری ہیں۔
پاکستان اور افغانستان کی بین الاقوامی سرحد سے شرق کی جانب زیرین حصے کے پشتون مقیم ہیں۔ ان دونوں

---

(1) "The cross road of asia"
Afghanistan Vol.II
Wdber

(2) The pathan Rice
By Olaf Caro,

علاقہ کہ پشتون دائمی اور مستقل شاہراہوں کی برکت سے ایک دوسرے کے ساتھ مستقل رشتے اُستوار رکھے ہوئے ہیں ۔
باجوڑ، مالاکنڈ۔ خیبر کرم ۔ ٹوچی۔ گومل اور بولان وہ دروازے ہیں جن پر جنوبی ایشیا کی تاریخ اور تجارت دونوں کا انحصار رہا ہے ۔ چین، ترکستان، ماوراء النہر اور ایران کے ساتھ پاک و ہند کا تمام تر تاریخی رابطہ انہی راہوں کا مرہونِ منت ہے ۔

بالائی پشتونخوا سے شمال کی طرف دریائے آمو کے کنارے کنارے قرونِ وسطیٰ کی تجارت کی وہ مشہور و معروف شاہراہِ ریشم گذرتی ہے جس پر مشرقی اور مغربی دنیا کے مابین تجارت ہوا کرتی تھی ۔ اور ہند و سندھ کے قافلوں کے راستے پشتونخوا کے وسط سے گزرنے کے بعد اسی شاہراہ سے جا ملتے تھے اور جب تک بین الاقوامی تجارت کے لئے بحری راستے نہیں کھلے تھے اُسی وقت تک دریائے آمو کا کنارہ ہی عالمی تجارت کی عظیم شاہراہ تھی ، اور اسی شاہراہ نے ختاؔ اور ختنؔ کو جنیوا اور وینسؔ سے مربوط کیا تھا ۔

ہندوکش اور سلیمان کے دو بڑے کوہستانی سلسلے شمال مشرق سے جنوب مغرب کی جانب پشتونخوا سے ایک ساتھ گذرتے ہیں ۔ بالائی پشتونخوا کا علاقہ ہندوکش کے اُرخ میں واقع ہے اور زیرین پشتونخوا کوہ سلیمان کے گرد و نواح میں ہے ۔

ہندوکش بیشمار پہاڑوں کا ایک ایسا بڑا اور غیر آباد کوہستان ہے جس پر آمد و رفت بے حد مشکل ہے ۔ اس سلسلے کے پہاڑ سطح سمندر سے اوسطاً پندرہ ہزار فٹ اونچے ہیں ۔ اور بعض اٹھارہ ہزار فٹ ، بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند ہیں ۔ ان سربفلک پہاڑوں کے معدودے چند درّوں میں آمد و رفت کے دشوار گذار رستے ہیں ۔ ان کے شمال میں بلخ اور باختر کی وہ سرزمین ہے جو بعض مؤرخین کے خیال کے مطابق تہذیب انسانی کا پہلا گہوارہ رہا ہے ۔ ان برف پوش پہاڑوں کے بعض حصوں میں گھنے جنگلات ہیں ۔ سلیمان کے کوہستانی سلسلے کا بھی کم و بیش یہی حال ہے ۔

روہستان کا بیشتر علاقہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یا تو پہاڑی ہے ۔ اور یا سطح مرتفع لیکن مشرقی سمت دریائے

Asia by L.D. Stamp.

سندھ کے کنارے وادی پشاور اور کوہاٹ، بنوں، اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے میدان ہیں۔ جو دریائے سندھ کے پہلو میں سطح مرتفع بلوچستان تک پہنچتے ہیں۔ پہاڑوں کے بیچوں بیچ دریاؤں کے دونوں جانب سرسبز و شاداب درے ہیں جو ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑوں میں دور تک جا گھسے ہیں۔ بلند سطحوں پر کہیں کہیں ہموار میدان اور بیابان بھی ہیں۔ جو عموماً فلک بوس پہاڑوں میں گھرے ہوئے ہیں بعض میدانی علاقوں کے علاوہ اس سرزمین کی آب و ہوا صحت کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یہ عموماً خشک ہے، گرمی اور سردی کا تفاوت بہت زیادہ ہے۔ بلند سطح مرتفع پر موسم سرما اتنا شدید ہوتا ہے کہ بسا اوقات درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس میدانی علاقوں میں گرمی اس قدر شدید ہوتی ہے۔ کہ درجہ حرارت ۱۲۰ سنٹی گریڈ سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔ اس سرزمین پر بارش کی مقدار بہت کم ہے۔ سال کے دوسرے موسموں کی نسبت موسم سرما میں بارش زیادہ ہوتی ہے۔

پشتونخوا کی ندیاں اور دریا یا تو شمال مغربی سمت میں بہتے ہیں اور یا پھر جنوب مشرق کیطرف دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں۔ شمال مشرقی جانب کے دریا ایسے برف پوش پہاڑوں سے نکلتے ہیں کہ ان دریاؤں کا پانی سال بھر وافر رہتا ہے۔ سوات، باجوڑ، کونڑ، کابل کرم اور دریائے گومل دریائے سندھ کے معاون ہیں۔ ہلمند، ارغنداؤ، ترناک، ہری رود اور مرغاب شمال مغربی صحراؤں اور ریگزاروں میں ناپید ہو جاتے ہیں، یا پھر ہاموں ہلمند کیطرح دلدل بناتے ہیں۔ بعض دوسرے چھوٹے بڑے دریا اور ندی نالے یا تو موسمی ہیں یا ان بڑے دریاؤں کی طرح ریگستانوں میں جا کر سوکھ جاتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر بہاؤ شمال مغربی سمت کو ہے۔ جنوب مغربی دریاؤں میں دریائے ہلمند سب سے بڑا ہے۔ یہ تقریباً ایک لاکھ مربع میل علاقے کے برف و باران کا پانی اپنے پاٹ میں ذخیرہ کرتا ہے۔

پشتونخوا کے یہ سبھی ندی نالے، دریا، پہاڑ اور صحرا پشتونوں کی زندگی اور انکی ثقافت و ادب سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایک طرف دریائے سندھ کی لہریں انہیں فخر و عظمت کا دائمی درس دیتی ہیں تو دوسری طرف کرم اور کونڑ کے دریا، سپین غر کی چوٹیاں خیبر اور گومل کے درے، زرغلے اور اکوڑی کے وسیع و عریض میدان انہیں اپنی تاریخ اور رومان کی حسین یادیں یاد دلاتے ہیں۔ جیسے

اباسین بیا په چپو راغے
هره چپه ئے ورانوي د پګړئ ولونه

ما د کوټر د سینده ځاځ کړے   زما لالی به پکښے مخ وینځلے وینه
په ملاکنډ ئے توپے چلے کړے   تر رنګ مالا پورے ئے ونوستل ګلونه
مورے کوچیانو له مے ورکړه   چه تور وربل مے د سپین غرشمال وړینه
که د خالو لښکرے راغلے   زه به خپل یار له د ګومل درے له ځمه
که په میوند کښے شهید نه شوے   ګرانه لالیه بے ننګئ له دِ ساتینه
چرته لندن چرته چترال دے   بے ننګی زوره شوه فرنګیان چترال ته ځینه

"دریائے سندھ میں سیلاب پھر زوروں پر ہے اور اُس کی ہر لہر پگڑی کے بل پیچ بگاڑ رہی ہے"
"میں دریائے کونڑ کے وارے جاؤں۔ اسی میں میرے محبوب نے بھی کبھی اپنا منہ دھویا ہوگا۔"
"مالاکنڈ سے توپیں داغی گئیں اور رنگ مالا تک ہر جانب پھولوں کو تتر بتر کر دیا"
"اے میری ماں! میرا رشتہ کوچیوں میں دیدے تاکہ میری سیاہ زلفیں کوہ سفید کی بادِ شمال سے لہراتی رہیں"
"اگر خالو کی فوجِ ظفر موج واپس آئی تو میں اپنے محبوب کی خوش آمدید کے لئے گومل درے تک جاؤنگی۔"
"تم اگر میوند میں شہید نہ ہوئے تو اے میرے پیارے محبوب دشمن تمھیں محض بے حرمتی کے واسطے زندہ چھوڑے گا"
"کہاں لندن ہے اور کہاں چترال، بے حمیتی اور بے غیرتی کی حد ہوگئی اسی لئے تو انگریز چترال کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔"

یہ اور ایسی دوسری بیشمار مثالیں پشتو شاعری کی ہر صنف میں موجود ہیں جن سے اس سرزمین کے ساتھ انکی والہانہ محبت اور لگاؤ کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔
دریاؤں کے کنارے پشتونخوا کی آبادی خصوصاً ایسے مقامات پر ہے جہاں زراعت و کاشت کاری آسانی

کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ زیادہ تر آبپاشی چھوٹی چھوٹی نہروں، کنوؤں اور کاریزوں سے کی جاتی ہے۔ لیکن اب بڑی بڑی نہریں بھی عام ہیں۔ بعض زمینیں بارانی ہیں جو سال میں ایک فصل دیتی ہیں، لیکن آبی زمینیں سال میں دو یا زیادہ فصلیں بھی دے سکتی ہیں۔

پشتونوں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ پاوندوں (خانہ بدوش قبائل) پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ گرم اور سرد موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ میدانی اور پہاڑی علاقوں کو کوچ کرتے ہیں۔ مال مویشی اور بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ محنت مزدوری اور سوداگری بھی کرتے ہیں۔ ایک امریکی محقق ولبر کہتا ہے: "عہد حاضر کے پشتون معاشرہ میں عصر نو کے اونچے درجے کے تعلیم یافتہ افراد بھی ہیں اور خیموں میں بسر اوقات کرنیوالے خانہ بدوش بھی' ان میں یہ ایک گروہ تو ترقی یافتہ شہری زندگی بسر کرنے سے مانوس ہو چکا ہے۔ اور دوسرا گروہ معمولی درجے کے وہ کاشتکار ہیں جو زمین میں بیج بونے کے بعد کہیں اور کا رُخ کر لیتے ہیں۔ اور جب فصل پکنے کے دن قریب آتے ہیں تو لوٹ کر آ جاتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

مالہ رخصت راکړه چې لاړ شم
پاس په وطن مې غنم زیړ لوئې کومه

"مجھے رخصت دو کہ میں چلا جاؤں، میرے وطنِ بالا میں گندم کی فصل پک چکی ہے اور میں اُس کی کٹائی کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ موسمی ہجرتیں بالا و زیریں سرزمین کے درمیان اب بھی جاری و ساری ہیں۔ یہ خانہ بدوش افراد "کوچی" یا "پاوندوں" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اِن دونوں طبقوں کے مابین عوامی زندگی کی کئی دیگر سیڑھیاں بھی ہیں۔

اسی طرح قدیم گلہ بانی کی زندگی سے لے کر ابتدائی زراعتی اور دیہی زندگی اور پھر عصر نو کی شہری زندگی کی تمام مثالیں اور نمونے اس میں موجود ہیں۔ پشتونوں میں سب سے زیادہ تجارت پیشہ قبیلہ لوہانیوں کا رہا ہے۔ بعض پاوندوں میں سوداگری کا رواج گلہ بانی سے زیادہ مقبول ہے۔ پہلے پہل اِن کا میدانِ تجارت بلخ، بخارا اور ہندوستان کے میدانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن آج کل دریائے سندھ۔ اور آمو کے دوآبے میں ان کے

اونٹوں کے کاروان نظر آتے رہتے ہیں۔ اور اب تو ذرائع آمد و رفت میں انقلاب آ جانے سے پشتونخوا کی زندگی کا یہ رنگین پہلو دھیرے دھیرے مدہم ہوتا جا رہا ہے۔

پشتونوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ایران، توران پاک و ہند کے میدان اور شہر پشتون قبائل کے لئے سدا حصولِ معاش کا ذریعہ بنے رہے۔ اونٹ کی مہار، اور گھوڑے کی لگام نے ان کی زندگی کے ساتھ ایک ایسا دائمی بندھن استوار رکھا جس نے انکی نظر میں وسعت، وجود میں قوت، طبیعت میں بیقراری اور عزم و حوصلہ میں استحکام پیدا کیا ہے۔ یہی انکے تجربے اور دومان کا بنیادی سبب تھا پشتو ادب کا بیشتر حصہ اسی کا مرہون منت ہے۔

پشتونخوا کا نام

پشتونخوا نے کئی ناموں سے شہرت پائی ہے۔ ان میں بعض قدیمی نام تو اب صرف اوراق تاریخ تک محدود ہو چکے ہیں اور کچھ یکسر فراموش کر دیئے گئے ہیں بعض ایسے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے علاقوں یا شہروں سے منسوب دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن دریائے آمو کے جنوب میں بلھ۔ بلھیکا۔ بلخ، باختر۔ قدیم زمانے میں ہیروڈوٹس یونانی کا پکتی ایکا، ایرانیوں کا ایرن باستان اور عربوں کا خراسان اسی سرزمین کے نام ہیں۔ جیسے کوہستان روہستان، ولایت پشتونخوا اور اسی کا کچھ حصہ ایک عرصے سے افغانستان کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ یہ سرزمین برصغیر جنوبی ایشیا کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اور قوموں اور ملکوں کے مابین روابط اور اُن راستوں کی وجہ سے جو یہاں سے ہو کر گذرتے ہیں بہت اہمیت کی حامل رہی ہے، وہ راہیں ایک طرف شمالی اور مشرقی ایشیا کے جنوبی ایشیائی ممالک کے ساتھ تاریخی اور تجارتی بندھن کا سبب ہیں۔ اور دوسری طرف تاتارستان اور چین کو بھی مغرب کی جانب سے بری راستے مہیا کرتی ہے۔

تاریخی شاہراہ ریشم بھی اسی سرزمین سے گذرتی ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کیوجہ سے ایک زمانے میں یہ سرزمین کوہستان کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ تمام پشتون بعض دوسرے پہاڑی قبیلوں سمیت یہاں مقیم تھے۔

کوہستان

حضرت سید علی ترمذیؒ (پیر بابا علیہ الرحمۃ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور جن کا روضہ بنیر میں ہے) کا بیان ہے کہ "میرے پیر نے وفات کے وقت مجھے حکم دیا کہ تم کوہستان جا کر وہاں کے لوگوں

کوراہ اسلام پرلے آؤ" مورخ فرشتہ بھی کوہستان کا ذکر کرتا ہے۔ اور سلسلۂ کوہ سلیمان کو کوہستان کہتا ہے لیکن کوہستان کے نام کی وسعت جیسے کہ وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ علاقہ کتنا بڑا ہے! اسکی تفصیل روہ یا روہستان کی بحث میں واضح کی جائیگی۔

پروفیسر اے ایچ دانی کہتے ہیں کہ" اگر یہ صحیح ہو کہ لفظ کوہ روہ کا ہم معنیٰ ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روہ کا لفظ سنسکرت کا " روہتیاگری" (کوہِ سُرخ) ہو۔ اور پانڑینی جو سنسکرت زبان کے گرامر کے بہت بڑے عالم تھے اور موجودہ تحصیل صوابی میں لاہور کے باشندے تھے، کہتا ہے کہ وہ سرزمین روہتیاگری یعنی کوہ سُرخ کے علاقہ کے رہنے والے تھے،،

داورٹی نے اپنی کتاب NOTES ON THE AFGHAN میں کوہِ سلیمان کے مشرقی حصے کو "کوہِ سرخ" کہا ہے۔ روہ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ وہی علاقہ ہے جہاں پشتون مقیم ہیں اور یہی اُن کا وطن ہے۔

داورٹی کا تحریر کردہ روہ کا حدود اربعہ کم وبیش وہی ہے جس کا تذکرہ حافظ رحمت خان روہیلہ نے اپنی کتاب " خلاصۃ الانساب" میں کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ" روہ کے مشرق میں کشمیر مغرب میں دریائے ہلمند۔ شمال کیطرف قاشقار اور جنوب میں بلوچستان واقع ہے۔ مطلب یہ کہ علاقہ ایران، تُوران اور ہند کے مابین ہے اور ہند میں وہاں کے باشندوں کو" روہیلہ" کہتے ہیں۔ لیکن پروفیسر دانی کے خیال میں سرزمین روہ کے مذکورہ سرحدات عصر حاضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسکے قدیمی سرحدات کے لئے پرانے مسودات کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پانچویں صدی عیسوی میں چینی سیاح فاھیان نے ننگرہار میں موسم سرما کے دو مہینے گذارے تھے، پھر دوساتھیوں سمیت وہ جنوب کی طرف چلا گیا۔ اور علاقہ روہ جا پہنچا۔ اس سرزمین میں بُدھ مذہب کا دور دورہ تھا اور یہاں اس مذہب کے دو الگ الگ فرقوں کے تین ہزار بھکشو قیام پذیر تھے۔ انہوں نے موسم برسات یہیں بسر کیا اور پھر جانب جنوب بنوں چلے گئے۔

پروفیسر ایم ایچ دانی ایک دوسرے چینی سیاح ہیون تسانگ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس علاقہ کے لوگ پہاڑوں میں الگ الگ خیلوں اور قبیلوں میں سکونت پذیر اور آباد ہیں۔ ان کا کوئی خاص بادشاہ یا حاکم نہیں ہے۔

داورٹی کے خیال کے مطابق پشتونوں کا قدیم وطن کوہ بابا سے کوہِ سلیمان کی مشرقی شاخوں تک ہے۔ اس بارے میں "حدود العالم" کے مصنف سلسلہ ہائے کوہ سلیمان کے حدود میں ساول نامی گاؤں میں افغانوں (پشتونوں) کی رہائش کا

تذکرہ کرتے ہیں۔ مقامی روایات اور دربارِ غزنی کے مورخین مثلاً عُتبیؔ اور البیرونی یہی کہتے ہیں۔ مزید یہ کہ دہلی اور باقی ہندوستان کے پشتون شاہی گھرانے مثلاً لودھی سوری اور خلجی بھی اِسی سمت سے آئے تھے۔ اِن سب باتوں کی روشنی میں سرزمینِ روہؔ کا اطلاق اُس تمام کوہستانی علاقے پر ہوتا ہے جسے ہم "پشتونخوا" کہتے ہیں۔

روہستان پشتونخوا کے علاوہ پشتونوں نے اپنی سرزمین کو کوہستان، روہستان یا ولایت کا نام بھی دیا ہے۔ اور اپنے آپ کو کوہی، روہی یا ولایتی کہا ہے۔ تاریخ کے الگ الگ ادوار میں جو پشتون ہند میں آباد ہوئے ہیں انہوں نے روہیلہ کے نام سے شہرت پائی ہے۔ اور سرزمین ہند میں اُنکی ایک بڑی نوآبادی "روہیلکھنڈ" کے نام سے موسوم تھی۔ برصغیر جنوبی ایشیا کے دور اُفتادہ علاقوں میں قیام پذیر پشتون شعراء بھی اپنے کلام میں وطن کی مناسبت سے تخلص رکھا کرتے۔ اِس طرح خود کو روہ کی نسبت سے روہی اور کوہ اور ولایت سے کوہی اور ولایتی کہا کرتے۔ روہ۔ روہی۔ کوہی ولایت، ولایتی اور پشتونخوا کا تذکرہ اِن روہیلہ پشتونوں کے فارسی اور پشتو کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ پشتو زبان کے سب سے بڑے شاعر خوشحال خان خٹک کا کچھ فارسی کلام بھی دستیاب ہے۔ وہ اپنے فارسی کلام میں کبھی تو روہیؔ اور کبھی کوہیؔ کا تخلص لائے ہیں۔ جیسے کہ وہ کہتے ہیں[1]۔

روہی:۔

روہیؔ ام از پیشِ خوبانِ چگل — می روم دل پیش شان بگذاشتم

بہ زلف و خالِ تو روہیؔ مگر سرے دارد — کہ شد شکنج پریشان و تیرہ و ژولان

روہیا یوسفِ عہدیست نگارِ تو ولے — نیست آگاہ زِ دردِ دلِ یعقوبیِ تو

زِ روہیؔ می رود آن گلشنِ حسن — ز گلزارِ رُخش وِردے نہ چیدہ

کوہی:۔

روئے زرد و آہ سرد و چشم تر — عشق کوہیؔ را چنیں بیمار کرد

ز لعلِ شکرینِ تو نباتے — بہ کوہیؔ می رسد من من بگوید

---

[1] ارمغانِ خوشحال۔

(ترجمہ) "گل فام حسینوں کے لئے میں روہی ہوں اور میں اپنا دل اُن کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
شاید روہی کو تیری زلف و رخسار کی آرزو ہے کہ وہ ، پریشان دل اور آشفتہ حال ہو گیا ہے۔
اے روہی! تیرا محبوب اپنے عصر کا یوسف ثانی ہے لیکن افسوس کہ وہ تیرے یعقوب (علیہ السلام) جیسے دردمند دل سے آگاہ نہیں۔
"وہ گلشنِ خوبی روہی کو چھوڑے جا رہا ہے مگر افسوس کہ اُس نے گل زار رخسار سے ایک پھول بھی نہیں چنا"
"عشق نے روہی کو ایسا بیمار کیا کہ اُس کا رنگ فق ہے۔ سرد آہیں بھر رہا ہے۔ اور اُس کی آنکھ تر ہے"
"اُسکے لعل جیسے سُرخ اور میٹھے لبوں سے کوہی کو بہت سی مصری پہنچتی رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ "من من" کہے جا رہا ہے۔
اشرف خان ہجری کہتا ہے۔

(۱) کۂ میئن ئے پہ حیات ځنے ګو بہ څہ   د بہار پہ څیر دروی روهیلئ دی
(۲) هجری حُسن پہ روهي بتانو زیب کا   تر نسبت ئے د هند بونہ سهیلئ دی

"اگر تمہیں زندگی عزیز ہے تو ان سے دور رہا کرو۔ روہ کی دوشیزائیں باد بہاری کی طرح گذر جاتی ہیں"
"اے ہجری حُسن روہی، توں کو ہی زیب دیتا ہے اور ہند کی دوشیزائیں تو انکے آگے پانی بھرتی ہیں"
ہجری ولایتِ روہ کا ذکر یوں کرتے ہیں[1]۔

۱   زۂ خټک پہ بیجاپور اشنا پہ روہ دے   ولایت موسرہ اہ د هند و بار دے
۲   پہ اشعار ئے د پښتو فارسی تیرے کا   کۂ هجري پہ ذات خټک د روہ پښتون دے

"میں (خٹک) یہاں بیجاپور میں ہوں اور میرا محبوب یہاں سے بہت دُور "روہ" میں ہے۔ ہماری جدائی ایسی ہے کہ سرزمین ہند کی تمام مسافتیں ہمارے درمیاں حائل ہیں"
"ہجری قومیت کے لحاظ سے خٹک اور سرزمینِ "روہ" کا پشتون ہے لیکن اُس کے فارسی اشعار پشتو سے

---

[1] دیوان اشرف خان ہجری

زیادہ اچھے ہیں ۔

عبدالرحمان بابا کہتے ہیں[1] ۔

پہ امید د زلفو اونښتم پہ دام کښے　　　　روھیلے وم سادہ دل پہ ھند و بار کښے

" زلف یار کی امید نے مجھے دام میں پھنسا دیا اس ہند و بار میں میری مثال گویا ایک سادہ لوح روہیلے کی سی تھی ۔

بیسویں صدی کے مشہور شاعر فضل احمد غر بھی کبھی کبھار اپنے کلام میں روہی کے تخلص کو بروئے کار لاتے ہیں ۔ انکی زیادہ تر زندگی جنوبی ہندوستان میں اور آخری عمر لاہور میں گذری ۔ انہوں نے اپنا دیوان " روہی گلونہ " کے نام سے مرتب کیا ۔ لیکن ابھی تک یہ شائع نہیں ہو سکا ۔

سر اولف کیرو[2] کے خیال کے مطابق ملتان کی سرائیکی اور بلوچستان کی بلوچی زبانوں میں لفظ روہ پہاڑ کو کہتے ہیں ۔ ملتان اور ڈیرہ جات کے باشندے اپنی زبان میں تخت سلیمان کے پہاڑوں کے سلسلے کو اسی نام سے پکارتے ۔ اسی لئے ہند میں اس سے مراد پشتونوں کا علاقہ تھا ۔ اور روہی روہیلہ اسی سرزمین کے مکینوں کو کہتے تھے ۔ کیرو کہتے ہیں ۔ کہ سولہویں صدی عیسوی میں خوشحال خان خٹک نے پشتونخوا کے باشندوں کو " روہی " کہا ہے ۔

اس سلسلے میں مسٹر الفنسٹن[3] کی تحقیق بھی اسی نوعیت کی ہے ۔ انکے خیال کے مطابق بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ روہ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ۔ خلاصۃ الانساب کے مؤلف حافظ رحمت خان نے بھی اس علاقہ کو روہ کہا ہے[4] ۔

روہ کی ہی سرزمین پشتون مسافر کی ولایت تھی ۔ اس لئے سرزمین ہند میں یہ ولایتی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔ خوشحال خان بابا نے اپنے ایک قصیدے میں تخت دہلی کی مختصر سی تاریخ بیان کی ہے اسکے ایک شعر میں سلطان جلال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں[5]

سہ　بیا سلطان جلال الدین پہ سریر کینیناست　　　　چہ پہ اصل کښے غلجے د ولایت وو

---

[1] دیوان عبدالرحمان بابا　[2] The pathan XVI　[3]

[4] خلاصۃ الانساب ص ۹۰ ، ۹۱　[5] اسی نسبت سے مشہور مستشرق میجر راورٹی نے اپنی ایک کتاب کا نام جو منتخب پشتو نثر و نظم ہے ، گلشن روہ رکھا ہے ۔

"پھر سلطان جلال الدین تخت نشین ہوئے جو دراصل ولایت کے غلزئی تھے"۔

اسی طرح پشتو رومانوں میں ایک معروف رومان "ظرف خان او مئی" کے دلاویز بول میں[1]

او بنانو اوخوړئ دا اوبۀ دے غاړے　　　　دا لوے ورنو نه

پروون لا دا مال ظریف دے　و و　　　　نن نو موتیں کړو تروولاتو نه

"او نٹو! خدا تمہاری لمبی گردنوں اور نکیلوں کو غارت کرے کل اِس وقت تک ظریف خان یہاں تھا اور آج تم نے اُسے ولایتوں سے پار پہنچا دیا"۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں قبائل صدیوں سے مقیم ہیں۔ اپنے پرانے نام پکتی ایکا کی نسبت سے اِس کا فطری نام پشتونخوا یا پختونخوا رہا ہے۔ یہ نام پشتون قوم کے آبائی وطن، تاریخ، تمدن، زبان اور ثقافت کی یکساں نمائندگی کرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ پشتون بادشاہ احمد شاہ ابدالی نے تخت دہلی حاصل کرنے کے باوجود اپنی پشتونخوا کے ساتھ محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اور روہستان کوہستان یا ولایت کی جگہ اپنی دلی محبت کی پیاس اِسی نام سے بجھائی ہے۔ افغان مورخین کے خیال کے مطابق پشتونخوا کے بعض حصوں کو موصوف نے ۱۸۹۳ء میں افغانستان کا نام دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر احمد حسن دانی مؤرخ فرشتہ کے حوالے سے لکھتے ہیں[2] کہ:-

"کوہستان کو افغانستان بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں افغانوں کے شور و شغب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں"۔

اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نام احمد شاہ بابا کے زمانے سے بہت پہلے مستعمل تھا۔

پشتونخوا میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں جو بدستور اپنے پرانے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں، یہ کسی قوم قبیلے یا گروہ سے مخصوص نہیں۔ جیسے بُنیر، سوات، باجوڑ، تیراہ وغیرہ انہوں نے قبائلی، معاشرتی یا نظریاتی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے نام "گندھارا۔ ستاگودیا۔ اداکوسیا۔ تتاگوش وغیرہ کیطرح خود کو تبدیل نہیں ہونے دیا۔

تیراہ چاہے افریدیوں کا ہو یا اورکزیوں کا۔ اس میں چاہے ہیروڈوٹس کے زمانے کے اپریٹائی قیام پذیر ہوں یا کوئی اور تیراہ کو تیراہ ہی کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر سوات باجوڑ میں گندھارا مقیم تھے یا گبر۔ دھگان، شلمانی، جہانگیری یا اب ترکلانی۔ اتمانخیل اور یوسفزئی مقیم ہیں لیکن باجوڑ۔ بنیر۔ سوات کے نام جوں کے توں رہے ہیں۔

---

[1] ظریف خان اور ادمئی کی کہانی سے۔ [2] سیناشہ ۱۹۶۸ء پشتون اور اسلام۔ ڈاکٹر اے ایچ دانی

بہرحال پشتونخواہی یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کے زمانے کے پکتیکایاپشتونخوا کی سرزمین کا سب سے پرانا نام ہے اور اس سرزمین کو پشتون عوام میں عہد قدیم سے اسی نام سے شہرت حاصل ہے۔ اسی لئے تو احمد شاہ بابا نے بھی اپنے کلام میں اس سرزمین کا تذکرہ اسی نام سے کیا ہے۔

د دیلی تخت هیرو مه چه را یاد کړم
زما د ښکلي پښتونخوا د غرو سرونه

"جب میں اپنی پشتونخوا کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو یاد کرتا ہوں تو تختِ دہلی تک فراموش کر دیتا ہوں"۔

پشتون اور پشتو

پشتو پاکستان میں ایک کروڑ سات لاکھ پشتونوں کی زبان ہے جو صوبہ سرحد اور بلوچستان کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے میدانوں، شہروں اور قصبوں میں بھی ہر سو پھیلے ہوئے ہیں بالا اور زیرین پشتونخوا میں پشتونوں کے ساتھ یکجا رہنے والے لاکھوں باشندے ایسے بھی ہیں، جو پشتو کو ثانوی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔
علمائے لسانیات کا خیال ہے کہ پشتو ہند آریائی زبانوں میں ایک بہت پرانی زبان ہے مستشرق انولڈ سن نے اپنے پیش رو مستشرقین و محققین کی کاوشوں اور اپنی عرقریزی سے جو جدید نتائج اخذ کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو بلا شک و شبہ مشرقی آریائی زبان ہے جس کی ساخت میں الفاظ کی صوتی رد و بدل کے لئے کافی لچک موجود ہے۔ اس کا براہ راست تعلق اوستا سے ہے۔ جس کا وجود کم از کم چھ سو سال قبل مسیح تک ثابت ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ انڈو اریائی زبانوں کے ساتھ بھی مربوط ہے خصوصاً د۔ ڈ۔ ٹ، ڑ۔ نون غنہ والی ڑ مثلاً نڑ کی ادائیگی یکساں ہے محقق مذکور کہتا ہے کہ پہلے ایرانی اور انڈو آریائی زبانوں کی ماضی اور مطلق دونوں زمانوں کے متعدی مصادر کے افعال یکساں تھے۔

پشتو لغات محاورے اور شعر و ادب کے ضمن میں خاص نفسیات اور مزاج کی حامل ہے۔ اس زبان کی ساخت بڑی پکی اور مضبوط ہے اس میں جذب و اخذ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے، انہی

خصائص کیوجہ سے تو یہ زبان اب تک زندہ ہے ۔

بعض مؤرخین خصوصاً افغانستان کے عصرِ حاضر کے اہلِ قلم کہتے ہیں ۔ کہ پشتو آریائی نسل کے ایک حصے کی زبان ہونیکے ناتے سے سنسکرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے ، لیکن بعض محققین کے خیال کے مطابق یہ بات صحیح دکھائی نہیں دیتی ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس زبان کا ماخذ سنسکرت ہو، تو قدیم رسم الخط بھی سنسکرت سے مشابہہ ہوتا ۔ حالانکہ اس زبان کا ابتدائی رسم الخط ناگری نہیں بلکہ خروشتی تھا ۔ اور خروشتی دائیں سے بائیں کی طرف لکھی جاتی ہے ۔ پھر یہ کہ پشتو میں فارسی ۔ عربی ۔ پہلوی عبرانی ۔ ترکی ۔ سُغدی ۔ خوارزمی الفاظ بھی موجود ہیں ۔ اس لئے الفاظ کی ایک آدھ مثال سے پشتو کی اصلیت انڈو آریائی نہیں ہو سکتی ۔

حیات افغانی کے مؤلف محمد حیات خان حیات افغانی میں یوں رقمطراز ہیں کہ " حقیقت یہ ہے کہ اس زبان کی بنیاد بہت زیادہ پرانی نہیں ۔ جدید فارسی ۔ پہلوی اور قدیم ژند کی آمیزش سے ایک کرخت سی زبان معرضِ وجود میں آئی جس کا نام پشتو پڑ گیا ۔

آگے لکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ پشتو کے اصوات کانوں کو بُرے نہیں لگتے " لیکن ان میں ادب ، بزرگی اور رکھ رکھاؤ کم ہے ۔ جو بھی تھوڑا بہت اس زبان سے واقف ہو اُسے یہ معلوم ہو گا کہ اس زبان کے بیشتر الفاظ معمولی ردوبدل کے ساتھ اور بعض اصلی شکل میں فارسی ہیں ۔

محقق محمد امین خوگیانی لکھتے ہیں ۔ کہ ویسے تو پشتو زبان کی قدامت مسلّم ہے کیونکہ اُن کے بیان کے مطابق اِس کا تذکرہ ویدوں ، مہابھارت اور اَوِستا میں موجود ہے ۔ اور پھر یونانی مؤرخین سٹرابُو اور ہیروڈوٹس نے بھی سکندرِ اعظم کے حملے کے ضمن میں اس کا تذکرہ کیا ہے محقق خوگیانی کا خیال یہ ہے کہ پشتو عوامی زبان تھی جسے علمی بنانے کے لئے بعض علماء متحد ہوئے اور حسب ضرورت اسے مہذب بنا دیا ۔ نامانوس و اجنبی کلمات نکال باہر کئے ۔ جب اسے صوتی قواعد و ضوابط کے تحت لایا گیا ، تو یہ زبان سنسکرت سے الگ نام سے موسوم ہوئی ۔

جناب فارغ بخاری کہتے ہیں ۔ کہ محققین متقدمین نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچادی ہے کہ پشتون قوم چودھویں صدی قبل مسیح میں بھی موجود تھی ۔ اور جدید تحقیقات کی رو سے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح تک اِس قوم کے وجود کے آثار و شواہد دریافت کئے گئے ہیں ۔" اگر اس تحقیق کو صحیح مانا جائے تو پھر تو یقیناً پشتو زبان بھی اُتنی ہی پرانی ہے ۔

اس لئے کہ کوئی قوم زبان کے بغیر جنم نہیں لیتی۔ اور نہ ہی اتنے عرصے تک بغیر بات چیت کے کوئی معاشرتی زندگی ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر ہم پشتون قوم کے ساتھ اس کی زبان پشتو کو بھی اُتنی ہی قدیم سمجھ لیں تو پھر اسکے شعر و ادب سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ رونا اور گانا انسان کے ساتھ ہی جنم لیتے ہیں اور گائیکی بغیر کسی شعر یا بیان کے ممکن نہیں۔ اس لئے پشتو زبان کے ادب کی تاریخ بھی اُتنی ہی قدیم ہے جتنے کہ خود پشتون عوام اور پشتو زبان کی تاریخ ہے۔ لیکن اپنی اس قدر زیادہ قدامت کے باوجود پشتو شاہراہ ترقی پر پیش قدمی کرنیوالی زبانوں میں بہت پیچھے دکھائی دیتی ہے۔ اسکی وجوہات اپنی جگہ بیان کی جائیں گی۔ بعض دانشوروں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ پسماندگی تحریر شدہ پشتو ادبی سرمائے کی کمی کی وجہ سے ہے لیکن زبان و ادب کے علماء نے کبھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی کہ یہ کمی اِس زبان کے عوامی ادب نے کافی حد تک پوری کر دی ہے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی ہو جو اس میدان میں پشتو کی ہمسری کر سکے۔ اس زبان کے عوامی ادب میں زندگی کے ہر موضوع اور ہر پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس میں سادگی و پُرکاری کے وہ نادر نمونے موجود ہیں جو پشتون عوام کی فطرت کی صحیح ترجمانی اور غمازی کرتے ہیں۔ باوجود اسکے کہ تاریخ کے کسی ایک دور میں بھی شاہی درباروں اور حکومتوں کی طرف سے کبھی سرکاری طور پر اس زبان کی سرپرستی اور پرورش نہیں ہوئی حتیٰ کہ خود پشتون بادشاہوں نے بھی اپنے سینکڑوں سال کے دور حکومت میں پشتو کو توجہ اور نظر کرم سے نہیں نوازا اور نہ کبھی اس زبان کو دنیائے علم و ادب میں کوئی مقام دینے کی آرزو کی پھر بھی یہ زبان اور اس کا ادب دونوں زندہ حقیقت ہیں۔

بادشاہوں اور سلاطین کے درباروں میں پشتو کی بینوائی کی داستان تاریخ ادبیات پشتو کا ایک مایوس کن باب ہے۔ لیکن اس سرد مہری کے باوجود پشتو نے اپنی سرزمین میں خود رو بیل بوٹوں، درختوں اور سبزۂ بیگانہ کی طرح اپنی جڑیں مضبوط گاڑ رکھی تھیں وہ ہر طوفان اور انقلاب کا مقابلہ کرتی رہی۔ چاہے وہ نظریاتی انقلاب تھا، یا علمی، فکری اور سیاسی طوفان، جن کی وجہ سے وقتاً فوقتاً باقی دنیا میں زبانوں کی شکست و ریخت جاری رہی۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ان طوفانوں نے زندہ زبانوں کا گلا گھونٹ دیا ہے اور ثقافتی ورثے، علمی ذخائر اور تحقیقی ادبیات کو یکسر تہہ و بالا کر دیا ہے۔ لیکن انقلابات کے ساتھ پشتون عوام اور پشتو زبان کی مانوس فطرت نے اس قوم اور اس زبان میں یہ خوبی پیدا کی ہے۔ کہ وقت کے مزاج کے ساتھ وہ اپنے مزاج کو ڈھالنے کی صلاحیت

رکھتی ہے۔ اور یوں اپنے آپ کو دوسری زبانوں کے حملے اور تصرف سے بچاتی رہی ہے۔
باوجود اس کے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں پیش آنے والے انقلابات کی نوعیت الگ الگ تھی لیکن ردّ و ایجاب کی فطری قوت اور لسانی لچک نے اس زبان کو ہر حملہ آور کے تعلیمی تصرف سے محفوظ رکھا ہے۔ افادیت کی خاطر اس نے سنئے عقائد، نظریات، افکار اور اصناف شعر و شاعری کو تو اپنایا، لیکن کسی دوسری زبان کے ہاتھوں خود کو فنا ہونے نہیں دیا۔
پشتو کی فطرت ازل ہی سے جدت پسند ہے۔ اس زبان کی طویل تاریخ کے تمام ادوار اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس نے ہر نئے اسلوب و انداز کو حب مزاج قبول کیا ہے۔
پشتو زبان کی تاریخ کے طویل ادوار نے یہ تمام آفات دیکھے اور برداشت کئے ہیں۔ لیکن ان کی جوین زیست نے جیسے کہ آب حیات نوش کیا ہو اور سات چکیوں سے نکلے ہوئے گھن کیطرح اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ماضی کے ہر طوفان سے نکل آئی ہے اور آج بھی اپنے فطری انداز میں زندہ اور روبہ ترقی ہے۔

پشتو کا ماحول

بے آب وگیاہ پہاڑ اور دشت و بیابان پشتونخوا کا مقدر بن چکے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کی قبائلی زندگی بھی عموماً خانہ بدوشوں جیسی رہی۔ سرسبز مرغزاروں اور شاداب چراگاہوں کی تلاش میں ان کا ساز و سامان ہمیشہ لدا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ ان قبائل کے درمیان رقابتیں اور جنگ و جدل بھی پیش آتے رہے۔ یہ قبیلے ہر وقت ایک دوسرے کو سرسبز و شاداب مسکنوں اور چراگاہوں سے نکال باہر کرنے کے درپے ہوتے اور یوں انکے درمیان قبائلی مخاصمت اور دشمنی جاری رہتی[1]۔ یہ کیفیت ایسے حالات میں مزید بڑھ جاتی جب خشک سالی، یا قحط پڑتا اور پانی کی قلت ہوتی۔

---

[1] تذکرۃ الابرار والاشرار ص ۱۴۴

پشتو محاورات، ضرب الامثال نقلوں، ٹپوں، چار بیتوں اور مروت قبیلہ کے کسروں وغیرہ غرضیکہ تمام لوک گیتوں میں اس قسم کے واقعات کی بڑی پُر لطف اور دلچسپ روداد اور بیان موجود ہے۔ جیسے کہ کہا ہے "بھائی مارے جانے سے تو یہ بہتر ہوگا کہ گوت کو چھوڑ دیا جائے" یا اگر بے آرامی نہ ہوتی تو ہر کسی کا خیمہ اپنی جگہ پر آباد ہوتا"۔
پشتو زبان کی وہ کہانیاں جو پشتون مائیں پشت با پشت سے اپنے بچوں کو سناتی ہیں۔ ان میں بھی بہت سی ایسی ہیں جو ان چراگاہوں اور سرسبز و شاداب ماحول میں پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتی ہیں تاخت و باخت کا یہ سلسلہ بعض پشتون قبائل میں آج بھی موجود ہے جو ایک دوسرے کی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور مال مویشیوں کے گلے اور رمے بھگا کر لے جاتے ہیں۔ ان روایات نے پشتو ادب اور خصوصاً شعر و شاعری پر گہرا اثر ڈالا ہے اور بعض قبائل میں شعر و شاعری کے خصوصی اصناف کو فروغ دیا ہے۔

ان اصناف میں سب سے زیادہ اہم صنف جو تمام تر ایسی ہی موضوعات رکھتی ہے۔ اور جو قبیلۂ مروت میں مقبول ہے وہ "کسرونہ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ مروتوں کے کسر اسی قسم کے ماحول میں جری اور جنگجو پشتونوں کی جسارت کے قصے بیان کرتے ہیں۔ یہ پشتو کی قدیم شاعری کا ایک خالص اور دلچسپ نمونہ ہے جس میں پشتو شاعری مغربی شاعری کی طرح بحر اور وزن کی تابع تو تھی لیکن اس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ تاہم بیان رواں اور مصرعے اچھے خاصے موزون تھے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ؎

اتمل زوئ د ظفر دے نن ئے بیا کړے ھنر دے

تاختے ئے کڑ تیار په بنجو خیل وترسیده
وختے ئے بر بخو وو چه راتول ئے کړهٔ مالونه
د لته بنجو خیلو پسے ووهل د ډولونه
چیغه په کبرېزی بنجو خیل پسے سپر وزی
په سرچه شي وزیر ده یاره نن ئے په وُدریزی
یاره سپینو تورو تر راجی لکه پراندهٔ
بیا زوئ ئے تجمل وو ژغئے اودے پاس په تمل وو

دوسرد تربرونه سپاره سوی په عمل دو
سانګوغرب به وکی که د شمنے اولیده

اٹل ظفر کالاڑ کا آج پھر اپنی جنگی مہارت کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہے پنجوخیل کو ہراسان کرنے کے لئے اُس نے حملے کی تیاری کی اور دوپہر ہونے سے پہلے پہلے اُس نے ڈھور ڈنگر اکٹھے کئے ۔ پنجوخیل کو ڈرانے دھمکانے کی خاطر ڈھول بجائے اور نعرہ مارکر اور سوار ہوکر اُن کا پیچھا کیا چونکہ سب سے آگے وزیر ہے ۔ اس لئے وہ رُکنے والے نہیں ۔ وہ اندھے ہوکر سفید تلواروں کی زد میں آرہے ہیں ۔ اُس کا ایک جوانمرد بیٹا تھا جس کا نام بخمل تھا ۔ اور جس کی شہرت دور دور تک پہنچی تھی ۔ اُن کے ساتھ اُنکے عزیز عملی اقدام کی خاطر سوار تھے ۔ اگر انہیں دشمن دکھائی دے، تو وہ اُس سے دو دو ہاتھ کرکے اپنی بہادری کا لوہا منوالیں گے ۔

بدلہ اور چاربیتہ میں بھی اِس قسم کی شعروشاعری کے اچھے خاصے نمونے موجود ہیں ۔ شاعری کے ان قدیمی اصناف کو "چرواہوں کی شاعری" "PASTORAL POETRY" کہا جاتا ہے ۔ اِس قسم کی شاعری میں محض اُسی ماحول کی ترجمانی کی جاتی ہے ۔ پشتو ٹپہ میں اُس کے بعض موضوعات بڑے دلچسپ اور پُر لطف ہیں ۔ شاید یہی سبب ہے کہ پشتو ٹپہ پشتونوں کے مزاج اور فطرت سے اُنکی شاعری کی دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ مطابقت رکھتی ہے ۔ جیسا کہ کہا ہے ؎

لیلی دغواوُ غوبنه شوه ــــ مالتہ غوشکے کړے چه ځنګزن ورسره ځمه

شاړے بنجرے شوے آبادے ــــ اوس به لیلی غوا کلنے کوم ځلئے څروینه

"لیلی چرواہی بن گئی ہے ۔ مجھے سست رو بچھڑا بنادے تاکہ میں اُس کے سنگ جایا کروں"

"غیر آباد اور بنجر زمینیں آباد ہوگئیں ۔ جانے اب لیلی اپنی گائے کہاں چرائیگی" ؟

یہ دونوں مثالیں محض اُس قسم کی شاعری کی ہیں جو چرواہوں کے ماحول اور قدیمی معاشرتی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں اس قسم کی شاعری میں ماضی اور حال کے سبھی ادوار میں ایک ہی قسم کے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا گیا ہے ۔

درسی ادب اور اسلامی کتابیں

جیساکہ یونانی زبان کی قدیمی علمی اور ادبی تخلیقات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اِس زبان کی وہ کتابیں ابھی تک موجود ہیں جنہیں یونانِ قدیم میں درسی کتُب کا درجہ حاصل [1] تھا۔ اسی طرح پشتو کی کتابوں پر بھی یہ نظریہ صادق آتا ہے۔ اور اسلام کی اشاعت کے آخری دور میں اِس زبان کی وہ علمی اور ادبی تخلیقات جنہیں مسلسل مانگ کی وجہ سے فروغ حاصل ہوکر ایک طرح کا نصابی درجہ حاصل ہوا تو یہی کتابیں بار بار نقل کی گئیں اور ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کے پاس منتقل ہوتی رہیں۔ ایسی کتابوں میں "مخزن اسلام" "دیوان عبدالرحمان بابا" "دیوان بابو جان" "فوائدالشریعت" "رشید البیان" "فقص نامہ" "نور نامہ" دیوان حافظ۔ جنت الفردوس۔ نافع المسلمین۔ قیامت نامہ وفات نامہ عہدنامہ وغیرہ۔ اور اسی طرح بعض جنگ نامے اور معجزاتِ نبوی کی کئی اور کتابیں اِسی زمرے میں آتی ہیں۔

یونان قدیم میں بعض ناقدوں نے ادبی تخلیقات کے معیار کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی مقرر کی تھی جو کتاب بھی اس پر پوری نہ اترتی وہ خود بخود ادب کے دائرے سے خارج ہوکر کچھ عرصے کے بعد ضائع ہو جاتی تیسری صدی ہجری کے بعد پشتو ادب میں اسی طرح کے ایک نظریاتی انقلاب نے جنم لیا یہاں تک کہ اِس زبان کی ادبیات نے اپنا قدیم راستہ یکسر بدل دیا۔ اِس ضمن میں مغربی دنیا کا ایک محقق لکھتا ہے۔ کہ جب پشتو نے اسلام قبول کیا تو وہ یہ بالکل فراموش کر گیا کہ پہلے وہ ہندو، بدھی یا کچھ اور بھی تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم ادب کا وہ تمام موجود ذخیرہ تلف کر دیا گیا۔ جو تحریری شکل میں موجود تھا، اور اب ایسی کوئی تحریر دستیاب نہیں رہی، جو قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت کے دور کے پشتو ادب کا خالص نمونہ ہو۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ خود اسلام نے پشتونوں کی ساری زندگی پر عربوں کی

---

[1] اسکے لئے یونانی کلاسیکی ادب مولفہ ٹی۔ اے سنکلیئر ایم اے دیکھئے۔

زندگی سے کہیں زیادہ گہرا اثر ڈالا ہے اِس لئے کہ عربوں میں اب بھی زمانۂ جاہلیت کا شعر و ادب اور بعض علمی موضوعات مقبول ہیں۔ اور ادب و تنقید کی کتابوں میں اُن کا بڑے شدّومد سے تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن پشتون فطرتاً ایک ہی ڈگر پر چلنے والے لوگ ہیں جب انہوں نے ایک دفعہ اپنا قدیمی راستہ ترک کر دیا تو پھر اُس سمت پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

عقیدے کے مقابلے میں عربوں کے زمانۂ جاہلیت کا ادب ضائع نہیں کیا گیا۔ بعض عرب علماء مثلاً محمود شکری آلوسی اِس کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اِن کے فطری علوم و معارف کچھ اِس قسم کے ہیں کہ اُن سے اُن کے ذہن کی تیزی، قوت فہم اور کمال استعداد اُجاگر ہوتا ہے۔ اِس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اِس میدان میں انہیں باقیماندہ دنیا پر سبقت حاصل تھی۔ لیکن پشتون اگر اِس قسم کی برتری کے دعویدار نہ بھی ہوتے پھر بھی وہی کچھ جو اُنکی فطرت کا ترجمان تھا اور اُنکی زبان میں اُن کے مزاج کے مطابق تخلیق کیا گیا تھا وہ سب کچھ انہوں نے "جاء الحق وزھق الباطل" کے حکم کی پیروی میں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھدیا۔ اور باوجود اِس کے کہ کسی زمین کا خود رو پودا بھی اسی زمین کا چیدہ اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ پشتونوں نے اپنی یہ فطرت بھی نورِ اسلام کو قبول کرنیکی خاطر بدل ڈالی۔ اُنکی زبان میں ادب کی صرف وہ اصناف باقی رہ گیئں جو زمانۂ قدیم سے عوامی رنگ میں سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں اِن میں قصے، روایات، نقلیں، ضرب الامثال، ٹَرغونہ، نعرے، مرثیۓ، غاڑے، کسرونہ وغیرہ تمام عوامی گیت شامل تھے۔ جو ہر جگہ اُنکی زندگی کے ساتھی تھے اور جن کا اُنکی عام معاشرتی بود و باش کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ پشتو زبان کی یہ اصناف آج بھی زندہ و پائندہ ہیں چونکہ ان کا کوئی تاریخی دور دریافت و متعین نہیں کیا جاسکتا، اس وجہ سے یہ تاریخِ ادب میں زمانے کی قدامت کو متعین کرنے کے کام نہیں آسکتے۔

"آئیسوگلاس کا خطہ"

محل وقوع کے لحاظ سے سرزمین روہ ایسے جغرافیائی مقام پر واقع ہے کہ یورش و انقلاباتِ زمانہ کے کئی ریلے اِس پر سے گذرے ہیں۔ ان انقلاباتِ زمانہ کیوجہ سے پشتو ادب کا تحریری سرمایہ وقتاً

نوقتاً تلف ہوتا رہاہے اور پشتو کے قدیمی ادب کے سرمائے کا کوئی تحریری نمونہ ہم تک نہیں پہنچا، اس لئے ہم اپنے ادبی ورثے کے سلسلے میں ایسی کوئی سند پیش نہیں کرسکتے جسے ماقبلِ اسلام کے ادبیات کا نام دیا جاسکے۔ اگر محقق حبیبی اور بعض دوسرے صاحب بصیرت محققین کا یہ دعویٰ صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے کہ قدیم فارسی چھٹی صدی قبل مسیح سے ایران میں بولی جاتی تھی۔ اور ہخامنشیوں کی درباری زبان تھی پھر بھی اس زبان کی بھی کوئی ایسی تصنیف موجود نہیں، صرف ایران اور مصر کے بعض مقامات پر خط میخی میں پتھروں پر کندہ کچھ عبارات ملی ہیں۔ جو مل ملاکر تین سو الفاظ بنتے ہیں۔ ہخامنشیوں کے گھرانے کا ایک بڑا بادشاہ داریوش گزرا ہے۔ یہ بادشاہ ۵۲۲ ق م اور ۴۸۶ ق م کے درمیان زندہ تھا۔ اس ایرانی بادشاہ کے حکم کے مطابق بیستون کے کتبے لکھے گئے ہیں۔ اُن کتبوں میں چوتھے ستون پر حماسی انداز میں یوں لکھا گیا ہے ؎

نے اریکہ آہم نے درو جنہ آہم

نے زورہ کرہ اہم

"نہ تو میں پابند تھا اور نہ فریبی مکار، ظالم اور ستمگر"۔ ان تینوں مصرعوں کی تقطیع سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پہلے دو مصرعے چھ چھ اور آخری سات ماترون کا ہے۔ نے ا۔ ری۔ کہ آ۔ ہم۔ نے۔ درو۔ جہ۔ نہ آ۔ ہم۔

دانشور حبیبی لکھتا ہے کہ اس میں نے، نا کی آواز دیتا ہے۔ اریکہ یا اڑیکہ پشتو میں اڑیکہ بمعنی "پاسے بند" یا اڑی کرنے والا کے ہے۔ "اہم" "دِم" کی شکل ہے۔ جیسے اب بھی بعض پښتون "ادم" کہتے ہیں "دروجہ نہ" اب بھی اُس شکل میں "دروہ جن" موجود ہے جو فریبی اور مکار کے معنوں میں آتا ہے۔ "ځورکرہ" زورگیر۔ ظالم اور ستمگر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حبیبی کہتے ہیں کہ ان کلمات سے ہم پشتو اور قدیم فارسی کی باہمی ساتھ قربت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں کہ شمالی افغانستان کے گردونواح اور ہندوکش کے دامن میں گیارہویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ایک زبان بولی جاتی تھی جو آج کل کی دری زبان کی ماں سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کی صرف ایک حجری تحریر ۱۹۵۱ء میں بغلان کے سُرخ کوتل نامی مقام سے ملی ہے جو پچیس سطروں اور ۲۰۰ یونانی الفاظ

پر مشتمل ہے اس تحریر کے تمام فقرے ۱۶۵ ہیں لیکن ہر فقرے کے درمیان ایک فاصلہ اس شکل " ٥ " کا موجود ہے۔ جیبیؔ کا خیال ہے کہ اس کتبے میں موجودہ حروف کی تطبیق پشتو اور دری دونوں زبانوں کے موجودہ حروف پر ہوتی ہے۔ لیکن بعض آوازیں ایسی بھی ہیں جو پُرانی دری میں پشتو کی مخصوص آوازیں ٹ۔ ڈ۔ ڑ جو قدیم دری میں بھی نہ تھیں بغلان کے اِس کتبے میں بھی موجود نہیں ہیں۔ اسی تحقیق کے مطابق ہلمند اور دریائے سندھ کے درمیان زبانوں کی تقسیم کا ایک آئیسوگلاس " Iso glass " موجود رہا ہے جو پشتو اور دری کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اِس کتبے کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو اور پُرانی دری ایک دوسرے کے بہت زیادہ مشابہ تھیں۔ اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ پُرانے کتبوں میں بھی وہی کلمات لائے گئے ہوں جنہیں پشتو اور دری بولنے والے سبھی سمجھتے تھے۔

پشتو ادب کا قدیم معیار

پشتو میں عوامی ادب کے سبھی اصناف اپنے انتہائی بلند معیار سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عہد قدیم سے جن صاف ستھرے۔ خالص اور معیاری خیالات کے وہ حامل رہے ہیں۔ اُسی معیار سے اُن کے قدیم ادب کو پرکھنا مناسب ہوگا۔ اس لئے کہ اِسی خطے میں آریا تہذیب گزری ہے اور یہیں بلخ و باختر کے بلند پرچموں والے شہر اُس زمانے سے آباد تھے جبکہ باقی دنیا مہذب انسان کے قبضۂ قدرت میں ابھی آئی بھی نہیں تھی اس سرزمین پر زرتشت نے جنم لیا ہے۔ اور شاید اِسی علاقے میں پہلی بار ایک باقاعدہ عالمگیر مذہب کی تعلیمات " اوستا " کی شکل میں دُنیا کو دی گئی ہیں۔ یہاں ہندو اور بدھ مذہب نے اپنے عروج وزوال کا زمانہ دیکھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ رگ وید کی مقدس کتاب بھی اِسی سرزمین پر لکھی گئی ہے مختصر یہ کہ یہیں تہذیب وادب کے سرچشمے پھوٹے اور کچھ عرصے اہل یونان کی بالادستی کا دور دورہ بھی رہا۔ اِسلام سے قبل یہ سبھی کچھ اِسی سرزمین پر موجود تھا۔ اور اسلام کی اشاعت کے بعد بھی جب یہاں باقاعدہ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں تو یہی معیار اُن درباری زبانوں میں برقرار رکھا گیا جنہیں عام طور پر شاہی درباروں اور بالخصوص دربار غزنویہ کی سرپرستی حاصل رہی۔

بے قرار زندگی

اُس زمانے میں شاہی درباروں کے قبضۂ قدرت سے آزاد پشتون مجاہد جنوبی ایشیا میں ہر اسلامی پرچم کے زیر سایہ شمشیر بدست رہے انہوں نے اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دیا تھا وہ اب قبائلی ، قومی یا نسلی عصبیت کی جگہ عالمگیر اسلامی اخوت کے شیدائی بنے ہوئے تھے ۔ اس لئے انہوں نے اپنی زبان اپنے قدیم ادب اور عہد رفتہ کی فرسودہ روایات کی اہمیت کو سراسر فراموش کر دیا تھا ان کا خلوص اس حد تک تھا کہ بار بار سننے سے انہیں کامل یقین ہو گیا کہ واقعی پشتو دوزخ کی زبان ہے اور جب اس کا ٹھکانا ہی دوزخ ٹھہرا تو پھر اسے توجہ دینا یا اسکے شعر و ادب کی نگہداشت اور پرورش کرنا بھی تو جہنمیوں کا عمل ہوا ۔ ان حالات میں وہ یہ قطعاً بھلا بیٹھے کہ ادب وہ قوت ہے جو ، علمی خیالات اور تفکرات کو جنم دینے کا سبب ہوتا ہے اور جو معاشرے کے ذہنی ارتقا اور نشوونما کا باعث بنتا ہے ۔ بقول اقبالؒ ؎

جہان تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

ادب خیالاتِ بشری کو جمود سے بچاتا اور انسانی جذبات و افکار کو فروغ اور دوام بخشتا ہے ۔ یہ وہ قوت ہے کہ باقی تمام قوتیں اسکی تابع ہیں ۔ زندگی کے زیر و بم کی ساری رعنائی ، افکار و خیالات کے ربط و ترتیب اور اُنکی جدت اور تسلسل سے قائم ہے اگر یہ نہ ہو تو تہذیب کے ارتقا کی رفتار تھم جائے ۔ زندگی میں جمود اور سست روی پیدا ہو اور زبان جو انسان کا سب سے بڑا معجزہ ہے اپنی اعجازی قوت سے محروم ہو جائے ۔ اور جس وقت زبان ، زبان نہیں رہتی ، تو زندگی بھی بے مزہ اور مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے اور جب زندگی مفلوج ہو جائے تو برگ زیست مدقوق دکھائی دینے لگتا ہے ۔ اور پھر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ وہ جھڑ جاتا ہے ۔ اور وہ معاشرہ تہذیب کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے ۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت کی بے شمار مثالوں سے پُر ہیں کہ سُست رو اور پسماندہ قومیں توی چوکس اور بیدار قوموں کی ہمسری ہرگز نہیں کر سکتیں ۔ اور یہی قانونِ قدرت بھی ہے کہ جس میں زندہ رہنے کی اہلیت اور سکت ہو وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے ۔ دنیا میں زندہ رہنے کا حق صرف اُنکو دیا گیا ہے جو صلاحیت رکھتے ہوں ۔ قدرت کا یہی

قانون نباتات، حیوانات، اور انسانوں کی طرح معاشروں، ثقافتوں تمدنوں اور زبانوں میں بھی جاری و ساری ہے۔ فنا اور بقا کا یہ فطری عمل ہر کہیں یکساں ہے۔

پشتونوں کے تمدنی اقدار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پشتون قبائل نے زمینداری اور زراعت کیطرف بہت دیر سے توجہ دی ہے۔ انکی تمام پرانی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انکے بنیادی پیشے یا تو لشکر کشی مویشی پالنا اور یا گھوڑوں کی تجارت اور کاروبار کرنا تھا۔ لیکن ان کی عام زندگی کی یک رنگی نے انہیں زندگی کا ایک ایسا فلسفہ ودیعت کیا تھا۔ کہ اپنے مابین بہت سی پرانی رنجشوں اور مخاصمتوں کے باوجود انکے سبھی قبیلے وضع شدہ اصولوں کے مطابق زندگی گذارتے آئے ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جنہیں یہ اپنی اصطلاح میں "پشتونولی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس لحاظ سے پشتو صرف زبان ہی نہیں بلکہ اُن معاشرتی اصولوں کا نام بھی ہے جن پر پشتونوں کی عوامی زندگی اور روایات استوار ہیں یہی وہ نظریۂ حیات ہے جس پر انہوں نے ہمیشہ فخر اور ناز کیا ہے۔ پشتون اپنی "پشتونولی" کو تمام اعلیٰ انسانی صفات اور زندگی کے بہترین اقدار کا مجموعہ خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض پشتون مفکرین نے پشتو کو حقیقی اسلام کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسے انسانی شرافت کی کسوٹی اور تمدن کی معراج خیال کیا ہے۔ ان میں محمد گل خان مہمند، امیر حمزہ خان شنواری، حاجی سمندر خان سمندر، مولانا عبدالقادر۔ عبدالاکبر خان اکبر، عبدالخالق خلیق، محمد اکبر خادم۔ میاں احمد شاہ بادشاہ، عبدالغفار خان اچکزئی۔ خان میر ہلالی، صنوبر حسین کاکاجی اور پروفیسر پریشان خٹک وغیرہ وغیرہ، وہ بزرگ شامل ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور کہا ہے۔

"پشتونولی" کی یہ اہمیت محض نئی قومیت پرستی کے رجحانات کیوجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس کا احساس بھی اسی قدر قدیم اور پرانا ہے جس قدر کہ اس زبان کی ادبیات اور اس نسل کے افکار ہیں۔ پشتو ضرب الامثال میں "پشتونولی" کے ان تمام اقدار کی ترجمانی بڑے اچھے انداز میں موجود ہے۔

ہر زبان میں ضرب المثل کی قدامت اور حقیقت کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس لحاظ

سے پشتو کہاوتیں بھی پشتونولی کی فضیلت کی قدامت کے بارے میں بڑی ثقہ دلیل ہے۔ پشتو کہاوتوں میں اُن اوصاف اور اقدار (جن سے پشتونولی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے) کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ اور اُن میں سے بیشتر کہاوتوں میں پشتو کی مرکزیت اور اہمیت ایسی صاف دکھائی دیتی ہے کہ پشتو گویا درخت کا ایک تنہ ہے اور باقی تمام انسانی اور معاشرتی اوصاف و اقدار ٹہنیوں اور شاخوں کی مانند ہیں مثلاً

اولوالعزمی | پشتون کی دکے ڈھیر پر رہٹ تک مار بیٹھتا ہے۔

حمیت اور عذر | پشتون ننگ و حمیت پر کٹ مرتا ہے۔ اور اگر عذر پیش کیا جائے تو جی اٹھتا ہے۔

باہمی احترام | جو پشتون غیرت و حمیت سے عاری ہو اور خویش و اقارب کی سبکی پر اُتر آئے وہ نیست و نابود ہو جائے۔

پابندیٔ روایات | پشتون، جس میں ننگ و غیرت نہ ہو تو اُس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔

خلوص اور بدی | پشتون دشمن کو کھا جاتا ہے اور ہندو دوست کو۔

غیرت | پشتون مارے غیرت کے خود کو آگ میں جھونک دیتا ہے۔

عسکریت | پشتون گھر میں پیدا ہوتا ہے اور مورچے میں مرتا ہے۔

بدلہ | پشتون اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہے۔

بردباری | پشتون ہلکا بوجھ نہیں لے جاتا۔

رضا صلاح | پشتون کو آہستہ آہستہ ورغلاؤ اور ہندو کو مٹی کا ڈھیلا دکھا کر ڈراؤ۔

نیکی بدی فراموش نہ کرنا | پشتون سب کچھ کرتا ہے مگر بھلاتا نہیں۔

غیرت و سخاوت | پشتون وہ ہے جو دلیر بھی ہو اور مہمان نواز بھی۔ پشتو کے لوک گیتوں، خصوصاً ٹپوں میں اِس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں جن کا بنیادی موضوع "پشتونولی" کے وہ عناصر ہیں جن کا اُس کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔

6206

پشتو چودہ سو سال پہلے

پشتو ادب کی قدیمی تاریخ کا بیشتر حصہ اگرچہ اب بھی تحقیق اور تدقیق کا محتاج ہے۔ پھر بھی دورِ اسلامی کے آغاز کے بعد یہ زبان نظم و نثر دونوں میں جن عمدہ اور دلکش آثار کی حامل ہے، اُسکے کچھ پرانے نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

دانشور حبیبی نے ان نمونوں کے بارے میں اپنے مقالے "پشتو خوار لس سوہ کالہ پخوا" میں ایک دلچسپ تحقیق کی ہے یہ مقالہ[۲] پشتو جریدہ کے ۱۹۶۰ء کے شمارے میں چھپا ہے۔ مقالہ کے آخر میں انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ یوں ہیں (۱) لویک[۱] ایک شاہی گھرانہ تھا جو زابلستان اور غزنی میں کابل شاہیوں کے ساتھ رشتے ناطے رکھتا تھا۔ ان کا نام پشتو کے (لوئے) سے مشتق ہے اور انکی زبان پشتو ہے۔ ان میں سب سے قدیم لویک وجویر (وجویر) کے نام سے موسوم تھا جو ۱۲۰ھ میں زندہ تھا۔

(۲) ویکوں کی زبان کا یہ ایک شعر بطور نمونہ رہ گیا ہے ؎

پہ زمی گزنہ بنخید لویک لویانو باتیلہ لو بہ

کبنہ تو بہ براغلوم (رسلوم) ملہ تازیو بہ ملا

(۳) انکی زبان کا لہجوی طریقہ وزدگوں محسودوں اور وزیریوں کی موجودہ طرزِ ادا سے مشابہ ہے۔

(۴) یہ اصنام پرست تھے لیکن بعد میں مسلمان ہو گئے۔

(۵) صفاریوں اور غزنویوں کے ساتھ انکے جھگڑے صدیوں تک جاری رہے۔

(۶) خاندانی لحاظ سے غلجیوں کے زیادہ قریب تھے۔ اس لئے کہ ان کی زبان کو زبان غلجیہ کہا گیا ہے۔

(۷) غزنی کا قدیمی نام (گزنہ) جیسے کہ سغدی اور فارسی زبانوں میں رشتہ ہے۔ پشتو میں بھی گزنہ تھا۔

---

[۱] تاریخ استناد (پٹہ خزانہ) موقع پر بحث کی جائیگی۔

[۲] پشتو چودہ سو سال قبل۔ مقالہ حبیبی پشتو ۱۹۶۰ء پشتو اکیڈیمی۔

(۸) پشتو کی ایک قدیم نظم کہنے والا لویک جو خاندان لویک اور خنجل کابل شاہ کا معاصر تھا۔ غالباً ۲۶۳ھ میں زندہ تھا۔ وہ بھی شاید امیر کروڑ سوری کی طرح پشتو کا ایک قدیمی شاعر اور اُس کا معاصر تھا۔

(۹) لویکان کا گھرانہ سبکتگین کے ہاتھوں ختم ہوا (۳۶۵ھ)

(۱۰) اُس زمانے میں پشتو (ن ۳۰۰ھ) شرقی پہلوی کے نزدیک تھی جیسے اِس شعر میں زمی۔ گرزنہ۔ برا غلوم اور تازی وغیرہ کے کلمات سُغدی اور پہلوی کے ساتھ قرب و مماثلت و اشتراک رکھتے ہیں لیکن امیر کروڑ کا اُس زمانے کا کلام بھی موجود ہے جو ان اثرات سے پاک و منزہ ہے لہذا یوں معلوم ہوتا ہے کہ امیر کروڑ کی زبان غور کے پہاڑوں میں اُن بیگانے اثرات سے کہیں دور تھی۔"

زابل اور غزنی کے آس پاس ساسانی دور کی ثقافت اور زبان نے اپنے اثرات چھوڑے تھے۔ اس لئے کہ یہ پہاڑ اور دشت ودمن ہند کی سیاسی اور تجارتی شاہراہ تھی اور ایران ماوراء النہر اور عربوں کی آمدورفت یہاں زیادہ تھی۔ لہذا اُنکے ثقافتی اور لسانی اثرات کا ہونا بھی ایک طبعی بات ہے۔

(۱۱) سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں سفید ھُن (آریائی قوم) تخارستان کی طرف سے زابلستان آئے اُنکے ساتھ ھفتالی (ابدالی) ارغنداؤ اور بلند کے ندی نالوں کے قریب اور پہاڑوں کی وادیوں اور گھاٹیوں میں "کوزک" تک قدیم پشتونوں کے ساتھ خلط ملط ہو کر قیام پذیر ہو گئے۔ لفظ ابدالی (درّانی) میں وہ بندھن اب بھی موجود ہے اور دوسرا گروہ غلجی خلجی (غرجی) کے نام سے مقامی پشتونوں کے ساتھ آباد ہو گیا تھا۔ اُن لوگوں کی زبان چاہے جو بھی تھی لیکن یہاں زابلستان میں غزنی سے لے کر سیستان تک پشتو ہو گئی۔ اور قدیم پشتونوں کے ساتھ اِن کی شمولیت کی وجہ سے اُس زبان میں بعض قدیمی الفاظ و کلمات شامل ہو گئے۔ جیسے ہون جو خان کہلایا۔ اولس جرگہ۔ یرغل وغیرہ۔

"امیر کروڑ"

عہد قدیم کے مورخین سوری کو زوری کہتے ہیں جنوبی شام، عراق اور لبنان میں دروز یا دروزی کہلاتے ہیں۔ یہ بھی لویکوں کے گھرانے کی طرح پشتون بادشاہوں کا ایک قدیمی خاندان ہے۔ دانشور حبیبی کے قول کے مطابق پشتو

زبان کی اسلامی دور کی ادبیات کے بعض قدیم آثار جواب تک موجود ہیں، اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ادبی آثار پشتو زبان کی ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سوری غور کا ایک مشہور طبقہ ہے جواب بھی ہے۔ اور جنہیں زوری کہا جاتا ہے۔ یہ بہت پرانا نام ہے عرب مورخین اور جغرافیہ دانوں نے بھی انہیں زور یا زوری کہا ہے۔ اسلامی دور کا پہلا مورخ جسے زور کا نام دیا گیا احمد بن یحییٰ ہے جو البلاذری کے نام سے مشہور ہے۔ بلاذری ۲۵۵ھ کے لگ بھگ کابل اور سیستان کی فتوحات کے ضمن میں لکھتا ہے کہ ۳۰ھ کے بعد عبدالرحمان بن سمرہ بن حبیب بن عبدالشمس سیجستان، زرنج اور کش پر قبضہ ہونے کے بعد الرخج کے راستے بلادِ اور تک پہنچے اور وہاں کے مقامی باشندوں کو "جبل زور" کے قلعے میں محصور کیا۔ اور بعد میں اُن سے صلح کرلی۔ اور ایک بڑا طلائی بت جس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں اور نام زور تھا پر قبضہ کیا۔ پہلے اُس کے ہاتھ کاٹ ڈالے اور آنکھوں سے یاقوت نکالے۔ اور زوریاں کے بت خانے کے "موبد مو بدان" کو کہا کہ یہ بت کسی کو کوئی نقصان یا نفع نہیں دے سکتا۔ اسکے بعد بست اور زابل پر حملہ کیا۔

مورخ زید بن احمد بن سہیل بلخی (متوفی ۳۲۲) اور مورخ اصطخری دونوں اُس بت اور جبلِ زور کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی کچھ یاقوتی نے بھی "معجم البلدان" میں نقل کیا ہے

جیسی بعض چینی مورخین مثلاً ہیون سانگ کے حوالے سے کہتا ہے کہ رب النوع آفتاب کا وہ بت جو ہندوکش کے جنوبی جانب بعض بادشاہوں کے سکوں پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ شونا (سونڑا) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اس کا معبد ستاگدی کے علاقے میں ایک پہاڑ پر تھا۔ ایک مغربی مستشرق لی سترانج کا دعویٰ ہے۔ کہ پہاڑ تل یا تل شہر کے نزدیک تھا۔ لیکن اب اس کا مقام و آثار ناپید ہیں ان تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ سُوری کا نام قدیم ویدی سوریا سے لیا گیا ہے۔ جو "اوستا" میں ہور اور بعد میں "اور" بنا ہے۔ یہی زور یا سُور نام اسلام کی اشاعت کے بعد تک بھی باقی تھا۔ اور پشتونوں کا ایک مشہور اور بڑا قبیلہ سوری اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔ انہی کے نام سے زور کے شہر اور معبد کو شہرت ملی ہے۔

یہ سُوری لودھیوں کی قرابت داری میں ہیں۔ اور پشتو ادبیات میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ان میں شیخ حمید سلطان بہلول لودھی اور بعض دوسرے بادشاہ گذرے ہیں۔ سوریوں میں شنسبیوں کا گھرانہ خصوصی شہرت کا حامل ہے۔

جو غور کے حکمران تھے "خربنگ" کا بیٹا شنسب اسلام کے ابتدائی سالوں میں زندہ تھا۔ اسکے بیٹے امیر پولاد نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اور اپنے آبائی نام اور شہرت کو از سرِ نو زندہ کیا تھا۔ امیر پولاد نے عباسی خلیفہ کی طرفداری میں بنی اُمیہ کے خلاف ابو مسلم خراسانی کی مدد کی تھی۔ غور میں ان کا مرکز "مندیش" تھا۔ اور سارے غورستان پر اس کی بادشاہی تھی۔ جب وہ چل بسا تو اُسکی حکومت اُسکے بیٹوں کے ہاتھ آئی لیکن اُنکے حالات کئی پشتوں تک معلوم نہیں۔ جب غور کے یہ امیر غزنوی گھرانے پر غالب آئے تو شنسب گھرانے کے یہ سوری مغلوں کے حملوں تک ھند اور خراسان پر حکومت کرتے رہے۔ ان کے دور کے بعض ادبی آثار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سوریوں کا یہ گھرانہ پشتو بولتا تھا۔ اور یہیں پشتو ادب کے پسندیدہ اور قدیمی آثار پیدا ہوئے ہیں۔

"پٹہ خزانہ" کا مؤلف محمد ہوتک شیخ کٹہ متی زئی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "امیر کروڑ جہان پہلوان امیر پولاد سوری کا بیٹا تھا اور یہ امیر کی جنگوں میں ابو مسلم خراسانی کا یکار فیق اور فاتح ساتھی تھا۔ محمد بن علی البستی نے تاریخ سوری میں امیر پولاد کے ایک بیٹے امیر کروڑ جہان پہلوان کو "غور کا سوری" کہکر یاد کیا ہے اور اسکے پشتو اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ امیر کروڑ اپنے دور کا صاحب سیف و قلم تھا۔ پٹہ خزانہ کے مؤلف نے شیخ کٹہ متی زئی کی کتاب "لرغونی پبنتانہ" سے ایک اقتباس اس تمہید کے ساتھ نقل کیا ہے کہ زبدۃ الواصلین شیخ کٹہ متی زئی غوریاخیل اپنی کتاب "لرغونی پبنتانہ" (قدیم پشتون) میں جو اُس نے تاریخ سوری سے نقل کی ہے جو اُس نے بالشتان (والشتان) میں دیکھی اور پائی تھی شیخ کٹہ علیہ الرحمۃ یوں کہتا ہے کہ "امیر کروڑ امیر پولاد سوری کا بیٹا تھا جو سال ۱۳۹ھ میں غور کے علاقہ مندیش میں امیر بنا۔ وہ جہان پہلوان کہلاتا تھا"۔ مزید لکھتا ہے کہ "غور کے قلعے بالشتان۔ خیسار تمران کی حویلیوں اور برکوشک پر قابض ہوا۔ اور سلسلۂ رسالت کی وجہ سے خلافت کو بڑی شہ دی"۔ آگے لکھتا ہے کہ امیر کروڑ بہت تنومند اور قوی پہلوان تھا۔ تن تنہا سو جنگجوؤں سے مقابلہ کر سکتا تھا اس لئے کروڑ کہلاتا تھا، جس کا مطلب ہے مضبوط اور سخت جان۔

کہتے ہیں کہ امیر کروڑ گرمیوں میں زمینداور میں قیام کرتا اور وہاں اپنے لئے ایک محل بنا لیا تھا جس کی شکل ہوبہو وہی تھی جو مندیش میں تھی۔ وہاں شکار اور عیش و عشرت کیا کرتا۔ تاریخ سوری میں لکھا ہے کہ یہ امیر پشت بہ پشت غور، بالشتان اور بست میں حکمران رہے۔ اور سوری کی اولاد سے تھے جو کہ ضحاک کی نسل سے تھا۔ شیخ کٹہ لکھتا ہے کہ امیر کروڑ عادل، ضابط اور خوش گفتار تھا۔ اور ہر وقت شعر کہتا۔ ۱۵۴ھ میں پوشنج کی جنگوں میں

جل بسا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا امیر ناصر حکمران ہوا ۔ دانشور حبیبی کہتا ہے کہ "کروڑ" کا نام پشتو محاورہ میں ابھی تک یاد کیا جاتا ہے اور اسے قدیم سمجھا جاتا ہے ۔

انہی (امیر کروڑ) کی ایک حماسی (فخریہ) نظم ہے جو "پٹہ خزانہ" کے مؤلف نے تاریخ سوری کے حوالے سے نقل کی ہے۔ یہ نظم تحریری شکل میں پشتو ادبی آثار کا قدیم ترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے چاہے بعض ناقدین اس کی تاریخی حیثیت کے ساتھ اتفاق نہ بھی رکھتے ہوں پھر بھی ایک ایسی سند کی موجودگی کی رو سے جسے حبیبی نے پٹہ خزانہ کے نام سے دنیا کو پیش کیا ہے اور مؤلف محمد ہوتک کے ساتھ منسوب ہے اُسی حوالے سے یہاں نقل کی جاتی ہے ۔

حبیبی کہتا ہے کہ سوریوں میں پشتو شعر آغاز اسلام ہی سے موجود تھا ۔ اس لئے کہ امیر کروڑ غالباً ۱۳۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ ان سوریوں میں سلطان محمود کے زمانے تک پشتو شعر مقبول رہا اور یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ غزنویوں کے عہد تک غور کے سوری قبائل میں پشتو شعر و ادب کو فروغ حاصل تھا۔ اور پشتو میں مستند اشعار اور ادبی آثار موجود تھے ۔ پٹہ خزانہ میں امیر کروڑ کی جو نظم نقل کی گئی ہے اُس کی تمہید میں محمد ہوتک لکھتا ہے کہ تاریخ سوری میں محمد بن البستی یوں رقمطراز ہیں" عباسیوں کی طرفداری میں کئی جنگوں میں جب امیر کروڑ نے بڑی فتوحات حاصل کیں ۔ تو یہ اشعار کہے جن کا عنوان ویاڑنہ (حماسہ) ہے اور وہ یہ ہیں جو شیخ کتہ علیہ الرحمۃ نے تاریخ سوری سے نقل کئے ہیں ۔

زهٔ یم زمری پہ دے نړئ لہ ما اتل نشتہ پر هندو سند و پر تخار و پر کابل نشتہ
بل پر زابل نشتہ لہ ما اتل نشتہ

غشی د مزے حئی پر یرغالم پر تښتید و نو باندے پر ژوبلہ یو نم پر غالم پر تښتید و نو باندے
پر ماتید و نو باندے لہ ما اتل نشتہ

زما د بریو پر څول تاویږی هسک پر ننګ و پر و یاړ د اس لہ سوړے مځکہ ریږدی غرونہ کاندی لتاړ
کرم ایوادونہ ویجاړ لہ ما اتل نشتہ

زما د توره ترشپول لانسے دی هرات او جروم غرج و بامیان و تخار بولی نوم زما پہ اودوم
زهٔ پیژندویم پہ روم لہ ما اتل نشتہ

پر مرو زما غشی لونی داری دښمنو ته ځی　　　دهری رود پر ختو وځم تبنتی پلن راځی
دپی زرت راځی لہ ما اتل نشته

د زرنج سوبہ مے د توره پر مسوره وکړه　　　پر بادری مے لوراوے کول د سورو کړه
ستره مے تر بوره وکړه لہ ما اتل نشته

خپلو دګړو لره لوره پیرزوینه کوم　　　دوی پہ ما داډینه ښه با هم ښه یئے روزنه کوم
تل یئے ودنه کوم لہ ما اتل نشته

پر لویو غرو مے ویاړ دومی نه پر ختو پر تال　　　نړئ زمادہ نوم مے بولی پردیځ ستائیو ال
پر ورځو شپو میاشتو کال لہ ما اتل نشته

" میں شیر ہوں، اس خطے میں میرا ثانی ، ہند ، سندھ ، تخار اور کابل تک نہیں ۔ میرے جیسا دوسرا نہ تو زابل میں ہے اور نہ ہوگا اور مجھ جیسا پہلوان اور کوئی نہیں ۔ میری برتری کے تیر روشنی کی سی سُرعت کے ساتھ دشمنوں پر برستے ہیں اور شکست خوردہ اور بھاگتے ہوئے دشمن میرے حملوں کا شکار بنتے ہیں ۔ میری فتحمندی کے اعتراف میں فخریہ انداز سے آسمان میں گھوم رہا ہے ۔ میرے گھوڑے کے سُم سے زمین کانپ رہی ہے ۔ اور پہاڑ تہ و بالا ہو رہے ہیں ۔ میں ملکوں کو ویران کرتا ہوں ۔ میرے جیسا کوئی اور پہلوان کہاں ! ہرات اور گرمسیر کا علاقہ میری تلوار کی زد میں ہے ۔ غرجستان ، بامیان اور تخار کے علاقے چارہ کار کے طور پر میرا ہی نام لیتے ہیں ۔ میں روم میں بھی پہچانا جاتا ہوں ۔ میرے جیسا کوئی اور پہلوان کہاں ! جب دشمن پر میرے تیروں کی بارش ہوتی ہے تو وہ ڈر جاتا ہے ۔ دریائے ہری کے کنارے جاتا ہوں تو دشمن سے بیادے　　مجھے دیکھتے ہی　بھاگ جاتے ہیں ۔ بڑے بڑے شہزور دلاور بھی مجھے دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں ۔ میرے جیسا کوئی اور پہلوان کہاں ! زرنج کا صوبہ تلوار سے فتح کر کے میں نے سوریوں کے حوالے کیا اور سردار بنکر سُوری گھرانے کو ترقی دی ۔ اپنے عزیزوں کو قابل احترام بنایا ۔ میرے جیسا کوئی اور پہلوان کہاں ! اپنے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہوں ۔ اور رواداری سے کام لیتا ہوں ۔ میں انہیں تسلی دیکر اُن کی اچھی پرورش اور خاطر خواہ نگہداشت کرتا ہوں ۔ اور ہمیشہ اُنکی ترقی کے لیے کوشاں رہتا ہوں ۔ میرے جیسا کوئی اور پہلوان اور بہادر کہاں ! تاخیر کے بغیر میرا حکم بڑے بڑے پہاڑوں پر فوری طور پر چلتا ہے ۔ یہ ملک میرا ہے　　خطیب منبر پر اور سرود گر

رقص وسرود کی محفلوں میں میری تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ دن رات مہینوں اور سالہا سال تک ستائش کرنیوالے مجھے سراہتے رہیں گے۔"

ناقدین کی رائے کا خلاصہ

اسلامی دور میں یہ پشتو ادب کی ایک ایسی اولین نظم سمجھی جاتی ہے۔ جو ہماری ادبیات کی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ یہ نظم "پٹہ خزانہ" کے ذریعے مؤلف محمد ہوتک نے محفوظ کی ہے اِس نظم میں بہت سے ایسے محاورے اور لغات آئے ہیں جو بقول جیبسی اب متروک ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ دوسری صدی ہجری میں پشتو پر بیرونی زبانوں کا نمایاں اثر نہیں تھا۔ یہ خالص زبان چوتھی صدی ہجری تک قائم رہی۔ بعد ازاں صدی بہ صدی اِس پر دوسری زبانوں خصوصًا عربی، فارسی اور ترکی کا اثر نمایاں ہوا ہے۔ گرامر کے لحاظ سے پُرانی پشتو موجودہ پشتو سے زیادہ موزوں اور پابند قواعد تھی۔ اور فقہ اللغت Etymology کی رو سے بڑی دلچسپ اور پُرلطف تھی۔ مثلاً اِس نظم میں گرامر کے بعض نمونے ایسے ہیں کہ جواب موجودہ زبان میں نہیں۔ مثلاً یونم۔ یرغلم۔ ماتیدونی۔ بیسرندوئے۔ پلن۔ زڈن۔ مخ سودتیا لوپاوے۔ داڑینہ۔ اوربام وغیرہ۔ یونل۔ یرغالل۔ بالل اور لوڑاول کے مصادر اب پشتو میں متروک ہیں اسی طرح "زڈن" بہادر کے معنوں میں اور "پلن" جس کی ساخت پل سے ہے اور پیادہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اب اِس زبان میں مستعمل نہیں۔ اسی طرح من، منختہ بھی دل یا ارادہ کے معنوں میں اب متروک ہے۔

وزن اور عروض کے پیمانے کی رو سے بھی اِس نظم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی پشتو میں۔ اپنے ملی اوزان اور بحور میں بڑے گرانقدر اور بلندپایہ اشعار کہے جاتے تھے اِس کے اونچے معیار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اِس زبان نے اُس وقت تک مسلسل ادبی ارتقا کے کئی مدارج طے کئے تھے اور ایسے مقام و معیار تک پہنچی تھی۔ کہ اس میں ہر قسم کی نظمیں کہی جاتی تھیں۔

"ابو محمد ہاشم سروانڑی"

امیر کروڑ کے بعد پشتو تاریخ میں جن دوسرے شعراء کا پتہ چلا ہے اُن میں ایک زید سروانڑی کا بیٹا ہاشم (۲۲۳ - ۲۹۷ھ) ہے جس کا پورا نام ابو محمد ہاشم سروانڑی البُستی ہے۔ اِس شاعر کا نمونۂ کلام بھی پٹہ خزانہ کی وساطت

سے ہم تک پہنچا ہے اور شیخ کٹہ کی کتاب "لوغونی پښتانہ" سے ماخوذ ہے ۔

ہاشم نے طلبِ علم کی خاطر عراق کا سفر کیا تھا۔ اور عربی علوم کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا۔ یہ عربی فارسی اور پشتو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ عربوں کی فصاحت و بلاغت کے موضوع اور عربی زبان کی شعر و شاعری پر پشتو زبان میں ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ اس کتاب کا نام "د سالو و مکہ" تھا۔ یہ کتاب اب نایاب ہے مگر یہ پشتو نثری ادب کی ایسی اولین کتاب شمار ہوتی ہے جس کا نام ہمیں معلوم ہے۔ اِس نام کے معنی ہیں "ریگستانی ہوا"۔ ابن خلاد جو ابی العینا کے نام سے مشہور تھے اُنکے اُستاد تھے ہاشم کے کلام کا نمونہ جو "لوغونی پښتانہ" نامی کتاب کی وساطت سے پٹہ خزانہ میں نقل کیا گیا ہے، وہ محمد ہوتک کی تمہید سمیت یوں ہے۔" ابن خلاد جو ایک ظریف طبع ادیب تھے ایک نظم میں دولت کو سراہتے ہیں اس کی نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔ ؎

من يملك درهمين تعلا سفتاه انواع الكلام فقالا

"جس کے پاس تھوڑی سی دولت آجائے تو پھر اُس کے منہ سے انواع و اقسام کی باتیں نکلتی ہیں۔ اور آخر میں یہ مصرعہ ہے ؎

فهي اللسان لمن اراد فصاحته وهي السلاح لمن اراد قتالا

"یہ پیسہ ہے جو بولتا ہے اور جو جنگ کا ارادہ کرے۔ اُسکے لئے یہ اسلحہ بھی ہے۔"

ہاشم سروانڑی نے وہی نظم پشتو میں یوں منتقل کی ہے ؎

ژبه هم هغه وینا کاندی چه ئې وینه د خاوند په لاس کښې زر او درهم وینه
ژبه ور ورله ودځی وینلئ اوری د درهم خاوند ان تل وی په ویاړ
کڅ درهم ئې ځنی ورک ټوټی ئې نشته پر نړئ ئې وی پر خړ وپیژندنه
کڅ بیا ئې ټوټی و بولی خلق وائی دا ویناده ریشتیا نه لا ریښتونه
کڅ ئې وزلی و وائی ریښتیا خبره د درهم د خاوند هر خلئ پر تمونه
دا هم ده کڅ ټوک ژبور کیږی ده وسله کڅ ټوک پری کاندی قتالونه

ترجمہ :۔ فقط وہی زبان بولنے کا حق رکھتی ہے جس کا مالک صاحب مال و زر ہو اہل سخن بھی اُس کے پاس

جاکر اُس کی باتیں سنا کرتے ہیں۔ اہل ثروت ہمیشہ گھمنڈ کرتے رہتے ہیں۔ اگر دولت اُس سے جاتی رہے تو پھر کوئی بھی اُس کی بات نہیں مانتا۔ وہ خوار و زبون ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ملک میں بھی اُسے کوئی نہیں پوچھتا مالدار اگر جھوٹ بھی کہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اگر سچی باتوں میں کوئی سچ ہے تو یہی ہے، لیکن اگر غریب سچی بات بھی کہے، تو (لوگوں کے نزدیک) اُس کی بات قابل قبول نہیں ہوتی۔ صاحب ثروت شان و شوکت کے مالک ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ ہر کہیں دولت نچھاور کر سکتے ہیں۔ کوئی لسّان بننا چاہے تو (اُسے کہو) کہ یہ دولت ہے جو بولتی ہے اور اگر اِس سے کوئی قتل مقاتلہ کرنا چاہے تو یہ ہتھیار بھی ہے۔"

اِس منظوم تأثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں پشتو پر عربی کا اثر شروع ہو گیا تھا اور پشتون تخلیقی ادب کے میدان سے تقلیدی ادب کی سمت راغب ہو چکے تھے۔ ان پر آہستہ آہستہ عربی افکار و ادب کا اثر غالب ہو رہا تھا چونکہ اکثر پشتون خصوصاً "سڑبنی" اُس زمانے میں پشتونخوا کے مغربی علاقے میں مقیم تھے لہذا فارسی سے قبل عربی کے تصرف نے انکی زبان و ادب میں اپنا اثر رسوخ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی اُس زمانے میں اس زبان میں بیشتر اپنے ہی مخصوص لغات مستعمل تھے اور ابو محمد ہاشم نے بھی اپنے اشعار میں انہیں کو جگہ دی ہے مثلاً دیاڑ نہ تحڑی۔ سونڑی۔ بل تیرونہ وغیرہ جن کا اصل اب متروک ہے لیکن انکے ماخذ (ریشے) اب بھی پشتو میں مستعمل ہیں۔

شعر کا یہ نمونہ بھی عربی وزن اور بحر سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے اور اسی لئے ہم اسے پشتو میں تقلیدی ادب کا اولین نمونہ سمجھتے ہیں۔ اور جیسا کہ پروفیسر حبیبی کہتا ہے "ابو محمد ہاشم پشتو کی ادبی تاریخ میں عربی مکتب فکر اور ادبی تحول کا سب سے پہلا نمائندہ ہے اور مذکورہ قطعے سے اُسکے دور کے ادبی میلان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عوامی ادب

ادب کا یہ متذکرہ بالا اثاثہ عوامی ادب کے اُس خزانے سے یکسر الگ ہے۔ جو ضرب الامثال اور قصوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ اور ٹپہ صوت۔ ٹنگ۔ مارہ۔ غاڑہ، چاربیتہ۔ بدلہ وغیرہ کی طرح شعر کے اُن عوامی اصناف میں موجود ہے، جو پشت در پشت ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے

کے لئے محفوظ چلا آیا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

پشتو کا عوامی ادب زندہ اور فعال ہے یہ ہر دور میں پشتون عوام کی فطرت کا ترجمان رہا ہے۔ اس لئے بذات خود اس کے فراموش ہوجانے یا کھو جانے کا ڈر تو کیا اس نے خود پشتو زبان اور پشتون قوم کو فراموشی اور معدوم ہونیکے خطرے سے محفوظ رکھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ پشتو عوامی ادب اِس زبان کی زندگی کا امین اور ضامن ہے۔

ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ ہر زبان کے ادب کا آغاز لوک گیتوں سے ہوتا ہے۔ بعض پشتون محققین کہتے ہیں۔ کہ پشتو کے غنائی ادب کی ابتدا بھی پشتونخوا کے لوک گیتوں سے ہوئی ہے۔ ان گیتوں کی کئی قسمیں ہیں جن کا تذکرہ اپنی جگہ آ جائیگا۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ اُس میں سب سے زیادہ صاف، آسان، قدیم اور پشتونوں کی فطرت سے زیادہ قریب صنف ٹپہ، مصرعہ یا لنڈئی ہے۔

قدامت کے لحاظ سے یہ گیت اُن قدیم ادوار تک جا پہنچتے ہیں۔ جن میں پشتون قبائل نے آریائی قبائل کے خروج کے راستوں والی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ موجودہ دور کا ایک مستشرق جمز انولڈمن اِس سلسلے میں لکھتا ہے[1]۔ کہ اِس تاریخی حقیقت کے پیشِ نظر کہ جن آریائی قبیلوں نے ۱۵۰۰ ق م میں مشرقی جانب خروج اور ہجرت کی تو وہ شاید چند پشتوں تک اُس سرزمین میں قیام پذیر رہے جسے آج ہم پشتونخوا کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور یہیں پر حمد اور اپنی وہ دعائیں مرتب کیں جو اب رگ وید کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اِن کا عام بحر اشلوک تھا جو مستقل طور پر ۲۲ اوزان کا تھا اور اسکے مصرعے دو ہوا کرتے۔ یہ بارہ اوزان پر مشتمل دو ایک برابر مصرعے ہوتے یا ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا ہوتا۔ میرا دل یہ کہتا ہے کہ پشتو کے ٹپے جو بائیس اوزان کے دو مصرعوں (۹ - ۱۳) کے مستقل اصول کے تابع ہیں۔ یہ قدیم آریائی دور کے اوزان یا اُس سے بھی زیادہ قدیم زمانے کے آثار ہیں جو اب فقط پشتو میں دستیاب ہیں"۔

اس کے بعد آریہ برصغیر جنوبی ایشیا میں وارد ہوئے رگ ویدکی زبان میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو ہو بہو

---

[1] سپوږمئ کږنګ وهه راخیشه - (دیباچہ مؤلف)۔

مُرکب طور پر اب بھی پشتو میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً پروسہ کال (پچھلے سال) نا ٹیک (آقا) لیکن مابعد کی سنسکرت میں ایسے لغات نہیں ملتے۔ مذکورہ محقق کا یہ خیال ہے کہ قدیم آریہ اپنے گیتوں میں وزن اور بحر کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے۔ اور عام بحر جیسے کہ کہا گیا ہے اشلوک۔ ٹپے کے بارے میں تفصیلی بیان اِس بحث کا ایک الگ موضوع ہے۔ جس پر علیحدہ بحث کی جا سکتی ہے۔

ضرب الامثال اور پشتو

پشتونوں کے ضرب الامثال بھی عوامی ادب کے اصناف میں اُس خاص اہمیت کے حامل ہیں جو ادب کے اِن موتیوں کو دنیا کی باقی ترقی یافتہ زبانوں میں دی جاتی ہے۔ مزید برآں اُن کی بدولت پشتو اور پشتونوں کے تمام معاشرتی اقدار محفوظ ہیں۔

دوسری زبانوں کے ضرب الامثال معاشرتی زندگی کی اِس ضرورت کو پورا نہیں کرتے، کیونکہ باقی دنیا میں کہیں بھی ایسی کوئی قوم یا قبیلہ نہیں جو زبان وکردار کے لحاظ سے "پشتو" جیسے ایک نام سے منسوب کیا گیا ہو۔ پشتو کے ضرب الامثال بھی پشتون روایات کی ترجمان ہیں اور انکے فکر ونظر اور مشاہدے کی ایسی صاف ستھری مثالیں ہیں۔ جن کی وجہ سے مفکرین اور عالموں کے لئے اِس میں دلچسپیوں کا خزانہ موجود ہے۔

ادب و مدنیت کا ایک طالب علم جب اِن موتیوں کا بنظر غائر مطالعہ کرے گا تو وہ بھی جرمن مفکر نیٹشے کی طرح اِس بیان کا ترجمان ہوگا:[*] " وہ جو خون جگر اور ضرب الامثال کے ذریعے لکھنے اور بات چیت کرنے کا عادی ہو، وہ اِس کا آرزومند ہوتا کہ اُس کی باتیں خالی پڑھنے اور سننے کے لئے نہ ہوں بلکہ انہیں دل میں آثار کر یاد رکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ پہاڑوں میں مختصر راستہ پہاڑ کی ایک چوٹی سے لے کر دوسری چوٹی تک ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے لئے اُتنے ہی بڑے قدم بھی درکار ہوتے ہیں۔ ضرب الامثال کی مثال بھی پہاڑ کی چوٹی کی سی ہے۔ اور جسے مخاطب

Taus spake Zara-Thustra.

کیا جاتا ہے اُسے خود بھی چاہیئے کہ وہ اِس قدر بڑی شخصیت اور عظمت کا مالک ہو جس کا قدم ان چوٹیوں تک پہنچ سکے"
جو شخصیت بھی اِس معیار پر پوری اُترے وہ ننگ وحمیت کی تکمیل کرتی ہے۔ اور ننگ وحمیت کی تکمیل کرنے والا انسان درحقیقت وہ کردار ہے۔ جسے یہ مفکر فوق البشر کا نام دیتا ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی ننگ وحمیت کی تکمیل کرنے والی شخصیت اِس سے بھی زیادہ بلند اور ارفع مقام رکھتی ہے۔ موجودہ دور کا ایک پشتون شاعر حاجی سمندر خان سمندرؔ ایسی پشتون صفت شخصیت کو" اِمامِ انسانیت" کہتا ہے۔ اور اُس کی ستائش یوں کرتا ہے۔ ؎

پښتو له هر چا ځاریدل او احترام بوله
پښتون چه وی پکښے پښتو نو دے امام بوله

" پشتو کا مقصد ہر ایک پر جان نثار کرنا اور ہر ایک کا احترام کرنا ہے۔ پشتون میں اگر پشتو (ننگ وحمیت) ہو تو اُسے امام انسانیت کے نام سے تعبیر کیا کرو۔"

لال پورہ کے محمد گل خان مومند کہتے ہیں کہ" پشتون" پشتو کا اطلاق صرف اُس ظاہری زبان پر نہیں کرتے جس میں وہ آپس میں بات چیت کرتے ہیں، بلکہ پشتونوں کے سامنے پشتو کے معنی اور مفہوم میں دیانت داری کے علاوہ پشتون خو خصلت، پشتون آداب وعادات، پشتو رسم ورواج اور اُنکے پورے معاشرتی فضائل خصائص، صفات اور مزایا آتے ہیں۔ اِسے" پشتوالہ" بھی کہتے ہیں۔ ہوتی کے نواب محمد اکبر خان کہتے ہیں کہ پشتون وہ ہے جو " پشتونوالہ" کا مفہوم جانے اور پھر اُس پر عمل پیرا ہو"۔

پشتونوں کی تاریخ میں ایسے بہت سے غیور اور شریف النفس پشتون گذرے ہیں جنہوں نے اُس معیار تک پہنچنے کی راہ میں تادمِ آخر اپنی تگ ودو جاری رکھی ہے۔ اور انہوں نے بڑی حد تک اپنے آپ کو اُن صفات سے مزین کیا ہے، اِن بزرگوں کی زندگی اور کردار کے مطالعہ سے ایک طالب علم اُن ہمہ گیر محاسن سے کما حقہ استفادہ کر سکتا ہے جو ایک عام پشتون غازی سے لیکر سید جمال الدین افغانی جیسی بین الاقوامی شخصیت اور دیگر پشتون شاعر

لہ لنډکئی پښتو صفحہ ۳

کے کردار میں صاف دکھائی دیتے ہیں اُنکے ایثار، تدبر، تدبیر، سیاست، جہاں بینی و جہانبانی تاج ستانی، تاج بخشی، شجاعت، سخاوت، بہادری، شرافت اور دیگر ہمہ گیر اوصاف و افکار میں پشتو کی روح نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

"پشتونولی" کے مثبت نظریئے کی ترجمانی کرنے والے دانشور پشتونولی میں منفی پشتو کے وجود کے قطعاً قائل نہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ عام معاشرے اور عوامی زندگی میں کجرؤوں اور بعض گم کردہ راہ کرداروں کی خودسری اور خودغرضی کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے، انہی لوگوں کی بے راہ رویوں کی وجہ سے پشتون اُن قوموں کی امامت کرنے سے محروم رہا ہے جن کی طرف علامہ اقبال نے "مقتدی تاتار و افغانی امام"[1] کے صاف اور واضح الفاظ میں اِشارہ کیا ہے۔ بعض پشتون اہل علم اور مفکر جیسے مولانا عبدالقادر مرحوم کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر قوم اپنی باری گذار چکی ہے لیکن پشتون کی باری ابھی باقی ہے۔ وہ کہتے ہیں "پشتو زبان[2] دنیا کی قدیم زبانوں میں اکثر زبانوں سے زیادہ قدیم ہے فقہہ اللغۃ کے ماہر جس قدر بھی اسکی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ اُسی قدر یہ حقیقت ان پر ظاہر ہوتی ہے کہ پشتو ایک بہت پرانی زبان ہے۔ بہت جلد سُن لوگے کہ بعض تاریخ دان ایسے بھی پیدا ہوئے ہیں جو اِس دعویٰ پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں پشتو کے علاقے سے پھیلی ہیں۔ اور دنیا کی بہت سی زبانوں کا ماٴخذ پشتو ہی ہے۔ یہ جگہ اس قسم کے تاریخی نظریات کے مباحث کی نہیں۔ فقط اشارةً اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اِس زبان کی قدامت اور اس کے پارینہ ہونے کے باوجود اِسے وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی جو اس کے بعد جنم لینے والی زبانوں کو حاصل ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اِس بحث کے لئے یہ موقع نہیں۔ صرف اِس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ماں کی باری تھی سو گذر گئی اور اب باری ہے دادا کی۔ دنیا کی دوسری زبانوں اور قوموں میں سے بیشتر نے اپنا حصہ حاصل کر لیا ہے۔ بلکہ بیشتر اپنی باری گذار بھی چکے ہیں۔ پشتو کی باری تو اب آنے والی ہے۔ زمانے کا رنگ یوں بدلتا رہتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ کہ اللہ میاں ایک صاحب ہمت شخص پر رزق کے دروازے بند نہیں کرتا۔ بھاری پتھر ہمیشہ جوہڑ کی تہہ میں دھنسا ہوتا ہے لیکن جب اُسے ہلا دیا جاتا ہے تو سارا جوہڑ موج موج اور تہہ و بالا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پشتو کا پتھر پانی میں

---

[1] جاوید نامہ ص ۷۶ [2] پشتو ادب ص ۸۳

گلق نہیں اس لئے ترقی کے میدان میں ایک دفعہ اِس پتھر کا سر نکالنا لازمی تھا۔
مشہور شاعر امیر حمزہ خان شنواری کہتا ہے ؎

وار مے را غلے دے نو وار کومہ
خنگہ کار و نہ د ھوښیار کومہ

" اگر چہ اب میری باری آئی ہوئی ہے، مگر میں صبر اور سوچ بچار سے کام کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا دیکھو تو کہ میں کس قدر تدبّر سے کام لے رہا ہوں" ایک امریکی محقق ولبر لکھتا ہے کہ پشتو کے بارے میں بہت سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ جب پشتونوں کی باری آئیگی تو یہ لوگ دنیا کے سامنے اسلام کو اپنے اصلی روپ میں پیش کرینگے [1]

پشتو کا کتابی ادب

پشتو زبان کا کتابی ادب بھی دراصل عوام کی پیش کش ہے اس ادب نے شاہی درباروں کے جُود وسخا کی آبیاری نہیں دیکھی اور نہ کبھی وقت کے ناموافق اور نامساعد حالات نے ان پر ترس کھایا ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان کے بولنے والے بھی اس کی موجودگی میں دوسری زبانوں کے ادب کی تربیت اور پرورش میں کوشاں رہے اور اِسے طاقِ نسیان پر رکھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ بعض پشتو لکھنے والوں مثلاً عبدالروف بینوا کا یہ دعویٰ کہ پشتون بادشاہوں کے درباروں میں پشتو زبان کی سرپرستی ہوتی رہی ہے، ایک ایسا معنی خیز تأثر پیدا کرتا ہے جس سے اس وقت کے حالات کے پیش نظر مقالہ نگار کی مجبوری صاف طور پر دکھائی دیتی ہے [2] انتقادی نظر سے جناب بینوا کا یہ مقالہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہے۔

ادب کو ہمیشہ سے کسی جماعت یا قوم کے فکر و نظر کے میزان کا ایک حساس پیمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیئے

---

[1] Afghanistan by Wilber, Vol II

[2] سالنامہ کابل ۱۹۴۳ء

کہ یہی زندگی کی مربوط تشریح کرتا ہے۔ اور روح انسانی کی حقیقی روداد بیان کرتا ہے۔ یہ اصل میں معاشرے کی تخلیقی وجدان کو بیدار کرنے والا وہ جامِ جم ہے جس میں اپنے معاشرے کے خوب و زشت کا تماشہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر اس کے فطری رنگ روپ کو کسی خاص نظریئے کے تابع کر دیا جائے تو عروضی شاعری کی طرح یہ بھی اپنے لئے قافیئے اور ردیف کے حدود کی پابندیوں میں مقید ہو جاتا ہے۔ اور فطری وجدان کی بجائے یہ تصنع کا مرقع بن کر رہ جاتا ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے ادیب مؤلف بن جاتا ہے۔ اور ادیب معاشرے کی مربوط تشریح سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

تخلیقی اور تقلیدی ادب

پشتو ادبیات کی تاریخ میں ادب کی یہ ہر دو نوں قسمیں اُس وقت سے متوازی چلی آرہی ہیں جب سے پشتون خصوصی عقائد اور نظریات کی پابندیوں سے متعارف ہوئے ہیں لیکن چونکہ اس زبان کی قدیمی ادبیات تحریری شکل میں محفوظ نہیں لہذا اسلام سے قبل پشتو ادب یا شعر کے ایسے نمونے موازنے کے لئے فی الحال ناپید ہیں اور اُس وقت کے ادب کا صرف وہ حصہ باقی ہے جو ہر دور کے عوامی احساسات کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ اور جس کا تعین وقت اور زمانے کے لحاظ سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں جب اس سرزمین پر ایک فکری انقلاب نے جنم لیا اور یہاں پر نورِ اسلام کی شعاعیں پھیلیں تو اس نئے دین کی تعلیمات میں پشتون قبائل نے اپنے فطری جوہر کا تماشہ دیکھا۔ انہیں دینِ اسلام بھی اُس پشتونولی کی طرح اپنے صاف ستھرے اقدار کا مظہر دکھائی دینے لگا جس پر اُنکی معاشرتی زندگی کی اساس قائم ہوئی تھی۔ اس لئے وہ من حیث القوم اسلام کی سربلندی کے لئے ڈٹ گئے اور اس دینِ برحق کی تعلیمات پر ایمان لے آئے۔ اور اس پر ایسی مضبوطی سے قائم رہے کہ اُس زمانے سے لے کر آج تک پشتون مسلمان کے بغیر متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی رُو سے پشتو اور اسلام کا آپس میں اس قدر مضبوط رشتہ استوار ہوا کہ اسلام پشتونوں کے نزدیک جیسے پشتو ہی کا دوسرا نام ہو۔

پشتو کا مزاج اور اسلامی تعلیمات گویا ایک سکے کے دو رُخ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پشتون عقیدے کی رو سے اول و آخر مسلمان ہے۔ اس کے معاشی، عوامی اور سیاسی نظریوں میں رد و بدل ہو سکتا ہے لیکن مذہبی عقیدے کی رُو سے یہ لوگ دینِ فطرت کے بغیر کسی دوسرے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ یہ اگر کوئی دوسرا مذہب اختیار کریں تو انکی پشتو پر آنچ آتی ہے اور جب پشتو پر حرف آئے تو وہ "پشتو نولی" سے خارج ہو جاتے ہیں۔ یہ پشتونوں کی فطرت ہے اور فطرت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں۔

پشتونوں کی معاشرتی زندگی کے ساتھ اسلام کے اس فطری بندھن نے پشتو ادبیات کے پیکر میں زندگی کی مربوط تشریح کی خصوصیت کو مزید صیقل کیا اور اس میں عرفان اور روحانیت کا عنصر شامل کر دیا۔ لیکن جب عقائد اور مسالک کے درمیان تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہوا تو پشتو ادبیات نے بھی عوامی زندگی کی مربوط تشریح اور انسانی روح کی خالص اور پاکیزہ دو دادوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تصنع اور پابندی کے اُس ادب کو جنم دیا جو نہ تو روح کی آواز تھی اور نہ زندگی کی شارح و ترجمان۔ یہی سبب تھا کہ اگر کوئی گذشتہ ہزار سالہ پشتو ادبیات کا تجزیہ کرے تو اس زبان کے عوامی گیتوں کے ادب سے قطع نظر کتابی ادب میں وہ حصہ اُسے نسبتاً بہت معمولی دکھائی دے گا جسے پشتون عوام کے فکر و نظر کے معیار کا ایک حساس پیمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب شاید پشتون شاعر اور ادیب کی وہ تقلیدی روش تھی جو وہ بحیثیت ایک دیا نتدار مقلد کے اپنا فرضِ منصبی سمجھتا تھا۔ اسی طرح پشتو ادبیات کی تاریخ میں تخلیقی اور تقلیدی ادب کے دو نمایاں حصے چلے آئے ہیں۔ اور معلوم شہادتوں کی رُو سے اُس کی ابتدا تیسری صدی ہجری سے ہوئی ہے۔ تقلیدی ادب کے اولین نمونے کے طور پر ابو محمد ہاشم سروانڑی کے وہ اشعار ہیں جو ابن خلاد کی عربی نظم سے پشتو میں منتقل کیے گئے ہیں۔

پشتونوں کی انفرادیت پسندی

پشتون فطرتاً ایک انفرادیت پسند قوم ہے۔ اپنی انا کو زندہ رکھنا اور ہر جگہ سرِ تسلیم خم نہ کرنا اس قوم کا جوہرِ فطری ہے

یمنئ پښتنئے هو د په خته کښے راوړے دے[1]

څهٔ وائے اوچت ے شمله د ه هیڅ خبر نهٔ وم

"ثابت قدمی اور سرفرازی میری پشتون عشق میں رچی بسی ہے۔ کیا کہا! عشق میں بھی میرے دستار کا شملہ اونچا رہا مجھے تو اس کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔"

یہ لوگ جو اسلام کی اشاعت سے قبل بھی اپنے قبیلے پر ناز کیا کرتے تھے۔ اور اس کے باوجود کہ ان کی زبان کلچر اور روایات ایک تھے۔ یک قبیلہ دوسرے قبیلے کے ہر قسم کے تصرف یا بالادستی کو ناپسند کرتا تھا۔ شک و تمسری کے اِس احساس نے ان میں پھوٹ اور نفاق کا مرض راسخ کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا ماحول تھا جس میں پشتون نسل کے تمام قبائل پر مشتمل کسی مضبوط اور جمہوری ریاست کے قیام کے لئے ساز گار فضا کا پیدا کرنا قرین قیاس نہیں تھا۔ ان کی گھر گھر طوائف الملوکی تھی اور اپنے ماحول کے تیز رفتار ندی نالوں اور دریاؤں کی طرح یہ خود بھی یا تو کہیں سرابوں میں مرکھپ جاتے۔ یا دشت و صحرا کی نذر ہو جاتے۔ ان میں سے کوئی مشرق کا راہی تھا تو کوئی مغرب کا۔ خود سری نے انکی زندگی کا یہی وطیرہ بنا رکھا تھا۔ ان کی ایکا کے واسطے کسی اباسین کا پاٹ موجود نہیں تھا اس لئے اس زمانے میں بھی ان کی کیفیت یوں تھی جیسے کہ شاعرِ اسلام علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

ملتے آوارہ کوہ و دمن — در رگِ او خونِ شیران موجزن

زیرک و روئین تن و روشن جبین — چشم او چون جرّہ بازان تیز بین

" وہ کوہ و دمن میں آوارہ پھرنے والی ایک قوم ہے اور اس کی رگوں میں شیروں کا خون موجزن ہے۔ وہ ہوشیار، سخت جان اور روشن جبین ہے اور جرہ باز کی طرح اس کی آنکھیں تیز ہیں۔" با ایں ہمہ بھائی بھائی سے ان کی آپس کی لڑائی، اور گھر گھر کی دشمنی اور ترہ گنی نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا ہے۔

"مذہبی اور درباری زبانوں کا اثر"

اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ پشتو ادبیات میں عربی اور فارسی زبانوں کا نفوذ ایک فطری بات تھی۔ اس لئے کہ اگر ایک طرف

---

[1] حمزہ شنواری

عربی اسلامی تعلیمات کی زبان تھی۔ تو دوسری طرف فارسی شاہی دربار سے وابستہ تھی۔ اِن دونوں زبانوں کے لئے علم وفن کے دروازے بھی کھلے تھے اور انکی پرورش اور سرپرستی بھی کی جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ اِن زبانوں کی شاعری کے تمام اصناف اور افکار و خیالات کے ہر مروّج کا اثر پشتون شاعر اور ادیب نے ادبیاتِ پشتو میں منتقل کرنیکی کوشش کی۔ یہ ظاہر ہے کہ سرزمین پشتو پر ان پودوں کی کاشت کیلئے پشتو کے مزاج کا قلم لگانا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چند کہ پشتونوں نے اپنے کتابی ادب کے لئے شعر و شاعری کے وہ تمام اصناف اپنالئے جو انہیں عربی اور فارسی میں نظر آئے۔ مگر اپنی زبان کے مزاج کے مطابق انہیں اُن عروضی پابندیوں سے آزاد رکھا، جن پر عربی اور کسی حد تک فارسی شاعری کی اساس قائم تھی۔ اس طرح یہ تمام اخذ شدہ اصناف پشتو کے مزاج اور ماحول کے ساتھ متوازی خطوط پر استوار کئے گئے۔ انہی اصناف میں پشتو کے تخلیقی اور تقلیدی ہر دو اقسامِ ادب کی روایات کا سلسلہ قائم رکھا گیا۔ اس قسم کی شاعری میں شعر کے وہ سارے اقسام جو عربی فارسی میں رائج تھے پشتو نے اپنالئے مثلاً مربع، رباعی غزل، قطعہ، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، نظم، مثنوی۔ معشر، مستزاد، سبھی عروضی شاعری کے بحور میں ہیں۔ اس قسم کی شاعری اور یہ سارے اصناف اس سے پہلے پشتو میں نہیں تھے۔ مگر اِن اصناف کی ترویج سے خوشحال خان خٹک جیسے اِس میدان کے عظیم پشتون شاعر نے بھی کہا کہ ؎

په تازه تازه مضمون د پښتو شعر
په معنى ے د شيراز او د خجند كړه

"پشتو شاعری میں نئے نئے مضامین پیش کر کے میں نے بلحاظِ معنی اُسے شیراز و خجند کا ہمسر بنادیا۔
شعر کی ان اقسام کی اجزا کی وجہ سے شیراز اور خجند کی شاعری کا لُطف اور مزہ پشتو ادب میں داخل ہوگیا۔

"رندانہ شاعری اور شاہد بازی"

عربی فارسی ادبیات کے مطالعے کے زیر اثر اگر ایک طرف پشتو زبان کی شعر و شاعری کو بہت سی نئی اور پُر لُطف اصناف ہاتھ آئیں اور عملاً اِس زبان کا تمام کتابی ادب۔ اپنے روایتی انداز میں عربی اور فارسی سے آیا۔ اور

اِس زبان کا دامن علم وعرفان کے موتیوں اور عشق ومحبت کے گیتوں سے آراستہ ہوا تو دوسری طرف پشتو شاعری میں شاہد بازی اور مےنخواری کی قباحتوں نے بھی جگہ پالی۔

چونکہ پشتونوں کا معاشرہ مفلوک الحال تھا۔ اور پردے کا رواج بھی ایسا کوئی عام نہ تھا اس لحاظ سے انکی اُس شاعری میں جو اس زبان کے اپنے ملی اوزان میں ہے یہ دونوں عناصر ابھی تک بہت کم دستیاب ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کتابی ادب یا شعر کے اُن اصناف میں جو فارسی کے رستے پشتو میں آئے ہیں۔ یہ موضوعات ایک عام سی بات دکھائی دیتی ہے ؎

خط پہ مخ دصنم راغے کہ سپوږمئ شوه په هاله کښے
د اے غابښ په خله کښے زیب کاکہ ژاله شوه په لاله کښے

"رخ محبوب پر خط آگیا ہے یا چاند نے ہالہ کرلیا ہے۔ یہ دانت ہیں جو اُس کے منہ میں باعث زیب وزینت ہیں یا پھر گلِ لالہ پر ژالہ باری ہوئی ہے۔"

بارہویں صدی ہجری کے مشہور شعراء مثلاً عبدالحمید اور علی خان سے لیکر چودھویں صدی ہجری میں احمد دین طالب کے زمانے تک یہ ایک دل پسند اور مقبول موضوع سمجھا جاتا تھا۔ اس خطہ میں ان موضوعات کی طرف رجحان کی ابتداد شاید پہلی بار محمود و ایاز کے افسانے سے ہوئی ہوگی اور بعد میں جب مغلیہ بادشاہوں کے درباروں اور جلوسوں میں بھی حسن وجمال اور زیب وزینت میں کامل شہزادے امیرزادے اور غلام دیکھے جاتے تو شاعر کے جذبات واحساسات برانگیختہ ہو جاتے اور یہ لوگ بھی سعدیؔ، عرفیؔ اور دوسرے فارسی گو شعراء کے تتبع میں اشعار کہنے لگے۔ پشتو زبان کے تمام بڑے بڑے شعراء میں سے صرف خوشحال خان بابا کی شخصیت منفرد ہے جو اپنے سارے کلام میں اپنی محبوبہ کی نسوانی حیثیت برقرار رکھتے ہیں اور یہی اُن کا مسلک ہے ؎

چه په حُسن په بناشت دی زور ورے
د هغوئ واڅئ بدلے یا سندرے

"خوشحال) ان حسیناؤں کی تعریف میں بدلے اور گیت تخلیق کرتا ہے جو بھرپور حُسن ورعنائی کی مالک ہیں"۔
یہ اس لئے کہ خان علیین مکان کی نظر میں پشتون دوشیزاؤں کے حسن میں جو کشش اور جاذبیت موجود ہے

وہ شاہدِ رعنا کی غیر فطری کشش اور جاذبیت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

کہ پہ حُسن د کشمیر خوبان اوښاردی یا د چین او د ماچین او د تاتار دی
پښتنے چونہ چہ ما پہ سترګو حُسن کړے حقہ کل واړہ خجل د دوئ ترکار دی
پہ ښائست بانديے ئے ختمہ دا ویناده چہ پہ اصل د یعقوب قوم و تبار دی
تر صورت ئے د سیرت خوبي افضل دہ تر ظاهر ئے د باطن خوږه بسیار دی

'' اگر حسن میں خوبانِ کشمیر نمایاں ہیں یا چین و ماچین اور تاتاری دوشیزائیں ہیں۔ لیکن جب میں نے پشتون دوشیزاؤں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مذکورہ تمام (دوشیزائیں) اُنکے سامنے پانی بھرتی ہیں اُن کی خوبصورتی کے بارے میں اتنا کہدینا کافی ہے کہ شجرۂ نسب کے لحاظ سے اُن کا تعلق حضرت یعقوب علیہ السلام کی قوم اور خاندان سے ہے۔ اُنکی صورت سے اُنکی سیرت کی خوبی کہیں زیادہ ہے۔ اور ظاہر کے مقابلے میں اُنکے باطن کی شیرینی اور بھی زیادہ ہے۔

پھر بھی ان کے کلام میں میخواری کے موضوع نے ایک خاص مقام پایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خان علیین مکان نہ تو خود غافل روح کے مالک تھے اور نہ ہی عملی زندگی سے کنارہ کشی اور فراریت کی آرزو رکھتے تھے لہذا کردار و عمل کی اِس شخصیت کے کلام میں میخواری اور رندی کے موضوعات بظاہر بڑے معنی خیز دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر اس موضوع کو خان کے کلام کے آئینے میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایرانی یا ہندی شعراء کی طرح فراری ذہنیت کے مالک نہ تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے مسلکِ میخواری کو محض روایتی تتبع اور مجبوری کی رو سے اپنایا تھا۔ وہ ایک مستانہ اور زندہ دل انسان تھے اور کیف و سرور کی قدروں سے آگاہ تھے۔ اور اِسلئے وہ اِس کے طلبگار اور آرزومند تھے۔ :-

راته نیسی جانانه د شرابو پیمانه
د شرابو پیمانه راته نیسی جانانه
مغنّی په چغانه راشه بیا کیږده لیندۍ
راشه بیا کیږده لیندۍ مغنّی په چغانه

"میری محبوبہ پیمانہ مے لئے سامنے کھڑی ہے (اے مغنی چغانہ ساز کے تاروں کو ایک دفعہ پھر چھیڑ)۔"
ایسے آزاد منش مفکر کے لئے حوادثِ زیست شکست خوردگی کا باعث کیونکر بنتے۔ ہر مصیبت کو گلے لگانا وہ اپنا شعار سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر رندی و مےخواری کے موضوعات میں وہ محض خوشحالی اور طرب افزائی کے آرزومند دکھائی دیتے ہیں تو اِس کا جواز ہے۔ یارو گلزار اور حسن و عشق کی دنیا میں جب یہ کیفیت ہو کہ ؎

مے شتہ چنگ و نے شتہ د خپل یار سرہ خوشحالہ
خپل بیاض پہ لاس کښے څہ گلزار لوہ کئے نہ

"مے بھی ہے چنگ و نے بھی ہے، اے خوشحال کیا تو اپنے محبوب کے ہمراہ اپنی بیاض ساتھ لئے ہوئے سوئے گلزار جائیگا بھی کہ نہیں"۔

ایسی حالت میں رندانہ شاعری کا وجود ایک لازمی سی بات ہو جاتی ہے۔ اگر پشتو کے دوسرے شعراء کے متعلق ہم کوئی حتمی نتیجہ مرتب نہ بھی کر سکیں پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ان دونوں موضوعات کے ساتھ پشتونوں کا کوئی عملی علاقہ نہ تھا، لہٰذا یہ دونوں موضوعات اُس تقلیدی ادب اور شاعری کا ایک اہم جزو ہیں۔ جو وہ عربی اور فارسی شعراء کی تقلید اور تتبع میں کیا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ساقی نامہ کے موضوع کو اپنی شاعری میں خصوصی طور پر فروغ دیا۔ اور جیسے کہ فارسی مثنوی میں کوئی روداد بیان کرنے سے پہلے ساقی نامہ سے ابتدا کرنا لازمی خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح پشتو شعراء نے بھی پشتو مثنوی میں اِس روایت کو جگہ دی ہے جیسا کہ ان منظومات سے ظاہر ہے۔ پشتو کا سب سے پہلا ساقی نامہ جو ادبیات پشتو کے ذخیرے میں موجود ہے وہ نویں صدی ہجری کے شاعر زرغون خان نورزی کا ہے۔ زرغون خان پشتو کا ایک بہت بڑا شاعر تھا۔ کہتے ہیں کہ ۹۱۲ھ میں دوست محمد کاکڑ نے اس کا دیوان ملا ایوب تیمنی کے پاس دیکھا تھا اور اپنی کتاب "غورغشت نامہ" میں اُس سے یہ مثنوی نقل کی تھی۔ اور پھر پٹہ خزانہ کے مؤلف نے اُس کتاب کے حوالے سے اپنی کتاب میں محفوظ کر لی۔ یہ ایک مکمل ساقی نامہ تھا۔ جس کی کوئی دوسری نظیر ادبیات پشتو میں شاید کم ہی ملے۔ زرغون خان کہتا ہے ؎

ساقی پاسہ پیالہ را کړه — مرور یار مے پہ خولا کړه
او بہ توئے پہ ملیو کړه — اور مے سر پہ دے او بو کړه

پسرلے شو غنچه گل کا — زلفے تاوے د سنبل کا
بلبلان شور وفغان کا — گرځیدن په گلستان کا
زاهد وو زی صومعے ځخه — شراب پیری میخانے ځخه
هر سړے په میو مست دے — دے بهار کښے گل پرست دے
په راغو کښے سرے بلے دی — د غټو لو ننداره دی
جهان ټول سور او زرغون شو — ویچ راغه بنگلے گلگون شو
سړی ټول شور وشغب کا — یارانے کاندی طلب کا
بهار وخت د یارانے دے — ښه موسم د پیمانے دے
نو ساقی پاسه بهار دے — ن ژوندون صبا رفتار دے
دنیا پاتے موږ به ځو نه — تور وخاور وکښے به یو نه
پیمانه ډکه دے کړه — بزم تود په پیاپے کړه
چه یو دم شمه آزاد — نابناد زړه مے شی نه بناد
ساقی پاسه وخت دگل دے — په جوشش کښے خم دمل دے
وخت د میو د ویشو دے — د پیالو د ډکیدو دے
صفه ټوک اوس دپیغو دے — چه مے جام تش او نسکور دے
مستان گرځی په باغو کښے — مستی کاندی په راغو کښے
لاس په لاس دی یارانے کا — یو په بل ناز او نخرے کا
مجنون وصل د لیلیٰ دے — د جمال په تماشا دے
نه غم ژن شته نه بیلتون شته — نه مهجور نه ځیگر نون شته
تر تا وگوځمه را سه — ساقی یو گړی پخلا سه
ماته جام دریل ولوړ را — چه یو تش شی ډک نے نور را

اور مے بلا د زړهٔ به کوړ کړه   له هر چا هر څهٔ ئے توړ کړه
چه بیا څهٔ نهٔ وی الفت وی   تپول مهر و محبت وی
تپولے خلاص وی او صفا وی   تیارهٔ ورک شی رنړا وی
له زړهٔ کم غش او دغل سی   جهان تپول گل او مل سی
ساقی ستا مهر مطلب دے   نو بهار څُکه مرغوب دے
کهٔ ستا لور ده پیس زونهٔ وی   نو بهار به په څهٔ بنهٔ وی
خوند به نهٔ کا رنگ د گلو   بے مستیو بے له مُلو
نهٔ به بزم په شور تود سی   نهٔ نغمے به په سرود سی
جام به تش د آرزو سی   ورک به مهر او پیرنهٔ وسی
نو ساقی پاسه بهار دے   بزم تاله امیدوار دے
یاران ناست ستر کے خلوړ دی   ستا د جام په اُمید نوړ دی
تهٔ هم راسه عنایت کړه   بزم تود د محبت کړه
د سرو مُلو څخه ډک جام کړه   و یارانو ئے انعام کړه
چه سور بزم به تود سی   د رند انو غوږ سرود سی
د جهان ویرو غم هیس کا   یو دم بنهٔ په عشرت تیر کا
چه په مخکنے مو بیلتون دے
د جهانهٔ صبا یون دے

" ساقی اٹھو پیالہ دو اور میرے روٹھے ہوئے محبوب کو منالو میری آتش عشق کے شعلوں پر آب (مئے) ڈال کر اسے ٹھنڈا کر دو۔ بہار ہے اور کلی پھول بننا چاہتی ہے۔ سنبل کی زلفوں کو سنوار لو۔ بلبلیں شور مچاتی باغ میں چکر لگا رہی ہیں۔ زاہد اپنی عبادت کی کوٹھڑی چھوڑ کر نکلا ہے اور میخانہ سے شراب لے رہا ہے۔ ہر آدمی شراب سے سرشار ہے اور اس بہار میں وہ گل کی پرستش کرتا ہے۔ داغوں میں سُرخ شعلے ہیں اور غانٹول

کے پھول جوبن دکھا رہے ہیں، تمام جہاں سُرخ اور سبز ہو گیا ہے۔ اور صحرائے خشک گلگوں ہے۔ تمام لوگ ہاؤ ہو میں مصروف ہیں اور دوستی اور طلب دوستی کے خواہش مند ہیں اور بہار کا موسم دوستی اور ناؤ نوش کا موسم ہے۔ تو پھر ساقی اٹھو بہار ہے۔ آج زندہ ہیں کل جانا ہے۔ یہ دنیا رہ جائیگی اور ہم چلے جائیں گے۔ اور خاک سیاہ میں رہیں گے۔ پیمانہ کو شراب سے پُر کرو اور دورِ جام سے محفل کو گرماؤ، تاکہ یکدم میں آزاد ہو جاؤں اور میرا افسردہ دل شادکام ہو جائے۔ ساقی اٹھو کہ موسم گل ہے اور شراب کی وجہ سے خم جوشش میں ہے۔ شراب بانٹنے اور پیالہ بھرنے کا وقت ہے۔ ایسے میں وہ طعن و تشنیع کا سزاوار ہے جس کا جام خالی اور نگوں سار ہو۔ باغوں میں مست گھوم رہے ہیں۔ اور باہر صحراؤں میں نکل کر مستی کر رہے ہیں اور بانہوں میں بانہیں ڈالے دوستیاں کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہیں۔ مجنوں لیلیٰ سے واصل ہے۔ اور اُس کے جمال میں محوِ تماشا ہے۔ نہ تو کوئی محزون ہے اور نہ رنجور اور نہ کوئی غمزدہ دکھائی دیتا ہے میں تیرے قربان! آجاؤ اے ساقی گھڑی بھر کے لئے مان جاؤ مجھے رواداری اور مہربانی کا جام لاکر دو۔ اور جب ایک خالی ہو جائے تو دوسرا بھرا ہوا لاکر دو۔ میرے خانۂ دل کو تقسیم کرکے اسے ہر شے سے بے نیاز کر دو۔ بس اور کچھ بھی نہ ہو فقط اُلفت سراسر مہر و محبت اور اخلاص و صفا ہی ہو۔ اندھیرا چھٹ جائے اور روشنی ہو جائے۔ اور دل سے مکر و فریب محو ہو جائے۔ یہ ساری دنیا پھول اور شراب سے بھر جائے۔ اے ساقی مجھے بہار اِس لئے مرغوب ہے کہ مجھے تمہاری محبت کی طلب ہے۔ اگر تیری نظر عنایت مجھ پر نہ ہو تو بہار بھلا کس کام کی! شراب اور مستی کے بغیر پھولوں کے رنگ بھلے دکھائی نہیں دیں گے۔ اور محض شور و غل سے محفل گرم نہ ہوگی۔ نہ تو نغمے ہوں گے اور نہ ساز بجیں گے۔ جام آرزو خالی ہو جائے گا۔ اور مہر و ایثار باقی نہیں رہے گا۔ تو پھر ساقی اُٹھو کہ بہار ہے اور بزم تمہاری متمنی ہے۔ دوست آنکھیں کھولے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اور باقی لوگ بھی اُمید جام لئے بیٹھے ہیں۔ تو بھی آکر ذرا مہربان ہو اور بزم کو محبت سے گرمائے۔ سُرخ شراب سے جام لبریز کرکے احباب کو بطور انعام دے دے۔ تاکہ اس ٹھنڈی محفل میں گرمی آجائے۔ اور پھر رندوں کے کانوں تک موسیقی کی آواز آئے۔ جہان کے ڈر کا غم بھلا دو اور دنیا کی یہ ایک گھڑی عیش و عشرت میں گزار دو، کیونکہ ہمیں جدائی درپیش ہے اور کل ہمیں اِس دنیا سے جانا ہے۔"

یہ روایت ابھی تک جاری ہے اور غزل اور رباعی کے علاوہ ایسی مثنوی میں جس میں عشق اور رومان کی داستان بیان کی جا سکتی ہے، ساقی نامہ کے اشعار نہایت اہتمام کے ساتھ لائے جاتے ہیں۔ مثلاً فتح خان قندھاری کی کہانی میں مُلا نعمت اللہ کہتے ہیں ؎

ساقی را کړه صفا سره شراب د تونده — چه مے شي دغه پرهر د زړهٔ پیوند

تو تاثیر د میو نایو پرے او نهٔ شي — قسم خودم چه په بل څیز توبه نه دیو په نه شي

پا سه پا سه اے ساقي مجلس روښان کړه — مضامین د جام و شعر په لسان کړه

چه اوچے ولے شي د ژبے تانده — چه میوه د شعر تویُ کړي لاندی بانده

زر شه زر شه اے ساقي جام د اخلاص — په تلوار سره ے کړه زما په لاس

کهٔ په لاس ے ستا د وصل پیاله کښیوزی — د هجران غموږ تول را څخنے پریوزی

ساقي ډک کړه شیشه د مۓ ناب — زما نهٔ دے پاتے شوے د زړهٔ تابے

خو چه دا پیالے کښېږده په کام — تر قیامته به بیا نهٔ مومي آرام

جوړه شوی ده ساقي د مجلس شمع — چه تول ناست دی ستا د سرو میو په طمع

زر شه زر شه معطلي مهٔ کړه سرعت کړه — د پیاله د سرو شرابو ے قسمت کړه

اے ساقي نوے نوروز نوے بهار دے — جمع شوے په گلشن کښے هر یو یار دے

چنگ ونے ورته وهلے شي په جوش — تهٔ ترے هم پیاله د سرو میو کړه نوش

"ساقی مجھے وہ لطف شراب دو کہ میرا زخم دل مندمل ہو جائے۔ جب تک یہ مے ناب کی تاثیر سے اثر پذیر نہ ہو جائے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ کسی دوسری چیز سے یہ شفایاب نہ ہوگا۔"

"اے ساقی اٹھو! اٹھو! اور محفل کو منوّر کر دو اور جام و شعر کے مضامین اپنی زبان پر لاؤ اگر پھلوں جیسی رسیلی شاعری ادھر اُدھر بکھیر دیں تو پھر بھلا میری زبان کی نسیں کیوں خشک ہوں گی۔"

"اے ساقی جلدی کرو اور اخلاص کا جام میرے ہاتھ میں تھما دو - اگر تمھارے وصال کا پیالہ میرے ہاتھ آ جائے تو ہجران کے سبھی غم جھڑ جائیں۔"

"ساقی مئے ناب سے شیشہ لبریز کر اب مجھ میں تاب لانے کا یارا نہیں۔ اگر کوئی ایک دفعہ یہ پیالہ حلق سے لگالے تو تاقیامت اُسے آرام نہیں آئے گا۔"

"ساقی تو گویا شمع محفل بنا ہے کہ سبھی تمہاری سُرخ شراب کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ جلدی کر اور لیت ولعل سے کام نہ لے تیزی اختیار کر۔ اور سرخ شراب کے اِس پیالے کو میرا مقدر بنا دے۔"

"اے ساقی نوروز اور نئی نویلی بہار ہے ذرا دیکھو تو ہر ایک دوست باغ میں آیا ہوا ہے یہاں جوش و خروش کے ساتھ چنگ و نے انہیں سنائے جاتے ہیں۔ تو بھی اُس میں سے سُرخ شراب کا پیالہ نوش جان کرلے۔"

اسی طرح امان گجراتی کے ساقی نامے کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں :-

ساقی بیا راوړه شراب ارغوانی — تشنه لب به کوړم لاړشم ارمانی
نه به دا زما سوالونه همیشه وی — نه به ستا کبر وغرور وی نه ځوانی

ساقی بیا راوړه صفي شراب لذیذ — چه په څښلو سره وړی عقل تمیز
چه زه مست شمه دیار په محبت کښې — شپه ورځ به لګیا دیار صفت کښې

ساقی بیا ډک دسرو مییو پیاله کړه — څښلو دپاره مې زما په حواله کړه
وصال نن صبا نیټې دا ته کوی — د بیلتون په سوړو کور به مې تالاکه

"ساقی! پھر شراب ارغوانی لادے ورنہ اِس فانی دنیا سے تشنہ لب اور ارمانوں بھرا دل لے کر چلا جاؤں گا۔ نہ تو میرے یہ سوال ہمیشہ کے لئے ہونگے اور نہ یہ تمہارا کبر و غرور اور جوانی ابدالاباد تک رہے گی۔ ساقی! وہ شراب لذیذ پھر لادے جسے پیتے ہی عقل و ہوش باقی نہ رہے اور عشق یار میں مست ہوکر اُسی کی تعریف و توصیف میں شب و روز لگا رہوں۔

ساقی! ایک دفعہ پھر سرخ شراب کا پیالہ بھر دے اور پینے کے لئے میرے حوالے کر دے۔ وہ وصال کے لئے آج کل کے وعدے وعید کر رہا ہے۔ اس لئے ہجر کی آہ و فغاں سے میرے گھر کو تباہ و برباد کر دے گا۔"

پشتو ادبیات میں ساقی نامہ کی دوسری شکل وہ ہے جسے عبدالرحمان بابا اور خوشحال خان خٹک نے اپنے

کلام میں فروغ دیا ہے۔ چونکہ انہوں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں چھوڑی جس میں کوئی افسانہ یا داستان بیان کی گئی ہو اور منظر بدلنے کی خاطر ساقی نامہ کی ضرورت انہیں پیش آئی ہو۔ جیسا کہ متأخرین کی مثنوی میں عام نظر آتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی غزل اور رباعی میں ادب کی اِس صنف کو جگہ دی ہے۔ اور حافظ اور خیام نے فارسی ادب کے میدان میں جو معیار قائم کیا تھا وہی معیار رحمان باباؒ اور خان علیین مکان نے اپنے مخصوص طرز و انداز میں پشتو ادب میں بھی پیدا کیا ہے۔ یہاں اِن دونوں کے ساقی ناموں کی غزلوں کے دو دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں خوشحال بابا کے ساقی نامہ کی طرز کچھ یوں ہے :- سے

هغه دم چه د ساقي پیاله نوش کړم — په مستئ دواړه کون نه فراموش کړم

په معنی کښے هم شراب یم هم ساقي یم — طالبان د میو شته چه ئے مدهوش کړم

ناصحان راته په عقل دفتر لولي — خدائے به نه کا چه ئے ذه په ویل گوش کړم

د زاهد په صومعه کښے زړهٔ تنګ شو — لدے پسه به خدمت د میفروش کړم

چه بلبله توشنوا د دے چمن یم — په موسم د ګلو څهٔ رنګ خاموش کړم

چه په زړهٔ ئے اثر نه کیږی خوشحاله
څهٔ فائدهٔ که تل ورو ورو ورته خروش کړم

ز جس دم میں ساقی کا پیالہ نوش کرلیتا ہوں تو اُس کی مستی سے ہر دو کون فراموش کر دیتا ہوں۔
معنی کے لحاظ سے میں شراب بھی ہوں اور ساقی بھی۔ کیا کوئی شراب کے طالب ہیں جنہیں میں مدہوش کر دوں!

ناصح عقل کا دفتر لئے مجھے پڑھ کر سنا رہے ہیں خدا نہ کرے کہ میں اُن کے کہے پر کان دھروں۔
زاہد کی عبادت کی کوٹھڑی میں میرا دل تنگ ہو گیا۔ اس کے بعد میں مئے فروش کی خدمت کیا کروں گا۔
میں اِس چمن کا بلبل خوش نوا ہوں، تو موسم گل میں بھلا کیسے خاموش رہوں۔

اے خوشحالؔ جب اُس کے دل پہ اثر ہی نہ ہوتا ہو تو فائدہ ہی کیا ہے جو میں اس کے لئے ہمیشہ دھیرے دھیرے فریاد کرتا رہوں"

رباعی

دا اکرامونه دا انعامونه — دچا په یاد دی هسے کامونه
په بوئ د میومست شم صوفی یم — ساقی را سر کړه ډک ډک جامونه
په باغ کښے ګوره لالا ګلونه — یاقوت پیالے دی غواړی مُلونه
ساقی را پاسه تردا دپاسه — بے میو نیشته تحمّلونه
ساقی راپاسه دیوتې هوا ده — دا رضائی بے لا تر جوزا ده
ټولا یو ګل شته په باغ وراغ کښے — ایاغ رانوشه زما رضا ده

"یہ انعام واکرام اور ایسے کام بھلا کسے یاد ہیں۔ میں وہ صوفی ہوں کہ بوئے شراب سے مست ہو جاتا ہوں اور اے ساقی تو مجھے جام شراب بھر بھر کر پلا۔

گلہائے لالہ کو باغ میں دیکھو گویا یاقوتی پیالے لئے شراب طلب کر رہے ہیں۔ اے ساقی اٹھو کیونکہ اب اس کے بعد بغیر شراب ناب کے مزید ضبط و تحمل کا یارا نہیں۔

ساقی اٹھو کہ پوٹ کی ہوا چل رہی ہے۔ اور یہ موسم بہار برج[لہ] جوزا تک (۲۱ مئی) تک رہے گا۔ جب تک باغ وراغ میں ایک بھی پھول باقی ہو تو میری خواہش ہے کہ جام شراب میرے ہاتھ میں ہو۔"

اب ذرا اسی موضوع پر رحمان کے کلام پر نظر ڈالئے۔ ؎

ساقی پورته شه د میو جام تیار کړه — عمر هیڅ معطل نهٔ لری تلوار کړه
هر دم تیغ دا ستا زما په ګلو ګرځی — هر نفس د خپل نفس له تیغه دار کړه
تر هودئ په هورته بله بلا نشته — خادمی د بیخودانو په دربار کړه
دا ښځه ورځے ژوندون چه غنیمت دے — شکرانه په دا نعمت د کودګار کړه

لہ بہار کا موسم

کړه غمخوار غواړے په غم او په اندوه کښې — بنیښه ډکه د شرابو اختیار کړه

څو دِ دوه سترګے غړ یږی په جهان کښے — ننداره په هر ساعت دخپل نګار کړه

هغه څوک دے چه تهمت پرے وانه نشی — غوږ په هیڅ چا بانده مه باسه خپل کار کړه

بے وفادی ددے دهر یاران واړه — چه دِ پس له مرګه یادشی هغه یار کړه

د مدعی په خله چه ورشی هغه وائی — ګوش او هوش د محبانو په ګفتار کړه

رحمٰن وائی دد نیا چارے فانی دی

البته په دا خبرو اعتبار کړه

د ساقی اٹھو اور جام مے تیار کرو۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اس لئے جلدی کرو۔ اے میرے محبوب! ہم دونوں کے گلے پر ہر وقت تیغ بران چل رہی ہے۔ اپنے ہر سانس کی تلوار سے ہر دم خوف زدہ رہو۔ خود نگری سے بڑھ کر اور کوئی چیز بلائے جان نہیں ہے۔ تو اُن لوگوں کے دربار کی غلامی کر جو بیخودی سے سرشار ہوں۔ یہ پنج روزہ زندگی غنیمت ہے، اِس نعمت کے لئے پروردگار کا شکریہ ادا کرو، اگر غم واندوہ میں تمہیں غم خوار کی ضرورت ہو تو شراب سے لبالب جام کو اپنا لو۔ جب تک اِس دنیا میں تمہاری یہ دو آنکھیں وا ہوں تو ہر لمحہ اپنے محبوب کا تماشا کیا کرو۔ وہ کون ہے جس پر تہمت نہ دھری گئی ہو۔ کسی کی نہ سنو اور اپنا کام کئے جاؤ۔ اِس زمانے کے سبھی محبوب بے وفا ہیں موت کے بعد جو تیرے کام آسکے، اُسے اپنا یار بنالو۔ مدعی کے منہ میں جو بھی آئے کہے جاتا ہے۔ گوش و ہوش اپنے خیر خواہوں کی طرف کرو۔ رحمٰن کہتا ہے کہ دنیا کے باقی سب دھندے فانی ہیں تجھے چاہئے کہ تو اُن باتوں کا اعتبار کرلے۔

(۲)

د ساقی په لاس کښے جام د مئے ناب دے — مطرب ایښے په زانو بانده رباب دے

ته چه ماوته توبه وائے ناصحه — په دا وخت کښے چا څخه د توبے تاب دے

زه چه ځان منع کوم د عشق له کاره — په دا هسے کار کښے کم سود او ثواب دے

دا آسمان چه لوئے په عقل کښے بالهٔ شی — په محیط د عاشقئ کښے یو حباب دے

تہ چہ توبہ غواړے پہ عشق کښے راتہ وایہ — کوم چا کړے د زمری پہ خلہ کښے خواب دے
عبادت پہ شتاب ھسے کړہ رحمانؔ!
دکہ عمر چہ دے تلونے پہ شتاب دے

" دست ساقی میں مئے ناب کا جام ہے ۔ اور مطرب نے رباب اپنے زانو پر رکھا ہوا ہے ۔ اے ناصح تم مجھے توبہ کی تلقین کرتے ہو بھلا اس وقت توبہ کی تاب کون لاسکتا ہے! میں اگر اپنے آپ کو کاروبار عشق سے روک لوں تو بھلا بتاؤ تو سہی ایسا کرتے میں کیا فائدہ اور ثواب ہوگا! یہ وسیع آسمان جو عقل میں بلند و بالا سمجھا جاتا ہے عاشقی کے محیط میں ایک حباب سا ہے ۔ تم جو عشق میں سونا چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ کہ شیر کے منہ میں نیند بھلا کیسے آتی ہے! اے رحمانؔ عبادت میں ایسی تیزی پیدا کرو جس سرعت کے ساتھ تیری عمر گذر رہی ہے ۔

پشتو شاعری میں جدید ساقی نامہ کا منفرد انداز جناب عبدالغنی خان کا ہے اُن کی رندانہ شاعری خمار و مستی اور کیف و سرور کے علاوہ زندگی کے ساتھ خالق و مخلوق دونوں کی محبت اور اُسکے انجام اور مکافات کے بارے میں مثبت تصورات و افکار اُنکے ساقی نامے میں جھلکتے نظر آتے ہیں ۔ غنی خانؔ کی اس قسم کی جدت کا ایک پُرلطف ساقی نامہ وہ نظم ہے جسے وہ بہار کہتا ہے ۔ ؎

بیا سپرلے راغے، بیائے پیغام راوړو
د رنګونو ګلونو او د نڅا

شو ساقی مُسکے ډکے جام راوړو — د مستئ خوانئ او خندا
دا شینکے چمن دا ګلونہ سرہ — دا مست مست شانے مستانہ ماښام
دا شبوت د ساقی د مینے دے — دا د سرو شرابو ډک پوره جام
د ساقی چہ سترګے خمارے دی — د جانان چہ شونډے دلدارے دی
چہ تہ تش یوہ نظارہ د رنګ وی — ترھغے بہ دا زړہ او نہ منم
دا خمارے ماتہ تور کړے دے — دا سنګارے ماتہ جوړ کړے دے

د غورزنګ د مستئ په انسان کښې وي   چه اور ونه په ټوله جهان کښې وي

" پھر بہار آئی اور پیغام لائی۔ رنگوں پھولوں اور روشنیوں کا ساقی مسکرا کر جام لایا جو مستی، جوانی اور مستی سے لبریز تھا۔ چمن کی یہ ہریالی اور اُسکے یہ سُرخ پھول اور یہ مستوں جیسی مستانہ شام۔ محبت کا سُرخ اور لبریز جام ساقی کی محبت کا ثبوت ہے۔ چشم ساقی خمار آلود ہے اور لبِ محبوب دلداری لئے ہوئے ہیں۔ جب تک رنگ کا ایک بھی نظارہ ہوگا میں سمجھتا ہوں کہ یہ خمار و سنگار میرے لئے ہی تو ہے۔ انسان میں جذب و مستی اُنہی کی پیدا کردہ ہے۔ اس بات کو میں ہرگز نہیں مان سکتا کہ اُس جہان میں تو بس آگ ہی آگ ہوگی۔"

پشتو ادبیات میں روایتی ساقی نامہ کا موضوع بھی ایرانی شاعری کی طرح دنیا کی بے ثباتی غموں سے راہ فرار اختیار کرتے اور خود کو ایسی بیخودی اور بیخبری کے حوالے کر دینا ہے جو سرور و نشاط کے ساتھ بے غمی اور بے خبری کا بھی حامل ہو۔ لیکن پشتو کی روایتی تخلیقی شاعری کے وجود میں یہ عنصر عام دکھائی نہیں دیتا۔ اگر چہ پشتو ادب میں نویں صدی ہجری سے قبل ساقی نامے کا پہلی بار متعارف ہونے کا حتمی وقت معلوم نہیں لیکن پھر بھی پشتو کے تقلیدی ادب کا یہ ایک بہت ہی دلچسپ اور پُرلطف حصہ رہا ہے۔ جس نے پشتو مثنوی کا مزہ دوبالا کر دیا ہے اور دنیا کی بے ثباتی اور اُسکے ساتھ دل نہ لگانیکی تعلیم بھی اُس میں موجود ہے۔

پشتو مثنوی[1]

پشتو میں مثنوی کی ابتدا غالباً خود خوشحال خان نے کی اُن چند مختصر مثنویوں کے علاوہ جو خان کے دیوان میں موجود ہیں اُس نے اِس صنفِ شاعری میں داستان اور روداد بیان کرنیکی تربیت اپنے بیٹوں کو بھی دی تھی۔ اور اُس کے بعد اُس کے بیٹے عبدالقادر خان خٹک اور صدر خان نے شاعری کی اس صنف کو فروغ دیا۔ اس ضمن میں عبدالقادر خان کی مثنوی یوسف زلیخا (۱۱۱۲ھ) صدر خان کی آدم دُرخانی ۱۱۱۸ھ

---

[1] نویں صدی ہجری میں میرحسن زدغونہ نے مثنوی میں حکایاتِ گلستان سعدی کا ترجمہ کیا ہے۔

اور تور دلے شاہی پشتو ادبیات میں مثنوی کے اعلیٰ معیار کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ انہی کے عصر میں عبدالحمید ماشوخیل نے اپنی مشہور مثنوی شاہ وگدا لکھی ہے۔ اور یوں پشتو میں عشقیہ قصوں اور رومانی داستانوں اور جنگ ناموں کو تحریر کرنے کا آغاز ہوا ہے۔ اس طرح اگر ایک طرف عربی ایرانی اور ہندی قصے پشتو ادب میں شامل کئے گئے تو دوسری طرف پشتون عشاق کی مقبول داستانیں بھی نظمائی گئیں اور پشتو کے مشہور شاعر صدر خان خٹک کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ جو اُس نے اپنے والد محترم خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کے سامنے ظاہر کی تھی۔ اُس نے کہا تھا ؎

دیر اشعار له هره بابه　　کتابت شو بے حسابه
دعشاقو افغانانو　　د ماضیو عاشقانو
کتاب بویه چه نګار شي　　ورو ستو پاتو یو یادګار شي

" انواع و اقسام کے بہت سے اشعار ہر موضوع پر بے حساب لکھے گئے۔ عشاق افغان جو ماضی میں گذرے ہیں۔ چاہیئے کہ ایک کتاب اُن پر بھی لکھی جائے اور پیچھے ایک یادگار باقی رہ جائے "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل اِس میدان میں کسی نے کوئی کتاب تحریر نہیں کی تھی۔ اس لئے کہ اِس موقع پر خان علیین مکان نے اسکے جواب میں کہا تھا ؎

دهٔ وے بنهٔ دِ اووے زویه　　یو کتاب په دا باب بویه
کهٔ د عمر خدهٔ وفا وی　　له کاروبار فرصت زما وی
ز آدم له در خانئ　　بویه بنے سخن رانئ
چه منظوم یوه نسخه شي　　یادګار پاتو په ستنه شي
او کهٔ پاتو شي له مانه　　زهٔ روان شم له جهانه
تهٔ منظومه کړه بالجزم　　دا قیصه په بنسکلی نظم

ما آغازه دا نامه کړه
خدا مانه ے خامه کړه

"اس نے کہا بیٹے تونے اچھا کہا اِس سلسلے میں ایک کتاب لکھنی چاہئے اگر زندگی کچھ وفا کرے اور مجھے کاروبار سے فرصت ملے تو چاہئے کہ آدم درخانیؔ کے بارے میں خاطرخواہ سخن دانی کی جائے۔ تاکہ ایک نسخہ منظوم تیار ہوجائے اور پیچھے یادگار رہ جائے۔ اور اگر یہ کام مجھ سے رہ جائے اور میں اس دنیا سے کوچ کر جاؤں تو تم ارادتاً اِس قصے کو منظوم کرکے خوبصورت طریقے سے پیش کرو۔ اے میرے لال! جب والد کی وفات کے بعد ۱۸ سال کا عرصہ گذرا تو میں نے یہ نامہ لکھنا شروع کیا اور یوں اپنے قلم کو جولانی دی۔"

اِس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پشتو مثنوی میں افسانے کا آغاز بظاہر آدم خان درخانیؔ کی اِس مثنوی سے ہو۔ لیکن چونکہ خوشحال بابا نے ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی ۔ اور بقول پروفیسر حبیبی عبدالقادر خان خٹک نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۱۲ھ میں لکھی تھی تو اِس حساب سے صدر خان خٹک کی لکھی ہوئی آدم درخانیؔ کی مثنوی اِس سے چھ سال بعد یعنی ۱۱۱۸ھ میں منظوم کی گئی ۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ پشتو مثنوی میں افسانے کی ابتداء بھی مذہب اور عقیدے کے پس منظر میں ہوئی ہے۔ یوسف زلیخا کا قرآنی قصہ جو مولانا جامی نے فارسی مثنوی میں لکھا تھا۔ اُس کے تتبع میں عبدالقادر خان خٹک نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا لکھی۔ یہ بھی بحر خفیف میں تھی۔ اور اُس کا نمونہ کچھ یوں ہے۔

د مغرب پہ لوی باچا وو ۔۔۔ چہ دولت یے بے احصا وو
دده اسم شاہ طیموس وو ۔۔۔ لوئے ملک لوئے ئے ناموس وو
مہتیا ور تہ ھر شۂ وو ۔۔۔ چہ دده وو دبل نۂ وو
ترے زوے یوہ لور وہ ۔۔۔ چہ پہ حسن لکہ حور وہ
زلیخائے د لور نوم وو ۔۔۔ چہ مثال ددے معدوم وو
کڑ ئے وصف د جمال کرم ۔۔۔ ددے بابہ تل مقال کرم
لکہ حق چہ د صفت دے ۔۔۔ چہ ئے کاد چا قدرت دے

"جانب مغرب ایک بادشاہ تھا جس کی سلطنت لامحدود تھی اس کا نام شاہ طیموس تھا۔ اس کا ملک اور اس کی عزت بہت زیادہ تھی سبھی کچھ مہیا تھا۔ اور جو کچھ اُسے مہیا تھا وہ کسی اور کے پاس نہیں تھا۔ اُس کی ایک بیٹی پیدا

ہوئی جو حسن و جمال میں مثلِ حور تھی اُس کی بیٹی کا نام زلیخا تھا ۔ جس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ اگر اُس کے جمال کی تعریف کروں اور اِس باب میں مسلسل بولتا رہوں تو جس قدر اس کی صفت کا حق ہے ، کسے یارا ہے کہ وہ ادا کر سکے" جیسا کہ کہا گیا ہے ، پشتو مثنوی میں افسانے کی ابتدا مذہب اور عقیدے کے پس منظر میں ہوئی ہے اور اُس کی رو سے یوسف زلیخا کے قصے کو خاص اہمیت دی گئی ہے ۔ اِس ضمن میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عبدالقادر خان خٹک کی مثنوی کے علاوہ اسی موضوع پہ ایک اور مثنوی عبدالقادر خان مومند کی بھی ہے جس کے ابتدائی اشعار کچھ اس قسم کے ہیں ۔

د تفسیره د قرآن	واوره دا دره و مرجان
ښه نوره قیصه له خدایه	غوږ دې کیږده سر تر پایه
چې دا په څه سبب	دا سوره ده نازل له رب
دا رنګ وائي دانایان	خبر دار دے کُل جهان
یوه ورځ پیغمبر	نجسته خیر البشر
د علیؓ کره د ننه	ناست په زړه خوشحال وو ښه
ناست په سنګ ددهٔ همه وو	هم علیؓ هم فاطمهؓ وو
هم حسنؓ حسینؓ مشغول	وو په سنګ کښې د رسولؐ

"تفسیر قرآن سے یہ موتیوں جیسی باتیں اور یہ میٹھی کہانی اللہ کی طرف سے ہے ، اسے خوب کان لگا کر سنو ۔ کیا وجہ تھی کہ اللہ پاک کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی ۔ دانایوں کہتے ہیں اور سارا جہان جانتا ہے کہ ایک دن پیغمبر خجستہ خیر البشرؐ حضرت علیؓ کے گھر میں خوش خوش تشریف فرما تھے ۔ اُن سے سبھی علیؓ ، فاطمہؓ ، حسنؓ ، اور حسینؓ مصروف گفتگو تھے ۔"

عبدالقادر مومند کی یہ مثنوی ۱۲۰۷ھ میں لکھی گئی ہے اور اِسکے آغاز میں وہ کہتا ہے " میرا نام عبدالقادر ہے ۔ نہ تو میں خٹک ہوں اور نہ وزیر ، میں علاقہ مہمند کا باشندہ ہوں کاروان میری جائے پیدائش ہے میرا جنم بھومی علاقہ باجوڑ ہے جو میری مستقل جائے سکونت ہے سن ہجری ۱۲۰۷ کا تھا جب میں نے یہ بیان آغاز کیا

عبدالقادر مومند کی مثنوی میں لگ بھگ آٹھ ہزار دوسو اشعار ہیں۔ بیان پُرلطف اور روان ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں قصے کے بیان کے علاوہ پند ونصیحت اور اخلاقیات کے موضوع پر دلچسپ اشعار کہے گئے ہیں۔ اور انداز وہی رکھا گیا ہے جو مولانا جامی کی مثنوی میں موجود ہے۔

ہمارے وہ ملی رومان جو بارھویں صدی ہجری میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اِس قسم کے قرآنی قصوں کے تتبع میں صوفیانہ افکار کی ترجمانی کرتے ہیں اور تصوف کے دیگر مسائل کے علاوہ عقل، علم اور عشق کی اہمیت اور آئین پر دلچسپ اور پُرلطف بحث و تمحیص کے حامل ہیں۔ اس قسم کے عمدہ اشعار مثنوی آدم خان درخانئ میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ ہیں، جو خود صدر خان کی شاعرانہ عظمت پر دال ہیں۔ جیسے کہ کہتا ہے۔

؎ نغمے اور ورباندے بل کړو	عقل عشق ورځنې بیل کړو
دا نغمه ده که جنون دے	دا سرود دے که افسون دے
دانائي ئې له ما یوړه	پارسائي ئې له ما یوړه
اے خاطره که اوس بنه کړے	له هیڅ چا به شرم نه کړے
رخصت راکړه ما رها کړه	خدائے راپیښه دا بلا کړه
مخ به بید بید یا وا کړم	عقل شرم زه رها کړم
بیائے عقل حیا یاره	مانعان شو له دے کاره
عاقبت چه عشق پید ا کا	زور قوت عقل بے پا کا

آتش نغمہ نے اسے بھسم کر ڈالا، عشق نے اس کی عقل چھین لی وہ کہنے لگی "یہ نغمہ ہے کہ جنون" یہ راگ ہے یا فسون! اِس نے تو مجھ سے میری دانائی چھین لی۔ اور میری پارسائی جاتی رہی۔ اے میرے دل اگر تو اب اچھا کرے تو کسی سے بھی شرم نہ کر۔ مجھے رہا کر کے رخصت دے دے۔ اللہ تعالیٰ نے جب عشق کی بلا میرے گلے میں ڈال دی ہے تو مجبوراً میں عقل و شرم تج کر بیابان کا رُخ کروں گی۔" مگر پھر میرے اے دوست، عقل و حیا اس کام میں مانع ہو گئی۔ انجام کار جب عشق ہو جائے تو زور، قوت اور عقل سبھی اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔"

ـه عشق چه ئے له شرمه — زلیخا اوویسته کومه
هغه عشق کړه ډرخو مسته — بے محابا کړه بے دسته
عشق ئے لوے کړل له سره — په یو ځل واړه معجره

رجس عشق نے زلیخا کو شرم وحیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ درخو کو بھی اسی عشق نے مست، بے حجاب اور بے دست و پا کر دیا۔ عشق نے ایک ہی دفعہ اس کے سر سے ساتوں چادریں اتار دیں۔

ـه علم هغه ته وایه شی — چه معلوم پرے بیلاوه شی
علم هغه ته وایه شی — چه تمیز په ده کاوه شی
د علوم فروع اصول شته — له فروع د دوئ حصول شته
هغه علم معیشت دے — چه حیوان ته عنایت دے
کنُ ئے دغه بخره نه وے — د حیوان روزګار به څه وے
چه انسان ته مرحمت دے — هغه علم شریعت دے
شریعت تمامی دین دے — کون له رب العالمین دے
علم بے عمله څه دے — د ګاؤ ښخوند په شنه سابه دے
په یرد خامو نا دهلا نو — دُنیا جو یو عالما نو
مجرد حروف قولو نه — بے عمله کلاموننه
د علوم په نام موسوم کړل — و سیلمے د خپل نوم کړل
چه په وصف د انسان شی — کامل تر هغه حیوان شی
د انسان کمال هغه دے — ځو اعلیٰ بلند پایه دے
په اخلاق د الهی شی — په وصال د کماهی شی
دا آدم هغه لوے ځیز دے — چه د خدائے په خوئ عزیز دے
چه د خدائے په خوئ آدم شی — په وصال د خدائے همدم شی

"علم وہ ہے جو معلوم اور نامعلوم میں امتیاز کر سکے۔ اور جو تمیز سکھا سکے علوم کے فروع اور اصول مقرر ہیں اور فروعات کی مدد سے اسے حاصل کیا جاتا ہے۔"

"وہ علم معیشت ہے جو حیوان کو ملا ہے۔ اگر اُسے یہ حصہ نہ ملتا تو پھر حیوان کا روزگار کیا ہوتا؟"

"جو انسان کو دیا گیا ہے وہ علم شریعت ہے جو سراسر دین ہے اور رب العلمین کی طرف سے اُتارا گیا ہے"

"علم بغیر عمل کے کیا ہے جیسے گائے سبز گھاس کی جگالی کرے۔ بہت سے خام نااہل اور دُنیا کے متلاشی عالموں نے مجرد حروف و اقوال اور بے عمل بیانات کو علوم کا نام دے کر بسے اپنے نام و نمود کا وسیلہ بنالیا وہ حیوانِ کامل تر ہوجاتا ہے۔ جو انسانی صفات کا حامل ہو۔ انسان کا اعلیٰ اور بلند پایہ کمال یہ ہے۔ کہ اُس میں خدائی صفات پیدا ہو جائیں۔ اور یہاں مفصل میں جن اوصاف الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُن سے متصف ہو جائے۔ آدم وہ بڑی ہستی ہے۔ جو صفاتِ الٰہیہ کیوجہ سے محبوب ہے۔ جب انسان میں خدائی صفات پیدا ہو جاتے ہیں تو وہ اللہ پاک سے واصل ہو جاتا ہے۔"

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے موضوعات اُس دور کی مثنوی میں جگہ جگہ بہت دلچسپ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں پشتو میں اس قدر زیادہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ کہ تعداد میں فارسی مثنوی سے عملاً ہمسری کرتی ہیں۔ اِن میں کتابی صورت میں شائع شدہ مثنویوں کا شمار بھی سو سے زیادہ ہے۔ ان مثنویوں کو زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے شعراء نے تخلیق کیا ہے۔ زبان اور نفس مضمون دونوں لحاظ سے یہ اٹھارویں صدی عیسوی کے شعراء کے قائم کردہ معیار سے بہت پست ہیں۔ پشتو مثنوی نے عوامی ادب کی ایک صنف کی صورت میں "بدلہ" کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور تقلیدی انداز کی بجائے وہ تخلیقی راستہ اپنایا ہے جس میں ہمارے لوک گیت یا عوامی ادب کے دوسرے اصناف جنم لیا کرتے تھے۔ مذ کتابی شاعری کی یہ صنف تمام پشتو نخوا میں بہت زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہے لیکن بَدلہ میں مثنوی کا علمی اور فلسفیانہ معیار قائم نہیں رکھا گیا۔

پشتو اسلام کی خدمت میں

اسلام نے پشتون قوم کی معاشرتی اور انفرادی خامیاں ایک حد تک اِن سے دور کر دیں۔ یہ دین تمام پشتون

قبائل کے لئے گویا ایک حصار تھا۔ وہ اسلام کے مجاہدین بنے۔ مساوات اور خودی پشتو کے جوہر تھے یہ اسلام کی تعلیم اور پشتو کی فطرت کا خاصہ تھے لیکن عقیدۂ توحید نے انہیں ایک لڑی میں پرو دیا۔ یہ خود دار، موحد اور مساوات کا قائل پشتون اسلام کا غازی اور مبلغ بنا۔ ہند پر مسلسل حملوں نے اس کو عظمت اور سربلندی عطا کی۔ اس نے صدیوں تک کشمیر سے دکن اور بنگال تک حکمرانی کی، اور بعض کے خیال کے مطابق یہ پشتون جو فاتح کہلائے جاتے تھے، کچھ عرصے کے بعد پٹھان کہلائے جانے لگے۔ اسلامی عقائد کے رُو سے جب پشتون کے افکار اور تصورات کو جِلا ملی تو قدرتاً ان کی اپنی مادری زبان بھی ان کی ترجمانی کا ذریعہ بنی۔ مگر مسلسل انقلابات اور مہمات نے اسے مناسب نشو و نما اور تربیت کا موقع نہ دیا۔ پشتو زبان میں خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور نہ یہ ملی روایات کی تکمیل سے عاری تھی۔ اِس کا دامن وسیع اور عہد قدیم ہی سے رنگین پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ مگر اسلام کی معاشرتی زندگی اور مثبت تعلیمات نے اس میں مزید رنگینی اور رعنائی پیدا کر دی۔ باوجود اس کے کہ تقلیدی ادب کی بعض کثافتوں نے اس کی اصلیت کو متاثر کیا۔ پھر بھی پشتو نے جدت پسندی، اخذ و قبول اور جوہر فطری کی برکت سے بہت کچھ پالیا۔

پشتو محاورے کی تشکیل

ہر زبان اپنے عوام اور ماحول کے مزاج اور ضروریات کے مطابق لغات، اصطلاحات اور محاورے پیدا کرتی ہے مشہور ترکی مدبرہ خالدہ ادیب خانم کہتی ہیں کہ "زبان ایک زندہ چیز ہے اور وہ لوگوں کے اذہان میں ایسی تدریجی نشو و نما پاتی ہے کہ جیسے جیسے ان کے ادراکات اور احساسات وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ ویسے ہی ایسے اس کے اظہار کے لئے الفاظ محاورے اور اصطلاحات جنم لیتے ہیں"

الفاظ محض خیالات اور تصورات کو ظاہر کرنے کی علامات ہیں اور پشتون قوم مرکزی ایشیا کے اُن علاقوں اور خطوں میں آباد ہے جہاں مغرب اور مشرق کے قافلوں اور شمال اور جنوب کے لشکروں کے راستے ان کے قریب سے گذرتے ہیں۔ اسلئے اِس ماحول نے اُس کی فطرت کی مٹی میں شجاعت اور بہادری کا جوہر گوندھا ہے۔ زراعت، گلہ بانی اور تجارت شروع ہی سے اُس کے پیشے ہیں۔ اور مہمان نوازی اور معاشرتی آؤ بھگت اُن کی

روایات ہیں۔

انہی لوگوں نے عہد قدیم سے اپنی سرزمین پر متمدن زندگی گذاری ہے، جبکہ ابھی یہاں کے دوسرے علاقوں میں انسانی تہذیب و تمدن کے آثار کی نیو ڈالی جا رہی تھی تو یہ قوم بلخ جیسے بلند آثار والے شہر آباد کر چکی تھی۔ پشتون اپنے اُس ماحول میں مدت مدید سے اپنے مزاج کے مطابق ایسا ادب تخلیق کر رہا تھا۔ جو اُس کے قلب و روح کے لئے وجہ سکون اور موجب مسرت تھا اور اُن الفاظ اور محاوروں کو جنم دے رہا تھا جن میں اُسکے افکار اور خیالات کی مناسب اور موزوں ترجمانی ہو سکتی تھی اس زبان میں وہ خوبی آج تک موجود ہے۔ اسلامی عقائد کی تعلیمات کے ساتھ اس زبان کا تعلق برسوں پرانا ہے۔ روزمرہ، محاورہ، اصطلاحات۔ افعال حتی کہ اس نے اکثر اسماء پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہاں تک کہ پشتونوں کے اکثر نام عربی سے ماخوذ ہیں اور یہ سارے ایسے لگتے ہیں جیسے یہ اِس زبان کا ایک مستقل حصہ ہوں۔

غنائیہ شاعری

اگر باختر اور بلخ کی قدیم تہذیب ان لوگوں کی میراث تھی تو ایسی دیرینہ تہذیب کی یہ زبان بھی اُسی تمدن کی روایات کی آئینہ دار تھی۔ اور اُس کا دامن اس قدر تنگ اور سمٹا سمٹایا نہ تھا کہ اُن روایات کا تحفظ نہ کر سکتا۔

جہاں تک عوامی ادب اور گیتوں کا تعلق تھا اور تحریر کی بجائے یادداشت پر انحصار زیادہ تھا تو دوسری ہم عصر زبانوں سے پشتو زبان شعر و ادب کے میدان میں بہت آگے تھی۔ اِس زبان کی بے شمار کہاوتیں اور لاتعداد قصے بچوں کے کھیلنے کے گیت، پرانے ٹپے، مصرعے اور غاڑے اِس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں۔

پشتون قبائل کی بے قرار زندگی اور اُن کی اُسی قسم کی ادبی تخلیقات صحرا کے خودرو پھولوں کی طرح خود بخود پھوٹ پڑی ہیں۔ اِن تخلیقات میں ٹپہ یا لنڈئے پشتو زبان کا ایک ایسا اعجاز ہے کہ روئے زمین کی کسی زبان میں بھی اس کا ثانی نہیں۔ ٹپے کا اختصار اور معنویت، شدت جذبات، حقائق زیست کی ترجمانی، فطرت کی

عکاسی اور بالائے دگر بیان کی رعنائی ایسی خوبیاں ہیں کہ باوجود ایجاز و اختصار کے اسے دوسرے ادبی اصناف پر برتری اور امتیاز حاصل ہے۔ عام انسانی زندگی سے وابستہ تمام مسائل ٹپے کے نفس مضمون کے موضوعات ہیں جسے ہر کوئی کہتا ہے۔ مگر اس کا بنانے والا معلوم نہیں۔ یہ مختصر مگر پُر معنی زود اثر اور جلد از بر ہونیوا لے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر دلعزیزی کی وجہ سے ہر پشتون مرد و زن کو یاد ہیں۔

"پشتو ٹپہ"

گردش دوراں اور انقلابات زمانہ پشتو زبان کے لوک ادب کے دریا کا رُخ نہیں موڑ سکے۔ جیسے کہ ماہرین لسانیات کا یہ خیال ہے کہ پشتو زبان سنسکرت۔ ژند اور اوستا کی بہن ہے، اور مرکزی ایشیا کے بیابانوں، میدانوں، پہاڑوں اور وادیوں میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ زندگی بسر کر چکی ہے۔ اور ایک ساتھ نشو و نما پائی ہے۔ اور ارتقائی عمل میں ایک دوسرے کی ہمسر رہ چکی ہیں۔ مگر حسب خواہش زمانہ اگر ایک طرف اُوستا اور سنسکرت کی ہر دو زبانوں کو قدیم مذہبی ادبیات کے خزانوں سے مالا مال کیا گیا تھا۔ اور ان دونوں زبانوں کو زردشتی اور ہندو مذہب کی رُو سے تقدس اور گرانقدری نصیب ہوئی تھی۔ تو دوسری طرف پشتو زبان کو اُسکے اپنے ماحول اور اپنی ہی سرزمین میں دوزخ کی زبان ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کے باوجود قدیم ادوار کے انقلابات و حادثات پشتو زبان کے وجود کو فنا نہ کر سکے اس لئے کہ پشتو نے پشتو بولنے والے عوام کا ساتھ نہ چھوڑا اور سنسکرت اور وستا یا تو مذہبی تقدس کی رو سے اور یا ماحول کے بدل جانیکی وجہ سے زندہ زبانوں کی صف سے نکل گئیں۔ مرکزی ایشیا کی اُن تین بڑی زبانوں میں صرف پشتو اپنے ماحول میں اپنے بولنے والوں کے ساتھ زندہ اور باقی رہ گئی۔

اوستا اور سنسکرت کے گات، اشلوک اور دعائیں عہد قدیم کے انسانوں کی روحانی تسلّی اور ترقی کے کام آتی رہیں۔ ان کی تخلیق گویا ایک خاص انسانی ماحول کی روحانی تسکین کے پیش نظر ہوئی تھی۔ ان منظوم گاتوں اور اشلوک کا انداز بھی بالکل عوامی تھا۔ اُن کے اپنے مخصوص طرز تھے۔ جو لوگوں کو سینہ بہ سینہ یاد رہتے۔ فی الحقیقت یہ گات اور دعائیں عوامی روح کی صدائیں تھیں۔ جنہوں نے اُس زمانے اور اُس ماحول میں جنم لیا تھا۔ بعد میں جب

انہیں مذہبی تقدس حاصل ہوگیا۔ تو انہوں نے اپنے عوام کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان پر ایک مخصوص فرقے یا ذات کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ گٹھ جوڑ کے اس عمل میں عوام الناس کے جذبات اور افکار کی ترجمانی کے لئے اس زمانے میں پشتو زبان میں منظوم بیانات کی جو طرزیں اور اصناف وضع کردیئے گئے ان میں ٹپے۔ غاڑے اور نخکونہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام رنگ میں سراسر عوامی تھے۔ اور ہر کسی کے لئے تھے اسی لئے تو ان پر کسی خاص گروہ کی اجارہ داری قائم نہ ہو سکی اور نہ ہی ان پر موضوع اور مضمون کی کوئی پابندی عائد ہو سکی۔ یہ اس لئے کہ سارے پشتون قبائل میں انہیں عالمگیر اور دائمی مقبولیت حاصل تھی۔

بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ رگ وید کے شلوک دراصل پشتو ٹپے کے انداز میں تھے اور چونکہ یہ بھی اسی ماحول کے پیدا کردہ تھے۔ لہذا بعید نہیں کہ انکی زبان بھی پشتو کی اس قدیم شکل سے مماثلت رکھتی ہو جس میں اس زمانے کے پشتون چرواہے اور خانہ بدوش ٹپے کہتے اور اپنے روح وقلب کو تسکین و آرام پہنچاتے۔

وید کے عالم کہتے ہیں کہ ویدوں میں انسانی افکار و جذبات کے تقریباً سبھی ممکن موضوعات موجود ہیں اور ان کا تخلیقی ماحول بھی وہی ہے جہاں آریائی قبائل اپنے عمومی خروج سے کچھ عرصہ پہلے آباد تھے۔ ان کے قیام کا وہ جغرافیائی ماحول دریائے آمو اور دریائے سندھ کے درمیان کا علاقہ اور بالخصوص بلخ و باختر کی وہ سرزمین تھی جہاں آج بھی پشتون کے تمام قبیلے آباد ہیں۔ موضوعاتی تنوع اور ماحول کی ہمرنگی کی یہ خوبی پشتو ٹپہ میں بعینہ ویدی انداز کی ہے۔ اس لئے اگر بالائی پشتونخوا کے بعض علماء یا کسی ایک آدھ مستشرق نے بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ویدوں کا اصل پشتونوں کے ٹپے سے ماخوذ ہے تو یہ کوئی بے جا دعویٰ نہیں ہے۔ البتہ اپنی موجودہ شکل میں یہ نظریہ تحقیق طلب ضرور ہے۔

پشتو ٹپہ ابتداء ہی سے اپنے ماحول اور عوام کے افکار و جذبات کا ترجمان رہا ہے۔ عوامی شاعری کی یہ صنف جو پشتو لوک گیتوں اور ادب کے متعدد اصناف میں سے ایک ہے، قدامت کے لحاظ سے ان گذشتہ اور قدیمی ادوار کی یادگار ہے۔ یہ پشتو شاعری کی ایک ایسی مخصوص طرز ہے جس کی دوسری زبانوں کے ادب میں کوئی مثال نہیں۔ یہ سراسر عوامی چیز ہے اور کوئی بھی شاعرہ یا شاعر اس پر اپنا دعویٰ ثابت نہیں کر سکتا۔ یہ ہر کوئی، ہر جگہ اور ہر وقت کہتا اور گاتا ہے۔ یہی اس کی خوبی اور عوامیت کی دلیل ہے۔ ٹپہ پشتون کی روح کی حقیقی عکس کا آئینہ دار

ہے۔ امیر و غریب، رند و صوفی اور ذات پات کی تخصیص کے بغیر، یہ ہر کسی کے دل کی پکار ہے۔ الغرض اپنی سوچ سمجھ کے مطابق ہر کسی کے دل کو سکون اور آرام بخشتا ہے۔

ایک عام پشتون اشاروں، کنایوں اور فلسفیانہ رموز و اسرار کی شاعری کو در خور اعتنا نہیں سمجھتا وہ اپنے عوامی شعر کی بحر اور روانی پر فریفتہ ہوتا ہے اسکے جذبات بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ٹپے کے لطف کا احساس یہ اسلئے کر سکتا ہے کہ ٹپہ خود اسکے جذبات کی سب سے بہتر اور صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ہر ٹپے کی "یا کہ زار" (میں قربان) کی آواز ان کے جذبات میں وجد، مستی اور ہیجان پیدا کرتی ہے اور گھر گھاٹ، قریہ بیابان اس کی سحر انگیزی اور سرور و مستی سے سرشار دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جیساکہ ذکر کیا جا چکا ہے ٹپے کی حرکات تصنع سے یکسر خالی ہیں۔ اُن کی گائیکی کے لئے کوئی خاص جگہ یا مقام متعین نہیں۔ اور نہ اُس کے صوتی اُتار چڑھاؤ پر کوئی پابندی ہے۔ گھر حجرہ، کوہ و دمن حتیٰ کہ چکی کے پاس اور پنگھٹ پر ہر جگہ اس کا خاص لطف اور مزہ ہے۔ مرد و زن ہر دو یہ نغمے الاپتے ہیں۔ اور اپنے غم اور دکھ درد بہلاتے ہیں۔ لمبی مسافتوں کو مختصر کرتے ہیں۔ اور سست روی کو تیزی بخشتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ماحول میں یہ ٹپاؤں کی اس شاعری سے زیادہ مقبول ہے جو مغربی ادب میں غنائیہ شاعری Lyrical Poetry. کے نام سے موسوم ہے اور اس خطے میں اس کے ساتھ لوک ادب کے بعض مخصوص اقسام وابستہ ہیں۔

ٹپہ کا مزاج زندہ بھی ہے اور حیات آفرین بھی۔ یہ راہ چلتے قافلوں کا رفیقِ سفر بھی ہوتا ہے اور پہاڑوں کے تنگناؤں اور ترائیوں میں گھاس کاٹنے والے گھسیاروں سے بھی الگ نہیں ہوتا۔ یہ چرواہے، ساربان گڈریوں، گوالوں کا ساتھی بھی ہے اور گاؤں کے زمیندار اور مزدور کا سنگ بھی نہیں چھوڑتا۔ ٹپہ گرمی کی تمازت اور شدت کے احساس کو گھٹاتا ہے۔ اور یخ بستہ برفانی ہواؤں کے خلاف مدافعت کی قوت بھی پیدا کرتا ہے صحرا نورد ساربان اسی میں حُدی خوانی بھی کرتے ہیں۔ اور فصلوں کی تخم پاشی، کٹائی، اور کھیتوں میں ہل جوتنے کے وقت یا سنہری فصلوں کے لہلہانے کے ساتھ جواں سال کسانوں، الھڑ دوشیزاؤں، ادھیڑ عمر اور سفید ریش محنت کشوں اور بچوں کے نغمہ ریز ٹپے جیون کا سندیسہ بھی لاتے ہیں۔ یہ دو محبت بھرے دلوں کے جذبات کی حقیقی ترجمان ہوتے ہیں۔ ان میں عاشق و معشوق کی تعریف و توصیف کے علاوہ راز و نیاز کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور غماز و قاصد کے ساتھ ساتھ ولن کے کردار کی پُر لطف اور دلچسپ ترجمانی بھی۔ ٹپہ یا مصرعہ میں یہ سب کچھ اس قدر حقیقی اور

فطری صورت میں ملتا ہے کہ شعر و ادب کے کسی دوسری صنف میں اس کا جواب نہیں۔

ٹپہ رزم و بزم اور شادی غمی کے ہر موقع پر پشتون عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ میدان جنگ کا سرفروش سپاہی بھی جب تلواروں کی کاٹ، بموں اور توپ و تفنگ کی گن گرج سے دوچار ہوتا ہے تو ایسے مواقع پر بھی وہ ہمیشہ اپنے دل کی پکار ٹپہ کی تان کی اٹھان میں الاپتا ہے۔

ٹپے کا لطف اور رعنائی جس قدر دلکش اور دائمی ہے اُسی قدر اُس کی تاریخ بھی دلچسپ اور قدیم ہے اور اس لئے اُس نے ادب کے مؤرخین کے سامنے یہ مسئلہ لا کھڑا کیا ہے کہ رگ وید کے اشلوک اور گات جو ۱۵۰۰ اور ۹۰۰ ق م کے مابین لکھے گئے ہیں آیا پشتو ٹپے کے ساتھ اُن کا کوئی رشتہ یا نسبت بھی ہے۔ اسی مسئلہ پر مستشرقین کے سب سے آخری محقق ریونڈ جنز ڈ انولڈسن نے جو نتائج مرتب کئے ہیں۔ اُن نتائج کا تذکرہ اِس کتاب کے آغاز میں آیا ہے اور اُس کی رو سے پشتو لوک ادب کے اِس صنف کی قدامت کے نظریئے کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ لیکن چونکہ ٹپے کا شاعر معلوم نہیں ہوا کرتا لہذا نہ تو اِس کے تاریخی ادوار متعین کئے جا سکتے ہیں اور نہ اِس کے صحیح وقت اور زمانے کا کوئی تعین کیا جا سکتا ہے۔

قوال اور اخون[1]

پشتو ادب میں قوالوں۔ بھاٹوں اور اخوند سرود گروں کی داستان بذات خود ایک لمبی تاریخ کی حامل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی جہاں دیدہ فنکار پشتو کے روایتی ادب کا بیشتر حصہ اپنے حافظوں میں محفوظ کرتے تھے اور یہ لوگ اِس زبان کے بیشتر مروجہ اصناف کو دوام بخشتے تھے۔ جب تک کہ اِس زبان میں کتابی ادب کو رواج نہیں دیا گیا تھا۔ یہی لوگ پشتو قصوں کہانیوں تمثیلوں۔ ضرب الامثال اور لوک گیتوں وغیرہ کا بیشتر حصہ اپنے حافظوں میں محفوظ رکھتے۔ یہ فنکار اپنی قوتِ حافظہ کے طفیل ہمیشہ اس قسم کے پشتو ادب اور پشتون روایات کو زندہ رکھتے۔ لیکن فن اور روایات کے ان امینوں کے اسماء تاریخ کے ابواب میں بہت کم ملتے ہیں۔ فقط وہ چند نام جو یہاں تک پہنچے ہیں۔ خواتو مورخ کے حوالے سے تواریخ حافظ رحمت خانی میں محفوظ ہیں۔ اس

[1] پشتونوں میں عوامی شاعر کا اصطلاحی نام

ہیں خونداد۔ سرکین، درویش، یشنکے، اَدو، فتوگے اور جونڑا[1] ایک ہی خاندان کے افراد تھے اسی طرح قبیلۂ دلہ زاک کا پیر شکے اور اسی دور کی مشہور رومانی داستان آدم درخانیؒ کے بیان میں صدر خان خٹک نے تاتی اور میرو قوال کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے سہ

یاتے نام یو یوسفزے وو — حاجی خیل وو ښہ زلمے وو
مردہ دل نۂ وو ژوندے وو — مدام مست د عشق پہ مے وو
قال او قیل ئے لہ بل خینہ — دۂ هر گز نۂ کړو عزیزہ
لہ عشاقو نزدے لرے — دۂ بہ کړے مدام خبرے
اما زیات چہ ئے بیان کړو
دۂ مذکور د آدم خان کړو

"تاتے نامی ایک یوسفزیٔ تھا۔ وہ حاجی خیل اور شریف النفس جوان تھا۔ مُردہ دل نہیں تھا بلکہ زندہ دل تھا۔ اور مۓ عشق سے سدا سرشار رہتا تھا۔ وہ غلط قسم کی گفتگو ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔ دُور اور نزدیک کے عشاق کی باتیں ہمیشہ سنایا کرتا لیکن وہ زیادہ تر آدم خان ہی کا تذکرہ کرتا"

اور تاتی قوال کی زبانی میروگی یا میرو قوال کا ذکر یوں کیا ہے[2] سہ

د میرو قوال لہ پورہ — ماتہ شوے دہ مزبورہ
هغہ اورے دا تحقیق دہ — نورہ لرے لہ طریق دہ
هم بہ دا طور تاتی — د خبرو نباتے
دا قیصہ او کړه شیرینہ — لا خوږہ تر انگبینہ
هر چہ مادہ اوریدلے
لہ تاتی دا قصہ ښکلے

---

[1] تواریخ حافظ رحمت خانی صفحات ۶۲، ۸۲، [2] آدم درخانیؒ

" میرو قوال کے خاندان والوں نے مجھے بتایا ہے ۔ اس میں مزید تفتیش کی گنجائش نہیں ۔ اسی طرح تاتی جو باتوں میں رس گھولتا تھا یہ شیریں داستان جو شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہے مجھے سناتی ۔ اور جو کچھ بھی ہے یہ خوبصورت نسہ میں نے تاتی (قوال) سے سنا ہے ۔

میرو گے یا میرو قوال خود آدم درخانی کی عشقیہ داستان میں ایک عمدہ کردار کا مالک ہے اور تمام داستان کے ڈھانچے میں اس کا وجود ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ فن قدیم زمانے سے موروثی چلا آرہا تھا ۔ اور اباؤ اجداد اپنے حافظے کی یادداشتوں کو اپنی اولاد کو منتقل کر دیتے اور یوں ثقہ راویوں کا سلسلہ قائم رہتا ۔ یہ لوگ ماہرین انساب بھی ہوتے تھے ۔ اور قبیلے کے تمام نسب نامے ان کو یاد ہوتے تھے ۔

جس زمانے میں لکھنے کا دستور اور رواج نہیں تھا ۔ تو مذہبی گاتیں اور حمد بھی لوگ اسی طرح اپنے حافظوں میں محفوظ رکھتے اور یوں جس طبقے نے اس فرض کو موروثی خیال کیا انہیں ہندی آریاؤں میں برہمنوں کی ذات سے موسوم کیا گیا ۔ اور دیگر مذاہب میں دوسرے ناموں سے پکارے گئے ۔

اس طرح انسانی معاشرے میں جو بھی منظوم روایات اور واقعات یاد کرتا اور لوگوں کو مشغول رکھتا وہ طبقہ قوالوں اور سرود گروں کے گروہ میں شمار ہوتا ۔ یوں قدیم الایام سے بھاٹوں کی اس شاعری کی بنیاد پڑ گئی ہے ۔ جسے مغربی ادب میں " غنائیہ ادب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ اور عربوں کا تو اس بارے میں یہ پختہ نظریہ تھا کہ اگر شعر پڑھو تو خوش الحانی سے پڑھو ۔ کیونکہ غنا شعر کی اصلی جولانگاہ ہے ۔

تغن بالشعر ان ماکنت قائلہ

ان الغناء لھذا الشعر مضمار

" اگر تو شعر کہنے والا نہیں تو کم از کم اسے گنگنا لیا کرو ۔ کیونکہ غنا ہی شعر گوئی کے واسطے ایک کھلا میدان ہے ۔"

عربوں میں سب سے مقدم فن شعر گوئی خیال کیا جاتا تھا ۔ اور اسی میں ہر بات کی توضیح کی جاتی رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عرب نے اس فن کو تاریخی واقعات ، دانائی کی باتوں اور نسلی شرافت کا وسیلہ گردانا ۔ اس سے انکی قدر دانی کو فروغ ملا ، شعر کے یہ اصناف عربوں کے زمانۂ جاہلیت سے ہی مقبول چلے آرہے ہیں ۔ لیکن جب اسلام

کی آمد سے انہوں نے مشرق و مغرب کے ممالک فتح کئے تو حدی خوانوں کی بجائے ایرانی اور رومی مغنی انکے موالی بن گئے ۔

آدم دُرخانیٔ کے مذکورہ قصے کی روایات کی رُو سے خود آدم خان بھی ایک عمدہ سخن دان مغنی تھے ۔ جیسے صدر خان خٹک نے اپنی مثنوی میں "آدم خان" "بلبل" کہا ہے وہ مزید کہتا ہے ؎

آدم میشت په شیرخانه وو — شب و روځ په ترانه وو
په مخ ګل نازک بدن وو — شکرلب شیرین سخن وو
نکته دان صاحب سخن وو — پوه د شعر په فن وو
موسیقی علم ئے ډیر وو — په مرونډ کښے ډیر پیش وو

"آدم موضع شیر خانہ میں رہتا تھا ۔ اور شب و روز نغمے گایا کرتا تھا ۔ صورت کے لحاظ سے وہ نازک بدن پھول تھا ۔ وہ شکرلب اور شیریں زبان تھا ۔ ساتھ ہی نکتہ دان، صاحب سخن، اور فن شعر سے واقف تھا ۔ وافر علم موسیقی رکھتا تھا ۔ اور اسکی کلائی میں بڑی لچک تھی ۔ اسی طرح بعض دوسرے شوقیہ فنکار جیسے شمسی خان اور بلوگی کا تذکرہ بھی اس مثنوی میں موجود ہے اور یہ دونوں اس افسانے میں کرداروں کی حیثیت سے آئے ہیں ۔ لیکن از روئے افسانہ آدم خان اور میر دُگی کی ذات ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے ۔ اور اس لئے اُن کا وجود بھی اس معاشرے میں خالی از امکان نہیں ۔ جیسا کہ صدر خان کہتا ہے ؎

یو غلام د آدم خان وو — بلو نام فصیح زبان وو
غوږ ئے ایښے په آواز وو — د خبرو جنګ ته ساز وو

"آدم خان کا بلو نامی ایک فصیح زبان غلام تھا ۔ وہ گوش بر آواز رہتا تھا اور مناظرہ اور مناقشہ کے لئے مستعد رہتا" ۔ شمسی خان کے بارے میں کہتا ہے ؎

شمسی خان یو دوئم ځوان وو — چه تربور د آدم خان وو
همیشه ئے له آدمه — شیطنت کوه همدمه
صفت اووے چه په کله — زه د احبل پربن دم عاقله

چہ پہ خلہ د آدم خان شی   سر سرتوړ کا نمایان شی۔

دا ئے اووے پہ قیام شو

پہ سرود ئے دا کلام شو

"شمسی خان ایک دوسرا جوان تھا جو آدم خان کا عزیز تھا۔ میرے دوست وہ ہمیشہ آدم خان کو ستایا کرتا۔ اُس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو آدم خان کے نغمے سے بے قابو کر کے اُسکے سر سے چادر ہٹا دوں گا" یہ کہہ کر وہ اُٹھا ۔ اور ساز و سرود کے ساتھ یوں گویا ہوا۔"

"ادباء اور شعراء کے دو گروہ"

جسطرح پشتو ادب میں عوامی اور کتابی ادب یا تخلیقی اور تقلیدی ادب کی صورت میں دو متوازی سلسلے جاری ہیں، اسی طرح ادیبوں اور شعراء کی بھی دو بڑی جماعتیں چلی آ رہی ہیں۔ ایک جماعت وہ ہے جس نے شعر کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھا ہے۔ اور دوسری جماعت وہ ہے جس نے اسے کتابی شکل دی ہے۔ سخن وروں کی یہ دونوں جماعتیں اب بھی پشتون معاشرہ میں موجود ہیں۔ مگر تاریخی لحاظ سے اُنیسویں صدی عیسوی قوالوں کا دور ہے، (جنھیں اس دور میں اخون کہا جاتا ہے) جو سب سے اہم خیال کیا جاتا ہے۔ اس دور میں برہان، نوردین، گل محمد[1]، حمید اخون، غازی الدین۔ ارسلا اخون ۔ عبدالغفار ۔ عیسیٰ اخونزادہ ۔ توکل ننگرہار ۔ شاہ گل اخون ۔ ناصر ۔ سکیا ۔ میرافضل ۔ محمود ۔ اکبر شاہ ۔ نواب جان ۔ طالب گل ۔ پاپاب ۔ عبداللہ ۔ علی جان ۔ مقصود گل ۔ محمد دین ۔ غریب ۔ امانت اخون ۔ یاسین[2] ۔ بہرام ۔ دوستم ۔ عجم ۔ میرا ۔ باجی ۔ میر عبداللہ میاں رجب ۔ محمد جی ۔ محمد دین تیلی ۔ محمد خان اشنغری ۔ نور شاہ علی ۔ پیر محمد ۔ قاسم ۔ سید احمد ۔ سید کمال ۔ کرم اور ظریف خان پشاوری وہ نامور اخون ہیں جو اُس زمانے میں سارے پختونخوا میں مشہور تھے وہ اپنے

---

[1] موضع پلوسئی کا باشندہ تھا۔ [2] پکلئی ضلع مانسہرہ کا رہنے والا تھا۔

[3] ضلع مردان کے موضع مینئی کا رہنے والا تھا۔

ساتھ شاگردوں کا ایک گروہ رکھا کرتے اور انکے پاس اپنے ساز بھی ہوتے۔ اور حجروں اور ڈیروں میں مجالس جماتے ان مجالس میں وہ اکثر اپنا کلام سنایا کرتے اور لوگوں کو اپنا زورِ سخنوری دکھایا کرتے۔ جہاں کہیں بھی دو اخون آمنے سامنے ہوتے تو مناظرے اور طرحی مشاعرے برپا کر دیتے۔ ایسے مقابلوں میں اکثر مصرعۂ طرح رکھا جاتا۔ اور یہ لوگ اس پر فی البدیہہ طبع آزمائی کیا کرتے۔ جو شاعر ہار جاتا تو خاموش ہو جاتا۔ جیتے ہوئے اخون کے شاگرد نغارے (ڈھول) اور دف بجانے شروع کر دیتے اور ساز گرم کر کے مجلس بپا کر دیتے۔ اخون شعراء کے مابین اس قسم کے مقابلوں کا رواج سارے پشتونخوا میں عام تھا۔ اور پشتونوں کی معاشرتی زندگی میں اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخری دور کے ان فنکاروں میں بقول قاضی عبدالحلیم اثر چیتیاخیل گروہ کو خاص شہرت حاصل تھی۔ وہ گاؤں گاؤں گھوما کرتے۔ جس گاؤں میں رات آتی۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے اس کے چوراہے میں فائر کرتے اور پھر مجلس جماتے۔ لوگ جمع ہو جاتے اور انہیں مہمان بنا کر اپنے ساتھ گاؤں لے جاتے۔ وہ کہتے کہ ہم نے پہلے فائر اس لئے کئے اور مجلس اس لئے بپا کی کہ کہیں کل تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے دسترخوان نے انہیں مست کر دیا۔ کہتے ہیں کہ ہر مہینے کی پہلی کو جب وہ کسی گاؤں کو چلے جاتے تو سارے گاؤں والوں کو اپنی طرف سے دعوت دیا کرتے تھے۔ چیتیاخیل کا یہ گروہ ہمیشہ بارہ افراد پر مشتمل ہوتا۔ اس گروہ میں نیا ممبر تب شامل کیا جاتا جب پرانے ممبر کو کوئی واقعہ یا حادثہ پیش آ جاتا۔ اور وہ گروہ سے خارج ہو جاتا۔

مذکورہ بالا اخوندوں میں سے ایک اخون عبدالعظیم ہشتنگری گذرا ہے مشہور صاحب دیوان شاعر عبدالعظیم رانیزئی نے اپنے اس ہمعصر غزلخواں فنکار کے بارے میں اپنی ایک غزل میں کہا ہے ؎

دا عظیم دا شنغر نو شاعر نۂ دے ۔۔۔ پہ پردو غزلو بولی شاعر ځانے
دے لہ چیلہ ځانہ ہیڅ و ټیلے نۂ شی ۔۔۔ غلا کوی لہ شاعرانو پکښے مانے
ولے ډیر بنۂ غزلی او مجلسی دے ۔۔۔ پہ آوازے ډیر مئین دی سرداران
پہ زاړو پہ منتونوئے خلق بیائی ۔۔۔ ورکوی پیسے روپئ شورکی مهران
چہ پہ شوق د زړۂ غزل کاندی راپورتہ ۔۔۔ اندرون پہ زړۂ زخمی کړی سامعان
زیر و بم غزل نغمے چہ کړی راپورتہ ۔۔۔ حق حیران شی وارہ پاتے غزلیان

"یہ پشتنگر کا عظیم نامی شاعر نہیں ہے۔ پرانی غزلوں پر خود کو شاعر کہتا ہے۔ اپنے آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ سراسر شعراء سے چوری کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک اچھا غزل گو اور فنکار ہے اور بہت سے سرداروں کو اُس کی آواز مرغوب ہے۔ لوگ اس کی منت سماجت کرکے اُسے لے جاتے ہیں۔ اور اُسے چاندی کے روپے اور سونے کی اشرفیاں انعام میں دیا کرتے ہیں۔ جب وہ دلی شوق سے غزل سرا ہوتا ہے تو سننے والوں کے دل اندر ہی اندر زخمی ہو جاتے ہیں جب وہ نغموں کی زیر و بم میں غزل چھیڑتا ہے تو محفل میں موجود غزل گو شعراء حیران ششدر رہ جاتے ہیں"

یہ اخون اور قوال دراصل پشتو روایات کے حقیقی محافظ اور ایسے لوگوں پر بے لاگ تنقید کرنے والے تھے جو آداب پشتو نولی کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے تھے۔ انکے کلام میں اُن لوگوں کی ہجو ہوتی جو ننگ و ناموس سے عاری ہوتے اور اچھے پشتون پیشواؤں اور راہنماؤں کی مدح سرائی انکے کلام کا ایک اہم عنصر تھا۔ وہ اسے اپنا قومی اور اخلاقی فریضہ سمجھتے۔ اس طرح اگر ایک طرف وہ اپنے کلام سے لوگوں کو محظوظ کیا کرتے اور محفلوں کو گرماتے تو دوسری طرف لوگوں کو ننگ و ناموس، پشتو اور پشتونولی کا درس بھی دیا کرتے اور یوں اپنی ملی روایات کو زندہ رکھتے۔

بیسویں صدی عیسوی میں اگر چہ اخوندوں کے یہ گروہ دھیرے دھیرے گھٹ گئے۔ مگر پھر بھی پشتو ادبیات کا میدان ان سے یکسر خالی نہ ہوا۔ وہ اب بھی موجود ہیں مگر روایتی انداز کی بجائے وہ ایک نئی ڈگر پہ چل پڑے ہیں اور اس خطے میں سیاسی تحریکوں کی ابتدا ہی سے وہ بھی اپنے انداز میں انگریز کی غلامی سے اپنی قوم کو آزاد کرانے کی کوشش میں کمربستہ ہوئے۔ اسی طرح وہ بھی حجرہ کی بجائے سٹیج اور جلسہ گاہ تک نکل آئے اور یہاں پر انہوں نے اپنے سامعین کو زیادہ سے زیادہ پایا۔ اس لئے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اس جگہ کو زیادہ موزون اور مناسب سمجھا۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق انہوں نے بھی ملک و قوم کو بیدار کرنے کے سلسلے میں بے اندازہ اور زیادہ مناسب کام کیا اور کاروانِ حریت کو آگے بڑھانے اور منزل مقصود تک پہنچانے کے کام کو تیز تر کر دیا۔

"یونانی اثرات"

یہ بات ضرور تعجب خیز دکھائی دیتی ہے کہ ۳۲۷ ق م سے اس طرف ۵۸ ق م کے لگ بھگ تین صدیوں تک باختر کے علاقہ پر یونانیوں کا تصرف اور غلبہ رہا۔ اور اس زمانے سے قبل یونان نے علم و ادب کے میدان میں بے اندازہ ترقی

کی تھی۔ شعر و شاعری میں عموماً اور ڈرامے کے میدان میں خصوصاً انہیں ساری دنیا میں برتری حاصل تھی اور اس ملک میں علوم و فنون کے ایسے نابغہ اساتذہ جیسے سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ گذرتے تھے لیکن پھر بھی باختر کے علاقے میں شعر و ادب کی دنیا میں اُن کی زبان اور ادب کی کوئی ظاہری نشانی باقی نہیں رہی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ گویا باختری زبانوں اور خصوصاً پشتو میں اُس زمانہ میں، اخذ کرنے یا قبول کرنے کا فطری جوہر مفقود تھا۔ بلکہ اس سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے۔ کہ یونانیوں کا یہ تسلط محض برائے نام تھا۔ اسلئے ان کے مابین نہ تو عمومی طور پر علمی و ادبی اشتراک واقع ہوا ہے اور نہ نسلی اختلاط۔ فقط ایک لحاظ سے ان میں یکرنگی اور مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ قدیم یونان میں بھی عوامی شعراء سانندہ یا رباب کی طرح کا ایک ساز اپنے پاس رکھا کرتے اور اپنے کلام کے ساتھ بجایا کرتے۔ اسی طرح اس کی بدولت ہی مغربی ادب کی غنائیہ شاعری LYRICAL POETRY کا نام پڑا ہے۔ اس قسم کی شاعری مخصوص اوزان میں کی جاتی۔ پشتو کسر کی شکل اس قسم کی شاعری کی مثال علاقہ مروت کے پشتونوں میں اب بھی موجود اور مقبول ہے۔

کہتے ہیں کہ یونانی گائیک اور بھاٹ شروع میں دیوتاؤں اور ملی قہرمانوں کی ستائش کیا کرتے تھے۔ ان کے اولین ممدوحین عموماً زندہ جوان مرد ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب وقت نے پلٹا کھایا تو وہ مردہ شمشیرزنوں کو سراہنے لگے۔ لیکن یونانِ قدیم کے اس رواج کے آغاز سے بہت پہلے جب آریہ قبائل ابھی باختر میں مقیم تھے تو اُن کے بعض قبیلوں کا یہ رواج تھا کہ جب کسی کو قبیلے کی سرداری کی مسند پہ بٹھانا مقصود ہوتا تو اُسے "مروتا" یا مروت قبیلے کی شرافت قسم دیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ اُس زمانے میں آریا قبائل مروت پشتونوں کو دیوتا سمجھتے[۱]۔ اس قبیلے کی یہ مثالی شرافت اب تک بہت مُمیّز اور آشکارا ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ: " د مروت زیاره د وزیر دُعا " "مروت کی گالی، وزیر کی دُعا" باہم برابر ہیں تو یہ بھی ان کی اسی فضیلت اور تمدنی برتری کی دلیل ہے۔ انہی مروتوں کے قومی گیتوں میں سب سے زیادہ مقبول وہ گیت ہیں جنہیں وہ کسر کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ کسر قدیم یونانی شاعری کی طرح مروت شمشیر زنوں

---

۱ قلمی مسودہ ڈاکٹر اوپل "ویدوں پر تحقیق"

اور جنگ آزما لوگوں کی بہادری شجاعت حمیت اور دلیری کے قصے اور دوداویں اور بالکل اُسی طرز میں سارنگی کے ساتھ گائے جاتے ہیں جیسے کہ قدیم یونان میں بربط (ستار نما ساز) کے ساتھ گائے جاتے تھے ۔

اس خطے میں قصہ گوئی اور داستان سرائی کا رواج انسانی تمدن کے ابتدائی ادوار کی یادگار معلوم ہوتا ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ منظوم قصہ خوانی کا فن اور اُس کے ساتھ ساز بجانیکا رواج گو براہ راست یا بالواسطہ یونان سے اس طرف آیا ہے اس کے برعکس یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ جس طرح آریہ قبائل اس سمت سے پھیلے ہیں۔ اسی طرح ان قبائل کا یہ تمدنی ورثہ بھی ان سے باقی دنیا میں پھیلا ہے اور یوں ایک قدیم ثقافتی مماثلت یونان اور پشتونخوا کے مابین موجود ہے ۔

پشتو کے عوامی گیتوں کے ادب میں شاعری کی ایسی کئی قسمیں موجود ہیں کہ سارنگی، چارتارے یا رباب کے ساتھ جو خاص داستان یا قصے بیان ہوتے ہیں یہ اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ ہمارا ثقافتی ورثہ یونان کی لیریکل شاعری LIRICAL POETRY کی ایک شکل ہے ۔ دراصل یہ باختری ثقافت کا وہ قدیمی ورثہ ہے جس نے اسی سرزمین پر جنم لیا ہے ۔ اور اسی سے ہر طرف پھیلا ہے اور الگ الگ ماحول میں اُس جگہ کے مزاج کے ساتھ یگانگت پیدا کی ہے۔

غنائیہ شاعری کی اس روایتی مشابہت کے علاوہ پشتو کی منظوم شاعری میں بعض دوسری روایات بھی قدیم یونانی ادب کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں ۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا کچھ حصہ ہماری ادبیات میں اس خطے پر یونانیوں کے تسلط کے زمانے میں آیا ہو ۔ اس میں ایک "ترانے" کا رواج تھا ۔ جسے رحمان بابا کی رباعی کی اجراء سے قبل خاص مقبولیت حاصل تھی ۔ یہ یونانی ڈرامے یا تمثیل کی تمہیدی نظم پرولوگ (PROLOGUE) کی طرح ایک ابتدائیہ تھا ۔ جس سے پشتون فنکار اپنی محفل کا آغاز کرتے ۔ اس کا تذکرہ صدر خان خٹک نے اپنی مثنوی آدم خان دُرخانئ میں اُس منظر کو پیش کرتے وقت کیا ہے، جب وقت بسکئ کی شادی کے موقع پر حسین وجمیل دُرخو بسکئ کے گھر گئ تو علیک سلیک کے بعد ۔ ؎

بسکئ دُرخو ترغاړه کړه　　　په بنهٔ ذنګ شوے سره دواړه

نورے کړه درخو مستوره　　　د همه بنځو ذکوره

چاپیس ه ے ترے حجاب کړو　　　په وریځ کښے آفتاب کړو

په دا کار ئې ډیر د لګیر شول   همګی په دا تدبیر شول
چه له ستره د ویستو د کا   دا ننګ کله د پریښوُ و ده

"بسکٹی اور درخو دونوں اچھی طرح بغلگیر ہوئیں۔ پھر گھر والوں نے درخو کو تمام مرد و زن سے الگ پردے میں بٹھایا اس طرح گویا سورج کو بادلوں میں چھپالیا گیا۔ گھر والوں کی اس حرکت سے لوگ بہت افسردہ ہوگئے اور متفقہ طور پر ایک ترکیب سوچی کہ کس طرح اُسے پردے سے نکالا جائے۔ یوں پردے میں اُسے بھلا کب چھوڑا جاسکتا ہے"۔

سب نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس بارے میں پیر صالح سے صلاح لینی چاہیئے جب وہ چند افراد اس کے پاس گئے تو اس نے انہیں بتایا کہ یہ کام آدم خان کے بغیر کوئی دوسرا نہیں کرسکتا اور کہا کہ ؎

هم آدم د حسن خان دے   چه دے کار وته شایان دے
د درخو پلو به لرے   هم آدم کا په خبرے
یعنی دے چه سرود ساز کا   د درخو صفت آغاز کا
په درخو به اثر وشی   د عشق نیش به ئې په زړهٔ شی
عشق به عقل ځنے ورک کا   نام و ننګ به ورته سپک کا
چه نام ننګ ځنے جدا شی   له حجاب به بیرون دا شی
بے د عشق له چنګ رباب   دا به څوک کا بے حجابه

"حسن خان کا بیٹا آدم خان اس کام کے لئے موزوں ہے۔ آدم خان باتوں باتوں میں درخو کا پلو اس کے منہ سے ہٹالے گا یعنی جب وہ ساز و سرود شروع کرے گا اور درخو کی توصیف کرنے لگ جائیگا تو درخو پر اس کا اثر ہو جائیگا اور نیش عشق اس کے دل کو ڈس لے گا۔ عشق اس سے عقل چھین لے گا اس لئے اسے نام و ننگ ہیچ دکھائی دینگے۔ جب وہ ننگ و ناموس تج دیگی تو پھر پردے سے باہر آجائیگی۔ عشق کے چنگ و رباب کے بغیر اسے بھلا کون پردے سے باہر لا سکے گا"!

پھر پیر صالح کے مشورے سے ایک آدمی کو آدم خان کے پاس بھیجا گیا اور اسے بلا کر وہ کام اس کے حوالے

کیا۔ آدم خان کے ہمراہ اُس کے دوسرے ساتھی بھی تھے۔ انہیں دعوت دی گئی وہ مجلس کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے رباب کے تار سر کئے۔ صدر خان نے اِس منظر کا حال یوں بیان کیا ہے ؎

چه پیر حسک له میانه شو مجلس جوړ په ترانه شو
میته خیلو دمابونه جوړ کړو جوړ دعشق بابونه
هر یو ژغ چې د رباب وو پکښې اور په پیچ وتاب وو

" اُن کے درمیان سے جب پیر اُٹھ کر چلے گئے تو ترانے سے مجلس کو آراستہ کیا گیا۔ میتہ خیل جوانوں نے رباب اُٹھا کر عشق کے باب کھولے اور رباب کی ایک ایک تان میں جیسے آگ پیچ وتاب کھانے لگی"۔

اِسی ترانے سے مجلس کا آغاز ہوتا اور مقامی موسیقی کی روایات اور آداب کی تقلید میں اصنافِ شعر ترتیب وار ساز کے ساتھ سنائے جاتے۔

اسی طرح پشتو شاعری میں لوبہ یا کھیل بھی، یونانی تمثیل یا ڈرامے کی صدائے بازگشت سی معلوم ہوتی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ پشتو لوبہ ڈرامہ کی ایک مکمل شکل تو نہیں ہوتی۔ پھر بھی ڈرامے کے قریب ضرور ہے۔ اگرچہ پشتو میں اِس کی ابتداء قصے سے ہوئی۔ قصہ گو قصے میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر ایسا انداز اختیار کرتا کہ سامعین محظوظ بھی ہوں اور اُس سے سبق اور عبرت بھی حاصل کر سکیں۔ اِس فن کے اُستاد اور باکمال فنکار کو نقلی کہا جاتا ہے۔ یہ نقلی حجروں، ڈیروں، بڑے شہروں اور میلوں ٹھیلوں میں عوام کی خوشی اور دلچسپی کا انتظام کیا کرتے۔ پشتو ادب میں وہ فنپارے جمع تو نہیں کئے گئے جو ظریف طبع فنکاروں کے زبانی بیان ہوئے۔ لیکن یہ مسخرے پشتو نخوا میں بیسویں صدی کے اوائل میں بھی موجود تھے اُنکی زبانی بعض دلچسپ قصے اور لطیفے اب بھی پشتو ادب میں رواج رکھتے ہیں اور بعض کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ عرصہ دراز سے پشتون عوام کی نظروں میں نہیں جچتے تھے۔ اور بہ نظر تحقیر دیکھے جاتے۔ لیکن پھر بھی محفل میں اُنکی موجودگی کو باعثِ مسرت سمجھا جاتا۔ شرف گل سواتی اور بادری کے چشکلے اور خیرات گل اور دوڑے وغیرہ کی مجلس آرائی کے قصے مشہور ہیں۔ ایسی محفلوں میں جب ایک اچھا مسخرہ کوئی روداد بیان کرتا تو بڑا لطف اور مزہ آتا۔

پشتو میں قصہ گوئی کا رواج اب بھی ہے ان میں بعض تو سٹیج اور ٹیلی ویژن تک جا پہنچے ہیں۔ اور پردۂ سیمیں پر

لائے گئے ہیں اگلے وقتوں میں ایسا زمانہ بھی تھا کہ یہ مسخرے نہایت آسانی کے ساتھ مختلف انسانوں اور جانوروں کی نقلیں اتار سکتے۔ یہ سوانگ بھرنے اور بہروپ دھارنے میں بڑے مشاق ہوتے۔ اور جیسے کہ عقل مندوں نے کہا کہ اس قسم کا آدمی ؎

کله سپے کله پیشو شي   کله کدو په تماشو شي

" کبھی کتا اور کبھی بلی اور کبھی اور طرح سے باعث تماشہ بنتا ہے۔" مرد و زن، خان و دہقان، خادمہ اور مالکن۔ آقا اور غلام گدھے، کتا بلی، بیل وغیرہ کی نقلیں اتارنے اور سوانگ بھرنے کا عمل یہ لوگ تن تنہا اس قدر آسانی سے کیا کرتے کہ تماشائی مارے حیرت کے انگشت بہ دندان رہ جاتے۔ اسکے لئے نہ تو وہ لباس تبدیل کرتے اور نہ وقفہ طلب کرتے۔ انکی سبھی ادائیں اور نخرے لوگوں کے بالکل سامنے ہی ہوتے۔ یہ لوگ معاشرتی زندگی کے سبھی پہلوؤں، علاقے کی سیاسیات اور بعض لوگوں کے کردار و عمل پر ایسی تنقید اور نکتہ چینی کیا کرتے کہ لوگ کافی عرصہ تک انہیں فراموش نہ کر سکتے۔ پشتونخوا کے کبھی حجرے ایسے محفل آرا لوگوں کے لئے کھلے ہوتے۔ ان حجروں کے مجالس نے پشتونخوا میں تھیٹر کی اس کمی کو پورا کر دیا تھا جو دوسرے ممالک میں عہد قدیم سے موجود اور مقبول تھے۔

پشتو لوبہ میں اکثر مکالمے سوال و جواب کے انداز میں ہوتے ہیں۔ یہ مکالمے عموماً بڑے دلچسپ اور پرلطف ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں انہیں خصوصی شعری اوزان کی حاجت نہیں ہوتی لیکن یہ عموماً مقبول ترین لوک گیت ٹپہ میں ہوتے ہیں۔ رومانی قصوں کے بیشتر مکالمے نارہ یا ڈرغ کی شکل میں ایک عرصہ سے پشتو ادب میں موجود ہیں۔ جیسا کہ آدم درخانئ کی داستان میں درخانئ اور آدم خان وغیرہ کا یہ مکالمہ ہے

درخانئ: په کومې کنجې دنوبت شه   اے زما د دادا مینے
صبانۀ دو تا صبا کړو   دا شاهي آدم ے تا وویست له غیرے

آدم خان: درخانئ میرمن ملوکے   چه په درست جهان دِ لارے دحُسن کوکے
آدم خان ستا کتو رنځور کړو   کۀ ورکونه کړے د دوارو زلفو ټوکے

دُرخانۍ: آدم خانه مېته‌خېله د یوسف د منډېر خانه
زړهٔ دې ډک په دُر ګوهر دے په ښکلو دُرفشانه
زهٔ په مثل یو صورت یم تهٔ زما د صورت ځانه

آدم خان: کهٔ مرونه مرونه له دے هسے غمه مرونه
دُر نو ورک دې شه کېږونه
ستا نظر ګوره په چا دے ښکلې نهٔ یم
دُر نو وله په دعویٰ تړے تربرونه

وینځه: آدم خانه تکه توره د چندړو رباب مهٔ وهه په زوره
چه ستا د رباب شرنګ شی
نو بی بی دُرخانۍ رو درېږی سرتوره

دُرخانۍ: نهٔ روغه یم نهٔ لیونۍ په آدم پسے اومرم ترڅو کړی
د کوږ روغه رمتۍ راغلم د آدم غمے یو وه په ښتۍ

آدم خان: د آدم صورت نو وینئ دے په هره بلا پېښ دے
دے عاشق د ښکلی مخ دے نهٔ د چا دوست نهٔ د چا نوینس دے

درخانۍ: نن شاهی آدم زما کره مهمان دے
د دهٔ خدمت زما په ځان دے
آدم خان مے مرور شو رانه درومی
پینه ځدے میلمستیا زړهٔ ترے قربان دے

درخانی: "اے میرے داد اکی بھیڑ خدا تیرا جگر زخمی کر دے۔ صبح ابھی نہیں ہوئی تھی اور تونے (آواز دیکر) صبح کردی۔ اور میرے راجا آدم کو تونے میری آغوش سے الگ کر دیا۔"

آدم خان: "اے دُرخانی خانم اور رانی جس کے حسن کے چرچے ساری دُنیا میں پھیل گئے۔ تیرے دیدار نے

آدم خان کو بیمار کر دیا۔ کاش تم اپنی زلفوں کی دونوں لٹیں اس کی طرف جھکا دو۔"

درخانئی: "اے میندخیل آدم خان، یوسف اور مندنڑ کے خانزادے! تیرا دل عقل و فراست کے لعل و جواہر سے بھرا پڑا ہے اور تیری باتیں جیسے موتی جھڑ رہے ہوں۔ میری مثال ایک ڈھانچے کی سی ہے اور تو اس میں بمثل روح کے ہے۔"

آدم خان: "اگر ہم نہ بھی مریں تو اس غم کے مارے مر جائیں گے۔

درخو! تیرا کبر و ناز باقی نہ رہے نہ معلوم تیری نظر انتخاب کس پر ہے؟ اے درخو! ذرا بتا تو بھی تو ہر وقت اپنے عزیزوں کے طعنوں کی اڈ کیوں لیتی ہے۔"

کنیز:۔ اے آدم بجھنگ! صندل کا بنا ہوا رباب زور سے نہ بجاؤ جب تو رباب چھیڑتا ہے تو بی بی درخانئی ننگے سر اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

درخانئی: نہ تو میں دیوانی ہوں اور نہ فرزانہ۔ دم بھر میں اپنی جان آدم کے پیچھے دیدونگی۔ گھر سے ابھی بھلی آئی تھی اور یہاں آکر میں نے پہلو میں آدم کے عشق کا تیر کھالیا۔

آدم خان:۔ آدم ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور وہ ہر قسم کے مصائب سے دوچار ہے۔ وہ ایک ماہ لقا کا شیدائی ہے۔ نہ تو کسی اور کا دوست ہے اور نہ اسے کوئی دوسرا پسند کرتا ہے۔

درخانئی:۔ آج میرا داجا آدم میرے ہاں مہمان ہے۔ اسکی خدمت میرے ذمے ہے۔ آدم خان مجھ سے روٹھ کر جا رہا ہے۔ اگرچہ اس کی مہمان داری کے لئے میرے پاس روپے سیمین اور دل جان نثار موجود ہیں۔"

اس افسانے کے بعض مکالمے جو ہم وزن اشعار میں ہیں۔ صدر خان ولد خوشحال خان خٹک کی مثنوی آدم درخانئی میں موجود ہیں۔ مثلاً جس وقت آدم خان نے اپنے ساتھیوں سمیت بسکئی کی شادی کے موقع پر مجلس برپا کی۔ اس موقع پر پیر صالح کے حکم کے مطابق انہوں نے درخانئی کے رونمائی کے لئے جو کچھ کہا تھا اس میں زیادہ تر تخاطب کا انداز ہے۔ لیکن پھر بھی انداز تمثیل یا لوبہ کا سا ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

آدم خان:۔ درخانئ د باغ بلبلے — چہ رخسار دِ گل نشان دی
مخ بنکاره کړه تن راغلي — ستا دیدن تہ تږی طوطیان دی

شمشی خان:۔ درخانئ د تولی میرے — چہ تہ نہ وی وار خطا کړے

بلو تینګ نیسه په مخ کښې — او کړه نه ځان به رسوا کړے

بلوګے:۔ دُرخانئ زمونږ میرمنے — آدم خان دسوړو میر دے

شمشی خان تارغه دے — آدم خان ښکلے تجیر دے

شمشی خان (بلوګی کومخاطب ہوکر) اے بلو نمک حرامه — دا ویل څه ووچه تا وے

فهم او کړه ویل په ځائے کړه — اوسے غلام دچا وے

بلوګے (شمشی خان کومخاطب ہوکر) شمشی خانه شمشی خانه — زهٔ ناځوال په ویل ستا کړم

تا ته بے ترما پیسے وے — خرڅ دِ ځکه په ببها کړم

بلوګے (آدم خان کومخاطب ہوکر) خانه زیرے مے دربانده — عین په وړه کښے نمرخلیږی

ویل کړه بی بی درخو به — اوس سرتوره اودریږی

آدم خان:۔ دُرخانئ اووهٔ پرونی — په سر کړی حجابے دی

شغلے کله په حجاب کښے — پټیدونی آفتابے دی

وديدن ته دِ راغلے — خلقے بے حسابے دی

خلقے دِ وديدن ته — دخشکئ کڅ دا آبے دے

دير راغلی دسوات سے — بے شماره، بے حسابی دی

واړه ستړکے دی په وره کښے — ستا په لوړ اضطرابی دی

مخ ښکاره کړه چه نر ښځے

ستا خواهان په شتابی دی

,, آدم خان :۔ دُرخانئ! اے عندلیب گلستان! اے رخسار گل نشان! اپنا چہرہ دکھا دے۔ آج تجھے دیکھنے کے لیے سبز طوطی آئے ہوئے تھے۔

شمشی خان : درخانئ اے گل سرسبد! ایسا نہ ہو کہ تیرے اوسان خطا ہو جائیں۔ گھونگھٹ کو مضبوط کرلو۔ ورنہ اپنے آپ کو رسوا کرلوگی۔

بلوگے :۔ در خانئ ۔ اسے ہماری مالکن آدم خان تو شہسواروں کا سردار ہے اور شمسی خان کی مثال کوّے کی سی ہے ۔ آدم خان تو ایک خوبصورت پرندہ ہے ۔

شمسی خان :۔ (بلوگے کو مخاطب ہو کر) اے نمک حرام بلو! یہ تم نے کیا کیا ۔ یہ تو سوچ لو کہ تو پہلے کس کا غلام تھا!

بلوگے :۔ (شمسی خان کو) اے شمسی خان مجھے تیری اس بات پر افسوس ہو رہا ہے ۔ تجھے تو مجھ سے دس دولت عزیز تھی ۔ اسی لئے تو تو نے مجھے بیچ ڈالا ۔

بلوگے (آدم خان سے) آدم خان یہ تجھیں خوشخبری مبارک ہو ۔ عین دروازے میں سورج چمک رہا ہے اپنا نغمہ سناتے جاؤ ۔ بی بی درخو تھوڑی دیر میں ننگے سر آکر کھڑی ہو جائیگی ۔

آدم خان :۔ درخانئ تو نے اپنے آپ کو سات پردوں کے اندر چھپا رکھا ہے ۔ آفتاب کی کرنیں بھلا کب پردے میں چھپ سکتی ہیں! تیرے دیدار کے لئے خشکی اور تری کے بے شمار لوگ آئے ہوئے ہیں ۔ اور بہت سے لوگ سمہ اور سوات سے آئے ہیں بے شمار مضطرب اور بے قرار نگاہیں تیری طرف ٹکٹکی باندھے لگی ہوئی ہیں تو ذرا اپنا جلوہ دکھا دے اس لئے کہ یہ تمام مرد و زن تجھے ایک نظر دیکھنے کے آرزومند ہیں ۔

میر وگے :۔ د بی بی مہربانیو موږ ته هر چا کړو مخ روڼړی
خانه اوس به مخ ښکاره کړي پاتو دی خلو ۷ پردونې

" میر وگے : (درخانئ کا آخر کار مہربان ہونا اور آدم خان کو داد دینا) بی بی کی مہربانیوں نے ہمیں سب کے سامنے سرخ رو کر دیا ۔ اے خان اب وہ اپنا چہرہ دکھا دیگی اور اب اس کی صرف چار پردہ چادریں باقی رہ گئی ہیں ۔

میر وگے :۔ اے خان تجھے مبارک ہو کہ سورج کی کرنیں پھوٹ پڑی ہیں ۔ اب سورج پردے سے نکل آئیگا ۔ اس لئے اب تو صرف تین پردے (یعنی تھوڑی سی کسر باقی ہے) رہ گئے ہیں ۔

آدم خان :۔ ہر کوئی یہی چاہتا ہے اگر بی بی حجاب سے باہر نکل آئے تو سارا عالم منور ہو جائیگا ۔ اور سورج بادلوں سے نکل آئیگا ۔

عین بیچ میں اس دلچسپ مکالمے کے ساتھ ساتھ رو داد کا وہ بیان بھی آیا ہے جس میں پورا پس منظر دکھایا گیا

ہے ۔ اور جو قصے کے واقعات کو بھی آگے بڑھاتا ہے جیسے کہ پہلے ذکر ہوا ہے اس قسم کے مکالمے "ژرغ یا مارہ" کی شکل میں پشتو کے اکثر رومانی قصوں میں موجود ہیں جو قصہ کے بیان میں رو داد اور کرداروں کے ساتھ ایک نئے تمثیلی عنصر کا اضافہ کرتے ہیں ۔

پشتو کے مختصر اور طویل قصے پشتو کی معاشرتی زندگی کے تانے بانے کو مضبوط بنانے میں عمل دخل رکھتے ہیں ۔ یہ بے شمار اور بے حساب ہیں۔ گھروں، حجروں، ڈیروں، سفر و حضر۔ بات چیت اور بات سے بات پیدا ہونے کی صورت میں بیان کئے جاتے ہیں ۔ قصے پشتو زبان کے عوامی ادب کے بے ضرر، انمٹ اور ایک لامتناہی خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ بھی اکثر یادداشت پر مبنی ہوتے ہیں ۔ عام پشتون اس کے امین اور محافظ ہیں ۔ ان کی قدامت بھی زبان کی قدامت کی طرح ہے ۔ اور ان کا آغاز بھی اس زمانے سے ہوا ہے جب سے انسان واقعات کے بست و کشاد اور انکی ہمرنگی اور تضاد سے روشناس ہوا ہے ۔ یہ پیش آنے والے واقعات کے بسا اوقات پہلے سے نتائج اخذ کرنے اور انکے ذریعے پیش بندی کرنے اور راہ ہموار کرنیکی منصوبہ بندی کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں ان ہی سے ہمیشہ مثال اور نظیر کا کام لیا جاتا رہا ہے یہ عہد قدیم سے بچوں کی تربیت اور تعلیم کے لئے بروئے کار لائے جاتے ہیں یہ بھی یادداشت پر انحصار رکھنے والے عوامی ادب کا ایک بے داغ اور پُر لطف حصہ ہے ۔

"عوامی کردار"

پشتو کے عوامی ادب نے اس زبان کو زندہ اور فعّال کردار دیئے ہیں وہ کردار جو ایک زمانے سے قصوں اور گیتوں میں زندہ ہیں جو پشتون قوم کے عمومی کردار اور پشتونخوا کی معاشرتی زندگی کی فطری نمایندگی کرتے ہیں اور اُن تمدنی اقدار کو زندہ رکھتے ہیں جنہیں "پشتونولی" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ ان میں پشتون کا مثالی ہیرو بھی ہے اور پشتونخوا کا ولن بھی ۔

عہد قدیم ہی سے پشتو عوامی گیتوں میں پشتونوں کا پورا معاشرہ پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ یہ پانچ گروہ بیشمار ناموں سے پہچانے جاتے ہیں لیکن اصطلاحاً انہیں شاہ لالے (عاشق) شاہ لیلیٰ (معشوق) غماز (چغل خور)

دریاب (قاصد) اور موزی کے نام دیئے گئے ہیں پشتون معاشرے کی ساری ساخت و پرداخت انہی پانچ کرداروں کی مرہون منت ہے اور لوک ادب کے تمام اصناف میں بہت پہلے سے انکی موافقت اور مخالفت کی جاتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے ارفع کردار بھی ہیں جو پشتو کے ملی رومانوں میں افسانوی کرداروں کے مقام تک پہنچتے ہیں اور ساری پشتونخوا میں انہیں شہرت اور دوام حاصل ہوا ہے۔ ایسے کردار جیسے آدم خان درخانئ۔ موسیٰ خان گل مکئی، مومن خان شیرینئ، طالب خان اومئ، یوسف خان شیر بانو، تور دے شہی، فتح خان رابیا اور جلات محبوبا وغیرہ کی طرح کے کئی کردار پشتونوں کے ملی افسانوں میں قدیم زمانے سے پشتون معاشرتی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انکی رو سے پشتو کے افسانوی ادب کو ترقی اور فروغ حاصل ہوا ہے اور اس میں وہ فعالیت پیدا ہوئی ہے جو اسے قصے و داستان کی راہ سے افسانے، ڈرامے اور ناول تک پہنچاتی ہے۔

"اکبر بادشاہ اور پشتو کے رومانی کردار"

پشتو کے رومانی کردار سولہویں صدی عیسوی یا اکبر بادشاہ کے دور سے زیادہ وابستہ کئے گئے ہیں۔ اس قسم کے ادب میں ایسا مصرعہ مثلاً " د اکبر په زمانه کښې ز ما لاله " " اے میرے لال! اکبر کے زمانے میں" - ایک عام روایت سی بن گئی ہے۔ اس پس منظر کے اسباب صحیح طور پر ابھی معلوم نہیں لیکن یہ قیاس کیا جاتا سکتا ہے کہ اسی زمانے میں ایک طرف پشتون قبائل نے اگر بعض نو مفتوحہ علاقوں میں سکونت اختیار کرلی تھی تو دوسری طرف انہوں نے جنوبی ایشیا کے ساتھ ایک بار پھر تجارتی آمد و رفت روزگار اور ملازمت کے سلسلے میں رابطہ قائم کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دریائے لنڈے کے شمالی اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر آباد پشتون قبائل کی تادیب و سرزنش کے لئے مغلوں کی بڑی بڑی عسکری مہمات بھی زیادہ تر اسی دور میں بھیجی گئیں اس لئے اکبر اعظم کے دور سے لوگوں کی بہت سی یادیں وابستہ ہوگئیں۔ اس زمانے سے پشتونوں کے لئے کچھ عرصے تک یہ بات کچھ نامانوس سی تھی۔ کہ پشتون سلطان اور بادشاہ کی بجائے دہلی۔ دکن اور بنگال پر کوئی اور بھی بادشاہ یا حکمران ہو سکتا ہے۔ شاید اسی اہم تاریخی انقلاب نے انکے رومانی ادب کو بھی ایک ایسے معین دور سے وابستہ کیا جو بہت

سے اہم واقعات کے لحاظ سے ہر کسی کے فکر و خیال تک بآسانی آسکتا تھا۔ پشتونوں کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ وقت اور زمانے کا تعین وہ مشہور واقعات کے انداز ے سے کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ غزا کے سال یہ ہوا۔ اسی طرح وبا، قحط اور سیلاب وغیرہ کے سال بھی وقت اور زمانے کو متعین کرنے کے لیئے عموماً یاد کئے جاتے ہیں۔ بعینہٖ پشتو رومان کے بیشتر واقعات پشتو شعراء نے اکبر بادشاہ کے اُس دور سے وابستہ کردیئے ہیں، جب میرزا حکیم، ابوالفتح اور زین خان کوکا، کی مغلیہ فوج پشتونخوا پر چڑھ آئی تھی اور یہاں پر اُن کا صفایا کر دیا گیا تھا۔

"قدیم مقبول رومان"

پشتو ادب میں رومانی کرداروں کا مختصر سا تذکرہ موضع ادینہ کے صاحبزادہ غلام قادر صاحبزادہ نے اپنے ایک دلچسپ چاربیتہ میں کیا ہے۔ ان سبھی افسانوں میں پشتونوں کے ماحول کے اکثر کرداروں کی روداد اور واقعات کے پس منظر کا ناتہ اکبر بادشاہ کے دور سے جوڑا گیا ہے۔ چونکہ یہ چاربیتہ پشتو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے بلا کم و کاست اسے یہاں لانا ضروری ہے سہ

خنکہ بنے وے هغہ مینے پخوانئ ‎   خہ یہ وایم د آدم د ډرخانئ

چہ یہ مینہ ئے تمام عالم خبر وو

عاشقان سوزی پہ اور د مهر دیانو ‎   پتنگ سوزی پہ ملبوکنبے د چراغ

هم بلبل ثنا د گل واخئ یارانو ‎   ناکهانہ غنچہ واخلی تورے نہ زاغ

د مجنون دستر گو نون لکہ باران وو ‎   د لیلیٰ د بیلتانہ ئے پہ زړه داغ

پہ ارمان لہ دنیا لاړه شیرینئ ‎   پہ فرهاد پسے ئے غوخ د زړگی سر وو

چہ یہ مینہ ئے تمام عالم خبر وو

پہ ارمان لہ دنیا لاړ فرهاد فقیر ‎   مکر جنے بودئ اوکړو پرے پسات

قطب خان د دا نریزو شو هوا گیر ‎   دروستو کوړ ئے شو عالمو تہ میرات

ښایي وګنۍ به په سرتوري کاوو ویر   حُې لوګې ئې د یوسف مصري جلات
نو شا به شوله د عشقه لیونۍ   زړه ئې ورې د سلطان سکندر وو

چه په مینه ئې تمام عالم خبر وو

زلیخا به د یوسف کوُ وصفت   تهمتونه ئې په غاړه کړو امیل
د یانۍ کوچرې واوره حکایت   چه پرې مړه ئې شول دولس شطے خدخیل
شهزاده بهرام فقیر کړو خپل قسمت   په خهره د ګل اندامې چه شو بنګیل
راغې واړه د شاه جمالې د ځوانۍ   ورپسې سیف الملوک چه قلندر وو

چه په مینه ئې تمام عالم خبر وو

چه جمال د ملوک نه شوله خلاصه   بې دیاڼه شو جهان ورباندې تنګ
جانس او واوړه ئې نو پیدا د خپله لاسه   میرئې هم ورپسې مړه شوه صغه درنګ
نیمبس لا تیمبولا د واړه بې وسواسه   ملا او سولو په اور لکه پتنګ
د طوطا د یمنې مستې خاره وني   چه نن بیا په زیړو ګلو د سحر وو

چه په مینه ئې تمام عالم خبر وو

د طوطا د خاره و یمنې کوُ د تونډ   خلق ئې ستاني په مصر عو کښې هر طرف
د پو لیل د لیل خبره لکه قند   حقیقي عاشق یادیږي شاه شرف
فتح خان رابیا په مینه وو ځړ ګند   کړې وو ملغلره د صدف
د یکه یوسف قصه ده پخوانۍ   دوباره ورپسې واره د صنوبر وو

چه په مینه ئې تمام عالم خبر وو

صاحبزاده تول عاشقان ذکر کړل قطاً   شاه محمود ایاز دې پاتې شو په خنګ
ثنا وایه د غني پروره د کهار   چه هیڅ چرې په دنیا نه شي بدرنګ
ته هم نیسه د بغداد شاهي دلبار   په تنکسه کښې به رارسي ستا په ننګ

وار دِ تیں عمں دِ ھم دحیوانئ   خوارشے بسکہ لاس او چت کرہ لہ دلبرو

چہ پہ میندے تمام عالم خبر وو

"وہ پرانی محبّتیں کس قدر عمدہ تھیں ۔ میں آدم خان درخانئ کے بارے میں کیا کہوں جن کی محبت کا چرچا ساری دُنیا میں پھیلا تھا ۔ عشاق معشوقوں کی آگ میں جلتے ہیں اور پتنگ شمع کی لَو پر بھسم ہو جاتا ہے ۔ بلبل پھول کی تعریف میں مگن ہوتا ہے اور کوا اچانک اُس سے غنچہ چھین لیتا ہے ۔ مجنون بارش کی طرح خون کے آنسو بہا رہا تھا ۔ شیریں ارمان لئے اِس دنیا سے چل بسی اور فرہاد کے پیچھے اُس کا دل فگار تھا ۔ جن کی محبت سے سارا عالم واقف تھا ۔ فرہاد بیچارا اِس دُنیا سے نامراد چلا گیا ۔ مکار بڑھیا نے اُس پر بڑا ظلم کیا ۔ رانی زئ کے قطب خان کا دماغ چل گیا ۔ اور اُس کا گھر پسماندگان کو میراث کے مال کی طرح مل گیا ۔ نیازو گئ اب ننگے سر آہ و بکا کیا کرموت نے جلاوطن کرا لیا اور اُس کی آہوں کا دھواں دور تک گیا ۔ عشق کی وجہ سے نوشابہ دیوانی ہو گئی اور سلطان سکندر اُس کا دل چھین کرلے گیا ۔ اِس سے سارا عالم خبردار تھا ۔ زلیخا یوسف کی تعریف کیا کرتی تھی ۔ اور اُس نے تہمتوں کو گلے کا ہار بنالیا تھا ۔ پانئ گجری کی حکایت سنو جس کی وجہ سے دو سو چالیس فدوخیل قتل ہوئے ۔ شہزادہ بہرام کو اپنی تقدیر نے فقیر بنا دیا ۔ جب گل اندام کے خوبصورت چہرے نے اُس کی ناک میں نکیل ڈال دی ۔ اور اب شاہ جمالہ کی جوانی کی باری آئی جس نے سیف الملوک کے گلے میں کشکول گدائی ڈال دیا اور اِس سے سارا عالم آگاہ تھا ۔ جب جمالہ ملوک سے بچھڑ گئی، تو محبوب کے بغیر اُس کے لئے دُنیا تنگ ہو گئی جانس نے خویشدار کو اپنے ہاتھوں قتل کیا ۔ اور میرئ بھی اُس کے پیچھے فی الفور چل بسی ۔ نیمبولا تیمبولا دونوں کو ملّا نے بغیر سوچے سمجھے آگ میں پروانوں کی طرح جھونک دیا ۔ طوطا کے عشق میں مست مینا جو زرد پھولوں میں صبح کے وقت موجود تھی ۔ اس کی محبت سے ساری دنیا واقف تھی ۔ طوطا مینا کی محبت بڑی پُرلطف تھی اور ہر جگہ لوگ انہیں کے عشق کے نغمے گاتے تھے ۔ پولیل دلیل کی بات بمثل قند کے تھی ۔ اور شاہ شرف حقیقی عاشق یاد کیا جاتا ہے ۔ فتح خان رابیا عشق میں نمایاں تھے اور کرمے جیسے سیپ کا موتی ہو ۔ یکہ یوسف کی داستان بڑی پرانی ہے اور اُسکے بعد صنوبر کی باری تھی جس سے ساری دنیا آگاہ تھی ۔ صاحبزادہ تونے سبھی عشاق کے نام ایک ایک کر کے گنوائے اور محمود و ایاز کو نظر انداز کر دیا ۔ غنی پروردگار کی تعریف کیا کرو ۔ تاکہ تم دنیا میں کبھی خوار و زبول نہ ہو   تم بھی شاہ بغداد کے دربار کا سہارا لو، جو آڑے وقت میں تمھاری مدد کرے گا ۔ تمھاری باری

گذر گئی اور اب تم جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے ہو۔ خدا تمہیں راہِ راست پر لائے اب تو تم معشوق سے ذرا باز آجاؤ کیونکہ تمھاری محبت سے ساری دنیا آگاہ ہو چکی ہے"۔

اس چار بیتہ میں آدم درخانئی، مجنوں لیلیٰ، شیریں. فرہاد، قطب خان، نیازو، جلات محبوبا۔ نوشابہ سکندر یوسف زلیخا، پانئ گوجرہ۔ بہرام گل اندامہ۔ بدر جمالہ سیف الملوک۔ جانس میری۔ خورشید آدم، نیمبولا، تیمبولا۔ مُلا بادر، طوطا۔ خارو۔ پولیٰن دلیں۔ شاہ شرف۔ فتح خان رابیا۔ کرمے رکہ یوسف۔ محمود اور ایاز جیسے افسانوی کرداروں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان میں بعض کردار خالص پشتونوں کے علاقے اور پشتون روایات کی نمائندگی کرتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کئے گئے ہیں حسن و رعنائی اور شخصی صفات بھی موجود ہیں۔ جو مشرقی معاشرہ میں ایک صاف ستھری اور نامور شخصیت کے لئے لازمی سمجھی جاتی ہیں ان کے افسانے حوادث زیست سے جنم لئے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے عملی زندگی میں کام آتے ہیں۔ اور تجربہ اور تعلیم کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

زندہ اور فعال ادب

عہد قدیم سے پشتو ایک زندہ اور فعال زبان رہی ہے۔ اس کے الفاظ میں معنویت، محاوروں اور تراکیب میں حسن و رعنائی اور بیان میں زور اور شدت جذبات کی تندی اور تیزی ابتدا ہی سے موجود رہی ہے۔ اس لئے کہ اس زبان کا ماحول ہی کچھ ایسا ہے۔ بلند پہاڑوں کے پُرپیچ اور دشوار گذار نیکلی چوٹیوں کے ساتھ یہ زبان مانوس ہے اس میں برفانی تودوں دگلیشیر) اور آبشاروں کا زور، آندھیوں اور بگولوں کی سیمابیت، صحراؤں کی تپش و وسعت اور شفاف برفیلے پہاڑوں کی سلوں کی ٹھنڈک بھی کچھ موجود ہے۔ اور یہ سب کچھ مدت مدید سے پشتونوں کی زندگی اور اس زبان کی فعالیت اور رعنائی کا ضامن رہا ہے۔ اس خطے میں اسلامی دور کے عظیم فاتح، سلطان محمود غزنوی کا دربار فارسی گو شعراء کے لئے گویا جنت ارضی کے مثیل تھا۔ یہ غازی سلطان جسے ہند پر حملوں اور جہاد کیوجہ سے اکثر پشتون اب تک اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ خود بھی محمود و ایاز کے افسانے کا مرکزی کردار ہے۔

اگرچہ اس کا دارالسلطنت غزنی تھا جو پشتونخوا کے قلب میں آباد تھا ۔ مگر اس کے دربار میں حسن میمندی کی قوم اور زبان کے کسی شاعر اور ادیب کو رسائی حاصل نہ تھی ۔ یہ وہ دور تھا جب فردوسی کی شہرۂ آفاق کتاب شاہنامہ اور عنصری اور عسجدی کے قصائد غزنی میں لکھے جا رہے تھے ۔ اور اُس دربار میں پذیرائی پا رہے تھے لیکن پشتوگویا وقت کے ناساعد حالات کی وجہ سے غور کے پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور تھی ۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ اُسی وقت سے پشتو زبان اور اُس کا شعر و ادب ہر دور میں پشتونخوا کے عام افراد کی برکت سے چلا پا رہا تھا ۔

شاہنامے کو فارسی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔ یہ ایرانی شاہنشاہیت کی ہزار سالہ تاریخ داساطیر کی روداد ہے ۔ لیکن یہ روداد ایسی سرزمین پر لکھی گئی ہے جہاں کے عام لوگ اُس وقت بھی پشتون تھے اور پشتو ان کی مادری زبان تھی ۔ اور آج بھی پشتون ہیں اور پشتو بولتے ہیں اگر اُس دور میں اس زبان کو بھی اُس اسلامی مملکت کی سرپرستی حاصل ہوتی تو غالباً اُس وقت کے تقاضوں کے مطابق اس زبان میں بھی ایک آدھ ادبی شاہکار تخلیق ہو چکا ہوتا اور کم از کم اُس وقت کی اُن تاریخی لڑائیوں اور اسلامی جنگوں کے واقعات اس زبان میں قلمبند کئے جاتے جن میں عموماً پشتون غازی ہراول دستے کے طور پر حرکت کرتے نظر آتے ہیں ۔ اور آج جس طرح ایرانی اُس شاہنامے پر فخر کرتے ہیں جو غزنوی دربار کا تحفہ ہے ۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی خدمات اور کارناموں کا صلہ پاتے ، اور اب وہ بھی جے پال کے گھرانے کے ساتھ اپنی لڑائیوں اور جنگوں سے لے کر سومنات کی فتح تک کی ساری روداد ایک دوسرے شاہنامے کے موضوعات کے روپ میں اپنے پاس رکھتے ۔ اگر اس دور کی پشتو نظم کا معیار یہی ہو جو امیر کروڑ پہلوان کی زبان اور کلام کا ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ اُس دور کی پشتو میں اعلیٰ معیار کے شعر و ادب کی تخلیق کی گنجائش موجود تھی ۔ تو جو زبان ویدی دور سے شعر و ادب کے ساتھ مانوس تھی اور غاڑے ، ٹپے ، ترانے کے علاوہ اُس میں غنائیہ شاعری کا رواج بھی عام تھا ۔ وہ زبان بے شک اس قابل تھی کہ عصری واقعات کی رودادیں اس میں قلمبند کر دی جاتیں ۔ لیکن چونکہ اُس وقت کے شاہی دربار میں اِس کی پذیرائی ممکن نہ تھی ۔ لہٰذا پشتونوں نے محض لوک گیتوں میں اپنی ملی روایات اور کارناموں کو جگہ دی ۔ اور چونکہ یہ ضبط تحریر میں نہیں آئے تھے اور صرف حافظے تک محدود رہے اس لئے جب تک یہ حافظوں میں محفوظ رہتے تب تک اُن لوگوں کے دلوں میں گرمی اور روحوں میں طلب کی آرزو تھی

زندہ رکھتے۔ اُس زمانے میں پشتو میں عربوں کے رجز و حماسے کیطرح نظمیں پڑھنے کا رواج موجود تھا۔ اور کچھ عرصہ بعد اس میں غوریوں کے دوُر کے شکارندوئیؒ شاعر کے انقلاب آفرین قصیدے لکھے گئے۔ لیکن یہ بھی جیسے پشتونوں کے اس قبی شاعر نے فقط اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور اپنی آرزوں کی تکمیل کی خواہش ظاہر کرنے کے لئے کہے ہوں۔ ان اشعار کا مزہ ان میں زورِ کلام اور رنگینی بیان مثلاً اُس معیار کی تھی جو معیار دربارِ غزنوی کے قصیدہ گو فارسی شعراء نے قائم کیا تھا۔ ان قصائد کے چند نمونے مورخ محمد ہوتک کی وساطت سے "لرغونی پشتانہ" نامی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں ان کا اصل ماخذ تاریخ سوری ہے جس سے "لرغونی پشتانہ" نامی کتاب کے مؤلف نے استفادہ کیا ہے۔ شکارندوئیؒ کے بارے میں پٹہ خزانہ کے مولف نے تاریخ سوری کے حوالے سے "لرغونی پشتانہ" نامی کتاب سے جو صراحت نقل کی ہے۔ وہ حبیبی کی تاریخ ادبیات میں یوں پیش کی گئی ہے۔" شکارندوئے اپنے عصر کا عالم اور شاعر پشتون تھا۔ سلطان شہاب الدین محمد شام شنسبانی کے حضور میں اُن کی بڑی قدر و منزلت اور اعتبار خاص تھا۔ بادشاہ اور غیاث الدین غوری کی ستائش میں بھی بہت سے قصیدے کہے ہیں وہ سلاطین غور کا درباری پشتون شاعر تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شکارندوئیؒ ہمیشہ سلاطین کو پشتو قصائد میں سراہتا رہتا۔ تاریخ سوری کا مؤلف محمد بن علی لکھتا ہے۔ کہ میں نے بست میں شکارندوئے کے کہے گئے اشعار اور کلام کی ضخیم کتاب دیکھی ہے۔

حبیبی کے خیال میں پشتو کا یہ قدیم قصیدہ گو شاعر سلاطین غور کے ساتھ ہمیشہ اسلامی جنگوں اور لڑائیوں میں ساتھ رہا۔ وہ ایک صاحب دیوان شاعر تھا تاریخ سوری کے مصنف نے اس شاعر کے دیوان سے ایک پشتو قصیدہ نقل کیا ہے جو شیخ کتہ کی پُراتی تاریخ کے توسط سے محمد ہوتک کے "پٹہ خزانہ" تک پہنچا ہے اس شاعر نے یہ قصیدہ سلطان محمد سام کی تعریف میں کہا ہے اور لشکر شاہی کے اٹک عبور کرنے کا خصوصی منظر بھی دکھایا گیا ہے۔ اس قصیدے میں تشبیب گریز کے فنی خواص موجود ہیں۔ شکارندوئیؒ شاعر کا قصیدہ یہ ہے۔

د سپرلی بنکلونکی بیا کړه سنګار ونه ... بیائے اولونل په غرونو کښې لالونه

ذ مکه شنه لابنونه شنه ځنی شنی شوی ... ځیلسان زمردی داغوستې غرونه

لہ تاریخ ادبیات پشتو ص ۱۳۰   تہ تاریخ ادبیات ادبیات پشتو ص ۱۳۰

دېښان مشاطے لاس د پچېدو دے
مرغلرو بانسے و ښکلو ښځو ته

لګ نا دے چه سور تېک په تندی وکا
چے وکانړل غښتو لو سره پښسولونه

مرغلرے چه اوده و نخونیو لیه
په ځلاسے شو را نړه چار د ښتونه

په زابل چه د بدئ په نیلی سپوږ شی
په لاهورے د میړانے کسذارونه

نه ئے ټوک مخ ته دری د میر خمنو
نسے تورے ته ټینګیږی کلک والونه

د اسلام د دین شهاب د نړئ ملر دے
تورستانے کوونړا په جهادونه

هر پله چه دے په هند و سند یرغل کا
د نړوی تورې نړئ په شهابونه

په سپرلی چه ئے تیرون په اټک وکا
غاړه غاړه ئے ترسولله زړونه

نه به ټوک زلمی د غور سره راغونډ کا
دا دا ورتورے به چیرے کا ځلونه

یو نهاوند شهاب الدین دے چه ئے وکا
په هر لوری هر ایوا د تریرغلونه

په جوپو جوپو جګړن ئے هندتیون کا
چه د غوربادار رحمت وکا زغلونه

نن په سند بانسے تیریږی یرغل کاندی
په پرتمے ئے زمری ریږدی په ځنګلونه

څپان سیندے ئے هم له داره ایلا ئی کا
په اوږو وری د غوریانو بشه یړونه

په هر کال اټک دده ئے بنه راغلے کاندی
غوړوی په خنده خپل پاستے شالونه

پښتو خوا ښکلی زلمی چه زغلی هندته
نو اغلیه پیغلے کاندی اتنړونه

زرغونے خټے اغوستی وی دے غرونو
بته بید یا هم پسوللی وی ځانونه

هر کیځ چه مرغوکیږی له خاتیزه
خوچه یون کا د لوبیدیزه په خندو

که بزګر وی که غرمه وی که برمل وی
که لرمل که مرلوبیده که ترملونه

د شهاب جګړن به نه کښینی له زغلو
نه به پریږدی دا زلمی خپل بهیرونه

زمری کله کاږی ځان له یرغل ګریو
څوئے نه کا مات متمونه ورمیږونه

یا به جګ کا د بریو بیرغ په هند کښے
یا به پریږدی هم پردے چاړه سرونه

یا بہ وران کا بت تو نو نہ د بامیزو | یا بہ سرۂ کا ندے پہ وینو ایوا دونہ
پہ دنڑا اوسے تہ ُتل دِ دین شہابہ | نوم دِ تل وہ بر دریخ پہ نمزد کونہ
ثو رانڑہ ُشی ستا پہ تورۂ دھند لو ریہ | ثو چہ نست کری لا نڑیہ بُت تو نو تہ

ستا پہ زیرمہ دِ خاوندہٗ لوے ُخبنتن وی
موبز خو ستا پہ مرستہ یو نہ ثو چہ یو نہ

"حسینان بہار پھر سنگار کر رہے ہیں اور انہوں نے پھر دشت و دمن میں موتی بکھیر دیئے ہیں۔ زمین، شاخیں اور دامن کوہ سرسبز ہو گئے ہیں اور پہاڑوں نے زمردی قبائیں زیب تن کی ہیں۔ مشاطۂ نیسان کے ہاتھ چومنے کے قابل ہیں جس نے نخلستان کو موتیوں سے سجا دیا، جیسے کہ دلہن اپنے ماتھے پر سرخ ٹیکہ لگائے۔ اسی طرح غانٹیں کے پھولوں نے سرخ رنگ کے زیور پہن رکھے ہیں۔ بادلوں نے جب چمکدار موتی نچھاور کئے تو اُن کی چمک سے ہموار دشت منور ہو گئے۔ ابر جود و سخا نے سارا ملک سرسبز کر دیا ہے۔ اور خضدار سے لے کر دیبل تک یورش بہار ہے۔ جب وہ زابل میں جنگ کے ارادہ سے گھوڑے پر سوار ہو جائے تو لاہور تک بہادری اور دلیری کے وار کرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی دشمن اُس کے مقابلے میں تنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور نہ دشمن کی فولادی ڈھالیں اُس کی تلوار کی تاب لا سکتی ہیں۔ وہ دین اسلام کے لئے بمثل شہاب اور اپنے ملک کے لئے اُس کی ذات سورج کی طرح ہے۔ اُس نے جہاد سے تیرہ و تار ہند کو منور کر دیا ہے وہ ہند اور سندھ پر جس طرف بھی حملہ آور ہوتا ہے تو اپنی تلوار کے شہاب ثاقب سے اِس تیرہ و تار ملک کو روشن کر دیتا ہے۔ جب موسم بہار میں وہ دریائے اٹک پار کرتا ہے تو دریا کے کنارے آباد لوگ اُسے دیکھ کر ہراساں ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ تو کوئی جنگجو سندھ کا رُخ کر سکے گا اور نہ کوئی ہند کے شہروں پر قابض ہو سکے گا۔ نہ تو کوئی غور کے جوانوں کو اکٹھا کر سکے گا۔ اور نہ زمیندار کی تلوار کبھی دوبارہ چمکیگی صرف ایک آقا شہاب الدین ہی ہے جس نے ہر سمت اور ہر ملک پر حملہ کیا۔ اُس کے جنگجو گروہ در گروہ ہند کی طرف جا رہے ہیں تاکہ غور کا سردار عزم و ہمت کے ساتھ اُس پر حملہ آور ہو سکے۔ آج پھر وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے حملہ آور ہو رہا ہے جس کے رعب اور دبدبہ سے جنگل میں شیر بھی کانپ رہے ہیں۔ دریا بذات خود بھی اُس کے خوف کی وجہ سے اطاعت گذار نظر آتا ہے۔ اور مجاہد غوریوں کی کشتیاں اپنے اوپر لاد کر بہہ رہا ہے۔ دریائے اٹک ہر

سال بھر سے خوش آمدید کہتے ہوئے کناروں پر اپنی نرم شال بچھادیتا ہے۔ پشتونخوا کے بانکے جوان جب ہند کی طرف بجلی کی سرعت سے جاتے ہیں تو خوبصورت دوشیزائیں رقص کرتی ہیں۔ پہاڑ سبز لباس میں ملبوس ہوتے ہیں اور دشت ودمن بھی بناؤ سنگار کی خاطر زمرد کا زیور پہنے ہوئے ہیں۔ ہر صبح جب مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے اور جب تک وہ مغربی اُفق میں جاکر غروب نہیں ہوتا۔ پو پھٹنے کا وقت ہو، دوپہر ہو یا دیگر وقت غروب یا وقت شام ہو شہاب الدین کے جنگجو تگ و تاز سے باز نہیں آتے اور نہ ہی یہ بہادر اپنی صفوں کو چھوڑتے ہیں۔ شیر بھلا کب دشمن کے مقابلے سے باز آتے ہیں جب تک کہ وہ اُن کے بازو اور گردن توڑ کر نہ رکھدیں۔ یا تو وہ عَلم فتح کو بلند کرینگے۔ یا پھر اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اپنے سروں کو قربان کردیں گے۔ یا تو کافروں کے بتوں کو توڑ کر رکھدیں گے۔ اور یا پھر دنیا کو اپنے خون سے لالہ زار بنادیں گے۔ اے دین کے شہاب! اللہ تمھیں ہمیشہ منور رکھے۔ اور خطیب مساجد کے ممبروں پر اور گویئے بزم آرائی کی محفلوں میں سدا تمھارا نام لیتے رہیں۔ جب تک تم سرزمین ہند سے بتوں کا قلع قمع نہیں کروگے تو یہ سرزمین منور نہیں ہوگی۔ اے سردار اللہ پاک تمھارا حامی و ناصر ہو۔ جب تک ہماری جان ہے ہم تمھارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

شہاب الدین محمد غوری کے دور میں پشتو شعراء کا بھی انداز ادبی معیار رہا ہے۔ اس قصیدے میں شعر کی رعنائی اور بیان اور شاعرانہ محاسن کو جس طرح جگہ دی گئی ہے ان کی وجہ سے یہ ہمارے مذکورہ دعویٰ کا ثبوت ہے۔ کہ پشتو زبان آج سے ہزار سال پہلے بھی لغات اور زور بیان کے لحاظ سے اُس وقت کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش رہی ہے اور اس نے اپنے شاعر اور قاری کو تہی دامنی اور کم مائیگی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا فرق صرف یہ تھا کہ اسے دربار سلاطین و اُمراء میں رسائی حاصل نہ تھی۔ اور اس کے شاعر و ادیب پر حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے راستے مسدود رہے۔ اگر دوسری زبان کے شاعر کا مطمح اُن زمانے میں سینکڑوں اونٹوں پر لدا ہوا جاتا تو اس زبان کے غازی اور مجاہد کے بھُنتے ہوئے گوشت کی کڑاہی کو ایک نحیف و نزار کتا بھی جب چاہتا لے کر بھاگ سکتا تھا۔ اس میں غزنوی۔ غوری۔ غلامان۔ خلجی لودھی سُوری۔ مغل۔ درانی۔ بارکزئی۔ سکھوں یا انگریزوں کے دور کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اپنوں بیگانوں سبھی نے اس زبان کے ساتھ یکساں سلوک کیا ہے۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے۔"

"ګله د خپل سه کېږي
نۀ کړي غوک پردو نه ګيله"

" گلہ تو اپنوں سے کیا جاتا ہے غیروں سے نہیں" تو پشتو بھی فقط اُن سے اپنی تمام ادبی تاریخ کے ادوار کے لیے گلہ کا حق رکھتی ہے۔ جو پشتون بھی تھے اور تاجدار بھی۔

عقائد و تعلیمات اسلامی کی رو سے جب پشتون کے افکار کو جلا ملی اور انکے تصورات ایک تجدید پسند دین کی تعلیمات کے ساتھ آشنا ہوگئے تو مادری زبان کی حیثیت سے پشتو ہی ان تعلیمات کو عوام میں پھیلانے کا ذریعہ بنی۔ حمد و ثنا اور عبادات و فقہی مسائل کی تشریح اور ترویج کافی عرصے تک پشتو کے شعر و سخن کا محور رہی۔ اس میں شیخ بیٹن نیکہ کی دعائیں ایک صاف ستھرے دل کی آرزوؤں کی شکل میں کسئی نامی پہاڑ کے دامن میں پھیل گئیں۔ یہ چوتھی صدی ہجری کے پشتون بزرگ تھے۔

" شیخ بیٹن "

تاریخ اور نسب ناموں کے علاوہ پشتو ادب میں بھی اس نام کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اور مورخین اور نسب نامے لکھنے والوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ بیٹنؔ۔ غور غوشت اور سڑبن کا ذکر پشتو کے ہر شجرہ میں آیا ہے۔ حبیبی نے آئین اکبری کے حوالے سے ابوالفضل کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ پشتونوں میں تین بھائی بیٹن۔ غور غوشت اور سڑبن بڑے مشہور اجداد شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں شیخ بیٹن جیسا کہ کہا گیا ہے پشتون نسب ناموں میں بڑے پڑدادا کی حیثیت اور مقام رکھنے کے علاوہ ادبیات پشتو میں بھی ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔

پشتو ادب میں انکی مناجات پشتو کی قدیمی شاعری کا ایک اور عمدہ نمونہ ہے۔ شیخ بیٹن کی مناجات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُس دُعا کا ایک عکس دکھائی دیتا ہے جو انہوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت مانگی تھی۔ اس مناجات میں نہ صرف یہ کہ شیخ بیٹن نے اللہ تعالیٰ کی حمد و تمجید ایک عمدہ طرز سے کی ہے، بلکہ ذات پاک کی الوہیت، عظمت و جبروت کو سراہنے کے بعد جو دُعا کی ہے اُس میں اپنی قوم اور اپنے لوگوں کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کی بھی التجا کی ہے۔ اور اپنی محبت اور بندگی کا اظہار نہایت انکساری سے کیا ہے۔ اُنکی دُعا پوری پشتون نسل کے لیے تھی جس نے اُس زمانے کے بعد بیٹنؔ، غورغشتؔ اور سڑبنؔ کے قبیلوی نام سے شہرت پائی ہے۔ تمام افغانی نسل، نسب ناموں کی رو سے اس وقت تک اِن تین نسبوں سے خارج نہیں۔ جیسا کہ خان علیین مکان خوشحال خان خٹک فرماتے ہیں۔

پښتون په اصل سړبنړ دے   یا غوړ غشتے دے یا بیټنے دے
لودی غلجے دے د بیټنی نه لوړه   په سړبن پورے بیا کرلاڼړے دے

پشتون اصل میں سڑبنے غور غشتی یا بیٹنے ہے۔ لودھی اور غلجی بیٹن کی اولاد میں آتے ہیں۔ اور کرلانڑی سڑبن سے منسلک ہیں"

سبھی پشتون شیخ بیٹن کی دعا میں شامل تھے۔ انہی لوگوں نے اپنے اس پڑدادا کی دعا کے طفیل تاریخ کے ہر دور میں اسلام کی خدمت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین پاک کی سربلندی کے لئے اپنے سروں کو داؤ پر لگا کر شیخ بیٹن کی دعا کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے ؎

لویہ خدایہ لویہ خدایہ   ستاپہ مینہ پہ هرځایہ
غر ولاړ دے درناوی کښے   تهوله ژدی پرځاری کښے
د لته دی د غرو لمنے   زمونږ کیږدئ پکښے پلنے
داوکړے ډیر کړے خدایہ   لویہ خدایہ لویہ خدایہ
دلته لږ زمونږ اوربل دے   وړه کوړکے دے وړه بورجل دے
مینه ستا کښے مونږ میشته یو   د بل چا په ملاتړ نه یو
هسک او مزک نغښته ستا ده   د مړو وده له تا ده
دا پالنه ستا ده خدایہ   لویہ خدایہ لویہ خدایہ

اے برتر اور عظیم پروردگار! پہاڑ تیری محبت میں ہر جگہ احتراماً کھڑے ہیں اور ہر ذی روح بصد عجز و انکسار دست بستہ ہے۔ یہاں پہاڑوں کے دامن میں جہاں ہمارے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ اے بڑے پروردگار! اس برادری کو زیادہ کر دے۔ چھوٹے سے گھر اور آنگن میں الاؤ روشن ہے۔ تیری محبت سے سرشار ہم یہاں مقیم ہیں۔ ہم کسی غیر کے طرفدار نہیں۔ زمین و آسمان سبھی کچھ تیرا ہے۔ مردوں کی طاقت کا انحصار تجھ پر ہے بیشک تو ہی پروردگار ہے۔ اے میرے عظیم اور بڑے خدا!

تاریخ کے سبھی ابواب اس بات کے گواہ ہیں کہ پشتونوں کے حق میں شیخ بیٹن کی یہی دعا اور مناجات اللہ تعالیٰ کے دربار

میں مستجاب ہوئی اور اس دعا نے اس کے ملی شعور میں وفا اور یقین کا جذبہ پختہ کر دیا ہے۔ خلاصۃ الانساب کے مؤلف نواب حافظ رحمت خان روہیلہ شہید کے قول کے مطابق "ولایت روہ کے پشتون اب تک اس علاقے کے کفار کے ساتھ برسر پیکار ہیں۔ ان کا یہ جہاد یا جنگیں محض اللہ کے لئے ہیں۔ چنانچہ لمغان، پنج شیر اور کندیا کے دروں کابل، جلال آباد کے آس پاس اور پنجکوڑہ، چملہ، بنیر کوہستان اور دمتوڑ، بکلئی وغیرہ اور پشاور لنگرکوٹ کے مضافات کے تمام کافران انکے ہاتھوں یا تو مسلمان ہوئے ہیں یا پھر قتل کئے جا چکے ہیں۔ اور اس وقت بھی پشتون سردار اور ولایت کے عام لوگ آپس میں ایک شخص کو جو نیک اور صالح ہو یا کسی سید یا عالم خاندان کا ہو، اپنا امام یا پیشوا بناتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہ کچھ توشہ اپنے ساتھ لے لیتا ہے اور کم و بیش بیس بیس دنوں کے سفر پہ کافروں کے پیچھے جنگوں اور لڑائیوں کے لئے جاتے ہیں اور ان کے اہل و عیال کو قید کرتے ہیں اور اپنے آپ کو شہید یا غازی بناتے ہیں۔ بغیر اس کے اور کوئی لالچ یا طمع ان کے سامنے نہیں ہوتی وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری میں کافروں سے جنگ کے لئے جاتے ہیں۔"[۱]

یہی وہ جذبہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی طرح دعا بن کر شیخ بیٹن کے دل سے اپنی آل اور اپنی نسل کے حق میں کسّی نامی پہاڑ کے دامن میں مذکورہ مناجات کی صورت میں نکلی تھی۔ جس سے وہ نتائج مرتب ہوئے ہیں جن سے ہند اور خراسان میں اسلامی تاریخ کے ابواب آئے پڑے ہیں اور ہند میں روہیلہ پشتونوں کے نامور سردار نے اپنے مخصوص اور مجاہدانہ انداز میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

پشتون عوام کا یہ جذبہ تیسویں اور بیسویں صدی میں بھی ویسے ہی تھا۔ جدال و قتال اور جنگوں اور معرکوں کی یہ روداد بڑی طویل ہے۔ اس میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی لڑائیاں۔ روہیلہ پشتونوں اور کفار کی کشمکش، سکھوں کی چیرہ دستیاں اور دست درازیاں اور انکے خلاف پشتونوں کی جدوجہد، سید احمد شہید بریلوی کی تحریک اور اس کے بعد فرنگی استعمار کے خلاف پشتونخوا کی ہر ڈگر اور ہر مورچے پر پشتون سرفروشوں کی قربانیاں وہ رنگین

---

[۱] خلاصۃ الانساب

داستان ہے جو شیخ بیٹن کی مناجات کے اِس بند کی تفسیر اور ترجمانی کرتی ہے ؎

دلته لږ زمونږ اور بل دے — وړوکوټے کے دے وړ بوجلا دے

مینه ستا کښے مونږ میشته یُو — بل د چا په ملهٔ تلهٔ منهٔ یُو

ځمکه او مزکه نغښته ستاده — د مړو وده له تا ده

دا پالنه ستاده خدایه

لویه خدایه لویه خدایه

"یہاں ہماری تھوڑی سی آگ روشن ہے۔ چھوٹا سا کنبہ اور چھوٹا سا آنگن ہے ہم تیری محبت سے سرشار ہیں اور کسی اور کے طرفدار نہیں ہیں ارض و سماء سب کے سب تیرے ہیں جوانمردوں کی طاقت کا انحصار تجھ پر ہے، بیشک تو ہی پروردگار ہے اے میرے عظیم اور برتر خدایا۔"

پشتو میں اسلام کی ابتدائی تعلیم

پشتون کی زندگی کے اِس شاندار پہلو کی برکت سے پشتو ادبیات نے وہ روایات پائی ہیں جو جدت حدید سے ملی استقلال، حمیت، بہادری، ننگ، غیرت اور حریت کی صفات کی ترجمانی کرتی رہی ہیں۔ اس کی رو سے پشتو کے عوامی اور کتابی دونوں قسم کے ادب میں زندگی اور حرکت کے آثار بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کے ملی افتخار اور سربلندی کی ساری داستان اسی بنیاد پر استوار ہے اور اس نے پشتو ادبیات میں اس قدر فروغ اور نشوونما پائی ہے۔ کہ اس نے ادب کی لطافت اور رنگینی کے اثر کو بھی دھندلا کر دیا ہے۔

پشتونخوا میں پشتو اُس زمانے میں اِسلام کی ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنی تھی۔ خطیب اور مُلّا اِس زمانے میں اسی میں وعظ اور خطبہ دیا کرتے تھے۔ پنج بنا کی تعلیم اور نیت اور دعا وغیرہ نے اس میں رواج پایا تھا اور اسی میں امر و نہی کی تاکید کی جاتی ۔ یوں اس زبان کا عربی اور فارسی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اور اپنی ملی روایات کے مطابق ان ہر دو کو زبانوں کو اس قدر اپنے قریب کر دیا، کہ "من تو شدم تو من شدی" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

لیکن پشتو ادبیات کی منزل سنسکرت کی طرح صرف اشلوک اور مناجات نہ تھی۔ یہ ایک زندہ اور فعال قوم کی زبان تھی جو گھر کی مالکن تھی۔ اور گھر کی محبت اور وفا اس کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی یہ لوگ آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کی اس طویل و عریض سرزمین پر زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور اپنی نسل کے اضافے اور پھیلنے کے آرزو مند تھے۔ اس لئے کہ اس زبان کے بولنے والے ایک ایسے دین پر ایمان لائے تھے جو امن و آشتی کا علمبردار تھا اور شر پسندوں اور مفسدوں کی بیخ کنی کرتا تھا۔

عربی، فارسی کے لئے پشتو کی قربانی"

جیسا کہ کہا گیا اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہی پشتونوں کی عربی اور عجمی زبانوں کے ساتھ بے اندازہ محبت پیدا ہو گئی۔ اور جب پشتو نے اپنے بوریا بستر پر انہیں جگہ دی تو اسے اپنے گرانقدر مہمانوں کی نازبرداریاں کھا گئیں اس لئے کہ یہ اپنی روایات سے مجبور تھی اس کے اخلاص کا معیار یہ تھا کہ ؎

د جانان غم په ما میلمه شـو
د چرگ په ځـلـځ به ورته ځان حلالومه

"د غم جاناں میرا مہمان ہو گیا ہے اس لئے بجائے مرغ ذبح کرنے کے میں اپنے آپ کو ذبح کر کے پیش کروں گی۔"

اگر یہ بات نہ ہوتی تو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے وہ بھی علم و ادب کے بیشمار میدانوں میں جولانی کرتی تھی لیکن مہمان نوازی کی قدیم روایات، اخلاص و محبت کے جذبے اور مزید برآں اپنے ماحول اور جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے دوسرے علوم کو اخذ کرنے اور انہیں ترویج دینے کے لئے پشتو کی فضا سازگار ثابت نہ ہوئی۔ اسے نہ تو کسی کی سرپرستی حاصل ہو سکی اور نہ کسی نے ایسا کرنے کو غیرت و حمیت جانا۔ پشتو کی راہ میں اس کی اپنی حیا ایسی مانع ہوئی کہ یہ دُرخو مدت مدید تک پردے سے بالکل باہر نہ نکلی۔ غزنوی اور غوری حکومتوں کے بعد کہ وہ بھی فارسی زبان کے ارتقاء نشوونما اور سرپرستی کا باعث تھیں۔ پشتونخوا کی نظریں ہمیشہ دہلی پر لگی رہیں۔ پشتونوں کی سرزمین ہمیشہ مرکز سے دور اور بیگانہ تھی۔ بغداد نیشاپور اور اصفہان کے علمی مراکز کی طرف ابو محمد ہاشم جیسا ایک آدھ ہی

رُخ کیا کرتا، ہرات۔ مرو۔ بخارا۔ سمرقند اور ماوراءالنہر کے دوسرے علمی اور دینی مراکز میں انکے لئے مقابلتاً زیادہ کشش تھی جیسے بھی بن پڑتا یہ لوگ ان مقامات تک پہنچتے لیکن وقت اور زمانے کا اثر انہیں بجائے اپنی زبان کے عربی فارسی اور ترکی زبانوں میں علمی تخلیقات پر مجبور کرتا۔ بعینہٖ اس طرح جیسے آج کل انگریزی، جرمن یا فرانسیسی وغیرہ زبانوں کو فوقیت حاصل ہے۔

یہ تقاضائے وقت اور دستور زمانہ تھا اس لئے کہ تینوں علم اور سیاست اِن زبانوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں یہ مرکزی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی تجارتی اور کاروباری زبانیں تھیں اور انہی زبانوں کے علماء اور دانشور متقتدر اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ دراصل یہ سرِ شکم حکام کی زبانیں تھیں ایک عرصے سے پشتون پر یہ راز ہویدا تھا وہ جانتا تھا کہ سرِ شکم ہی فارسی بولا کرتا ہے۔ اور جیسا کہ کلام الملوک ملک الکلام کا کلیہ تھا۔ حکام اور سرداروں کی زبانوں کا غلبہ رعایا کی زبان پر ایک لازمی امر تھا آج جس طرح علوم و فنون کی دنیا پر مغربی زبانوں کا راج ہے اور یہی فضیلت کی رو سے باقی دُنیا اُن کی محتاج ہے اسی طرح اُس زمانے میں بھی حال اور یہی کیفیت فارسی اور عربی زبانوں کی بھی رہی تفسیر حدیث، فقہ، فلسفہ، شعر و ادب، منطق ریاضی طب، کیمیا، تاریخ، نجوم حکمت، سیاست اور سیرت، غرضیکہ اُس وقت کے تمام یونانی اور اسلامی علوم انہی زبانوں میں سیکھے اور سکھائے جاتے تھے اسی طرح یہ سلسلہ جاری و ساری تھا۔

پشتون مفکر، ادیب اور اہل قلم اگر اپنے علم کے دریا سے پشتو کو کچھ دینا بھی چاہتا تو وہ صبح کے قطرۂ شبنم سے کچھ زیادہ نہ ہوتا پہلو بدلنے کے باوجود بھی یہ عمل یوں ہی جاری رہا۔ فارسی عربی کے سمند تیز گام کے ساتھ پشتو زبان کا یہ اشہب سست رفتار ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ریس اور ہمسری نہ تو روشانیوں کا انقلابی دور کر سکا اور نہ ہی خوشحال خان خٹک کی تنبیہہ و سرزنش اور لعن طعن نے ناموس پشتو کے لئے کسی کو ابھارا۔

"ایک عالی ظرف پشتون مفکر جو پشتو سے یکسر بیگانہ تھا"

پشتو زبان کے لئے دفتر علوم گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں اسلامی اتحاد کے علمبردار اور عظیم مفکر سید جمال الدین افغانی علاقہ کونڑ کے سیدوں میں پیدا ہوئے یہ ایک ایسی پشتون سرزمین کے باسی تھے۔ جہاں سوائے پشتو کے کوئی دوسری زبان نہیں بولی جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی انہوں نے تمام افکار اور خیالات فقط عربی یا بعض دوسری مغربی زبانوں میں دنیا کے سامنے پیش کئے۔ یہاں تک کہ پشتونوں کی تاریخ اور عوامی زندگی کے بارے میں اپنی معلومات اور نظریات بھی عربی زبان میں تالیف کئے۔ مختصر یہ کہ اگر یہ عظیم مفکر اپنے

نام کے ساتھ افغانی کی نسبت نہ لگاتے تو کسی کو یہ خیال بھی نہ آتا کہ جمال الدین افغانی نے سرزمین پشتونخوا میں جنم لیا تھا۔

یہ درست ہے کہ اسلام کے اِس عظیم مفکر کا پیغام تمام مسلمانوں کے لئے تھا۔ اُس کے افکار زبان کی تفریق اور عرب و عجم کی تخصیص سے بالاتر تھے۔ اور اسی لئے اُن کی سیاسی زندگی اور سرگرمیوں کا محور بھی ایک جگہ پر نہ تھا۔ اُس کے لئے طہران، استنبول قاہرہ لندن اور پیرس ایک تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ اگر اپنا پیغام ایک محدود جغرافیائی ماحول کی بجائے عریض و بسیطِ اسلامی دنیا کے لئے خصوصاً عربی زبان میں نشر کرتے رہے، تو یہ بیشک بجا تھا۔ اور یہ دراصل اُس حق کو پورا کرنا تھا۔ جسے پشتونوں کا طرۂ امتیاز گردانا جاتا ہے۔ جس کی طرف دو پہلا سردار حافظ رحمت خان نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اور جس کے لئے شیخ بیٹن نے اپنی مناجات میں اپنی قوم کے لئے پروردگار عالم سے عہد کیا تھا کہ ؎

میںہ ستا کښے موږ میشته یو

د بل چا په مله تله نه یو

"تیری ہی محبت سے ہماری وابستگی ہے اور ہم کسی اور کے اطاعت گذار نہیں ہیں"۔ پھر بھی پشتو زبان کا یہ گلہ زمانے کی اُس روش سے بیجا نہ ہوگا کہ ایسے عظیم مفکر کی اپنی تحریر کردہ چند سطور بھی اس کے حصے میں نہ آئیں۔ اور اگر بیسویں صدی عیسوی کے دو پشتون ادیب محترم فضل حق شیدا اور قاضی عبدالحلیم اثر افغانی انیسویں صدی کی دنیائے اسلام کے اِس بڑے محسن کے حالاتِ زندگی اور اُن کے افکار پشتو دنیا کے سامنے پیش نہ کرتے تو شاید یہ بھی پشتو پڑھنے والے عوام کے دائرہ مطالعہ سے ہمیشہ کے لئے باہر رہتے۔ اور بہت کم پشتونوں کو یہ معلوم ہوتا کہ ایک ایسے عظیم انسان نے بھی اُس قحط الرجال کے زمانے میں سرزمین پشتونخوا میں جنم لیا تھا۔

"سرزمین روہ اور قدما کی شاعری"

قدیم پشتو ادب کے سرسری جائزے سے یہ بات واضح ہوتی کہ ہمارے ادب کا سب سے پہلا نمونہ شعری صورت میں موجود ہے جس کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے۔ اور یہ امیر کروڑ سوری کی حماسی نظم ہے۔ اس کے بعد شعر کے قدیمی نمونے کافی زیادہ ہیں۔ اور شعرا بھی وقت اور ترتیب زمانہ کے لحاظ سے معلوم ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان میں بعض

تو سلاطین غور کے مداح تھے۔ اور بعض وہ تھے جو سلیمان اور کسٹی کے پہاڑوں کے دامن میں آباد تھے۔ اور اس زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ بعض ملتان اور سرزمین ہندوستان میں مقیم تھے۔ جیسا کہ قرائن سے پتہ چلتا ہے اس زمانے میں بھی پشتونخوا کی سرزمین عملاً اُن حدود تک تھی جس کی طرف "خلاصۃ الانساب" کے مؤلف نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ " اور افغانوں کے سبھی مذکورہ اماکن ایران، توران، ہند اور سندھ کے مابین ہیں۔ چنانچہ ان کی شرقی حد کشمیر ہے۔ اور مغربی حد دریائے ہلمند جو ہرات کے متصل ہے اور ان دونوں ملکوں کے درمیان کم و بیش پچھتر دن کی مسافت ہے اور شمالی حد قاشقار (چترال) اور جنوبی بحر اور بلوچستان بردی تک ہے۔ وہ ممالک جو ان حدود اربعہ میں آتے ہیں۔ انہیں مجموعی طور پر ملک روہ کہا جاتا ہے۔ اس لئے وہ افغان جو ہند میں آباد ہیں۔ اپنی اسی نسبت سے روہیلہ کہلاتے ہیں[1]

اس دور کے بعد بھی پشتونخوا کا علاقہ انہی جغرافیائی علاقوں پر مشتمل تھا۔ اسی طرح ملتان، ہرات، کوئٹہ اور پشاور کے درمیان واقع تمام علاقوں میں پشتو بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس میں صف اول کی شاعری بھی کی جاتی تھی۔ اس شاعری کے حماسی اور عشقیہ ہر دو نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ ان میں حمد و ثنا، پند و موعظت، مدح و ستائش، بین نوحے۔ اخلاقیات کے موضوعات پر اشعار موجود ہیں اور پشتو کے بعض قدیمی عروض کے نمونے بھی ملتے ہیں چوتھی صدی ہجری کے بعد پشتو زبان پر عربی اور فارسی کا اثر پڑا ہے اور پشتو شاعری میں اُن عروضی اصناف کو جگہ دی گئی ہے جن میں عربی اور فارسی شاعری کی جاتی رہی ہے۔

دا نشور جیبتی کے خیال کے مطابق قدماء کی شاعری میں خالص پشتو ملتی ہے۔ اور ان میں اکثر اشعار ایسے ہیں جو خارجی زبانوں کے اثرات اور تصرف سے یکسر پاک ہیں۔ ان میں نہ تو ایسے کلمات آئے ہیں، جو بلحاظ ساخت پشتو نہ ہوں اور نہ ایسے لغات کی کوئی کمی ہے جو پہلے تو روزمرہ کی عام بات چیت میں استعمال ہوتی تھی اور اب بالعموم متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بعض مصادر، اسماء افعال اور تراکیب بھی ایسے ہیں جو اب پشتو قواعد میں مستعمل نہیں ہیں۔ حالانکہ پشتو کی نحوی ساخت کی رُو سے وہ زیادہ موزوں اور صحیح ہیں۔ پشتو کا یہ قدیمی ادب۔ اخلاق

---

[1] خلاصۃ الانساب صفحہ ۶۵

افکار اور احساسات کی اُسی طرح ترجمانی کرتا ہے جیسے پشتون کی فطرت اور اُس کی سرشت ہے ۔

شعر کی ان خوبیوں کے علاوہ ان میں عہدِ قدیم کی شاعری کے وہ تمام خواص موجود ہیں جو ایک آزاد ماحول کے ادب کے لیئے لابدی سمجھے جاتے ہیں ۔ ان اشعار میں روشانیوں کی دعاؤں اور مناجاتوں اور جذب وسلوک کے مضامین کے علاوہ گرد و پیش کے نظاروں اور عام لوگوں کے جذبات اور اجتماعی شعور کی نمائندگی بھی کی گئی ہے ۔ اس دور کے اشعار زبان اور محاورے کی رُو سے بہت سادہ اور رواں ہیں ۔ ان میں نہ تو استعارے اور ایہام ہیں اور نہ یہ بیکار اور دور از کار تشبیہات و استعارات سے مملو ہیں ۔ یہ اشعار تکلف اور تصنع سے پاک ہیں اِس دور کے اشعار میں تسلسلِ بیان پایا جاتا ہے ۔ یہ خاصیت اس وقت تک پشتو شاعری میں موجود رہی جب تک غزل اور قطعہ فارسی عربی سے پشتو میں منتقل نہیں ہوئے ۔

قدماء کے اِس گروہ میں امیر کروڑ، ہاشم سروانڑی اور شیخ بیٹن بابا کے علاوہ شیخ رضی لودی اور شیخ نصر لودی بھی ہیں ۔ نصر لودی ملتان کے پشتون بادشاہ شیخ حمید کا بیٹا اور رضی اس کا بھتیجا تھا ۔ شیخ حمید کی وفات کے بعد نصر ملتان کا بادشاہ بنا اور یہ بات مشہور ہوگئی کہ وہ ملحدوں اور اسماعیلی فرقے کے عقائد اپنا کر اُن کا معتقد ہوگیا ہے اور الحاد کی ترویج کو پسند کرنے لگا ہے ۔ اُس وقت شیخ رضی پشتونخوا کے پہاڑوں میں اسلام کی تبلیغ میں مصروف تھا ۔ جب وہ نصر کی اس حالت سے آگاہ ہوا تو بڑا حیران ہوا اور اُسے لکھا ؎

د الحاد پر لور دے تر پلل   گروه دِ زمونږ وکوراوهٔ

مونږ رونړے پہ زیارمنه   تاپر توروړ نتوداوهٔ ۔

لرغون وے گروهیلے   چہ دے گوبنے اراوهٔ

ځکه گروه دِ اوس اره کړ   چہ پلرو دِ رنړاوهٔ

لودی ستا په نامه سپک شهٔ   کړ هر څومو درناوهٔ

نصره ستم سے کهاله   لودی ننه یرکاوهٔ

در تم نے الحاد کی راہ اختیار کرلی اور ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہم نے اپنی محنت اور قربانی سے جسے عزت اور احترام کے مقام پر پہنچایا تھا تو نے داغِ بدنامی سے اِسے رسوا کیا ۔ تم پہلے اس جماعت میں کیوں رہے جو اب اس سے تو نے منہ موڑ

لیا وہ گروہ جسے تمھارے آباؤ اجداد نے منور کیا تھا تم نے اُسے خیرباد کہدیا۔ لودھی تیرے ہی نام سے ذلیل ورسوا ہوئے ہرچند کہ ہم نے اُنہیں قابل احترام بنایا تھا۔ اے نصر اس کے بعد نہ تو تو ہمارے گھرانے کا فرد ہے اور نہ اپنے کردار وعمل سے تو لودھی کہلانے کا مستحق ہے ۔"

کہتے ہیں کہ نصر لودھی نے اس کے جواب میں شیخ رضی لودھی کو لکھا کہ ؎

د الحاد په تور تورن شوم — نه ؤ لرغون خو ملحد نه یم
زما د ښمنو هسې تور راکړی — که ملحد یم د دښمنو یم
له اسلامه نه ترپلمه — تورانو څخه تر پله یم
ګروه مې حقه لرغونې ده — اوس هم کوږ پر لرغونه یم
د اسلام پر هسک به ځلم — و تورانو ته تیاره یم
د لودی زوې سنتي یم — د حمید له لوړ کهاله یم
تورانې د بڼ چه وائي — زه له ګروهه پراړه یم
داسې تور تا سې درو هوی — زه مومن ستاسې پر تله یم

د دښمنو وینا وې مه غږه
نه زه لودی یمه خو زه یم

" الحاد کی بدنامی نے مجھے متہم کیا ہے پہلے تو میں ملحد نہیں تھا یہ میرے دشمن ہیں جو مجھے بدنام کرتے ہیں اس لئے اگر میں ملحد بھی ٹھہرا تو اپنے دشمنوں کی نظر میں۔ اسلام سے میں انحراف نہیں کر سکتا۔ البتہ اپنے بدخواہوں سے گریزاں ہوں۔ میرا عقیدہ وہی قدیمی ہے۔ میں اسی پر اب بھی سختی سے قائم ہوں۔ میں اسلام کے آسمان پر چمکوں گا۔

نوٹ :۔ " یہ اور اس قسم کے سارے اشعار ہم نے حبیبی صاحب کی دریافت کردہ کتاب " پٹہ خزانہ " سے جس کا مؤلف محمد ہوتک ہے۔ بطور سند پیش کئے ہیں۔ اس کے بارے میں بحث اپنی جگہ آئیگی ۔

اور اپنے بدخواہوں کے لئے گھٹاٹوپ اندھیرا ہوں گا۔ میں لودھی کا بیٹا، اہل سنت میں سے ہوں اور حمید کے اونچے خاندان سے ہوں۔ الزام لگانے والا دشمن جو کہتا ہے کہ میں عقیدے کے لحاظ سے بدل گیا ہوں تو وہ بہتان لگا کر آپ لوگوں کو بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں تیرے گروہ کا مومن ہوں۔ دشمنوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ اگر لودھی ہوں تو میں ہی ہوں۔"

شیخ رضی اور شیخ نصر دونوں کے اشعار "پٹہ خزانہ" کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اور پشتو ادب کی تاریخ میں ایک مضبوط کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غائر تحقیق اور گہری تدقیق کے بعد اس سے بعض پرلطف نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں مثلاً (۱) اس زمانے میں پشتونخوا کے مشرقی علاقے میں عربی زبان کا نفوذ ابھی زیادہ نہیں ہوا تھا (۲) ان قطعات میں بعض متروک الفاظ اور گرامری نمونے موجود ہیں، جو پشتو کے اپنے مخصوص انداز اور صحیح شکل کو اجاگر کرتے ہیں۔ (۳) بعض مذہبی اصطلاحات مثلاً الحاد، سنت، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پشتو پر عربی زبان کا ابتدائی اثر دینی اصطلاحات کے ذریعے سے ہوا ہے۔ (۴) ایک زمانے میں پشتو کا ادبی نفوذ گویا کہ اباسین کے مشرقی جانب ملتان تک جا پہنچا تھا۔

(۵) ملتان کے لودھی پشتون اس زمانے میں بھی "پشتونولہ" اور اسلام پر سختی سے کاربند تھے۔ اور اسلام کے سچے مبلغ اور خادم تھے۔ لیکن نصر لودھی کے خلاف الحاد کی باتوں کو جو ہوا دی گئی تھی وہ سب کچھ محض سیاسی رقابت کی وجہ سے تھا۔

"پندوموعظت"

جیسا کہ شیخ بیٹن کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ پشتو ادب کے اس دور میں حمد وثنا دعائیں ومناجات زیادہ تھیں۔ اور اسلامی عقائد رائج کرنے کے لئے ذریعۂ تبلیغ بھی پشتو تھا۔ اس بنا پر اس میں پند و موعظت کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا۔ اس لئے کسئی پہاڑ کے اسماعیل سڑبنی کے کلام میں یہی موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ کہتا ہے ؎

تیښته ادکره له ابلیسه — چه ابلیس لعین بتکاره شي
هلته ورکه پلوشه شي — تهول نړئ تورہ تیارهٔ شي

سرے وران شی لہ ابلیسہ ۔ غوخے پہ سر پر کتارہ شی
کڅ ھر چا ابلیس خرن کرو ۔ نوے ٔ مصلہ منندارہ شی
کڅ سرے ابلیس تہ پرے شہ ۔ نو بہ کور د وير نارہ شی

"تم شیطان لعین سے بھاگو جب وہ تمہیں دکھائی دے کیونکہ وہاں پر روشنی کی رمق باقی نہیں رہتی۔ اور سارے علاقہ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور جب آدمی ابلیس کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے تو گویا کناری سے اس کا سر کاٹ دیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص نے ابلیس کو نیچا دکھا دیا تو وہ سماں دیکھنے کا ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ابلیس سے ہار جائے تو اس کے گھر میں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔"

شیخ اسماعیل شیخ بیٹن کے ساتھ تھا۔ وہ بڑا متقی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ اور اسلام کے اُن چند بڑے مبلغین میں سے تھا جو کسٹی پہاڑ اور سلسلۂ کوہ سلیمان کے آس پاس اسلام کی روشنی پھیلا چکے تھے ان کا مزار کوہ سلیمان کے دامن میں وازہ خواہ نامی مقام پر ہے۔" پٹہ خزانہ کے مؤلف کے بیان کے مطابق شیخ اسمٰعیل، خرشبون بابا کے معاصر تھے اور خرشبون بابا نے بقول حبیبی ۱۱م ہجری میں وفات پائی۔

اسمٰعیل اپنے خاندان کے افراد سے بہت محبت کرتے تھے ان کے ان احساسات و جذبات کا اثر ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ خرشبون بابا شیخ بیٹن اور شیخ اسمٰعیل سے رخصت لے کر جا رہے تھے کہ شیخ اسمٰعیل پر جدائی کے اس منظر نے بڑا اثر کیا۔ اور اُس نے کہا ؎

کڅ یون دے یون دے مخکنے بیلتون دے ۔ لہ کسئ غرۂ تخہ ځی خرشبون دے
کڅ وروره وروره خرشبون وروره ۔ تہ چہ بیلتون کرے زما وير کوره
چہ ځے مرغۂ لہ توے کوغۂ لہ ۔ ھمزولی پاتہ ځے تۂ برغے لہ
دخدائے دپارہ خرشبون یارہ ۔ چہ هیر مونۂ کرے زمونۂ کهول وارہ
زرۂ مے دپیرۍ یار مے بیلیږي
بیلتون ئے اور دے ځان پرے سوزیږي

"یہاں سے نہیں جاتا ہے اور آگے فراق ہی فراق ہے اور کسٹی پہاڑ کے قریب سے جو ہو کر جا رہا ہے وہ خرشبون

ہے ۔ اے میرے بھائی خرشبون تو جب مجھ سے بچھڑے گا تو تو میری آہ و بکا دیکھ لے گا۔ تو تو مرغہ اور تورہ کرنے کی طرف جا رہا ہے اور تمھارے ساتھی پیچھے رہے جاتے ہیں ۔ خدا کے لئے اے میرے خرشبون دوست تو مجھے اور ہمارے گھرانے کو فراموش نہ کرنا ۔ میرا دل کانپ رہا ہے اس لئے کہ میرا دوست بچھڑ رہا ہے اُس کی جدائی آگ ہے جو مجھے جلا رہی ہے ۔"

"تصوف رائج ہونے کی ابتداء"

یہ وہ دور ہے کہ پشتو ادب میں تصوف کا رواج ہونیوالا تھا اور اب یہ ادب ایک دوسرے دور میں داخل ہوا چاہتا تھا ۔ شعری اصناف کی رو سے ملی اور تقلیدی اوزان ایک دوسرے کے متوازی جاری تھے اور شعرا کوئی ایسی قید یا قدغن محسوس نہیں کرتے تھے ۔ کہ گویا اُن کے کلام کے لئے کوئی خاص وزن یا صنف ضروری ہے ۔ یہی سبب ہے کہ شیخ اسمٰعیل کے شعر کا ایک نمونہ تو یکسر عروضی ہے اور دوسرا خالص اُس ملی وزن میں ہے جو قصوں اور افسانوی ادب کے ذریعے سے اب بھی موسوم کیا جاتا ہے ۔

"ایک تاریخی شخصیت جدّاعلیٰ اور شاعر"

سڑبن کا بیٹا خرشبون جس کا تذکرہ اسمٰعیل کے کلام میں موجود ہے ۔ شیخ بیٹن کا بھتیجا اور پشتونوں کے نسب ناموں کی رُو سے ایک تاریخی شخصیت ہے ۔ وہ چوتھی صدی ہجری میں زندہ تھے ۔ خرشبون صاحب کمالات و کرامات تھے ۔ اور پشتو شعر سے بھی علاقہ رکھتے تھے ۔ ہمیشہ اللہ پاک کی عبادت کرتے وہ " غوزہ مرغہ " میں مقیم تھے لیکن اپنے چچا شیخ بیٹن کے گھرانے کے ساتھ آمد و رفت رکھتے تھے ۔ اور علاقہ کی دوری کو گھرانے کے تعلقات میں حائل نہیں ہونے دیتے تھے ۔ اس کی وجہ سے اِن کے مابین خاندانی حمیت بہت زیادہ تھی ۔ اور یہ اِس محبت کی برکت تھی کہ شیخ اسمٰعیل نے خرشبون بابا کی جدائی میں سوز و گداز سے بھری ہوئی آہ و فغان کی ہے ۔ شیخ خرشبون

کو شاعری سے لگاؤ تھا۔ اور شیخ اسمٰعیل کی "ژغونو" کے جواب میں خرشبون کے مندرجہ ذیل "ژغونہ" ہم تک پہنچے ہیں [1]

بیلتانہ نارہ مے وسوہ پر کور باندے — سنہ پوھیږم چہ بہ څہ وی پیښ پر دپاندے

لہ خپلوا نو بہ بیلیږم پہ سرو سترګو — دوا پرہ سترګے مے پروینو دی ژړاندے

اسمٰعیلہ تا نازو مے زړہ سورے کړو — بیلتانہ خرشبون بیا لہ تا پردے کړو

نہ ھیریږی کہ مے بیا نہ ستا یادی کښے — پہ چړو ویږ بہ پرے شی د زړہ مراندے

څہ څہ چہ اوبہ د دیوان مے دے وښتہ — د ویانہ څوړی بہ اچو مہ و ترخ تہ

ستا بہ یاد بہ مے وی بس د زړہ وښتہ

کہ دا د مکہ غروتہ تول شی لاندے باندے

"صدائے ہجر میرے گھر میں آگئی اور میں نہیں جانتا کہ اب آگے کیا کچھ پیش آئے گا۔ میں اپنے خویش و اقارب سے سرخ آنکھوں کے ساتھ بچھڑ جاؤں گا۔ اس لئے میری دونوں آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں اے اسمٰعیل تمھارے ژرغ نے میرے دل کو چھلنی کر دیا ہے۔ غمِ فراق نے خرشبون کو ایک بار پھر تجھ سے بیگانہ کر دیا۔ تو مجھے بھلائے نہیں بھولتا۔ چاہے آہ و بکا کی چھریوں سے میرے دل کی نسیں ہی کیوں نہ کٹ جائیں۔ میں بہ امر مجبوری جا رہا ہوں کیونکہ مجھے ایک لمبا سفر درپیش ہے۔ اس لئے میں اپنا زادِ راہ کاندھے پر لٹکائے ہوئے ہوں تسکینِ خاطر کے لئے تمھاری یاد ہر حالت میں میرے ہمراہ رہے گی۔ چاہے یہ زمین اور پہاڑ تہ و بالا ہی کیوں نہ ہو جائیں۔"

خرشبون کے یہ اشعار چاہے جیسے بھی عروضی انداز کے ہوں اور اپنے اندر تقلیدی رنگ لئے ہوئے ہوں لیکن زبان خالص ہونے کی وجہ سے انہیں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں بھی پشتو نے ابھی خالص انداز نہیں گنوایا تھا۔

"پٹہ خزانہ" کی سند کے مطابق خرشبون کی قیام گاہ غوڑہ مرغہ تھی۔ جو قندہار کے جنوب مشرقی حصے کی طرف ارغستان اور قلات کے مابین کوجک اور کوہِ سلیمان کے دامنوں کو کہا جاتا تھا۔ وہ کبھی کبھار غنڈان کے پہاڑ میں

---

[1] تاریخ ادبیات پشتو رحیبتی ص ۱۱۳ (جلد دوم)

جو علاقہ قلات کی وادی ترنک میں ہے، کبھی ٹھہرا کرتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سڑبنی پشتون جب بھی کسی زرخیز زمین پر پڑاؤ ڈالتے تو اس کی زرخیزی کی وجہ سے اس سرزمین کو "غوڑہ مرغہ"[1] یعنی آباد مرغزار کہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اول گاڑتے نشکی، ترنک، ستقر اور قراباغ کے علاقوں کو جن میں پہلے مقیم تھے "غوڑہ مرغہ" کہا کرتے تھے۔ اور پھر مضافاتِ کابل کو جہاں انہوں نے الغ بیگ مغل کی فوجوں کو شکستیں دی تھیں غوڑہ مرغہ[2] کہا ہے۔

جب خرشبون ۱۱۹ ہجری میں "غوڑہ مرغہ" کے مقام پر وفات پا گئے تو ان کے بیٹوں میں سے کاسی کی اولاد ژیڑیانی۔ الوسئ اور کتوان تو بلوچستان میں رہ گئے۔ اور شنواری جلال آباد اور پشاور کے درمیان آباد ہو گئے۔ کند اور زمند کی اولاد اور غوری جو اولادِ کند سے ہیں پشاور، مردان، سوات، دیر، باجوڑ اور تیرہ میں مقیم ہوئے۔ اور محمد زئی، خویشکی، توخی، نیکوزئی، اور کتان کچھ ہشتنگر اور کچھ کرم ایجنسی میں اور کچھ خوست کے علاقے میں جا آباد ہوئے۔

"پشتو میں مرثیہ"

پشتو ادب میں سب سے پرانا مرثیہ جو اوراقِ تاریخ میں محفوظ رہ گیا ہے، ۴۰۰ ہجری کے لگ بھگ شیخ اسعد سوری کا ہے۔ اسعد سوری غور کا باشندہ تھا۔ ان کے والد کا نام محمد تھا۔ جس وقت سلطان محمود کے ساتھ ایک لڑائی میں امیر محمد سوری نے شکست کھائی اور قید کیا گیا تو کچھ ہی دنوں کے بعد وہ جیل خانے میں چل بسا۔ کہتے ہیں کہ امیر محمد سوری شیخ اسعد سوری کا مہربان دوست تھا۔ اپنے اس دوست کے بارے میں شیخ اسعد نے یہ مرثیہ کہا ہے۔

؎ د فلک لہ چارہ وخژہ اوکرم کوکار	زسلوی هر گل چہ خاندی په بهار
هر غتول چه په بیدیا غوړیدہ وکا	ریژوی ئے پانړے کاندی تار په تار

---

[1] تاریخ ادبیات پشتو حبیبی جلد دوم ص ۱۱۳ مطبوعہ پشتو اکیڈمی۔ پشاور یونیورسٹی۔
[2] تواریخ حافظ رحمت خانی ص ۱۳

ډیر مخونه د فلك څیره شنهٔ کا — ډیر سرونه کا ترخاورو لاندې خوار
د وامکن له سره تول پریباسی مر شی — دې وزلو ویني کاندی تو نخوار
چه له برمه ئې زمری په ځنګلو کښې — له اکو به ئې داری شیر وجبار
همې غشی سکنزی تال د ژوبلو و — رستمان ځنې ځغلا کاندی په چار
چې ملا وې نهٔ کړ یږدی په غبتلې — دا فلک پرې وکا څهٔ کا نړی ګذار
په یوه کردش ئې پریباسی له برمه — نړئې غشې نهٔ لیندې وی نسپار
څهٔ شیرې څهٔ ظلم کاندې اې فلکهٔ — ستا له لاسه نهٔ دې هیڅ ګل بې له خار
په ویر ژلولو نهٔ کړې په زړهٔ کراپه — په نتلیسو اودوې د غم تا تار
هیڅ روغی په زړهٔ نیشته ستا له جوړ — بیلوې په ژړا ژړا منّن له یار
له تیر یو دې او بل کښاڅي له وریځو — ځنې زاری ورتې ورتې ستا له شنار
نهٔ به لاس وا خلې له جوره نهٔ به لورې — نهٔ به ملا کړې له بې وزلو له ترار
نهٔ به زړهٔ او سوزوې په هیڅ چا بانسې — نهٔ به پر یوځې له کردشه له مدار
نهٔ به وصل کړې مین له مل مینه — نهٔ به درملې تیپونه د اوفکار
ستا له لاسه دی پر اته ژوبل زګیروی کا — هر پلوته تپی زړونه په خار خار
کله غو ځې کاندې مراندې د زړکیو — کله تیر باسې وکړې هوښیار
کله تکې وا چوې په نازولیو — کله څیرې کړې ګریوان د منځی چار
کله غوړ زوې وامکن له پلازونو — کله کښینوې په خاورو کښې یادار
زمونږ په زړونو دی ټن بیا یو غشی اوو شتی — وو دې ژوبللو په دې غشی هزار
په سوریو باندې ویر پریوت له پاسه — محمد وامکن چه لاړې په مل دار
یو وار شو امیر په لاس د میر محمد — انتقال ئې او کړو قیس له مل وار
په سماو کښې وران آهنګران وو — په تیکنه وو په درست جهان اوښار

د محمود د ژوبلو په لاس کښېووت   چه غزنه ته نه ئې باتلے په تلوار
ننګیالیو لره قید مرینه ده څکه   ساه ئې والوته له هسک ته په ډډې لار
تر نړئ ئې غوره خاورې هدیره کا   د زمریو په بیرېو کله وی ثوار
په دے غم د غور وکړی تور نمرئ شل   په دے ویر د نړا تیاره شوله د ښار
کور ته ځاځی رنړے او ښکے له دے غزنو   دا کرونکے ساندے لی په شور هار
نه صغه زغا د غزنو په بیدیا ده   نه د زرکیو په مسادی کتهار
نه غبتول بیا زر غونبنوی په رونس   نه بامی بیا موسیدوه کا په کهسار
نه له غرجه بیا راځی کاروان د مشکو   نه را دروی غور ته بیا جوپې د ښار
د پسرلی اوره تودے او بنے تویته   سلغلرے په نیسان نه کړی نشار
دا په څه چه محمد ولاړله تریه   په ویر نه ئې سو غور تول سوګوار
نه ښکاریږی صغه سور سپور په لتو   نه ځلیږی صغه نمر په دے دیار
چه په تجلیو په ځا پکښې خند له   چه په پیغلے کا ا تنزر قطار قطار
هغه غور په ویر ناماد د وامکن کښېو   هغه غور سو د جاندم غونده سوار
لاس د مات شه اے فلکه چه دے و کا   محمد صلی الله علیه وسلم غونده زمرے د مرینے ښکار
شین زړ ګے فلکه ولے لا ولاړے   اے د غور غزنو په څه نه سوئ غبار
زړګے ولے په زیږدلو نه یو یو زے   لاندے باندے شه چه ورک شی دا اشعار
چه زمری غوندے وامکن ځی له جهانه   هیڅ دے نه کړی په نړئ باندے قرار
سخ په تا اے محمده د غور نمر وے   په نړئ به نه وی ستا د عدل سار
ته به ننګه وے ولاړ په ننګ کښې مړشوے   هم په ننګه دے ننګه کا ځان ځار
که سوری د په تنګ و یر کاندی ویرنی شول   هم به ویاړی ستا له نوم ستا په تهار
په جنت کښې دې ته تون زمونږ وامکنه   هم په تا دې وی د یرلور د غفار

"آسمان کے کاموں پر میں کیا چیخوں چلاؤں؟ کیونکہ وہ ہر اُس پھول کو مرجھا دیتا ہے جو بہار میں کھلتا ہے۔ غنڈل کا ہر پھول جو صحرا میں کھل جاتا ہے۔ آسمان اس کی ایک ایک پتی جھاڑ کر تتر بتر کر دیتا ہے۔ بہت سے چہروں پر آسمان کے تھپیڑوں کیوجہ سے نیل پڑ گئے ہیں اور بہت سے سر مٹی کے نیچے دفن کر دیئے گئے۔ بادشاہ حاکم اور صاحب اختیار کے سر سے تاج اتار کر اسے مار ڈالتا ہے اور نہایت خونخوار طریقے سے بے بسوں کا خون گراتا ہے جس کے خوف سے شیر جنگلوں میں کانپتے پھرتے ہیں۔ اور جس کے رعب سے ظالم اور جابر ڈرتے ہیں اُسکے تیز جنگجو سپاہیوں کو چھلنی کر دیتے ہیں۔ اور رستم جیسے بہادر بھی ڈر کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جن کی کمر تنومندی کی وجہ سے کبھی خم نہیں ہوتی تھی۔ یہ آسمان اُن پر کیسے سنگ باری کرتا ہے۔ آسمان ایک ہی گردش سے اُسے نڈھال کر کے پھینک دیتا ہے اگرچہ اس کے ہاتھ میں تیر و کمان اور ڈھال کچھ بھی نہیں ہوتا (یا) اے آسمان تو کس قدر زیادہ ظلم کرتا ہے۔ تیری وجہ سے کوئی پھول بھی کانٹے کے بغیر نہیں۔ اے سنگ دل تو غم کے ماروں کے ساتھ رواداری نہیں برتتا۔ اور تو غم زدہ لوگوں پر غم کی یورش کر دیتا ہے۔ تیرے ظلم و ستم کیوجہ سے میرا دل ذرا بھی ٹھکانے نہیں۔ تم عاشق کو اُس کے معشوق سے رُلا رُلا کر جدا کر دیتے ہو۔ تمہارے ظلم و ستم کیوجہ سے میرا دل بھی اشکبار ہے اور وہ بے حد زار و قطار آنسو بہاتا ہے۔ نہ تو تم کبھی ظلم و ستم سے باز آؤ گے نہ مہربان بنکر بے سہاروں کی دستگیری کرو گے۔ نہ کسی پر ترس کھا کر رحم کرو گے اور نہ مدار میں گردش سے تھک کر باز آؤ گے۔ ہر طرف تمہارے ہاتھوں گھائل دل شدتِ درد سے کراہ رہے ہیں۔ نہ تو عاشق کو معشوق سے واصل کرو گے اور نہ زخمیوں کے زخموں کا مداوا کرو گے۔ دل کیوں نہ شدتِ درد سے بے قرار ہو کہ تو اُس کی نسیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ تو تو ہوشیار آدمی کو بھی جھانسہ دے دیتا ہے۔ کبھی نازپروروں پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ اور کبھی عابد و متقی کا گریبان پھاڑ ڈالتا ہے۔ کبھی حاکم وقت کو تخت سے تختے پر بٹھا دیتا ہے۔ اور کبھی اسے خاک نشین بنا دیتا ہے۔ آج ایک دفعہ پھر تو نے ہمارے دلوں پر تیر چلا کر ہزاروں کو گھائل کر دیا بالائے غم دگر سوریوں پر یہ اُفتاد آن پڑی کہ حاکم ر بادشاہ محمد) نے دوسری دنیا کو کوچ کیا۔ ایک دفعہ اسیر دشمنوں کے ہاتھ آگئے اور دوسری دفعہ جیل میں چل بسے۔ آسمانوں میں آہنگر آباد تھے۔ جو تمام دنیا کو معلوم تھے۔ وہ جب محمود کے لشکریوں کے ہاتھ لگا تو بلاتوقف اُسے اپنے ساتھ غزنی لے گئے۔ غیور و جوانمرد قید و بند کی صعوبتیں اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ اسی راستے سے وہ عالم بالا تک جا پہنچتے ہیں

اس دنیا پر اُس نے مٹی اور قبر کو ترجیح دی۔ شیر کو کب تک کوئی پابہ زنجیر رکھ سکتا ہے۔ غور کے لوگوں نے اس غم میں سیاہ ماتمی لباس پہن لیا۔ اور اس ماتم کی وجہ سے شہر کی روشنی، سیاہی میں بدل گئی ہے۔ دیکھو ان پہاڑوں کی آنکھوں سے بھی چمکیلے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ اور آبشار بھی بین کرتی ہوئی شور مچا رہی ہے۔ نہ تو پہاڑوں کا جاہ وجلال باقی ہے اور نہ چکور خوش ہو کر پرواز کرتے ہیں۔ اور نہ زمین سے گل غنثول کھلے گا۔ نہ گل باتی پہاڑوں میں مسکرائے گا اور نہ غرجستان سے مشک نافہ کے کاروان آئیں گے۔ اور نہ گروہ در گروہ ملک غور کو پھر کبھی اس خاندان کے بادشاہوں کے نام قافلے آیا کریں گے۔ اور نہ پھر کبھی غور تک تجارت کے کاروان آئیں گے۔ بہار کی برف گرم آنسو گرا رہی ہے۔ اور ابر نیسان اپنے موتی نچھاور نہیں کرتے یہ اس لئے کہ محمدؒ اس دنیا سے چلا گیا۔ اور سارا غور اُس کے ماتم میں سوگوار ہو گیا ہے۔ وہ سُوری شہسوار اب سوریوں کی سرزمین میں دکھائی نہیں دیتا۔ اب وہ سورج اس اُجڑے دیار میں نہیں چمکتا، جہاں غور کی کنواریاں قطار اندر قطار رقص وسرود کے ساتھ ہنسا کرتی تھیں اب وہ غورِ عالمِ وقت کے سوگ میں بین کرنے لگا ہے۔ اور جہنم کی طرح خشک اور گرم ہو گیا ہے۔ اے آسمان تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں کہ تو نے محمد جیسے شیر کو موت کے منہ میں دے دیا۔ اے نیلے آسمان مزید ظلم وستم کی آرزو لئے کیوں کھڑا ہے؟ اور اے غور کے پہاڑ تم (ہمارے غم کے) گرد وغبار بن کر کیوں نہ اُڑ گئے اے زمین تو کانپ کانپ کر گر کیوں نہیں جاتی؟ تو تہ وبالا (تباہ وبرباد) ہو جا کہ ظلم وستم کا یہ طور طریقہ ہی باقی نہ رہے۔ شیر جیسے سردار بھی جب اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں تو پھر اس جہاں پر کوئی کیا بھروسہ کرے۔ آفرین ہو تم پر اے محمد تو تو غور کا سورج تھا۔ اور اس ملک میں نہ تو تیرے جیسا کوئی عادل گذرا اور نہ آئندہ کوئی آئے گا۔ تو پیکر ننگ وحمیت تھا۔ اور اسی کی خاطر تو چل بسا۔ اب چاہیئے کہ یہ بے ننگ لوگ بھی تیرے نقش قدم پر چل کر ننگ وحمیت پر جان دے دیں۔ اگر سوری تمہاری وفات پر سوگوار ہیں تو ساتھ ہی ساتھ تمہارے نام اور خاندان کو اپنا سرمایہ افتخار بھی سمجھتے ہیں۔ اے ہمارے مالک تمہارا ٹھکانہ جنت ہی تو تھا اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تیرے شامل حال رہے۔"

مرثیہ کا رواج پشتو میں کب سے ہوا ہے؟ اس بارے میں اب تک کوئی بھی حتمی رائے قائم نہیں کر سکا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرشت انسانی میں ازل ہی سے یہ خاصیت موجود ہے کہ وہ اپنی نسل کے دکھ درد پر دردمندی

کا اظہار کرے گا۔ ان کے غم پر رنجیدہ ہوگا اور جو بھی مرکر ان سے رخصت ہوگا تو اس کی جدائی کا غم اسے رونے اور بین کرنے پر مجبور کرے گا اسی طرح قضائے الٰہی کے بعض سانحے ایسے ہوتے ہیں کہ اس موقع پر غم و اندوہ کا اظہار مرثیئے کی زبان میں ادبیات کا حصہ بن جاتا ہے جو قوم کا ملی اور ثقافتی ورثہ گردانا جاتا ہے۔ اس میں جس شخص کی یاد محفوظ کی گئی ہو، اسے قوم اور قبیلے کا سرد سمجھا جاتا ہے اور بقول خوشحال خان خٹک "یہ تو ننگیال یعنی غیرت والے ہی ہوتے ہیں جنہیں لوگ گیتوں اور نوحوں میں یاد کیا کرتے ہیں^ٹ" نوحہ گروں کی یہ روایات اگر ایک طرف ان قبائل میں موجود ہیں جنھوں نے ابھی تہذیب و شائستگی کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ تو دوسری طرف تاریخ کے سبھی ادوار گواہ ہیں کہ یہی روایات ہر دور کی ہر شائستہ اور مہذب قوم میں باقی رہ چکی ہیں۔ اس سے دنیائے ادب میں Apic یا بہادری کی طویل رزمیہ نظم کی بنیاد پڑی ہے۔ قدیم یونان کی LLiad اور اوڈیسی Odyssey. سے لے کر اسلامی دنیا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر لکھے گئے بے شمار مرثیوں تک اس دنیا کی ہر زبان میں بہت سارے تاریخی المیوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ المیہ کی جو بھی روداد کسی منظوم پیرائے میں بیان ہوتی ہو مشرقی ادب میں اُسے مرثیہ کہا جاتا ہے۔

عربی اور عجمی ادبیات کے علاوہ ہندی آریائی تہذیب میں بھی مرثیئے اور نوحے کا رواج عہد قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ہندوؤں کی پرانی داستانوں میں اور رامائن مہابھارت کے دور کے آثار میں بھی، مرثیئے کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی ہمدردی اور بین کے سبب پیدا شدہ شدید جذبات کی برکت سے ہندوؤں میں رسم ستی کا آغاز ہوا تھا۔

محبت اور ہمدردی زندہ دنیا کا ایک بشری تقاضا ہے اور المیئے کا پیش آنا اس کے لئے راستہ پیدا کرتا ہے۔ چونکہ موت المیئے کی انتہا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے پیش آنے کے ساتھ یہ دونوں تقاضے بھی اپنی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔ المیئے کا کردار جس قدر کسی کے دل کے زیادہ قریب ہو اُسی قدر اُس پر غمزدگی کے جذبات غالب آجاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی انسانی کمزوری ہے۔ کہ اس میں کئی دکھ اور کئی خوبیاں شامل حال رہتی ہیں۔ جب درد

ٹ ننګیالي دي چه یاد یږي په سندرو وهم په ویر۔

غم سے بھرپور یہ جذبات موزون الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں تو وہ پاک اور صاف ستھرے گیت جنم لیتے ہیں ۔ جو ہر دل کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ دوسری زبانوں کی طرح پشتو میں بھی منظوم نوحوں اور مرثیوں کا رواج بہت پرانا معلوم ہوتا ہے ۔ پشتون شعرا نے بھی اور زبانوں کے شاعروں کی طرح اپنے ملی بزرگوں کی وفات پر بین کئے ہیں ۔ اور ان کی یاد اور کارنامے پرسوز اور رقت انگیز اشعار اور گیتوں میں محفوظ کئے ہیں ۔ اس میں تاریخی شخصیتوں کے علاوہ طویل المیہ نظموں کے بعض وہ افسانوی کردار بھی شامل ہیں جنہوں نے پشتو ادبیات میں دوام پایا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پشتو کا کلاسیکی مرثیہ یا نوحہ کے علاوہ اس زبان کے لوک گیتوں اور ادب کا بھی یہ ایک اہم حصہ رہا ہے ۔ لیکن چونکہ اس قسم کے ادب کی تخلیق کے وقت اور میعاد کا تعین نہیں کیا جاسکتا ۔ اس لئے اس میں موجود مرثیہ کی قدامت کا اندازہ اور اس کے لئے وقت کو متعین کرنا بھی ممکن نہیں ۔ پھر بھی اس سے ایک نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ جن جذبات اور احساسات کی ترجمانی اس میں کی گئی ہے ، وہ ہر دور اور ہر زمانے کی انسانی فطرت کی ترجمان ہے ۔

پشتو کے لوک گیتوں میں اس قسم کے جذبات کے اظہار کا سب سے زیادہ پُرلطف ذریعہ مصرعہ یا ٹپہ ہے جس کے غم انگیز حصے کو " غاڑے " کہا گیا ہے ۔ یہ غاڑے ایک دوسرے سے سن کر یاد کئے جاتے ہیں ۔ اور چونکہ یہ فطری جذبات کا اظہار کرتے ہیں اس لئے نہایت آسانی کے ساتھ یاد رکھے جاسکتے ہیں اور اسی طرح پشت در پشت چلے آتے ہیں ۔ بسا اوقات ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اسی طرح یہ تفریط کا شکار بھی ہوتے رہے ہیں ۔ لیکن یہ ڈرامہ اسی طرح رواں دواں ہے ۔ اس لئے کہ ہر انسان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ

خو نګئ د مرګ په ټوک ماتېږي
زهٔ پټه ځله د مرګ د غمه ګرځمه

" یہ منہ موت کے تھپیڑے سے بگڑ جاتا ہے ۔ اس لئے میں ہمیشہ موت کے ڈر سے اپنا منہ چھپائے پھرتا ہوں " ۔ لیکن تابہ کے ۔ وہ منہ جو ہزار پردوں میں چھپا ہوتا ہے ۔ آخر کار موت کے تھپیڑوں سے بگڑ ہی جاتا ہے ۔ اور اس کا آب و دانہ ختم ہو جاتا ہے ۔ زندگی اور غم لازم و ملزوم ہیں ۔ اور پھر پشتونوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ دنیا غم کے روز پیدا ہوئی ہے ۔ اس لئے انسان جب تک زندہ ہے حادثات غم سے دوچار ہوتا رہتا ہے ۔ ایس گونہ حوادث پیش آنے کی وجہ سے اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ [1]

---

[1] حافظ الپوری

هغه طوطی چه چغیدو چغاړ اوس ولے نۀ کا
مرګ ئے مُهر په خُله او واهۀ ګویا به نۀ شی

"وہ طوطی جو کبھی چہچہاتا تھا۔ اب کیوں اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لگتا ہے موت نے اس کے مُنہ پر مُہر ثبت کردی ہے اور وہ اب کبھی بول نہیں سکے گا"

"غاړے ساندے"

اسی طرح کچھ حادثے اور کچھ حالات و واقعات ایسے ہوتے ہیں جو دل میں غموں کی ایسی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ کہ بار بار یہ زبانی پہ آتا ہے کہ

ے زما په خپله زړګے خوږ دے خکه د بل په غم کښے اوښکے تویومه

"میرا اپنا دل زخمی ہے اسی لئے تو میں دوسروں کے غم پر آنسو بہا رہی ہوں" یہ بین اکثر پشتون عورتیں اُس گھر میں کرتی ہیں جہاں غم پیش آیا ہو۔ غم کی خبر پھیل جانے سے لے کر ایک سال تک کئی ایک مواقع پر اس غم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور یہ نوحہ کافی عرصے تک گھر اور گورستان کے درمیان رابطے کا کام دیتا ہے۔ یہ مرحوم کی آخری ہچکی سے لے کر قبر پر سبزۂ بیگانہ اور خود رو پھولوں کے اُگنے تک غم زدہ دلوں کا ساتھی ہوتا ہے۔ موقع اور محل کے مطابق نوحے کی تین اقسام مقرر کی گئی ہیں اگرچہ ٹپے کی صورت میں ان کی تعداد بے شمار ہے۔ جس موقع پر جتنے بھی کسی کو یاد ہوں وہی کام آجاتے ہیں۔ مثلاً پہلی قسم کا نمونہ یہ ہے ؎۔

د دنیا کټی بازار دِ وران شی
چه نا آشنا خلق راځی اشنا ترے ځینه

د یار په ورو ستو سلګو را غلم
لکه شبنه د بارانه پرے تویوم اوښومه

پرون دُنیا وه نن قیامت دے
چه زهٔ ولاړه لاړے اخلی رخصتوؤ

کۀ په ژړا جانان راګرځی
اوچه کیا به زرغونه په اوښکو کړمه

پرېږده چه اوښکے بهیږی
مرګ ئے لید و جانان ئے نۀ پخلا کوُنه

پہ جانان سپین کفن غوړیږی   پہ ما وریږی د سکروټو بارانونہ
ولے بہ نہ ژاړم عالمہ   جانان مے ګل د پسرلی خاورو لہ ځینہ
نن بہ پہ چغو چغو ژاړم   د جانان زنہ پہ خاصہ باندے تړلہ

"اس دنیا کا یہ بازار ویران ہو جائے کہ یہاں نا آشنا لوگ آتے ہیں اور آشنا چلے جاتے ہیں۔
محبوب کی آخری ہچکیاں تھیں جب میں آپہنچی اور موسلا دھار بارش کی طرح میرے آنسو برسنے لگے
کل تک دنیا تھی اور آج قیامت ہے۔ اس لئے کہ میں کھڑی ہوں اور میرا محبوب مجھ سے ہمیشہ کے لئے
رخصت ہوا چاہتا ہے۔
اگر رونے دھونے سے محبوب کی واپسی ممکن ہو تو میں خشک گھاس کو اپنے آنسوؤں سے تر و تازہ کر دونگی
چھوڑ و کہ میرے آنسو بہتے رہیں۔ موت نظر آنے کے باوجود میں نے اپنے محبوب کو نہیں منایا۔
میرے محبوب پر سفید کفن ڈالا جا رہا ہے اور مجھ پر گویا انگاروں کی بارش ہو رہی ہے۔
اے لوگو! میں کیوں نہ روؤں میرا گل بہار کا محبوب جیسا مٹی میں دفن ہو رہا ہے۔
آج میں دھاڑیں مار مار کر روؤنگی کیونکہ میرے محبوب کی ٹھوڑی کو مارکین کے کپڑے سے باندھ رہے ہیں۔"
قبر کے قریب جو بین کئے جاتے ہیں اُن کا نمونہ یہ ہے۔

زما د ګل پہ شان جانانہ   تہ رانہ لاړے زۂ د چا تہ پرېښودمہ
پښے پہ تلاړ بہ دې خاورے نہ دی   هغہ زلمی دی چہ کا بہ دۂ لہ خیالہ تلہ نہ
لحد مے سم ورسرہ جوړ کړئ   زۂ مرور اشنا پہ مرګ پخلا کومہ
توره لحدہ نوم دې ورک شہ   د ګل پہ رنګ زلمی دې تورے خاورے کړو
کتے د ګور پہ غاړہ کیږدئ   د نوی کور مبارکی ورکړئ عالمہ
ځوانان سر تور لحد تہ کوز شول   پیغلے رندے کړئ چہ کونړ تون نہ قبلوینہ
لالے جدا لہ نور و بنج کړئ   چہ هر صباے زۂ سلام لرہ ورځمہ
زما صورت بہ څۂ بنادی کړی   چہ زۂ ولاړہ یہ تا خاورے اړہ وینہ

زمکے قسم به در له درکړم ــــ چه خاورے نهٔ کړے دجانان سپین مروندو

زمکے قلنګ دِ زورَ ور دے ــــ زلمی تورے اخلی را لیږے تش پالنګونه

عالمه را شئ تماشے له ــــ په لالی پریوتل دخاورو انبارونه

"میرے گل فام محبوب جب تُو رخصت ہوکر چلا گیا تو مجھے کس کے سہارے چھوڑ گیا۔

قدم ذرا احتیاط سے زمین پر رکھو، کیونکہ یہ نری مٹی نہیں بلکہ اپنے وقت کے گبرو جوان ہیں جو کبھی کبر و ناز سے زمین پر اترا کر چلا کرتے تھے۔

میری قبر بھی اُسکے برابر میں بنا دو میں اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو موت کے بعد منانا چاہتی ہوں۔

اے تیرہ و تار گورستان تیرا نام باقی نہ رہے کہ تو نے پھول جیسے جوان خاک میں ملا دیئے۔

اُس کی چارپائی گور کے کنارے رکھدو اور پہلے اسے اپنے نئے گھر کی مبارک باد دے دو۔

بہادر جوان ننگے سر قبروں میں چلے گئے، خدا کرے کہ وہ دوشیزائیں اندھی ہو جائیں جو دنڈوا پا قبول نہیں کرینگی۔

میرے محبوب کو دوسروں سے الگ دفن کرو تاکہ میں ہر صبح اُس کے سلام کے لئے جایا کروں۔

میں بھلا کیا خوشی مناؤں گی جب میں کھڑی دیکھ رہی ہوں اور اے میرے محبوب تجھ پر مٹی ڈالی جا رہی ہے۔

اے زمین میں تجھے قسم دیتی ہوں کہ میرے محبوب کی ساعد سیمین کو خاک نہ کرنا۔

اے زمین تیرا باج بہت بڑا ہے کہ تو جوانوں کو لے لیتی ہے اور اُنکے خالی پلنگ واپس بھجوا دیتی ہے۔

اے دنیا والو! ذرا آکر یہ تماشا تو دیکھ لو کہ میرے محبوب پر ڈھیروں خاک ڈالی گئی ہے۔"

بین کا تیسرا حصہ وہ ہے جو تجہیز و تکفین کے بعد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ؎

زړهٔ مے ناړو سوے سوے کړو ــــ زهٔ دجانان د قبره اوس راغلے یمه

په آخرت به آشنا غواړم ــــ دنیا فانی ده لاس مے اونهٔ رسیدونه

زړګیه صبر دِ په خدائے شه ــــ اشنا دِ لاړه په تورو لحد کښے بندی شونه

زړګیه صبر شه مهٔ ژاړه ــــ جانان په اوږد سفر لاړ شو نهٔ راځینه

جانان چہ تلو دے ویناوہ　　چہ تر قیامتہ بہ بیا نہ وی دیدنونہ

زما پہ سر دِ خاوری واوڑی　　چہ جانان نشتہ ژوندئ څہ تہ ناستیمہ

کڼ تورہ لحد تہ نرئ لار وے　　ما بہ جارو کړے د جانان د مخ گودونہ

زړہ مے ماشوم شو راتہ ژاړی　　را یادوی د تورو خاورو بشرونہ

گلے کول یار را تہ ناست وو　　چہ گل را لوئے شو لالے تورے خاورے شو

آشنا د لارے نہ هیریږی

زہ بہ د عمر آشنا څنگہ هیر ومہ

آہ و فغان نے میرے دل کو چھلنی کر دیا کیونکہ میں اپنے محبوب کے مزار سے ابھی ابھی لوٹ کر آئی ہوں۔

اِس فانی دنیا میں تو میرا کوئی بس نہ چل سکا اس لئے اب آخرت میں میں اپنا محبوب مانگونگی۔

اے میرے دل! رضائے الٰہی پر صابر و شاکر رہ، تیرا محبوب چلا گیا اور خاکِ سیاہ کا اسیر ہو گیا۔

اے میرے دل! صبر کر اور نہ رو۔ محبوب لمبے سفر پہ چلا گیا ہے۔ اور اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

جب میرا محبوب رخصت ہو رہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ اب تو دیدار قیامت ہی کے دن ہوگا۔

میرے سر پہ خاک ڈالی جائے جب میرا محبوب نہیں رہا تو پھر میں زندہ کس لئے بیٹھی ہوں؟

اگر سیاہ قبر میں جانے کا کوئی تنگ سا راستہ بھی ہوتا تو میں اپنے محبوب کے چہرے سے گرد و غبار جھاڑ دیا کرتی۔

میرا دل بچوں کی طرح رو رو کر مچل رہا ہے اور اُن چہروں کو یاد کر رہا ہے جو خاکِ سیاہ میں پڑے ہیں۔

جب میں پھولوں کی کاشت کر رہا تھا۔ تو میرا محبوب بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مگر اب جب پھول کھل گئے تو وہ چل بسا اور خاکِ سیاہ بن گیا۔

راستے کا رفیق بھی بھلائے نہیں بھولتا۔ میں عمر بھر کا ساتھی کیونکر فراموش کر سکونگی؟"

یہ وہ انسانی جذبات ہیں جو کسی ایک خاص دور یا زمانے سے تعلق نہیں رکھتے۔ بیشک یہ دائمی اور ابدی ہیں یہ نوحے اکثر برجستہ اور فی البدیہہ کہے گئے ہیں۔ اور اُسی طرح یاد بھی رکھے گئے ہیں۔ اس لئے ان کی تاریخ

اور زمانے کا تعین بھی ممکن نہیں۔ البتہ ان نوحوں کی ایک قسم وہ ہے جو ایک خاص فرد یا شخصیت کے نام کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایسے نوحے اور بین بیشک ایک مخصوص زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مثلاً صحبت خان باٹنری کی موت کے نوحے۔ بخت منیر ترکلانی کے غم کا نوحہ۔ رحمداد خان یا ماموئی کے قتل کئے جانے کے نوحے۔ اسی طرح بجی گرام کی لڑائی کے نوحے اور بین وغیرہ وہ غم انگیز نوحے ہیں جو تمام پشتونخوا کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں اُن کا مختصر سا نمونہ یہ ہے۔ ؎

د ملاکنډ بازاره وران شے — تا کښے خرخیږی د رامداد د کور شالونه
رامداده پاسه روان شه — د سره کمره مهمندان را غلی دینه
چه رامداد خان دې پرے وژلے — مړوند دې پریوزه په لستونړی کښے دننه
رامداد دې دا خلے خدائے جوړ کړی — که دوباره په کوپر جنګ وی مرد شینه
دخان رامداد پالنګے راوړو — خلقو د سرے ډولئ ګومان پرے کړنه
پاس په آسمان راشه رامداده — د کلی لارے رانړیز ونیولی دینه
د رامداد خان د مرګ آواز شو — پاس په آسمان کښے زانړو وران کړل قطارونه
سین تالی ورسره کیندئ — رامداد سخی دے میلمانه غذر کوینه
وارد رامداد د پکړئ تیر شو — نور مهمندان دې پګړئ نه پسر وینه

" اے ملاکنڈ کے بازار تو اُجڑ جائے کیونکہ تجھ ہی میں رحمداد خان کے گھر کے شال فروخت ہو رہے ہیں۔
اے رحمداد اُٹھ کر روانہ ہو جاؤ (موضع) سرہ کمر سے مہمند آئے ہوئے ہیں۔
جس کلائی سے تو نے رحمداد خان کو قتل کیا ہے خدا کرے کہ وہ کلائی آستین کے اندر ہی گل سڑ جائے۔
اے اللہ! اس دفعہ رحمداد کو صحت دے دے اور اگر دوبارہ کوپر کے مقام پر لڑائی ہو تو پھر بیشک مر جائے
جب رحمداد خان کا پلنگ لے آئے، تو لوگ اُس پر سرخ ڈولی کا گمان کرنے لگے۔
اے رحمداد اوپر آسمان کے راستے سے ہو کر آؤ کیونکہ گاؤں کے راستے تو دانڑیزیوں نے مسدود کر دیئے ہیں
جب رحمداد کی موت کی خبر پھیل گئی تو فضاؤں میں کونجوں نے اپنی قطاریں توڑ دیں۔

(لوگو!) قبر میں تانبے کے تھال اس کے ساتھ رکھدو، دحماد خان سخی ہے وہ مہمانوں کی خاطر تواضع کریگا۔ دحماد کی دستار کا دور گزر گیا اس لئے اب کوئی دوسرا بھنبد دستار باندھ کر نہ اترائے۔

"رومانی قصّوں کا مرثیہ"

اس قسم کی شخصیات کے علاوہ جن کا کوئی تاریخی وجود ہو، ایک اور رومانی داستانوں کے وہ کردار ہیں۔ جنہیں ایک منظوم داستان میں مرکزی کردار کی جگہ ملی ہے۔ پشتو ادب میں ایسے کرداروں کے بارے میں بھی نوحوں، آہ و فغان، بین گیتوں پشتو بدلہ اور مثنوی میں بہت رقت انگیز طریقے سے حزن و ملال کا اظہار کیا جاتا ہے، جیسے آدم درخانئ کے رومان میں آدم خان کی موت پر صدر خان خٹک کہتا ہے۔ ؎

خکہ کرئی دینا واحئے — نوحہ کرے مری ستائ
فلک هسے رنگ گردش کړو — د آدم ئے ستائنش کړو
زحل درست لہ غمہ تور شو — هندی طور خیں پہ اور شو
مشتری لاړ لہ مکانہ — تیں پرے ښنج لاړلہ کمانہ
غرق پہ وینو کښے مریخ شو — د دنیا دور پرے تریخ شو
ورجعت تہ جوړ آفتاب شو — پہ هیبت پہ اضطراب شو
زهرا عُود پہ آتش کیښوو — چنګسے ماتی طربیئے پریښوو
د ویړ دور ئے برپا کړ — برساتئے پہ ژړا کړو
چہ پہ ویر کښئے ویناوے — دا ویناے ویرہ لاوے
پہ دُنیا چہ تیں آدم شو — زما عیش مبدل پہ غم شو
چہ نسکور ئے د عیش جام شو — چنګ رباب پہ ما حرام شو
خپل قلم ئے ماتی پہ قط کړو — بیلئے سر د سرہ قط کړو

یعنی پس له دے به څه کښم؟   نور به هیڅ په قلم نه کښم
مرثیه به د آدم کښم   هر چه زړهٔ په خپل قلم کښم
د ماه غم چه په دیری شی   تمام مخنے ترسیری شی
چه هر ګوره شوه غمګینه   مدام شوه هاله نشینه
شپے ګیسو وربل پریشان کړو   صبح دم څیرے ګریبان کړو
بے آبی شوه په باغ پیشه   څار د ګل کړه سینه ریشه
د عمام بستان له غمه   واړه ویج لاړل له نمه
چه اطفال و نونهال دو   ویج ککړ ولاړ ملال دو
هم د رزو دختراے   اوچے ونے شوے ناتوانے
هر یوریش چه د شجر دو   ویج تر مزی د مسطر دو
د ګلابو ګل په اور شی   بنفشه په غم نسکور شی
د صدبرګ سینه له همه   صد پاره لاړه له غمه
د باغونو ناوے جونه   واړه خاورے شوے خاکونه
یعنی مرګ چه د آدم شی   د جهان عمر په غم شی
چه دده مکان په خاک دے   که مونږ خاورے شو څه پاک دے
پرده ورانه د رباب شوه   نغمه پاتو له څوا ب شوه
د سرود نوازش لاړ شی   د نغمے عالم اوجاړ شی
د مجلس یاران خوارهٔ شول   په غمونو کښے سکارهٔ شول
نوبتی لاړه له جهانه   غم را کوزه شی له آسمانه
د دُنیا عالم په غم شی   د عقبی عالم خرم شی
نامے پاتو په جهان شی   روحے لاړ په خپل مکان شی

" نوحہ گر اس لئے گھر گھر پھرتے ہیں کہ وہ نوحے سُنا سُنا کر بیان کریں اور مُردوں کو سراہیں۔ فلک کچھ یوں گردش کرنے لگا کہ آدم کی ستائش میں مگن ہوگیا اور ہندوؤں کی طرح آگ میں جل بُھن گیا۔

مشتری ستارہ اپنے بُرج سے نکل گیا۔ گویا اُس پر کمان سے تیر چل گیا۔ مریخ خون میں ڈوب گیا۔ اور اُس کے لئے زندگی تلخ ہوگئی سورج لوٹنے پر مجبور ہوگیا۔ اور اُس پر ہیبت و اضطراب طاری ہوگیا۔ زُہرہ نے عُود آگ میں جھونک دی۔ اپنا ساز توڑ کر اُس نے خوشی کو خیر باد کہدیا اور ایسا بین کرنا شروع کیا کہ برسات کو اپنے ساتھ رُلانے پر مجبور کر دیا۔ بین کرتے ہوئے بار بار یہی کچھ اس کے زبان پر آنے لگا کہ جب سے آدم اِس دنیا سے کوچ کر گیا ہے میرا عیش غم سے مملو ہے۔ آدم ایک آزاد مشرب انسان تھا مگر عیش و طرب کے لئے مایۂ افتخار تھا۔ جب اُس کا جام تعیش سرنگوں ہوا تو مجھ پر بھی چنگ و رباب حرام ہوگیا بس اُس نے اپنا قلم توڑ کر دو ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ اب آگے کچھ لکھنے سے میں رہا۔ اور قلم سے مجھے اگر کچھ لکھنا بھی ہو تو فقط آدم کی عظمت کا ہی تذکرہ ہوگا۔ جب چاند کا غم بڑھ گیا تو اُس کا سارا چہرہ چھائیوں اور جھاسوں سے بھر گیا اور دیکھئے کہ اس غم سے جب چاند اندوہگین ہوا۔ تو ہمیشہ کے لئے ہالہ نشین ہوگیا۔ رات نے اپنی زلف پریشان بکھر دی۔ اور (مارے غم کے) صبح نے اپنا گریبان چاک کر لیا۔ باغ پانی کے لئے ترسنے لگا اور خار نے پھول کا سینہ چھلنی کر دیا۔ باغ کے غم کی وجہ سے بادلوں میں بھی نمی باقی نہ رہی اور سوکھے ہی چلے گئے۔ باغ میں جو پودے تھے وہ خشک، گرد آلود اور غمگین ہوگئے اور انگور کی بیلیں سوکھ کر ناتوان ہوگئیں۔ درخت کا ہر رگ و ریشہ مسطر کے دھاگے سے بھی زیادہ پتلا اور باریک ہوگیا۔ گلاب کے پھول کو آگ لگ گئی۔ اور غم کے مارے بنفشہ سرنگوں ہوگیا۔ گلِ صد برگ کا سینہ و فورِ غم سے سو ٹکڑے ہوگیا اور نونہالانِ باغ سب کے سب مٹی اور راکھ بن گئے یعنی جب آدم چل بسا۔ تو دُنیا اور اہل دنیا کی زندگی غم و اندوہ میں بدل گئی اور سب یہ کہنے لگے کہ جب اُس کا (آدم) ٹھکانہ خاک ہے تو ہم بھی اگر فنا ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے! رباب کے پردے بگڑ گئے اور نغمے کی بازگشت ختم ہوگئی بربط کی نوازش باقی نہیں رہی اور نغمے کا عالم اُجڑ گیا۔ یاران محفل بکھر گئے اور غموں میں بھسم ہوکر کُڈھ ہوگئے دنیا سے مسرت جاتی رہی اور آسمان سے غم کا نزول ہوا۔ دنیائے فانی میں صف ماتم بچھ گئی اور عالم عقبیٰ میں بزم عیش و نشاط برپا ہوگئی اُس کا نام آدم اِس دنیا میں زندۂ جاوید ہوگیا اور روح اپنے مسکن کی طرف لوٹ گئی "۔

پشتو کی ملی داستانوں میں ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں اپنے المیئے کے مرکزی کردار یا محبوبہ کی وفات کے موقع پر ایسے ہی پُر لطف بیانات نظم کئے ہیں۔ اور مرثیئے کی اُس روایت کی ترجمانی کی ہے، جو اظہار غم کے جذبات کے لئے ہر دور کے انسان نے اپنے ماحول کے مطابق اپنائے ہیں۔

پشتو ادبیات میں المیہ کی تاریخ منظوم داستانوں کے ارتقا کی تاریخ ہے۔ اِن داستانوں کی بنیاد بھی اُس غنائیہ شاعری پر ہے۔ جو داستان گو ایک عرصے سے سارنگی، چو تارہ یا رباب کے ساتھ بیان کرتے اور لوگوں کو محظوظ کیا کرتے تھے لیکن منظر بدلتے کے لئے درمیان میں منظوم جیسے اور "غگونہ" یا نعروں کی شکل میں لائے جاتے۔ اور اُن کے ساتھ ساز یا نغمے کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی۔ جس زمانے سے ہماری ادبیات ایرانی ادبیات سے متأثر ہونی شروع ہوئیں تو اس فن نے بھی آہستہ آہستہ مثنوی اور بدلہ کا روپ دھار لیا اور ایک کامرثیہ بھی اسی میں موجود رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو باختری یونانیوں کے زمانے میں اور نہ ہی انکے بعد کشانیوں کے دور میں پشتو رزمیہ نظموں پر ہندی یا یونانی تمثیل کا اثر پڑا، اور نہ کبھی خود پشتو المیہ کو روایتی ڈرامے کی شکل دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ لوبھر کی رد و داد اور مکالموں کی روایت مع مرثیہ کے تو پشتو ادب میں بہت پرانی ہے لیکن مبسوط ڈرامے کی تاریخ چاہے نظم میں ہو یا نثر میں، بیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے پہلے نہیں ہے۔

مرثیئے کے بعض دوسرے پہلو

پشتو میں مرثیہ کی تاریخ کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جن کی رُو سے پشتو ادبیات کے اس میدان میں کافی زیادہ پیش رفت ہوئی ہے ان میں ایک خاص موضوع " سانحۂ کربلا" ہے کہ دنیا کی غم انگیز سانحوں کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھی راہ حق میں قربانی کی جو بے مثال روایت چھوڑ گئے ہیں اُسے اسلامی دنیا کی بیشتر زبانوں میں المیہ نظم کی شکل دینے کو ایک بہت دل پسند موضوع سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اہل رسول کی محبت ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے اسی لئے کربلا کی خونریز داستان پر ہر مسلمان کا دل پسیجتا ہے لہٰذا اِن واقعات نے پشتو ادب میں بے شمار مرثیوں اور نوحوں کو جنم دیا ہے۔ انکے ذریعے سے مظلوموں کے ساتھ محبت

اور ہمدردی کے جذبات بیدار کرنا اور ظالم کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات کو ابھارنا مقصود ہوتا ہے۔
اس قسم کے مرثیوں نے پشتو ادب میں بھی اسی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ اور جنگنامے کے منظوم انداز میں ساری پشتو نخوا میں المیۂ کربلا بیان کیا اور سنا جاتا ہے۔ داستانِ کربلا یا جنگ نامۂ حسینؓ بہت سے پشتو شعراء نے نظمایا ہے۔ ان میں سید ابو علی شاہ کی مثنوی اور خان میر ہلالی کی نظم " ذکر بلا معصوم " انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہیں۔ سید ابو علی شاہ کے لکھے ہوئے جنگ نامے کا بیان یوں ہے۔ ؎

خدایا زړۀ مے د ګناه له خیری سپین کړے
ستا صفت مے په خاطر کښے همنشین کړے
ذکر فکر مے جاری ستا په صفت کړے
ځنګدن کښے مے ګویا په شهادت کړے
ګرد غبار د معصیت کړے له ما لرے
نفس شیطان لکه د سپی کړے له ما کوڼے

" اے پروردگار تو میرے دل کو گناہ کے میل کچیل سے صاف کر دے اور اپنی تعریف میرے دل میں بٹھا دے تیری صفت میں میرا ذکر و فکر ہمیشہ جاری رہے اور نزع کی حالت میں بھی میری زبان کلمۂ شہادت پہ گویا کر دے۔ معصیت کا گرد و غبار مجھ سے دور کر دے اور نفس شیطان کو مجھ سے کتے کی طرح دھتکار دے "۔

یہ مثنوی جو کم و بیش دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے ان اشعار پر اختتام پذیر ہوئی ہے۔

د یزید په هیڅ یو ځلے کښے نۀ وه پته	کۀ هر څو چا لټولو پورته ښکته
آل عیال د یزید کل په خواری خوار شو	دوره لاړه د یزید د امام وار شو
اهل بیت د امام کل خلاص شول بنده	خوشحالی ورسره وه له خپله ژوندونه
څوک په شام کښے پاتے شو د شام شاها شو	څوک په مینه مدینے ته را روان شو

اے سید ابو علیشاه د خدائے ثنا ده
چه ورکړۀ د یزید په کور غوغا ؎

یزید کا کہیں بھی نام و نشان نہیں تھا ہر چند کہ لوگ اُسے اوپر نیچے ڈھونڈتے تھے نیز یزید کے اہل و عیال تمام کے تمام ذلیل و خوار ہو گئے ۔ اُس کا دور ختم ہو گیا اور امامؑ کی باری آئی ۔ امامؑ کے تمام اہل بیت قید سے رہا ہو گئے زندگی کی مسرتیں شامل حال تھیں ۔ کوئی تو شام میں رہ گئے اور وہاں کے بادشاہ بن گئے ۔ اور کوئی خوش خوش مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے ۔ اے سید ابو علیشاہ سب تعریف خدا کے لئے ہے اور خانۂ یزید میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے ۔"

پشتون شعراء نے اپنے خویش و اقارب دوستوں اور عزیزوں کے غم میں بھی مرثیے لکھے ہیں ۔ خوشحال بابا کے دیوان میں انکے بیٹے نظام خان کی وفات پر علیین مکان کا مرثیہ نہ صرف یہ کہ ایک غم زدہ باپ کے شدتِ جذبات کا آئینہ دار ہے ۔ بلکہ اِس مرثیے سے خود خان کی اپنی شخصیت بھی اُجاگر ہوتی ہے ۔ اس زیرک پشتون بزرگ نے اس میں پشتونولی کی اس روح کو سمویا ہے ، جو اِس ملّی سردار کی آرزوؤں کی آخری آماجگاہ تھی ۔ خان کا یہ بیان بہت جامع اور پُر لطف ہے اور جذبات ہر مصرعہ میں انگڑائی لیتے نظر آتے ہیں ۔ کہتا ہے ؎

څهٔ دا غوښه پرېوځي په زړهٔ باندې فلکه
چه نظام دِ زمابېل کړو خوا ئ د ک

خدایه تهٔ خو ستمګر نهٔ ئې داڅهٔ کړې
، خلقه دِ په دا کار کړه هسکه پکه

په لحد کښې هغه مخ خوړے په چجیو
چه د هېڅ چا پرې پیس زونه وه څوانکه

په غمو نو کښې دِ زوړ په دنیا پاتئ
کهٔ د زړهٔ په ارمان تهٔ اومرې کودک

کاش کهٔ څوان د پښتانه په ننګ کښې مړوې
نه چه کوړ لره روان شو له تو لتکه

چه د قام په ننګ کښې او مره هغه څو یه
په عالم کښې د خپل پلار غاړه کا لکه
مګر زړه ئے د هاتی دے چه زغمی ئے
دا شتئ چه د خوشحال په زړه شوه لکه

"اے آسمان تو میرے دل پر کیا کچوکے لگاتا ہے اور کیا ظلم کو مجھ سے الگ کیے کہ تیرا دل بھرا نہیں! اے پروردگار تُو تو ظالم نہیں تو پھر تُو نے یہ کیا کیا! لوگ بھی تیرے اس کام کو دیکھ کر ششدر و حیران رہ گئے۔ تو قبر میں اُس چہرے کو حشرات الارض کی خوراک بناتا ہے۔ جس کے منہ پر جوانی کا ایک مہاسہ بھی کوئی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں خوشحال اگر بڑھاپے کے باوجود بھی تیرے غم سہہ کر زندہ ہوں تو پھر اے بیٹے اپنے دل میں ارمان لئے تم کیوں چل بسے۔ کاش کہ تو عالم جوانی میں پشتون کے ننگ و ناموس پر قربان ہوا ہوتا نہ کہ چار پائی سے سوئے لحد چل پڑتا۔ وہ بیٹا جو ملت کے ناموس پر اپنی جان قربان کر دے وہی ساری دنیا میں اپنے والد کا سر فخر سے اونچا کر دیتا ہے۔ شاید کہ خوشحال کا دل ہاتھی کے دل کے برابر ہے کیونکہ غم نے اُس کے دل میں تیرِ ستم گاڑ دیئے اور اس نے برداشت کر لئے"۔

خود خان علیین مکان کی وفات پر اُن کے بڑے بیٹے اشرف خان ہجری نے جو مرثیہ کہا ہے وہ بھی بڑی خوبیوں کا حامل ہے۔ اس مرثیے میں کل انچاس اشعار ہیں اور اس کا ہر شعر رقت انگیز جذبات کا مرقع دکھائی دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ پشتو شاعری کے متقدمین، متأخرین اور دوسرے شعراء کے کلام میں مرثیے کے ایسے بہت سے پُر لطف نمونے موجود ہیں جو جذبات کے اظہار اور فن دونوں کے لحاظ سے پشتو ادب میں شہہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں علی خان کا رومانی انداز بھی ہے اور رحمان بابا کی عالمگیریت بھی جیسا کہ علی خان کہتا ہے۔ ؎

آه سپین لے مے د خزان په تاتار تیر شو	مالا ګل بوټیں کړے نه وو بهار تیر شو
لا مخ پټے غوټئ نه وے تازه شوے	چه بیا دور نیمه تنوا د ګلزار تیر شو
دوس که ځان وهم که ځاورے په سر نولم	په هیڅ رنګ په بیس ته نه راځي وار تیر شو
لا مے غټ ورته په خیر کتلی نه وو	لکه برق رخشنده په تلوار تیر شو

د بلبل اسره نوره شوله د نا ستے — چه د باغ په ښخنګ راته په چغا تېرشو
ستاد مرګ په ناره زړه ټوټه زما پاره شو — نو د به چاو د چپرے د هجر منشار تېرشو

يوه ورځ به دِ غبز اوشی علیخـانه
چه فلانے هم لکه ګرد و غبار تېر شو

"آه میری بہار خزاں کے ظلم وستم کا شکار ہوگئی۔ ابھی میں نے پھول سونگھا بھی نہیں تھا۔ کہ موسم بہار بیت گیا۔ ابھی منہ بند کلیاں کھلی بھی نہیں تھیں کہ باغ کا ادھورا دور گذر گیا۔ اب اگر میں خود کو پیٹوں اور اپنے سر پہ خاک ڈالوں تو کسی طرح سے بھی گذرا ہوا وقت لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ابھی تو میں نے سیر ہو کر اسے بغور دیکھا بھی نہیں تھا۔ کہ وہ بجلی کی سرعت سے گذر گیا۔ بلبل کے بیٹھنے کا آسرا جاتا رہا۔ اسی لئے جب وہ باغ کے پاس سے گذرا تو چیختا چلاتا گذر گیا۔ تیری موت کی خبر سن کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اسے تو ٹکڑے ہونا ہی تھا۔ اس لئے کہ اس پہ ہجر کی قیامت گذر گئی۔ اے علی خان! ایک دن تیری موت کی خبر بھی سنائی دیگی۔ کہ فلاں بھی گرد و غبار کی مانند اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔"

لیکن عبدالرحمان بابا جسے شاعر انسانیت کہا جاتا ہے کا انداز مرثیے میں بھی منفرد اور کُلّی طور پر اجتماعی ہے۔ انہوں نے مرثیے میں فرد کی بجائے بنی نوع انسان کی یاد اور تصور کو پیش نظر رکھا ہے اور اپنے ان ہمعصر لوگوں کی وفات پر غم کے بین کئے ہیں جن کی ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً شادی، غمی اور ہر اچھے برے وقت میں نشست و برخاست تھی اور حجرہ، مسجد کی رفاقت بھی مشترک تھی ایسے ہی رشتوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ؎

اشنا د لارے نهٔ هیریږی
زهٔ به د عمر آشنا څنګه هیر ومه

"ایک رفیق راہ کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا تو پھر بھلا میں عمر بھر کے ساتھی کو کیونکر فراموش کر سکوں گا؟ اور یہی احباب رحمان بابا کی زندگی میں جیسے کہ ایک ایک کر کے اس سے بچھڑ رہے تھے۔ اور اُس کے دل کو رنجیدہ و کبیدہ بنا رہے تھے حتیٰ کہ اِس افسردہ کر دینے والے مرثیے نے جنم لیا ؎

خدایه څه شو هغه ښکلي ښکلي خلق — په ظاهر په باطن سپین سپیځلي خلق
هیڅ خند مې له دې خلقو سره نه شي — ژړوي مې هغه تللي تللي خلق
خبر نه شوم چه د کوم خوا ته لاړ شو — لیدې نه شي هغه مالیدلي خلق
لکه ځګ چه د اوبو په مخ کښې دروي — هسې دروي په دنیا راغلي خلق
دریغه یو ځل نو بیا په دنیا راغلي — له جهانه په ارمان وتلي خلق
هزار حیف دې چه په خاورو وکښې لاړه شي — په عود او چندن لړلي خلق

رحمان هسې ګوښه توته له خلقو بیا مومنه
چه هرګز نه شي دا توته مومنلي خلق

"اے خدا وہ حسین و جمیل لوگ کہاں چلے گئے؟ وہ لوگ جن کا ظاہر و باطن دونوں صاف ستھرے تھے، کہاں گئے! اِن (موجودہ) لوگوں کے ساتھ مجھے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی، اس لئے کہ گزرے ہوئے لوگوں کی یاد مجھے رُلا رہی ہے۔ خدا جانے وہ لوگ جنہیں میں نے دیکھا تھا کس طرف چلے گئے۔ سطح آب پر رواں دواں جھاگ کی مانند یہ دنیا میں آئے ہوئے لوگ بھی ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ کاش وہ لوگ جو اپنے دلوں میں ارمان لے کر چل بسے ہیں۔ صرف ایک بار پھر اِس دُنیا میں لوٹ کر آ جائیں، ہزار افسوس کہ مٹی میں وہ لوگ بھی لتھڑ جائیں گے جو عود و لوبان کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے تھے۔ رحمان نے لوگوں سے الگ رہ کر ایک ایسا عجیب مزہ پایا ہے کہ دوسرے لوگ اِس لطف سے کبھی بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

مختصر یہ کہ پشتو مرثیہ بھی اُن ارتقائی منازل کی راہوں پر محوِ سفر رہا ہے۔ جن راہوں پر پشتو شاعری گامزن تھی اس میں بھی تخلیقی اور تقلیدی ہر دو اقسام کے انداز موجود ہیں اور یہ ملّی اور عروضی دونوں اقسام کے اوزان کی حامل ہے۔

پانچویں صدی ہجری کے شیخ سعدی سوری سے ہزارویں صدی ہجری تک پشتو شاعری ایک ایسے راستے پر گامزن رہی کہ جگہ جگہ ملّی اوزان اور عروضی طرزوں سے سابقہ پیش آتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ملّی اوزان آہستہ آہستہ کتابی ادب سے خارج ہوتے رہے اور عروضی اصناف کتابی شاعری کے نام سے پشتو ادبیات کی جگہ لیتی رہی ہیں

دور میں تیمن کاکڑ، بنکار ندوسے، غوری (جن کا قصیدہ زیر بحث آیا ہے) ملکیار غرشین ۔ تایمنی ۔ قطب الدین بختیار کاکی ؒ جیسے بزرگ اہل قلم چھٹی صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ شیخ متی بابا ہوتک، شیخ ملک یار ہوتک ۔ اکبر زمینداوری اور سلطان بہلول لودھی آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں زندہ تھے، خلیل خان نیازی زرغون خان نورزئے ۔ زرغونہ کاکڑہ اور میرمن رابعہ نویں صدی ہجری کے آخری حصے کے شعراء تھے ۔ دوست محمد کاکڑ، شیخ عیسیٰ مشوانڑی، شیخ بوستان بڑیچ ۔ علی سرور لودی ۔ میرمن نیک بختہ اور شیخ محمد صالح الکوزئے اور کئی ایک اور وہ شعراء ہیں جن کے نام دسویں صدی تک پشتو کے منظوم ادب میں آئے ہیں ۔ اور جن کے کلام کے نمونے بھی موجود ہیں ۔ ان میں شیخ اسعد سوری کا کلام فارسی زبان کے معاصر شعراء کے کلام سے بہت قریب ہے اور اس میں وہ ادبی رابطہ دکھائی دیتا ہے ۔ جو آخر میں پشتو شاعری کے تمام اصناف میں عام ہوا ہے ۔ اُس زمانے میں عموماً فارسی ادب میں قصیدے کا رواج تھا ۔ اور اسی فن کو ترقی دی گئی تھی ۔ یہی سبب تھا کہ غزنوی حکومت کے زیر اثر غور کے علاقے میں پشتون شعراء بھی فارسی شاعری کی طرح پشتو میں قصیدے لکھا کرتے ۔ لیکن پھر بھی پشتو قصیدہ ۔ پشتون رنگ، مزاج اور اصلیت سے خالی نہ تھا ۔ اور اس نے کسی بھی موقع پر وہ درباری انداز قبول نہیں کیا جس میں پشتون کی فطری آزادی درباری کورنشوں کی بھینٹ چڑھی ہو ۔

"نئے اصناف"

اس دور میں قصیدے کے علاوہ پشتو میں مثنوی، رباعی، غزل، قطعہ وغیرہ وہ شعری اصناف داخل ہو گئے جن کا اس سے پہلے پشتو ادب سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان تمام اصناف نے پشتو ادب میں ایسا مقام پیدا کیا کہ خوشحال خان خٹک کے وقت تک اس سے تمام غیریت اور بیگانگی جاتی رہی ۔ اور ایسا دکھائی دیتا تھا ۔ جیسے کہ یہ پشتو زبان کے اپنے ہی اوزان تھے ۔ یہی سبب تھا کہ ہمارے شعری ادب پر گیارھویں صدی عیسوی میں ان اصناف نے ایسا تسلط جما لیا کہ نہ تو خوشحال خان خٹک اور اُن کے ہمعصر شعراء اُن سے روگردانی کر سکے ۔ تھے اور نہ عبدالرحمان بابا اور اُن کے مسلک کے دیگر شاعران کی تقلید

سے بچ سکے اسی طرح پشتو شاعری ردیف اور قافیہ کی پابندیوں سے پوری طرح شناسا ہو گئی۔ جب خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کی شاعری کا دور دورہ ہوا تو شعر کی اِن سبھی اصناف نے اس میں تکمیل پائی۔

پشتو کے عظیم شاعر، پشتون رہنما اور ملی سردار خوشحال خان خٹک کے زمانے تک پشتون فضلاء اور شعرا یکسر ایک ہی مسلک کے پیرو تھے یہی وجہ تھی کہ اُن کی زبان میں بیان و کلام ہر دو کی ملاحت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے خوشحال خان نے کہا ؎

مدعی د تو رے شپے اور اور کے وو	د سہیل غوندے خان بانندے څرگند کړو
یو پہ حال او پہ ماضی کښے ھسے نہ وو	چہ ښکار مے د خبرو د اتہ غوند کړو
د مرزا دیوان مے اومندو پہ طاق کو دی	سنحر مے ارزانی خویشکے زمند کړو
کہ دولت ووکہ واصل ووکہ دانو وو	پہ خپس وے دے دص یوہ ریشخند کړو
قتیلے مے ورتہ سازے کړے د قند و	د اور بشو پہ دو دیو چہ چاشخوند کړو
پہ تازہ تازہ مضمون د پښتو شعر	پہ معنی مے د شیراز او د خوجند کړو

د بوستان وُنے مے وارہ پیوند دی
حقیقت مے د مجاز سرہ پیوند کړو

"فن شاعری کا مدعی گویا شب سیاہ کا جگنو تھا۔ میں سہیل کا ستارہ بن کر اُبھرا (تو اس کی رونق جاتی رہی) ماضی اور حال میں ایک بھی (شاعر) ایسا نہیں تھا جس کی باتیں سن کر مجھے مزہ آتا۔ مرزا کا دیوان میں نے (بند کر کے) طاق نسیان پر رکھدیا۔ اور میں نے ارزانی خویشکی اور زمند کو درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ دولت تھا کہ واصل یا کوئی دوسرے شعرا تھے ان سب کو میں نے اپنی قادر الکلامی سے کہیں کا نہیں رکھا وہ جو دنیائے سخن میں نانِ جوین کھا کر جُگالی کیا کرتے تھے میں نے انہیں شکر کے قتلے پیش کئے پشتو میں نئے مضامین کے انبار لگا کر بلحاظ معنی میں نے اُسے شیراز و خجند (کی زبان) کے ہم پلہ کر دیا۔ میرے (ادب کے) باغ میں سبھی درختوں کی پیوند کاری کی گئی ہے۔ اور حقیقت کو مجاز کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔"

یہی ایک مسلک اور موضوع تصوف تھا کہ پشتو ادب میں اُس کے داخل ہونے سے غزنوی اور غوری دور

کی شاعری کا جوش اور شدت باقی نہ رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو ان صوفیانہ موضوعات کے آجانے کی برکت سے اُس دور کے ادبیات میں مایوسی، ڈر، فرار اور گریز کا خاصا دخل رہا اور کچھ اس علمی اور ادبی غلبے کے سبب جو فارسی اور عربی زبانوں نے سیاسی غلبے کے ساتھ ساتھ اِس علاقے میں حاصل کیا تھا، اور مقامی زبانوں پر ایسا خوف اور رعب طاری کیا تھا کہ اِن زبانوں کے اپنے اعضا مفلوج ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں جو دوسری مقامی زبانوں کا حال تھا۔ وہی پشتو کا تھا۔

"پشتو شعر پر فارسی کا اثر"

پشتو شاعری پر فارسی کا اثر خصوصیت کے ساتھ نمایاں تھا۔ اس لئے کہ اس خطے کے لوگ علم و ادب کا تمام تر سرمایہ فارسی سے حاصل کیا کرتے اور اس کی روشنی میں اپنے افکار اور خیالات اُجاگر کرتے۔ اس اثر کی رُو سے پشتو زبان کا کتابی ادب مجموعی طور پر فعالیّت کی بجائے فرار اور جائے پناہ کا خواہاں اور متلاشی رہا۔ اور باوجود اِس کے کہ یہ زبان اپنے ابتدائی ادوار میں ویدانت، یوگا، زردشتی اور بدھی قنوطیت سے آزاد رہ چکی تھی اور اس نے اُن مراسم کو قبول نہیں کیا تھا۔ جنہوں نے سنسکرت اور اوستائی زبانوں کو نابود کر دیا تھا پھر بھی اِس دور میں کچھ عرصے کے لئے پشتو اِس افسون میں پھنس کر رہ گئی۔

خوش قسمتی سے یہ ایک عبوری دور تھا۔ جو بعض مثبت نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کی برکت سے دو نئی تحریکوں کے جنم لینے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ یہ ادب میں عرفان و سیاست کی تحریکیں تھیں یہ دونوں تحریکیں روشنیہ مسلک کے بانی بایزید انصاری کے افکار سے پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی برکت سے پشتو ادب اور پشتون سیاست کی وہ راہیں متعین ہوئیں جن کی بدولت پشتو زبان کے اعلیٰ ادب اور قومیّت پرستی کی سیاست پروان چڑھی۔ اور جس نے صاحب سیف و قلم خان علیین مکان خوشحال خان خٹک اور لسان الغیب حضرت عبدالرحمان بابا کے افکار اور کلام کو جنم دیا۔

"تصوّف پشتو شعر میں"

تصوف کی اصل بنیاد اِس نظریئے پر ہے کہ ذاتِ مطلق جو حسنِ مطلق اور خیرِ محض ہے ایک ایسی اکائی ہے جس کا ظہور ساری کائنات میں اور ہر شے کے وجود میں بے شمار آئینوں میں ایک عکس کی صورت میں ظاہر ہے اُس کی ذات اُس وقت بھی موجود تھی جب کچھ بھی نہ تھا۔ اس ذات میں نہ تو کوئی تغیر رونما ہوا ہے۔ اور نہ ہوگا۔ ذات مطلق جسے اللہ کہتے ہیں ایک مجرد ہستی ہے۔ اور ہر چیز جو ماسوا اللہ ہے اس کے وجود میں اُس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ جس کا ظہور منشائے الٰہی ہی پر مبنی ہے۔ چونکہ وہ خیرِ محض بھی ہے اور حسنِ مطلق بھی اس لئے عارف اُسے معشوقِ حقیقی کہتے ہیں۔ صوفیا کی نظر میں یہی توحید ہے۔ " ہمہ اوست و ہمہ از وست" (یعنی سب وہ ہی ہے اور سب کچھ اُسی سے ہے) کے نظریات نے تصوف کے دو مسلک قائم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں صوفیا ایک حدیث قدسی پیش کرتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ " میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا اور میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا"۔ لیکن چونکہ چیزوں کی پہچان اُن کے تضاد سے کی جاتی ہے۔ جیسے روشنی اندھیرے سے تندرستی بیماری سے اچھائی برائی سے۔ اسی لئے ہستی نیستی سے اور وجود عدم وجود سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی وابستگی پر تخلیق مظاہر فطرت منتج ہوتی ہے۔ اسی طرح حسنِ مطلق نے اپنے کرشمے اُجاگر کرنے کے لئے وہ تضادات پیدا کئے ہیں۔ جو تاریکی، بیماری، بدی یا اسی قسم کے دوسرے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ صوفیا کہتے ہیں کہ بدی کا راز تخلیق کا راز ہے۔ جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے۔ لیکن برائی کا بذاتِ خود کوئی الگ وجود نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اندھیرا روشنی کی نیستی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح برائی اچھائی کے نہ ہونے یا عدم وجود کو ظاہر کرتی ہے اس وجہ سے تمام مظاہر فطرت یا محسوسات کچھ نہ کچھ اچھائی رکھتے ہیں۔ اور جسطرح سفید روشنی ایک شفاف علاقہ سے گذرنے کے بعد بھی روشنی شمار ہوتی ہے چاہے اُس کا رنگ جتنا بھی بدل گیا ہو یا مدھم ہوچکا ہو۔ اسی طرح اُس دنیا سے جو عالم بیرنگ کہلاتا ہے محسوسات میں نورِ حقیقی کا اُترنا فساد اور ٹکراؤ سے دوچار ہوتا ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ معشوقِ حقیقی کی ذات کے بغیر باقی سب کچھ ایک سراب ہے اس لئے کہ اس کائنات میں سوائے اُس کی

ذات سُے جو کچھ بھی ہے ایک ہی اکائی ہے۔ اس کا نور اگرچہ اپنے جمال کے اظہار کے لئے بیشمار آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا منبع اور مخزن ایک ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کا جمال ہر خوبصورت چیز میں دکھائی دیتا ہے۔ درحقیقت یہی وہ ذاتِ واحد ہے جسے معشوقِ حقیقی کہتے ہیں۔ اس دنیا میں سارا جھگڑا اور فساد اُسی کی محبت نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ بات اب سب پر عیاں ہے کہ وہ ان سب کی روح ہے۔

تصوف کا یہ نظریہ فرود ذات کا وہ نظریہ ہے جو تمام محسوسات میں معشوق حقیقی کے اظہار جمال کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن اس فلسفے کا دوسرا رُخ وہ ہے جسے روحانی ارتقا کہتے ہیں جس میں انسان جو انتہائے مقصود کہلاتا ہے اپنے روحانی ارتقاء کے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ اور آخرکار ذاتِ حق کے وصال سے مشرف ہو جاتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جسے "فنافی اللہ" کہتے ہیں اور کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِھَا یعنی "ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے" کی منشا پوری کرتا ہے۔ یہ مقصد اپنی انا کو زیر کرنے اور اپنی تمام نفسانی خواہشات پر قابو پانے کے بعد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے صوفیاء نے راہِ طریقت کو پسند کیا ہے۔ جسے اپنا کر انسان اُس راہِ عشق کا راہی بنتا ہے جہاں جنون و سرور، کیف اور مستی انسان کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ بیشک یہی وہ کیمیا ہے جو مٹی کو اکسیر بنادے اور معشوق حقیقی کا طالب اپنے مطلوب کے دیدار سے مشرف ہو۔ اسلام کے سبھی بڑے صوفیائے کرام کا یہی مسلک اور یہی ان کی تعلیم تھی۔ اور یہی کچھ ہماری صوفیانہ شاعری کی بنیاد تھی۔ جو عربی اور فارسی زبانوں میں شیخ اکبر ابن عربی سے لے کر عطار، غزالی، سنائی، رومی، سعدی، حافظ اور جامی تک سبھی میدانِ شاعری میں اسی ڈگر پر گامزن رہے تھے۔ اور انہی کے افکار و تعلیمات سے پشتون صوفیا نے فیض حاصل کیا ہے۔ لیکن صوفیا کا وہ گروہ جو فرار اور ناامیدی کا درس دیتا تھا اور ترکِ دنیا اور ترکِ عمل کے راستے پر عمل پیرا تھا۔ انکے اثر سے بھی پشتو ادب بچ نہ سکا دنیا کی ناپائیداری، بے غمی، بےخودی، جبر و قدر، توبہ و استغفار کے موضوعات وغیرہ وہ مضامین ہیں جو ایک نئے انداز میں پشتو ادب میں صوفیانہ شاعری کی راہ سے ہو کر آئے۔

جیساکہ کہا گیا ہے اسلامی دور میں پشتو ادبیات کا پہلا حصہ، مناجات، حمد اور دعاؤں کا دور ہے۔ اس دور کے صاف ستھرے افکار میں خلوص اور سادگی تھی۔ اس میں شیخ بیٹنؔ کی مناجات سے لے کر شیخ اسمٰعیل ملک یار غرشین، قطب الدین بختیار کاکی، شیخ متی سڑبنی اور اکبر زمینداوری کے پند و نصائح اور عارفانہ

افکار کا ایک پُر لطف سلسلہ قائم ہے۔

"شیخ متی کا تصوّف"

ان میں شیخ متی سرِ بنی وہ عارف گذرا ہے جس نے پشتو ادب کو دریائے تصوف سے سیراب کیاہے۔ افغان محقق حبیبی اسکے بارے میں یوں رقمطراز ہیں "شیخ متی اپنے زمانے کے تصوف سے واقف شخص تھے۔ اور اُن کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے عرفان و تصوف میں پختہ افکار پیش کئے اور وہ پشتو کے صوفی شعراء کے گھرانے کے امام گردانے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ان کی فکر اور طرز کے بہت سے اشعار روشانیوں عبدالقادر خان خٹک، رحمان بابا اور دوسرے کئی شعراء کی طرف سے پیش کئے گئے ہیں۔

شیخ متی کے اشعار کا جو نمونہ "پٹہ خزانہ" کے مؤلف محمد ہوتک نے اسکی کتاب " د خدائے مینہ" سے نقل کیا ہے۔ اُس کا صوفیانہ اور عرفانی رنگ یکسر منفرد حیثیت رکھتا ہے، اسکی شاعری کا یہ نمونہ جمالیاتی افکار و نظریات کا ترجمان ہے وہ وجود کائنات میں حُسن و جمال کا تماشائی ہے اور اس مادی دنیا میں حسن معنوی کی نشاندھی کرتا ہے۔ جیسے کہ کہتا ہے۔ ؎

پہ لویو غرو نو هم پہ دشتو کښے
پہ لوے سھار پہ نیمو شپو کښے
پہ غارہ غږ او پہ شپیلکو کښے
یا د ویرژلیو پہ شپیلو کښے
تہول ستا د یاد نارے سورے دی
دا ستا د مینے ننداری دی

کہ نمر رو ښانہ مخ ښیئن دے
یاد سپوږمئ تندے وریږدے
کہ غر دے ښکلے یو ځمین دے
لکہ هندارہ مخ د سین دے
ستا د ښکلا دا پلوشہ دہ
دائے یو سپکہ ننداره ده

خاوندہ ښکلے ستا جمال دے
ښکاره دے لوے پہ لوے کمال دے
کہ ورځ کہ شپہ کہ پیری کال دے
ستا د قدرت یکے مثال دے

ستا د لوړ ونو یو ځنړا ده ... د لته چه جوړه تماشا ده
زړه ځے د ستا د مینے کوړدے ... سوے دعشق په سوزندہ اور دے
ډیرے وتاته ستا په لوړ دے ... بے لدے هیڅ دے ورکہ ځے پیلوړ دے
ستا د جمال په یدو بنیاد دے ... که نه وی دغه نوړ برباد دے
نه هسک نه زمکه وه تو ړ تم وو ... تیاره ځوره وه تورل عدم وو
نه دا ابلیس نه آدم وو ... ستا د جمال سوچه برتم وو
چه څو ښکاره ښکلے د نیا شوه
د پنځ په لوری ئے د نړا سوه

"د بڑے پہاڑوں اور دشتوں میں، روشن صبح اور اندھیری راتوں میں گیتوں اور تانوں میں ۔نے کی سُریلی اوازوں میں ۔ بادلوں کی گھن گرج میں سب تیرے ہی یاد کا واویلا ہے ۔ اور تیری محبت کے نظارے ہیں۔
اگر سورج روشن اور اُس کا چہرہ سفید ہے یا چاند کا ماتھا چمکدار اور اگر پہاڑ خوبصورت اور پُر عظمت ہے اور دریا کا چہرہ شیشے کی طرح شفاف ہے، تو یہ تیری رعنائی کی کرن ہے اور یہ تو تیرا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔
اے پروردگار تیرے حسن کا پرتو بہت خوبصورت ہے اور تیرا کمال ہر سو آشکار ہے ۔ دن رات ۔ صدی یا سال سبھی تیری قدرت کی ایک چھوٹی سی مثال ہے ۔
یہاں جو تماشا نظر آرہا ہے در اصل ہر سُو انوار الٰہی کی ایک جھلک ہے ۔ میرا دل تیری محبت کا مسکن ہے ۔ جو عشق کے آتش سوزاں میں مجسم ہو چکا ہے ۔ اُس کی دھڑکن کا رُخ تیری طرف ہے ۔
اس کے (محبت) بغیر یہ دل کچھ بھی نہیں اور بے مصرف ہے تیرے جمال کو دیکھ کر میرا دل خوش ہے ورنہ تباہ و برباد ہے۔
نہ آسمان تھا اور نہ یہ زمین تھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا ۔ اور سب کچھ عدم تھا نہ شیطان تھا، اور نہ آدم اور صرف تیرے جمال کا دبدبہ تھا ۔ جب یہ خوبصورت دُنیا منصہ شہود پر آئی تو تیری تخلیق کیطرف تیرا نور منعطف ہو گیا ۔"

مختصر جائزہ

جمال حقیقی کے تصورات پر پشتون صوفیا کے افکار کی بنیاد بھی قائم کی گئی ہے۔ اور ان کے افکار میں بھی کائنات کے سبھی نظاروں کے حسن اور رعنائی کا سبب فقط ایک ہی (ذات باری تعالیٰ) ہے۔ اور انجام کار روحِ انسانی نور کے جس سرچشمے سے فیضیاب ہوتی ہے، اس کی طلب اور کشش اس کی روح کی نشوونما اور ارتقا کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح جمال حقیقی کے فرود اور روح انسانی کے ارتقا کی وہ قوسین بنتی ہیں جس کا ماویٰ و ملجا تہنیتِ وصال پر منتج ہوتا ہے۔ اس میں ابتدا اور انتہا کے مابین جو واردات اور کیفیات صوفیا کے دل، نظر اور روح اور تمام حسیات پر گزرتی ہیں۔ وہی واردات انکی شعر و شاعری کے موضوعات بنتے ہیں۔ اسے عشق کہتے ہیں۔ یہ دراصل حصولِ نور کا وہ جذبہ ہے جس سے اخذ کرنے والے کے ایجاب و قبول کی استعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی عمل روح کے تنزلی مدارج کے ساتھ جاری رہتا ہے اور اسی پر حقیقی اور مجازی عشق کے مدارج بھی متعین ہوتے ہیں لیکن عشق جس رنگ میں بھی ہو فیض کمال سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو ان کا یہ نظریہ ہے کہ۔ ؎

که مجاز که حقیقت دے
محبت واړه دولت دے

"مجاز ہو یا حقیقت محبت سراسر دولت ہی دولت ہے۔"

ویسے تو پشتو ادب میں عشقیہ شاعری کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے جذبات کی ترجمانی انسانی فطرت کا جزو ہے جو روزِ اول سے سرشتِ انسانی میں گوندھا گیا ہے لیکن جب یہ ادب اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوا اور اس خطے میں بھی معرفت اور سلوک کا فیض عام ہوا تو پشتونوں کے فکر و نظر کے میدان میں بھی وسعت پیدا ہوگئی اور اس طرح ادب اور عروضی اصناف کے ساتھ ساتھ وہ صوفیانہ افکار و خیالات بھی سامنے آئے جو صاحبانِ طریقت نے عربی و فارسی ادبیات کو دئے تھے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم صنف جسے پشتو ادب نے اپنایا ہے غزل ہے، جو فارسی کے راستے سے ہوکر

پشتو میں داخل ہوئی ہے ۔ اور اُس کی عروضی ترکیب و ترتیب بھی عملاً اس طرح سے رکھی گئی ہے ۔ ویسے تو معشوقہ کے ساتھ شعر کی زبان میں راز و نیاز کی باتیں پشتو شاعری میں عرصہ دراز سے موجود تھیں ۔ عربی میں غزل کی منشا اور غرض وہی ہوتی ہے جو پشتو کے شفاہی ادب کے بہت سے اصناف مثلاً ٹپہ ۔ لوبھہ ۔ نیمکئی اور بَدَلہ پورا کر سکتے تھے ۔ لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کے ساتھ جب غزل کی یہ صنف پشتو ادب میں آئی تو اس نے ادب کے انداز تغزل کو بدل ڈالا اور ایک تقلیدی صنف اس طور سے اپنائی گئی جس کی ساخت و پرداخت اور زمین ایرانی اور افکار و خیالات افغانی تھے ۔

جناب امیر حمزہ شنواری اس بارے میں لکھتے ہیں کہ " فارسی غزل میں محض تغزل ہے ۔ اس میں قومی روایات کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی ۔ اگر فارسی غزل کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو قارئین سمجھ نہیں سکیں گے کہ یہ غزل کس قوم اور کونسی ملّت کے شاعر کی ہے ۔ مگر اس کے برعکس پشتون شعراء نے فارسی غزل سے استفادہ تو کیا ، لیکن اس میں افغانی روح کی جھلک اُجاگر کردی اور اگر پشتو غزل کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو قارئین آسانی سے یہ محسوس کرلیں گے ۔ کہ یہ پشتون قوم کے کسی شاعر کا کلام ہے ۔"

"تصوّف پشتو غزل میں"

پشتو غزل کی ان بنیادی خوبیوں کے علاوہ شاعری کی اس صنف میں پشتون شعراء نے معرفت و سلوک کی سبھی باتیں اور عشق و عرفان کی تمام واردات ، کیفیات اپنے مخصوص رنگ اور انداز میں بیان کی ہیں ۔ اسی طرح جو غزل آٹھویں صدی ہجری میں فارسی کے راستے سے پشتو میں آئی ہے ۔ اُس کا دامن تصوّف کے موتیوں سے اٹا پڑا ہے ۔ اکبر زمینداوری غالباً پہلے شاعر تھے جنہوں نے پشتو زبان کو پختہ اور معیاری غزل عطا کی اور پشتو کو وہ افکار و تصورات دیئے جو ایرانی شعراء نے فارسی غزل میں عموماً پیش کئے تھے ۔ اکبر کی یہ غزل اس صنف کی ایک خوبصورت مثال ہے ۔ ؎

چہ مدام زۂ ستا دمخ و تہ نظر ورم   د بیلتون لہ ویرے زرۂ زیرو زیر ورم

کڅُ په ما دِ حکم اوشي چه خادم شه — دغه ستا د لغړي سور انګار په سر وړم

چه جمال په مهر و مینه را ښکاره کړے — شین طوطي شم په هوا دِ مینې بوړم

چه ګفتار دِ په بشه مینه را ته اوشي — بے بها ئي شم کوټے کوټے د ډکوهر وړم

کڅُ مے وژنے کڅُ مے پریږدے رضا ستا ده — ستا د غشي ته مدام موخه ځیګر وړم

چه جمال دِ په هجران کښے راپه یاد شي — هغه دم په تصور شمس و قمر وړم

ستا د تورو و ځنو و خیال هسے طویل دے
تل په زړهٔ کښے دغه فکر زهٔ اکبر وړم

"جب سے مجھے تمہارے چہرے پر نظر ڈالنے کی عادت ہوگئی ہے تو ہجر و فراق کے ڈر سے میرا دل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اگر تو مجھے یہ حکم دے کہ میرا غلام بن جا تو میں تمہارے چولہے کی دہکتی ہوئی آگ کو اپنے سر پر اُٹھالوں گا۔ جب تو مہر و محبت کے ساتھ اپنا جمال دکھاتا ہے تو خوشی کے مارے میں سبز طوطی بن کر محبت کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوں اور جب پیار و محبت سے تم مجھ سے باتیں کرتے ہو تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ڈھیروں موتی میرے دامن میں ڈالے گئے ہوں۔ چاہے تو مجھے قتل کر دے یا چھوڑ دے تیری رضا ہے۔ میں نے تو یہ دل ہمیشہ سے تیرے تیروں کا ہدف بنا رکھا ہے۔ جب ہجر میں تمہارا جمال یاد آجاتا ہے تو اُسی وقت سورج اور چاند کا تصور اپنے دل میں لے آتا ہوں۔ تیری زلف سیاہ کا تصور اِس قدر طویل ہے۔ کہ مجھے (اکبر کو) اُس کی فکر سدا دامنگیر رہتی ہے۔"

یہ نہیں کہ صوفیانہ انداز شاعری کو صرف غزل ہی میں جگہ ملی بلکہ یہ ہمارے شفاہی اور کتابی ادب دونوں میدانوں پر چھاگئی اور اُن واردات و کیفیات کی ترجمانی شروع ہوئی، جس نے اہل سلوک و طریقت کے جذب و عرفان کے وقت اُن پر اپنا غلبہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ پشتو ٹپہ بھی اُسی وصف سے مزین ہوا۔ اور عارفوں نے ڈنکے کی چوٹ کہا ؂

ستله د ننر آسمان ته لاړه
ماچه د ستا حُسن د نمر سره تالنه

" جب میں نے تیرے حُسن کو سورج کے ساتھ تولنا چاہا تو سورج کا پلڑا آسمان سے جا لگا "

اور جب فارسی شعراء نے یہ کہا ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ‘   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

" تو نے اپنی قیمت دونوں جہاں بتا دی ، لیکن خدا را اپنی قیمت کچھ اور بھی بڑھا دو کیونکہ اس قیمت پر تو بہت ارزاں ہے "

پشتو نخوا کے سالک نے کہا ؎

چہ سرو مال پہ تا قربان کرم
دا راتہ وایہ باقی دار بہ ثومرہ شمہ

" جب میں اپنا سر و مال تجھ پر قربان کر دوں تو پھر خدا را مجھے ذرا یہ تو بتا دو کہ میں مزید کتنا قرضدار رہوں گا "

یہی جذبات و افکار تھے جنہوں نے پشتو شاعری ایک ایسی ڈگر پر ڈالدی کہ فکر و نظر کی پینگیں بھی بڑھائیں اور ساتھ ہی جہان قلبی کے احوال بھی آشکارا کئے ۔

اِن واردات و کیفیات کے اظہار کے لئے انہوں نے بھی فارسی شعراء کی طرح مثنوی کے مسلسل انداز کو منتخب کیا ۔ اور اسی لئے مثنوی کو بھی پشتو میں منتقل کیا ، تاکہ دنیائے معرفت کے بیان و اظہار کا کام آسان ہو جائے ۔

پشتو میں مثنوی کی اولین بحر جسے آٹھویں صدی ہجری کے نامور شاعر اکبر زمینداوری نے پسند کیا تھا وہ بحرِ خفیف ہے جس میں سات ماتروں کا ایک ایک مصرع ہوتا ہے اور خاصی روانی و سلاست کا حامل ہوتا ہے ۔ اس انداز کا نمونہ یہ ہے ۔ ؎

زہ عاشق یم یار ھم نشین   میل ځہ نہ لرو تمیز
یو تر بلہ عاشقان یو   پہ خپل عشق کښے صادقان یو
یو پہ بل پسے رنځور یو   چہ نزدے نہ یو مهجور یو
عشق کۀ ښۀ دے کۀ بلا دے   پیدا کړے زمونږ مولا دے

کۀ غر نه کا عاشقان ثوک　　مړهٔ شی دوئ په دا جهان ثوک
نود به دواړه شهیدان وی　　کۀ ریښتنی مسلمان وی

" عاشق میں بھی ہوں اور میرا محبوب بھی۔ ہم دونوں میں مزید کوئی تخصیص نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے عاشق ہیں اور اپنے عشق میں صادق ہیں عشق کی وجہ سے ایک دوسرے کے پیچھے بیمار ہو جاتے ہیں۔ اور جب قریب نہیں ہوتے تو مہجور ہوتے ہیں۔ عشق چاہے اچھا ہے یا برا یہ میرے مولا کی تخلیق ہے۔ اگر عاشق و معشوق چپ سادھ لیں اور ایسی حالت میں مُہر بہ لب اِس دنیا سے چل بسیں تو اگر وہ سچے مسلمان ہوں تو دونوں شہید کہلائیں گے۔"

اس کے بعد مثنوی کی یہ بحر ایسی مقبول رہی کہ ہر دور کے اکثر بڑے شعراء نے اس بحر میں مثنویاں لکھیں ان میں سے بیشتر مثنویوں میں تصوف کے اسرار و رموز بیان ہوئے ہیں۔ اور پشتو ادب کے باغ کو ان رنگین پھولوں کے حُسن نے مزین کیا ہے۔ لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی غزل کو اِس لحاظ سے زیادہ فوقیت دی گئی ہے۔

دسویں صدی ہجری میں علی سرور لودھی کے عرفانی افکار بھی پشتو غزل میں پیدا ہوئے اور اس وقت کے عارفوں کے لئے باعث کیف و مستی بنے رہے جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ ـــ

محبت پیالہ مے نوش کړه په مجاز کښے　　د حق نور وینم په سترګو د ایاز کښے
درست وطن راته دریاب شو مے دیلا نه　　دیدمے نشی مګر خدائے مے سبب سازکی
کۀ زهٔ مړشم هم لګوړ کوم ما پورته　　ناګهان چمے دلبر پورته آواز کی
کښے سر غوڅ د رقیب په تیرهٔ تیغ شی　　هم په خُم کۀ دلبر غوښت په مهر و نازکی
زهٔ او یار مدام ناست یو یو له بله　　په غماز دِ بارے کانړے د غم ساز کی
ګران بیلتون په د هغو مینو وینه
چه ناست وی په خلوت کښے سره نازکی
اے سرور له غمازان شو مے حسا به
پاک الله دِ ئے صورتیے مغز ه پیا زکی

جب میں نے عشقِ مجازی میں عشقِ حقیقی کا پیالہ نوش کیا تو چشم ایاز میں مجھے نورِ حق دکھائی دیا۔

محبوب کی دید کے بغیر سارا وطن میرے لئے سمندر بن گیا۔ اب اُس کا دیدار اگرچہ میرے لئے کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا مگر کارساز تو خدا ہی ہے۔

اگر مر بھی جاؤں تو قبر سے اُٹھ کر دیکھوں گا۔
اگر اچانک میرا محبوب مجھے آواز دیکر پکارے۔

چاہے رقیب کے تیغ تیز سے میرا سر کٹ بھی جائے لیکن اگر میرا محبوب مجھے مہر و ناز سے بلائے تو میں ضرور اُس کے پاس جاؤں گا۔

میں اور میرا محبوب ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر وہ اس سے ناخوش ہے تو خدا کرے کہ غماز پر غم کے پتھر برسیں۔

ان دو محبت بھرے دلوں کی جدائی بڑی شاق ہوگی۔ جو ہمیشہ خلوت میں بیٹھکر ایک دوسرے کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف رہے ہوں۔

اسے سرور چغل خور بہت زیادہ ہوگئے ہیں جو چغلی کھاتے ہیں خدا کرے وہ لوگ بے مغز پیاز کی طرح بیکار بن جائیں۔

"زوال کی پہلی لہر"

صوفی شعراء کا فیض پشتو ادب پر اسی طرح جاری رہا۔ اور اس زبان کا دامن ادب آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا کہ سرزمین ہند پر پشتونوں کی جہانبانی اور سلطانی کا زمانہ انحطاط پذیر ہوا۔ یہ لودھیوں کے زوال اور بابر کی فتح کا زمانہ تھا۔ بابر مغل تھا وہ اُس سلطان الغ بیگ کا بھتیجا تھا جو پشتونوں کے ساتھ عداوت اور مخاصمت پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ پشتونخوا کو پائمال کرنے کا طریقہ بابر نے اپنے چچا اُلغ بیگ ہی سے سیکھا تھا اور اسی ارادے سے تخت دہلی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اُس کے لئے یہ کوئی مشکل کام بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ سرزمین پشتونخوا پہلے ہی سے اُسکے زیر تصرّف تھی، اور لودھیوں کی کمک کا سلسلہ بھی بند کر دیا تھا۔ اُس نے اس غرض کی تکمیل کی خاطر پشتونخوا کے ہر قبیلے کے بزرگ کی رائے بھی معلوم کی تھی اور جب وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان میں ننگ

اور استقلال کی وحدت باقی نہیں رہی تو نہ صرف یہ کہ دولت خان لودھی کو اپنا طرفدار بنایا بلکہ دوسرے پشتون سرداروں کو بھی اپنی طرف مائل کیا اور اُن کی کمک اور امداد سے ایسے اقدامات کئے کہ ہند میں پشتون حکومت زوال پذیر ہوئی۔ خوشحال خان کہتا ہے ؂

بیا لہ پسہ د دھلی بادشاہ بابر شو
چہ ئے کار د پښتانہ پہ برکت وو

"اسکے بعد بابر دہلی کا بادشاہ بنا۔ اُس کی یہ آرزو خود پشتونوں ہی کی بدولت پوری ہوگئی۔"

یہ وہ دور تھا کہ پشتون قوم زوال کے ساتھ ساتھ نا اُمیدی ڈر، فرار اور گریز کی راہ پر چل پڑی تھی۔ اس کی ابتداء الغ بیگ مغل کے دور میں ہوئی تھی۔ یوسف زئی اور گگیانڑی قبائل کے اختلاف سے اِس مغل بادشاہ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا[1] اور یوں ان قبیلوں کی طاقت ختم کردی۔ اور اُن کی حمیت اور قرابت داری کو دشمنی اور بغض و عداوت میں تبدیل کر دیا۔ تواریخ افاغنہ کے مصنف خواجو یلزی نے یہ واقعات پوری تفصیل سے پیش کئے ہیں۔ اور پیر معظم شاہ نے اسکے حوالے سے تواریخ حافظ رحمت خانی میں نقل کئے ہیں۔

ان تاریخی حوادث اور انقلابات کے زمانے میں ملک سلیمان شاہ رزڑ مندنڑ یوسف زئی، شیخ ملی بن پیر کی اکازئی مندنڑ، یوسف زئی اور خان کجو ابن قرا خان اس قوم کی سرداری اور رہنمائی کرتے رہے اور ان کی سرکردگی میں ایک طویل اور مسلسل کشمکش کے بعد وہ پشاور سوات، بونیر، دیر اور باجوڑ کے علاقوں میں آباد ہوگئے۔ ان واقعات کا دستاویزی ثبوت مذکورہ تواریخ افاغنہ ہے۔ جو تاریخ خان کجو کے نام سے بھی مشہور ہوئی اور پیر معظم شاہ نے اِس کی تلخیص تواریخ حافظ رحمت خان کے نام سے کی ہے۔ اس کتاب کے متن میں اِس بحرانی دور کے بعض منظوم ادبی نمونے بھی موجود ہیں۔ جو فنی لحاظ سے پشتو کے اِس شفاہی ادب کے اصناف سے زیادہ قریب ہیں جو اِس زمانے میں فارسی سے ماخوذ عروضی ادب کے ساتھ متوازی طور پر جاری تھے۔ ان منظومات کی طرز یا تو اس قسم کی ہے جیسے کہ چوتھی صدی ہجری کے شعراء یعنی رضی لودھی اور نصر لودھی کے کلام میں ہم نے دیکھی ہے۔ ان میں بعض خرشبون

---

[1] تواریخ حافظ رحمت خانی پیر معظم شاہ۔

کے نمونوں کی طرز کے ہیں ۔ اور بعض ایسے ہیں جو اپنے منفرد انداز میں ہیں ۔ اشعار کی صنفی مشابہت کے پیش نظر یہاں نمونے پیش کرنا بے جا نہ ہوگا :-

رضی لودھی کی طرز سنہ [illegible]ھ

د الحاد پہ لور دے تو پلل گروہ د زموږ د کور اوہ
موږ رو تړلے پہ زیارنہ تاپہ تور و تور اوہ
لوغون ولے گوھید سے
چہ دِ گو بنے لړا وہ
ھغہ گروہ دِ اوس لرہ کړو
چہ پلرو دِ روښا وہ
لودی ستاپہ نامہ سپک شہ
کړ ھر ځو درنا وہ
نصرہ نمسے لہ کہالہ
لودی نړۍ پہ کاوہ
زموږ رغا دہ ستا لہ گروہ
د ورځ لوے پہ رغا وہ

خواجہ ملیزی کی طرز سنہ ۱۰۳۲ھ

ځار تر خدایہ شم پہ دا ھسے قدرتونہ
چہ آدم توا لانہ وو تالہ کښل قلمونہ
قدر تونہ دِ ښکارہ کړہ
تا پیدا کړو اووہ زمکے آسمانونہ
دغے زمکے قرار نہ کړو
تا پرے کیښول درانہ درانہ لوے غرونہ
تو دے غرونو دیر درانہ دی
معتبر د دیت مرونہ
د مرونو ځلے دِ جوړ کړو د گور غارہ تنگونہ
ھغو ځلے لرہ بہ ورشو چہ نہ لار لری نہ ورونہ
یوہ ورځ بہ پکښے بند شو تر قیامت بہ پکښے یونہ
لوغوتی سر پښتی چہ د یوسفزو د وکوم ملکونہ
ملکے نشکے میندے کاړکے
غور یا خیل کڼ تر اوسہ پیغور ونہ
غور یا خیل پیغور مکړہ تہ ښځے یئ سرہ ورونہ
ښځے ستا لہ لاسہ راغے
ھالہ تہ زورہ ور دے پہ مرونہ

رضی لودھی کی طرز کے حوالے کا ترجمہ اُس کے ذکر میں موجود ہے ۔

خواجہ ملیزی کی طرز ۱۰۳۲ھ :- "اللہ کی قدرتوں کے قربان جاؤں جب آدمؑ اور حواؑ تک نہ تھے تُو نے قلم اُس وقت بنائے اپنی قدرت ظاہر کی اور سات زمین اور آسمان پیدا کئے۔ زمین کو قرار حاصل نہ تھا تو تُو نے اس پر بڑے اور بھاری بھرکم پہاڑ رکھدیئے۔ لیکن دین کے جبور و غیور معتبرین اِن پہاڑوں سے بھی زیادہ صاحب عظمت و جلال ہیں۔ اس فانی انسان کو انجام کار تُو تنگ اور تیرہ و تار قبروں کے حوالے کرتا ہے۔

ہم سب ایک دن اُس جگہ پہلے جائیں گے جس کا نہ تو کوئی راستہ ہے اور نہ دروازہ۔ آخرالامر ہم سب اُس میں جاکر بند ہو جائیں گے اور پھر تا قیامت وہیں رہیں گے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ یوسف زیئوں کے ممالک کو نسے تھے۔ اُن کا ملک تو شکی اور گھر گاڑہ میں تھے۔ غوریہ خیل ابھی تک لعن طعن کر رہے ہیں غوریہ خیل ملامت نہ کرو۔ تم اور خشے تو آپس میں بھائی ہو۔ خشے تیرے ہاتھوں ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لئے کہ تو اُس زمانے میں زیادہ طاقتور تھا۔"

اسی طرح خرشبون کے نعرے اور خان کجو کے ایک معاصر اردو قوال کا وہ "غریبہ" جو خواجہ ملیزئی نے نقل کیا ہے اور اسی کے حوالے سے پیر معظم شاہ نے تاریخ حافظ رحمت خانی میں محفوظ کیا ہے۔ آپس میں بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ کہتا ہے ؎

خرشبون کا نارہ	اردو قوال کا غریبہ
بیلتانہ نارہ دے وسوہ پہ کوہ بانددے	خان کجیو د قیا زویہ
نۂ پوهیږم چہ بہ څۀ پیښ شي پہ وراندے	خیمہ دِ کړه ولاړ لویہ
دہ خپلوانو نۂ بیلیږم پہ سرستن کو	اوس پہ هر شان شیخ تپور تہ ستاتلۂ بویہ
دوارہ سترگے مے پہ ویښو دي ژړاندے	او کۂ نۂ وي دا خیمہ بہ دِ پیغور شي ترلوغو یہ

خرشبون کے ذکر میں اس "نعرے" کا ترجمہ موجود ہے۔ اردو قوال کے "غریبہ" کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"قرار کے بیٹے خان کجو تُو نے بڑا خیمہ تان لیا۔ اب ہر لحاظ سے شیخ تپور کو تمھارا کوچ کرنا لازم ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو بالآخر یہی خیمہ تمھارے لئے باعث ملامت بن جائیگا۔"

شیخ عثمان کے نوحے حسن ابن چینگا کے دوہے اور ملک سلیمان شاہ کی رباعیاں اُس دور کے ادب کے

دلچسپ نمونے ہیں جن کی طرز اور جن کا انداز پشتو کے قدیم ملی اصناف کا ہے۔ کہتے ہیں کہ شیخ عثمان بن موتی یلیزئی اپنے وقت کے صاحب کشف و کرامات اولیاء میں سے تھے۔ اور سارے یوسف زئیوں میں بڑے معتقد اور محترم تھے۔ اُن کے مکاشفات کا ذکر تواریخ حافظ رحمت خانی میں نقل ہوا ہے۔ انہی مکاشفوں میں سے ایک اُس تاریخی واقعے سے وابستہ کیا گیا ہے جس کے انجام میں انہیں یوسف زئیوں کے دوسرے بزرگوں سمیت جن میں ملک سلیمان شاہ منڈڑ بھی شامل تھا قتل کردیا گیا تھا یہ قتل عام سلطان الغ بیگ کے ہاتھوں ہوا تھا، قتل سے کچھ دیر پہلے شیخ عثمان نے جو "غریبہ" کہا تھا وہ یہ تھا:-

چه دا دود میرو لیدهٔ
بلغاک ۓ آزویدهٔ
دخدای په کروۓ وس نهٔ رسیدهٔ

" اہل دل پیش آنے والے واقعات سے باخبر تھے یہ بازگشت اُنکے کانوں کو سنائی دے رہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے کاموں پر کسی کا کوئی بس نہیں چلتا۔"

اور جب جذبۂ انتقام و عداوت میں یوسف زئی بزرگوں کے قتل کے موقع پر حسن بن چنگانے یہ کہا کہ:

لکه وایُو هسے دینه | لاس ترلی خدای راکړی
اوس مو وژنو لکه مږو

" جیسا ہم کہتے ہیں ویسے ہی ہے۔ بندھے ہوئے ہاتھوں سے تم کو خدانے ہمارے حوالے کیا۔ اب ہم تمہیں بھیڑ بکریوں کی طرح مارتے ہیں۔"

ملک سلیمان شاہ جو یوسف زئیوں کا بزرگ بلکہ تمام خبشی کا سردار مانا جاتا تھا، نے جواب میں کہا:

کهٔ جنګ وے په یرغونه | تهٔ به را نغلے په مړونه
لکه ۓ لاس ترلی درکړو | اوس مو وژنه لکه مږونه

" اگر جنگ تیز رفتار گھوڑوں پر ہوتی تو تمہارے لشکر کو ہمارے سامنے آنے کا یارا نہیں تھا۔ اب جب ہاتھ باندھ کر ہمیں تمہارے حوالہ کر دیا گیا۔ تو تو بیشک اب ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر۔"

"اس انحطاط میں رجز و حماسہ"

اُس زمانے میں رجزیہ اور حماسہ "خگونہ" عام تھے اور جنگ اور حملوں کے دوران میں اس قسم کی شاعری جوش اور جذبے کو اُبھارنے اور ڈرانے دھمکانے کے موقع پر کی جاتی۔ تاریخی شہادتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ ہند میں پشتونوں کی سلطنت روبہ انحطاط تھی۔ اور پشتونخوا پر بھی مغلوں کی بالادستی ایک حد تک قائم ہو چکی تھی۔ افراد کی جسارت کا انفرادی جوہر ابھی تک کاٹ کے قابل تھا اور روز بہ روز ننگ وشجاعت کی شاندار روایتوں میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اگرچہ اُن کی ملی آرزوؤں کی جگہ ان کی حمیت اپنے قبیلے اور اپنے طرفداروں تک محدود ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی جیساکہ خوشحال خان بابا نے کہا ہے ؎

ننګيالي دي چه يادېږي ۔۔۔ په سندرو هم په ویس

"غیور ہی تو ہوتے ہیں۔ جنہیں گیتوں اور بین میں یاد کیا جاتا ہے۔"

ان کا ہر ایک جوان ننگ قبیلہ پر سر قربان کیا کرتا۔ اسی لئے تو دادی ملیزئی کی طرح اسے اپنے قبیلے کا نور چشم اور راحت جان سمجھا جاتا، اور اُسے قوم کا غیور اور جسور خیال کیا جاتا، جیسے گیتوں میں یاد کیا جاتا جیسے دادی ملیزئی کے بارے میں کہتے ہیں ؎

که د نورو نېزې لنډې ۔۔۔ د دادي نېزه ده لويه

که هر څو سواره ډېر شي ۔۔۔ د دادي ورتله څو بويه

"دوسروں کے نیزے چھوٹے بھی ہوں مگر دادی کا نیزہ تو بڑا ہے۔ دشمن کے سوار چاہے جس قدر بھی زیادہ ہوں مگر دادی کو تو میدان میں نکل کر دادِ شجاعت دینا ہی ہے۔"

درحقیقت یہ جوانمری اور شجاعت The Age of Chivalry کا دور تھا لیکن افسوس کہ اس دور کے بہت کم حوالے پشتو شعر میں محفوظ ہیں اور یہی وجہ سے اِس دور کے پشتو ادب کا ستارہ مقابلتاً کچھ مدہم سا دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی تمام شاعری ملی اوزان میں کی جاتی تھی اور اُس کے بقاء اور دوام کا انحصار لوگوں

کی قوتِ حافظہ پر تھا۔ اِس دور میں نہ تو پشتونخوا میں ایسا کوئی موجود تھا کہ اُس وقت کے شعائی ادب اور ملی گیتوں کو محفوظ کرتا اور نہ کوئی مستشرق کسی ڈارمسٹیٹر کی طرح اس ارادے سے نکلا۔ کہ انیسویں صدی کے ملی چار بیتوں اور منظومات کی "بہار و بہار" کی طرح اُس وقت کے پشتو حماسی شعروں کا ایک اور "بہار و بہار" مرتب کرتا۔

"ملّی آرزوؤں کا زمانہ"

پشتونوں کی ملی آرزوؤں کے اعتبار سے یہ دونوں ادوار ایک دوسرے سے مشابہہ تھے۔ اس لئے کہ پہلے زمانے میں مغلوں اور بعد میں سکھوں اور انگریزوں کی چیرہ دستیاں تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ متقدمین کو مسلمان ہونے کا دعویٰ تھا۔ اور متاخرین یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ اُس دور کے حالات اور واقعات سے جو نتایجُ مرتب ہوئے اُن میں سب سے اہم نتیجہ یہ تھا کہ پشتونوں میں قومیت پرستی کی آگ کی چنگاریاں تازہ ہوگئیں اور وہ احساس جس نے غوریوں کے زمانے میں غزنیوں کے خلاف جہانسوز علاء الدین کے جذبات اُبھارے تھے۔ اور حکومت غزنوی کا خاتمہ کیا تھا۔ ایک دفعہ پھر ایک نئے روپ میں بیدار ہوا۔ لیکن اِس دفعہ اِس کا رشتہ اور تعلق نہ تو کسی شاہی گھرانے سے تھا اور نہ محض یہ ایک سیاسی تحریک تھی۔ جو انتقام لینے یا تاج و تخت کی دعویداری تک محدود رہتی۔ یہ تحریک جو آج تک روشنیہ تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے دراصل نیم سیاسی اور نیم مذہبی تحریک تھی۔ جو عوام سے اُٹھی تھی۔ بایزید روشان (پیر روشن یا پیر تاریک) جس کا اصلی نام بایزید انصاری تھا، اس تحریک کا بانی تھا۔ وہ اپنے مسلک کو روشانی مسلک کہا کرتا اور اس لئے اپنے مریدوں میں پیر روشان کے نام سے یاد کیا جاتا اور اُس کے مخالفین اُسے پیر تاریک کے نام سے یاد کرتے۔

"بایزید انصاری"

پشتونخوا کے اس انقلابی مفکر کی تعلیمات ہادیٔ کامل کی رہنمائی کی ظاہری اور معنوی ہر دو لحاظ سے پیروی پر مبنی تھی۔

ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی اور رہبر سمجھتے تھے اور خود کو اُس پیر کامل سے نسبت دیتے جسے معرفت الٰہی اور توحید کے علم سے حصہ ملا تھا۔ اور اسی سبب سے اُسے پیر روشن ضمیر کہا جاتا۔ اور خود بھی پیر کامل کا دعویٰ کرتے تھے اور اپنے مریدوں کی نظر میں بقول پروفیسر مولانا عبدالقدوس "یہ اپنے زمانے کا پیر کامل تھا جو زمانے کی ہدایت کے لیے اللہ پاک کی طرف سے مامور کیا گیا تھا۔ اور باطنی طور پر تجلّی انوار الٰہی سے منوّر تھا۔"[۱] اور "حالنامہ" کے مصنف کا بیان ہے کہ مریدوں نے ہاتف غیبی کی آواز سُنی کہ" اسکے بعد بایزید کو پیر روشان کہا کرو" اور اسی الہام کی وجہ سے بایزید اس لقب سے مشہور ہو گئے۔

جو کچھ بھی تھا یہ مسلّم ہے کہ وہ قاضی عبداللہ انصاری کا بیٹا تھا جو ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء میں جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ عبداللہ نے اپنے دادا کی بھتیجی (جس کا نام بیبن تھا) سے شادی کی تھی اور اسی کے بطن سے میاں روشان پیدا ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں قیام پذیر پشتونوں کو مغل شک کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں ملک بدر کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ انہی حالات کی وجہ سے میاں روشان کی ماں بھی اپنے کمسن بیٹے سمیت جالندھر سے کانی گرم کو آئی۔ میاں روشان کا باپ عبداللہ ایک صالح و عابد شخص تھا۔ بایزید کی تربیت علم و فضیلت کے اعلیٰ طریقے سے شروع کی۔ پروفیسر حبیبی مراط التوحید کے حوالے سے کہتا ہے کہ بایزید خود کو مسکین کی نسبت دیا کرتے اور یہی اُس کا لقب مانتا ہے۔ بہر حال خود کو فقیر اور مسکین سے تعبیر کرنا صوفیاء کا قدیمی مسلک رہا ہے۔ اس لئے کہ اس سے عجز و انکسار کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ فقر و درویشی راہِ سلوک کا لازمہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فخر کیا ہے۔ اس لئے اِتباعِ سنتِ نبویؐ کی خاطر بھی صوفیاء کا اپنے آپ کو فقیر اور مسکین کہنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہی راہِ طریقت پر چلنے والوں کی منزل مقصود ہے۔

حبیبی نے دولت، کے ایک محشی دیوان کے حوالے سے مسکین کی تشریح یوں کی ہے:

" انسان قادر مطلق کی قدرت سے نطفے سے پیدا ہوتا ہے ماں کے رحم میں آتا ہے اور مُعلق ہو کر گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے۔ وزن حاصل کرتا ہے۔ دودھ پیتا ہے۔ بولنے لگتا ہے لڑکا بنتا ہے، بڑا ہو کر بالغ ہو جاتا ہے

---

[۱] دیباچہ خیر البیان مطبوعہ پشتو اکیڈیمی

کافر ہوتا ہے، مسلمان بن جاتا ہے۔ گناہ گار ہوتا ہے فرمانبردار، ذاکر اور بینا ہو جاتا ہے۔ آشنا کا قرب حاصل کر کے واصل ہو جاتا ہے اور واصل ہو کر خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ بیگانہ مسکین یگانہ بن جاتا ہے۔" اسی طرح یہ بشریت کے صفات سے خدائی صفات کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے روشانیوں کے مکتب فکر کی اصطلاح میں مسکین وہ ہے جو حیوانی صفات سے تزکیہ حاصل کر چکا ہو اور معراج عرفان سے متصف ہوا ہو۔

پشتو ادب میں قومی حمیّت

پیر روشان کی تعلیمات کے لحاظ سے اگر ایک طرف تصوف اور عرفان کی شمعیں ساری پشتونخوا میں روشن ہونی شروع ہوئیں تو دوسری طرف پشتو میں "پشتونولی" کی حمیت بھی بیدار ہو گئی اور وہ جذبات و احساسات شیخ اسمٰعیل اور خرشبون کے قرابت داری اور حمیت کے نوحوں، اسعد سوری کے مرثیے کا محبت بھرا انداز، شکاندوی کے حماسی قصیدے کے جذبات اور ملک یار غرشین کی یہ "غگونہ" ؎

ښتن مو مل دے — اوس مو پہ غل دے — هیواد د بل دے

غازیانو کوړئ — ښتن مو مل دے

تورے تیرے کړئ — دښمن مو پرے کړئ — منګولے سرے کړئ

څلہ پہ تینتئ — ښتن مو مل دے

کړ تینګ کړو زړونہ — پہ بری یؤ نہ — چہ زمری یؤ نہ

اسلام راڅخہ دے — ښتن مو مل دے

غازیانو راشئ — تول شاوخوا شئ — د شهاب پہ ملا شئ

دښمن مو غوڅ کړئ — ښتن مو مل دے

" خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم حملہ آور ہوا چاہتے ہیں۔ ملک پرایا ہے۔ اے غازیو! یاد رکھو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تلواریں تیز کر لو۔ دشمن کو کاٹ کر گرا دو۔ اور اپنے ہاتھ خون سے رنگ لو ہم آخر کیوں بھاگیں! خدا ہمارے ساتھ

ہے۔ اگر ہم اپنے دلوں کو مضبوط کر لیں تو فتح ہماری ہے۔ اس لئے کہ ہم شیر ہیں۔ ہمارے پاس اسلام ہے خدا ہمارا شامل حال ہے۔ غازیو! آؤ ملکر قریب ہو جاؤ۔ اور شہاب الدین کے ہاتھ مضبوط کر دو۔ اپنے دشمن کو کاٹ کر رکھ دو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے"

اس سے بھی ایک قدم آگے تایمنی کے اُس قصیدے میں جو غیاث الدین غوری کی ستائش میں کہا ہے اور بابا ہوتک کی اس نظم میں جو محمد ہوتک مؤلف "پٹہ خزانہ" نے اپنے اس بیان کے ساتھ "پٹہ خزانہ" میں محفوظ کیا ہے مذکورہ جذبات پورے طور پر عیاں اور مؤثر ہیں لکھتا ہے:۔ "تاتاریوں کی ایک لڑائی میں مسلمان تھوڑے اور کمزور تھے تاتاریوں کا ایک ہراول دستہ آیا۔ اور بابا ہوتک کے چند رشتہ دار چل بسے انہوں نے اونچی آواز سے یہ حماسی گیت سنا دیا اور یوں لڑائی میں اپنے نوجوانوں کی ڈھارس بندھائی۔ اُنہوں نے دشمنوں پر فتح پائی۔ وہ گیت یہ ہے ؎

پہ سوړ غر بل راته نن اوړ دے	وکړیہ جوړ راته پیغوړ دے
پہ کلی کوړ بانسدے مغل راغے	هم پہ غزنی هم پہ کابل راغے
غبنتلیو ننگ کړئ دا سو وار دے	مغل را غلے پہ تلوار دے
دے پبنتو نخوا کښے ناتار دے	پہ کلی کوړ بانسدے مغل راغے
اے د مرغے غبنتلیو را شئ	پہ ننگ و لاړ د پبنتو نخوا شی
توړے تیرے غشی تر ملا شئ	پہ کلی کوړ باندے مغل راغے
زلمو پہ غشو کړی وار و نه	د تیر و توړ و گذار و نه
ور ورانسدے کړئ خپل تتر ود	پہ کلی کوړ بانسدے مغل راغے
زما د زلمو دیخ بھیږی	مزکہ او غروړ د پرے سره کیږی
میرځی زغلی او ترهیږی	پہ کلی کوړ بانسدے مغل راغے
پبنتنو هلئ پہ غرۀ جنگ دے	سوړ غر پہ وینو د دوئ رنگ دے
محال د توړے دے د ننگ دے	پہ کلی کوړ باندے مغل راغے

زلمو په ننګ ځانونه مړهٔ کړئ   دشمن په غشي مو ييهٔ کړی
د پښتو نخوا مزکے ساتهٔ کړئ
په کلي کوربانده مغل راغے

سرخ پہاڑ پر الاؤ روشن ہے اور اے لوگو! یہ ہمارے لئے باعث طعنہ ہے کہ ہمارے گھر بار پر مغل حملہ آور ہوا ہے۔ غزنی اور کابل دونوں پر وہ چڑھ آیا۔ اے بہادر جوانو غیرت کرو کہ اب موقع ہے۔ مغل بہ سرعت تمام حملہ آور ہوا ہے پشتونخوا میں ہل چل مچی ہوئی ہے کہ ہمارے گھر بار پر مغلوں نے حملہ کر دیا ہے" مرغے "کے بہادر جوانو آؤ اور پشتونخوا کے ننگ و ناموس کے دفاع پر ڈٹ جاؤ۔ تیز تلواروں کے ساتھ اور تیر چلے پر چڑھا کر آجاؤ کیونکہ ہمارے گھر بار پر مغل حملہ آور ہوا ہے۔ اے جوانو تیر چلاؤ اور اپنی تیز تلواروں سے (دشمن پر) وار کرو۔ اور اپنی جانیں قربانی کے لئے پیش کر دو۔ ہمارے گھر بار پر مغل حملہ آور ہوا ہے میرے جوانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ اور زمین اور پہاڑ سرخ ہو رہے ہیں۔ دشمن ہراسان ہو کر بھاگ رہا ہے۔ ہمارے گھر بار پر مغلوں نے حملہ کر دیا ہے۔ پشتونو جلدی کرو کوہ سرخ پر لڑائی ہو رہی ہے اور پہاڑ جوانوں کے خون سے رنگین ہے۔ یہ موقع دادِ شجاعت دینے اور ننگ و حمیت کا ہے، ہمارے گھر بار پر مغل حملہ آور ہوا ہے۔ اے بہادر جوانو جاؤ اپنے ننگ و ناموس کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دو اور دشمنوں پر حملہ کر کے انکے جسموں کو تیروں سے چھلنی کر دو۔ پشتونخوا کی سرزمین کی حفاظت کرو کیونکہ ہمارے گھر پر مغل حملہ آور ہوا ہے"

پشتونولی کی حمیّت کے یہ "گیت" بہت پرانے ہیں۔ پشتونوں نے دشمن کے خلاف ہر محاذ لے اور اس کے مقابلے کے لئے ناموسِ خانہ، ناموسِ قریہ اور ننگ پشتونولی کا ہمیشہ بہت پاس رکھا۔ یہی انکی ملی اور قومی ننگ و حمیت تھی۔ اور جیسا کہ کہا گیا ہے پشتونوالہ میں بھی قومی حمیت کی بنیاد اسلام پر تھی اور اسی اساس پر متقدمین کے کلام میں قومی حمیت کا جو انداز پیش نظر رکھا گیا تھا، وہ درحقیقت اسلامی اخوت کی ایک صاف ستھری شکل تھی۔ جسے وہ اپنی اصطلاح میں پشتونوالہ کہا کرتے تھے۔ مغلوں کے مظالم کے خلاف سلطان الغ بیگ کے زمانے سے لیکر اکبر اعظم کے زمانے تک یوسف زئیوں کی مسلسل کشمکش اور اس کے بعد روشانیوں کی تحریک یوسف زئیوں اور مغلوں کا دوسرا اختلاف اورنگزیب کے بیٹوں کے خلاف جمال خان یوسف زئی کے معرکے۔ یہ تمام پشتونوں

کی قومی حمیت کے ادب پر اثر انداز ہوئے تھے۔ ان معرکوں نے مشہور کتابوں، تواریخ خان کجو، تواریخ حافظ رحمت خان، "تذکرۃ الابرار" اور "تاریخ مرصع" اور مزید برآں خوشحال بابا کی انقلاب انگیز نظموں کو جنم دیا ہے۔

لیکن یہ تحریکیں اکثر قبیلوی انداز کی ہوا کرتی تھیں۔ اگر ایک قبیلہ حکومت کے خلاف ہوتا تو دوسرا اُس کا ساتھی اور معاون ہوتا۔ جب ایک وقت میں اِس خطے میں روشانیوں کا غلبہ اور اثر بڑھ گیا تو اس قومی تحریک نے تکمیل کی راہ پالی اور اس میں محدودیت کی بجائے ہمہ گیریت پیدا ہوئی اُس طرح مغلیہ سلطنت اور پشتونوں کے مابین یہ تحریک ایک لمبی کشمکش کا باعث بنی جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک پشتون دہلی کی مغلیہ حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے۔

بایزید قندہار، وزیرستان، دوڑ، تیراہ، ہشتنگر اور یوسف زئی کے علاقے میں خود گھوما کرتا۔ اُس نے پشتونخوا کے اکثر پشتون قبیلوں کی طرف اپنے نائبین اپنے مسلک کے پرچار کے لئے روانہ کئے تھے۔ ایک طرف عقائد کے اختلاف کی وجہ سے پشتونوں میں مخالفت پیدا ہونے اور دوسری طرف مغلوں کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے اپنی آخری عمر میں بایزید ڈھائی سال تک خود عملاً برسرپیکار رہے۔

ان کی اولاد کچھ مدت تک کلپانی (ضلع مردان) علاقہ یوسفزئی پر حکمران رہی لیکن یہ دور بہت مختصر تھا۔ آخر یوسف زئیوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور مغلوب ہوئے۔ پروفیسر مولانا عبدالقدوس نے بایزید روشان کی وفات ۹۸۰ھ اور ۹۸۹ کے درمیان قیاس کیا ہے لیکن جناب ایس ایم ظفر کے مطابق ان کی وفات کی زیادہ قرین قیاس تاریخ ۹۸۶-۸۷ھ کے لگ بھگ ہے۔

"دو متحارب تحریکیں"

اِس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پشتونخوا میں میاں روشان کی تحریک نے صوفیانہ شاعری اور پشتونوں کے قومی استقلال کو ترقی دی۔ اس تحریک کی برکت سے نظم و نثر کے ہر دو میدانوں میں پشتو کے تقلیدی اور تخلیقی ادبیات میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اس تحریک کی رو سے پشتونخوا میں عقائد کے لحاظ سے دو متحارب گروہ پیدا ہوئے۔ ایک

گروہ کی سربراہی حضرت سید علی ترمذی (عرف پیر بابا) کے خلیفہ حضرت اخون درویزہؒ کرتے تھے اور دوسرے کی پیشوائی میاں روشان کے خاندان کے افراد کرتے تھے اور اس طرح پشتو ادب میں عقائد اور تصوف کے موضوعات پر بہت اچھی اچھی اور دلچسپ کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں سے ایک بایزید انصاری کی مشہور و معروف کتاب "خیر البیان" اور دوسری حضرت اخون درویزہؒ کی کتاب "مخزن الاسلام" خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ بعد میں ان دونوں کتابوں کے تتبع میں بہت سی اور دوسری کتابیں لکھی گئیں۔

"بایزید کا علمی مقام"

بایزید انصاری کی کتاب "خیر البیان" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بایزید پشتو کے علاوہ فارسی عربی اور پنجابی زبانوں پر بھی عبور رکھتا تھا۔ اس نے اسلامی علوم، تفسیر، حدیث اور فقہ کا بھی کسی حد تک مطالعہ کیا تھا۔ فلسفہ اور عقلیات میں اُس نے دسترس حاصل کی تھی۔ وہ تصوف سے آشنا تھا۔ اور اُس وقت کی معقولات اور ادبیات کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ بایزید نے پشتو زبان کے رسم الخط کے لئے موزون حروف وضع کئے اور اُس کے بارے میں "خیر البیان" میں لکھا[1]

"وکښه هغه حرفونه چه په هغه ژبه سازېږي د فائدے د پاره د آدمیانو۔ تهٔ دا ناسے د هر څیز۔ ما نه زده بیرون حرفونو د قرآن او سبحان! د حرفونو کښل په تادی۔ د حرفونو ځر کندول او نمونے او بس دل په ما دی وکښه زما په فرمان په مانند د حرفونو د قرآن او کیږ ده په څینو حرفونو تهکی یا غروندی یا نوسے نښانے ئے له حرفونو۔ زر (یه) وپیژنی آدمیان څخه حرفونه څلور څلور وکښه عیات۔ زر یه سے زده کا چه سے لولی

---

[1] خیر البیان صفحہ ۲ مطبوعہ پشتو اکیڈمی۔

ساه ورسره باسی لہ ځینو دوو ستی یو (حرفو نو) سره آدمیان۔"

(او بایزید) " وہ حروف تحریر کرو جو ہر زبان سے ادا ہو سکیں نوع انسانی کے فائدے کے لئے (اے مولا) تو ہر شے سے بڑھ کر دانا ہے۔ مجھے سوائے قرآنی و سبحانی حروف کے دیگر حروف نہیں آتے۔ (او بایزید) حروف لکھنا تیرا کام ہے اور انہیں ظاہر آشکارا کرنا میرا۔ قرآنی حروف کی طرح میرے حکم سے لکھو بعض حروف پر نقطے ڈالو یا حروف کے علاوہ کچھ اور نشانیاں۔ لوگ بعض حروف کو جلد پہچان لیں گے۔ چار چار ظاہر کر کے لکھو جب وہ انہیں پڑھیں گے تو جلد سیکھ جائیں گے۔ بعض دفعہ دو بڑے حروف کی وجہ سے قاری کا سانس ٹوٹ جاتا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیر روشان نے پشتو زبان کے بعض حروف کی (جو مخصوص اصوات رکھتے ہیں اور عربی فارسی حروف کی اشکال کے ساتھ وہ اصوات سیکھے نہیں جا سکتے) ایک مخصوص رسالے میں ترتیب و توضیح کی اور اس کے لکھنے کی شکل مقرر کی۔ اگرچہ پشتو قدیم رسم الخط کتب و آثار کی حامل تھا۔ لیکن اس وقت شاید یہ سب کچھ ناپید ہو چکا تھا۔ اس لئے چند ہی صفحوں کا رسالہ مرتب ہو سکا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسالہ پشتو رسم الخط کے بارے میں تھا۔ جس کی طرف محقق حبیبی نے اپنے اس مذکورہ بیان میں اشارہ کیا ہے۔ اس کی اپنی کوئی الگ حیثیت نہیں۔ اور نہ کہیں دوسرے وقائع میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ نہ ہی دولت روشانی کا شعر جو جناب حبیبی نے اپنے دعویٰ کی تاویل گردانا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت فراہم کرتا ہے دولت کہتا ہے۔

افغانی لفظ مشکل لوست کو یئس نہ شو

ورته ئے وشوه کنندہ دیارلس حرفونہ

" پڑھنے لکھنے کے لحاظ سے افغانی (پشتو) تلفظ مشکل تھا۔ اس لئے اس میں مزید تیرہ حروف بڑھائے گئے۔"

رسم الخط کے بارے میں بایزید انصاری کی تحریر بھی " خیر البیان " کے ابتدائی صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کی ابتدا اس مذکورہ عبارت سے ہوئی ہے جس کا مفہوم واضح ہے۔

"خیرالبیان کے مطالب"

خیرالبیان کا نفس مضمون حقیقی طہارت ہے جس سے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کا تزکیہ مقصود ہے۔ طہارت عملاً جسم و روح ہر دو کے لئے لازم سمجھی جاتی ہے۔ اور انسان کی مادی اور روحانی ہر دو قسم کی فرد تیں اور ویسے اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔ اور شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے طویل راستے پر بہمہ حال اور ہر منزل میں اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے اس لئے کہ پاک ہے روح اور پاک جسم والے وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جہاں حُسن مطلق کا وصال ممکن ہے بقول ایک سالک:۔ع

پاک شو اول و پس دیدہ بر آن پاک انداز

"پہلے خود کو پاک کر اور پھر اُس پاک ذات پر نظر ڈال۔"

بایزید نے طریقت کے راستے کے لئے ہادی و رہبر کی متابعت پر بڑا زور دیا ہے اور اسی طرح اُس نے عبادات اور امر و نہی کی تعلیم اور تصوف کے مسائل کی وضاحت اور تشریح اپنے مخصوص انداز میں کی ہے۔ انہی تعلیمات کو بایزید کے مریدوں نے عام لوگوں میں پھیلایا اور جو ادب اُنہوں نے تخلیق کیا اُس میں اس کی وضاحت اور تشریح کر دی۔

میاں روشان کے مریدوں میں بعض اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء فضلاء اور شعراء تھے۔ اِن میں مخلص، دولت، واصل، ارزانی اور مرزا خان انصاری وغیرہ مصنفین اور صاحب دیوان شعراء شامل تھے۔

"بایزید کا مسلک"

پروفیسر مولانا عبدالقدوس نے "خیرالبیان" پر جو دیباچہ لکھا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بایزید انصاری وحدت الوجود کے مسلک کے صوفیاء میں سے تھے ان سے پہلے ان کی کتاب خیرالبیان کی طرز پر بعض دوسرے

بزرگوں نے بھی کتابیں لکھی تھیں۔ اس لئے تحریر کا یہ کوئی منفرد انداز نہیں۔ دوسرے لوگوں کا بزرگوں کی واردات قلبی کو تسلیم کرنا لازم اس لئے نہیں کہ یہ اُن کے ذاتی تجربات ہیں۔ انہوں نے جب جبراً اپنی بزرگی لوگوں پر ٹھونسنی چاہی تو یہ اس ملک کی روش سے گریز تھا۔ اس میں اسماعیلی مسلک کے طریقے اور نشانیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اور انہوں نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا مگر ولایت کا دعویٰ اس کے قریب تھا۔ اس وجہ سے پشتونوں کی اکثریت جن میں علماء بھی تھے ان کی مخالفت کیا کرتی۔ پھر بھی انکی پیری پر ابتلا تھی۔ صوفیاء کی بزرگی کے ساتھ اُن کا علمی کمال عموماً مسلّم سمجھا گیا ہے۔ اس لئے لوگ انکے اقوال کی تاویل کرتے ہیں۔ لیکن بایزید کے بارے میں موافق روایات کے مقابلے میں مخالف روایات نسبتاً زیادہ تھیں۔ اس لئے اخوند درویزہ بھی اس کی مخالفت کرنے پر مجبور تھے۔

"بایزید انصاری کی تصانیف"

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ بایزید انصاری نے پشتو کے علاوہ عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا تھا۔ اس لئے اُن کی تحریریں اور کتابیں بھی پشتو کے علاوہ انہی تین زبانوں میں موجود ہیں۔ مولانا عبدالقدوس نے میاں روشان کی نو کتابیں گنوائیں ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ خیر البیان، صراط التوحید، مقصود المومنین، وعظ ونصیحت، فخر الطالبین، حالنامہ، مکتوبات، واجبات سے شلوک اور رسم الخط پشتو ان میں سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب "خیر البیان" ہے۔

کہتے ہیں کہ صراط التوحید نامی کتاب ایک مکتوب کی شکل میں مغل شہنشاہ اکبر کو اس غرض سے بھیجی گئی تھی کہ وہ اُن کے مریدوں کے حلقے میں شامل ہو جائے۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں جناب عبدالشکور مہتمم عجائب خانہ پشاور نے شائع کی ہے۔

بایزید کے مریدوں میں انکی "مقصود المومنین" نامی کتاب کو خیر البیان کے بعد دوسرے نمبر کی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کے موضوعات وعظ ونصیحت، عقل، ایمان، خوف، اُمید، نفس، شیطان، قلب، روح

دنیا، آخرت، توکل، قناعت، توبہ اور شریعت سے لے کر سکونت اور سیر و سلوک تک کے مقامات ہیں۔ انکی دوسری اہم کتاب "فخر الطالبین" ہے۔ کہتے ہیں کہ میاں روشان نے اپنے ایک خلیفہ (جس کا نام یوسف تھا) کو اس کتاب کے ساتھ بدخشاں بھیجا تھا۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔

" حالنامہ " میں بایزید نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ کتاب ان کے ایک مرید علی محمد بن ابوبکر قندہاری نے جن کا تخلص مخلص ہے دوبارہ ترتیب دی ہے۔ اور اس میں میاں روشان کے بعد اس کی اولاد کے حالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی نقول موجود ہیں۔ زبان فارسی ہے اور بیانات مسلّم ہیں۔ لیکن واقعات کی تاریخیں عموماً غلط ہیں۔

مولانا عبدالقدوس نے ڈاکٹر جہانگیر کے ایک مضمون کے حوالے سے میاں روشان کے مکتوبات کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن اس مجموعے کی موجودگی پر شک کا اظہار کیا ہے " وجیدآ دسے سلوک پنجابی زبان کی ایک منظوم کتاب ہے جو اونکار ناتھ نامی ایک شخص نے مرتب کی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بھی بایزید کی تصنیف ہے۔ پشتو رسم الخط کے بارے میں مولانا موصوف نے بھی پروفیسر حبیبی کی طرح دولت کے مذکورہ شعر پر اکتفا کی ہے۔

" روشانیوں کا مسلک "

روشانیوں کی شاعری میں پیر کامل کی متابعت اور جذب و سلوک کے مقامات کے بارے میں بہت دل پسند اشعار موجود ہیں۔ ان میں وحدت الوجود کے فلسفہ کی پوری پوری وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اور واردات قلبی اور معشوق حقیقی کی تجلیات جن کا ظہور ہر چیز میں عیاں ہے کے بارے میں انکی رنگین نوائی مسلّم ہے جیسے کہ توحید کے بارے میں انکا ایک مرید ارزانی کہتا ہے ؎

دا ثبات په سرا ئے د نه — غیر نشته الا الله
یو الله دے ورانده بیارته — بنئ او کینه ته و بالا
د مولا په یاد کښے او سه — په ملا او په خلا

"اثبات کی سرائے کے اندر اللہ کے ماسوائے اور کوئی نہیں آئے گا پیچھے دائیں بائیں اوپر نیچے فقط اللہ ہی ہے۔ ذکر خفی اور ذکر جلی سے اللہ کو یاد کیا کرو۔"

دولت لوحانی کہتا ہے ؎

ھر چہ نوش د وحدت ے کا — د خودئ مرکب بہ ے ُ کا
یو دیدن بہ ے د دوست وینی — ھر نظر چہ پہ څہ شے کا

"جو بھی مئے وحدت کو نوش کرے گا وہ مرکب خودی کو قابو میں کرے گا جب بھی کسی چیز پر نظر ڈالے گا تو اُسے ایک ہی دوست کا پرتو دکھائی دے گا۔" مخلص کہتا ہے ؎

دوحدت پہ نوش زرغون گلزار لیدۂ شی — پہ دا باغ کښے کہ پتلہ وینی یا موتی
لکہ گل پہ نم تازہ پہ طراوت وی — ھسے شان پہ روح ولاړ دے د تن کوټ

"اس گلزار ہستی میں چاہے پتلی چیز ہے یا موٹی سبھی نور وحدت کی نم سے اُگ رہے ہیں۔ جس طرح کسی باغ کے پھول نمی اور طراوت کی بدولت ترو تازہ کھڑے ہوتے ہیں اسی طرح تن کا یہ حصار بھی روح کے سہارے کھڑا ہے۔

مرزا خان انصاری کہتا ہے ؎

(ا) کل حساب د یوۂ یو دے — یو ے او پیش اند لیچند ہ
پیوری ھر تو رنگا رنگ دی — زیب ے څۂ دے بے مرو ندہ
پہ ھیڅ دود بہ جیدا نۂ شی — اوس واصل شہ بے پیوندہ
د وحدت پیالہ دِ نوش کرہ
اے مرزا پہ حال خورسندہ

(ب) مرزا پہ خپلہ ھیڅ وئیلی نۂ دی — پہ قفس کښے د وحدت طوطی آواز کا
(ج) پہ ھر حال کښے آیتونہ د مولا دی — و مرزا وتہ جلوۂ کا بے مکتوبہ

"مل ملا کر حاصل کلام یہ ہے کہ وہ ایک ہے اس لئے کثرت میں وحدت کو پہچان لے۔

چوڑیاں چاہے جس قدر رنگا رنگ کیوں نہ ہوں لیکن اُنکی زیب و زینت کا انحصار کلائی پر ہے۔
بغیر کسی پیوند کے اُس سے واصل ہو جاؤ اور کسی طرح بھی اُس سے جدا نہ ہونا۔
تونے وحدت کا پیالہ نوش کر لیا اے مرزا۔ اب اپنے حال پر خوش اور قانع رہو۔

(ب) مرزا نے خود کچھ نہیں کہا۔ یہ تو پنجرے میں وحدت کا طوطی بول رہا ہے۔

(ج) ہر حال میں اللہ پاک کی نشانیاں ہیں جو بغیر تحریر کے مرزا کو نظر آتی ہیں۔

روشانی مسلک کی تعلیمات کا جو خلاصہ مرزا خان انصاری کی ایک نظم میں موجود ہے۔ اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا خان اور اُس کے مکتب فکر کے دوسرے شعراء کے کلام نے بایزید روشان کی تعلیمات کی "فائقیت اور میاں روشان کی تعلیمات کی ترجمانی میں دوام پایا ہے اور اُس کے ذریعے بایزید کی تعلیمات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

مرزا خان انصاری کہتا ہے ؎

د نبیؐ خلیفہ دا دے چہ رندہ ویدہ سنت کا
د ناقصہ حذر بویہ پہ کامل دے ارادت کا
ارادت د طالب دا دے چہ فانی رسم عادت کا
خدمت د پیر دغہ دے چہ توبہ لہ معصیت کا

"نبی کا خلیفہ وہ ہے جو سوتے جاگتے سنت کی پابندی کرے۔ ناقص سے پرہیز کرے اور کامل پر عقیدہ رکھے۔ طالب کی ارادت یہ ہے کہ وہ رسم فنا کا خوگر ہو جائے۔ پیر کی خدمت یہ ہے کہ گناہ سے تائب رہے"۔

پھر راہ مستقیم کی نشاندھی یوں کرتے ہیں۔

د بینتنے لار دغہ دہ چہ عمل پہ شریعت کا
شریعت رینبتیا گفتار دے صادقان دے طاعت کا
د اسلام پنځہ بنا دی مومنان دے طاعت کا
نارو ا دروغ دِ پریږدی او پرهیز دِ لہ غیبت کا
چہ ثابت پہ شریعت شی ترو دِ یون پہ طریقت کا

د دے لارے خطر دے　　مګر تګ په ډیر همت کا
طریقت د فرښتو خوی دے　　چه بندګی په هر ساعت کا
د غه زړهٔ په مثال تخت دے　　پرے دوه څیزه عداوت کا
یو ګروه د نیک بختئ دے　　بل فرمان د شقاوت کا
هر ګروه چه زور ور شی　　په څرګنده علامت کا
کهٔ په لغو ته د شیطان شی　　ډیر په خوار په ضلالت کا
مستقیم به په دا لار شی　　هر چه خدائے پرے عنایت کا
چه ثابت په طریقت شی　　او طلب د حقیقت کا
هر چه تن ئے پاکیزه شی　　ترو خاطر تصنیف کا
د ګمان مورچه دِ واخلی　　د خدائے یاد دِ مشغلت کا
دے دائم دِ په یاد اوسی　　او پرهیز دِ له غفلت کا
چه ګمان کا له زړهٔ لرے　　او ارواح ئے تجلیت کا
ترو چه روح د دهٔ روښان شی　　ور څرګند به معرفت کا

عارفان دِ پنځه لومه
چه مرنآ ئے عبارت کا

صراطِ مستقیم یہی ہے کہ شریعت پر عمل کیا جائے۔ شریعت راست گفتاری ہے اور صدیقین اس کی پابندی کرتے رہیں۔ اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں مومن اُس کی پابندی کریں۔ ناروا اور جھوٹ چھوڑ دیا جائے اور غیبت سے پرہیز کیا جائے وہی راہِ طریقت اختیار کی جائے جو شریعت سے ثابت ہو۔ اس راستے کے خطرات بہت زیادہ ہیں اس لئے ہمت کے ساتھ اس پر چلنا چاہیئے طریقت فرشتوں کی خوخصلت ہے۔ جو ہر گھڑی بندگی کرتے ہیں۔ دل کی مثال تخت کی سی ہے اور اُس کے اوپر دو چیزوں کا آپس میں بیر ہے۔ ایک گروہ نیک بختی کی تلقین کرتا ہے اور دوسرا بدی کا حکم دیتا ہے۔ جو گروہ بھی ان میں غالب آجائے وہ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جیسے

شیطان ورغلائے وہ گمراہ ہوکر خوار ہو جاتا ہے اور جس پر اللہ اپنی عنایت کرے وہ صراط مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے جب کوئی طریقت پر ثابت قدم ہو جائے اور طلب گار حقیقت بنے تو اس کا جسم پاک اور اس کے دل کی تنگی باقی نہیں رہتی وہ گمان کے مورچے کو سر کرکے یاد الٰہی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ جو کوئی ہمیشہ اس کی یاد میں مصروف رہے غفلت سے اجتناب کرے۔ گمان کو دل سے دور کر دے۔ اس کی روح میں تجلی پیدا ہو جائے گی اور اس کی روح روشن ہو جائیگی۔ تب جاکر اس پر معرفت آشکارہ ہو جائیگی۔ مرزا کی مراد جن عارفوں سے ہے۔ ان کی پانچ قسمیں ہیں۔"

اسی طرح پشتو شاعری میں ایک طرف عارفانہ کلام کی سبھی خصوصیات نے جگہ پائی اور دوسری طرف قومی شاعری کی جڑیں ایسی مضبوط ہو گئیں کہ پشتونوں کے بارے میں زندگی کی سبھی قدریں اس میں سمو دی گئیں۔ اس تدریجی ارتقاء کی برکت تھی کہ پشتو ادب نے وہ مقام حاصل کیا جس میں خوشحال خان خٹک اور حضرت عبدالرحمان بابا کے آفاقی افکار نے جنم لیا۔ یہی پشتو ادبیات عالیہ کی وہ معراج ہے جسے اس نے صدیوں کی تدریجی ارتقا اور منزل بہ منزل سفر کرنے کے بعد حاصل کیا۔

"روشانیوں کا ادب اور تعلیمات

اس طرح سے تصوف نے پشتو ادب میں بھی ایک منفرد مقام پالیا۔ اسی کی بدولت پشتونخوا میں صوفیا اور سالکین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوا۔ انہوں نے ایک طرف تو اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کو اپنا فریضہ بنا لیا اور دوسری طرف عام لوگوں کی اصلاح اور تعلیم کے کام کا آغاز کیا۔ بعض محققین اسے پشتو ادبیات کی ترقی کا اصل سبب خیال کرتے ہیں۔ خصوصاً پشتو شاعری کو میاں روشان کی صوفیانہ تحریک اور ان کے افکار اور تعلیمات نے جس قدر ترقی دی، وہ در حقیقت پشتو زبان کی ترقی کی اصل بنیاد تھی۔ یہ اہل طریقت کی تحریک تھی۔ اس کے رد عمل میں اہل شریعت اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح سے حضرت اخوند درویزہ کی سرکردگی میں جو تحریک شروع ہوئی اس نے بھی نظم و نثر دونوں میدانوں میں پشتو ادب کے سرمائے میں بڑا اضافہ کیا۔

"روشانی اور سماع"

سماع ساز و موسیقی کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور شعر و کلام کے لطف کو دوبالا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں ع

"نظم را ہمچو عروسے دان و نغمہ زیورش۔"

"نظم کو ایک دلہن کی طرح سمجھ لو، نغمے کو اُس کا زیور جانو"

میاں روشان نے اپنے مسلک میں سماع کو جائز ٹھہرایا تھا۔ اور اس کے مدارج بھی مقرر کئے تھے۔ اس کی برکت سے ساز کے ساتھ صوفیانہ کلام کے بیان کو فروغ حاصل ہوا۔ انہیں حقیقت کے گیتوں کا نام دیا جاتا تھا۔ جواب بھی پشتو محاورے میں خاص طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت کے یہ گیت ارزانی، دولت، مرزا خان انصاری اور مخلص وغیرہ کے کلام میں عام ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان شعراء کے کلام کا اہم موضوع تصوف ہے جو شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت کے سبھی مراحل کے بیان کا حامل ہے۔

بایزید اہل سنت حنفی صوفی تھے۔ انہوں نے حنفی فقہ کی روشنی میں خیر البیان تالیف کی ہے۔ پیر روشان کی تعلیمات کے مطالعے کے لئے انکی کتاب خیر البیان کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ بعض محققین جن میں مولانا عبد القدوس بھی شامل ہیں کہتے ہیں "خیر البیان کی تالیف کا بڑا سبب پیر روشان کے ساتھ اس وقت کے علماء کی مخالفت ہے۔ اخون درویزہ کی تحریروں میں بایزید انصاری کی اِس کتاب کے موضوعات کے ساتھ سراسر اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ نیز اِسی ایک کتاب کی رُو سے بایزید کے خلاف ساری مہم چلائی گئی تھی جیسے کہ کہتے ہیں۔

"و این ملعون کتابے را تصنیف کردہ۔ بعضے کلمات او را بہ زبانِ عربی بلا ادراکِ ترکیب و ترتیب آوردہ و بعضے را بہ زبان فارسی و بعضے را بزبان ہندی امّا ہر کدام ازین کلمات ناموزون و ناموافق افتادہ بحدے کہ طبائع اہل علم از آن متنفرے گردد و آن را خیر البیان نام بردہ و چون مملو از کفر و الحاد و مشحون از افتراء و فساد بودہ فقیر آن را شر البیان نامیدہ و اگر خیر البیان نامندہم مناسب

است۔ او دعویٰ نمودہ این بر وقف مدعائے من از جانب اللہ تعالیٰ نزول یافتہ نعوذ باللہ من کفر

"اور اس ملعون نے ایک کتاب لکھی ہے اور عربی میں بعض ایسے کلمات اکھٹے کئے ہیں اور بنائے ہیں کہ ان کی ترکیب و ترتیب کو خود سمجھ نہ سکے اور بعض فارسی، پشتو، ہندی میں بنائے، لیکن پھر بھی یہ تمام فقرے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی موزونیت یا موافقت نہیں رکھتے۔ اس حد تک کہ علماء کی طبیعت اس سے متنفر ہے اور اس نے اس کتاب کا نام خیر البیان رکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ کفر و الحاد اور شر و فساد سے پر ہے اس لئے میں نے اسے شر البیان کہا ہے اور اگر اسے غیر البیان کہا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب میرے دل پر حسب خواہش اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ (اس کے کفر سے اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے)"

اسی طرح اخون درویزہ نے اسکے ایک مرید ارزانی کے ذکر میں چار زبانوں پر مشتمل ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ ملا ارزانی نے اپنی اس کتاب کا نام "چار زبان" رکھا تھا۔ وہ کہتا ہے: -

"ارزانی چون شاعر تیز فہم و فصیح زبان بود در انواع ضلالت و بدعت شعر افغانی و فارسی و ہندی و عربی بیان کردہ و در تمام کتاب این لعین موافق نمودہ و ارزانی نیز کتابے را تصنیف کردہ است مملو از انواع ضلالت و آن را چہار زبان نامیدہ۔"

"ارزانی ایک تیز فہم اور فصیح زبان شاعر تھا۔ اور ضلالت اور بدعت سے بھرپور قسما قسم اشعار پشتو، فارسی، ہندی اور عربی میں کہے ہیں اور بیان کتاب اسکے موافق ہے۔ ارزانی نے ایک اور کتاب بھی تصنیف کی ہے جو گمراہی کی باتوں سے اٹی پڑی ہے۔ اس کتاب کا نام اس نے چہار زبان رکھا ہے۔"[۱]

پشتو ادبیات کی تاریخ کی کتابوں میں ارزانی کے دیوان کا ذکر تو عام ہے اور اس کے بعض قلمی نسخے بھی موجود ہیں لیکن "چہار زبان" بھی خیر البیان کی طرح محتاج تحقیق ہے ملا ارزانی نے شاید فارسی زبان کی بعض کتابوں مثلاً ہفت پیکر یا چہار مقالہ اور چہار درویش وغیرہ کے نام کے تتبع میں اپنی کتاب کے لئے "چہار

---

[۱] تذکرۃ الابرار ص ۲۰۶، ۲۰۷

زبان "نام پسند کیا ہو۔ اور کتاب کا اصل متن جو چار زبانوں میں تھا۔ اِس نام کے ذریعے اُسے ظاہر کرنا مقصود ہو۔
خیرالبیان کی عبارت مسجع ہے۔ جیسی اِسے نیم عروضی سبک (اسلوب) کہتا ہے یہ طرز پشتو نثر کی بعض دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی۔ کہ عبارت میں تعقید کی خامی کی وجہ سے اِس قسم کی کتابوں کی تحریر و بیان کو نظم کے مقابلہ میں بہت کم مقبولیت حاصل رہی۔ جیسے کہ خیرالبیان کی یہ عبارت :۔

" فرض کړی مے دی پر آدمیان۔ چہ باور او چار ډ لا پہ دا بیان۔ ھر چہ باور او چار کا پہ دا بیان۔ پناہ بہ ئے کوم د دنیا پہ ژوندون د نوس لہ بدئ او د مکرہ د شیطان۔ نہ بہ ئے عذابوم پہ عذاب د ځنکدن، نہ د گور، نہ د قیامت، نہ د اور، چہ سیزونے دے سوزان "

" لوگوں پر میں نے فرض کیا ہے کہ اِس بیان پر باور کرکے اس پر عمل کریں۔ جو اِس بیان پر یقین اور عمل کریگا تو زندگی ہی میں اُسے نفس وشیطان کے مکروفریب سے بچاؤں گا۔ اور نزع، قیامت اور آتش سوزندہ سے عذاب نہیں دوں گا۔"

محقق مولانا عبدالقدوس کہتے ہیں کہ خیرالبیان کی عبارت میں خاص جدت یہ ہے کہ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ اکثر مقامات پر خالص پشتو الفاظ لائے جائیں۔ بعض مقامات پر الگ اور اپنی خاص اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ مولانا موصوف نے ایسے الفاظ کے کچھ نمونے بھی اپنے مقالے میں وضاحت کے طور پر پیش کئے ہیں۔ مثلاً " امرا، اسپرئ، اتکل، برغو، بیرون، ثلوزبول، پریښنون، پاورگے، پس، بوادی، بردہ، ترکش بندی، تودی، پوندگلی، کوزل، لیزل، ارکن، یعنی حاکم، لوہے کا بنا ہوا، اندازہ صور اسرافیل، سوا، چوپایہ، جھوٹا، پیمانہ، ہوا، دوسالہ، غلام فوجی خدمت، حروف، چرواہے، حرکت کرنا ارادہ کرنا یا یقین کرنا لکڑی کا بنا ہوا۔

اِسی طرح " خپس۔ ورنہ پلیتی، زیر، تروی، سُرولین، سپکہ پلیتی، سادو، کرندہ، لیرونے، میرخی، مقیم ځائے، مزدک، نغوبزل، ورمند، ہرمونے" بمعنی" خود، نجاست وغلاظت۔ سونا، حیوانات، "تانبے کا بنا ہوا تخفیف نجاست، آزاد، شمار، ماہرو، دشمنی یا عداوت۔ وطن یا جائے سکونت مسجد، کانوں سے سننا، حکم امر، حرامی وغیرہ۔

خیرالبیان کی عبارت میں یہ اہتمام ضروری سمجھا گیا ہے کہ اُس زمانے کے وہ لغات اور زبان استعمال کی جائے جسے زیادہ لوگ سمجھتے تھے۔ اِس لئے نہ تو اُس میں اُدمڑی زبان کے لغات ہیں اور نہ وزیرستان کے وزیری لہجے کے الفاظ شامل کئے گئے ہیں۔ حالانکہ بایزید روشان اصلاً اُدمڑ تھے۔ اور وزیرستان کے "کانی گرم" کے رہنے والے تھے۔ لیکن چونکہ وہ آفریدیوں اور بالائی سرحدی قبائل میں قیام پذیر تھے۔ اس لئے اپنی اس اہم کتاب کی زبان کو بھی اِن ہی قبائل کے لہجوں کے زیادہ قریب رکھا ہے۔

بایزید کی تعلیمات نے ایک مستقل مسلک کی حیثیت اختیار کی تھی۔ اور اسکے ماننے والے روشانی کہلاتے۔ اس مسلک کی تعلیمات بایزید انصاری کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔ ان کے مریدوں نے اپنے اشعار اور اپنی کتابوں میں بھی ان کی تعلیمات کی وضاحت کی ہے۔

بایزید روشان نے انسان اور خدا کے مابین رابطے کی راہ کو عبادت کا نام دیا ہے۔ وہ ایمان، عقیدے کے اقرار و عمل کو کہتا ہے لیکن اُس کے نزدیک اس کے لئے معرفتِ الٰہی ضروری اور لابدی ہے۔ اس کے خیال میں علم ظاہری اُستاد سے اور علم باطنی پیر کامل سے سیکھا اور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ توحید کا راستہ حواس خمسہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مرا طِ قلبی ہے۔ جس کے لئے رہنمائے کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرشد کامل انبیاء کا وارث ہوتا ہے۔ اس لئے اُس کا حکم تسلیم نہ کرنا گمراہی ہے۔ اور جو ایسی گمراہی کا مرتکب ہو اُس سے احتراز کرنا چاہئے۔ پیر کامل نیکی کی ہدایت کرنے والا، قانع، بے طمع، پابند شریعت۔ طاعت گذار صادق، اخلاص مند اور پاکباز ہوتا ہے۔ وہ شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت کے مقامات سے آگاہ ہوتا ہے، اور انہیں اپنے مرید کی تربیت بھی کر سکتا ہے وہ اپنے مرید کو عباداتِ ظاہری اور اذکارِ خفی سکھاتا ہے۔ راہِ سلوک احتیاط پر مبنی ہے۔ مقامِ وحدت کے حصول کے لئے طالبانِ صادق پہلے چلے میں علم الیقین، دوسرے میں عین الیقین، تیسرے میں قربتہ الیقین۔ چوتھے میں وصلت الیقین، پانچویں میں توحید الیقین اور چھٹے میں کشف الاسرار کو پا لیتے ہیں۔ یہ سالکانِ طلب جب مذکورہ مقامات سے آگے نکل جاتے ہیں تو آخر میں صاحبانِ مقام سکونت ہو جاتے ہیں اور ایسے کامل کو راہِ سلوک میں مسکین کہتے ہیں۔

بایزید انصاری کے مریدوں میں جو صاحبانِ سیر و سلوک تھے اور شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس

تعلیم کی روشنی میں پشتو ادب کو پُر لطف آفاقی افکار سے مزیّن کیا ہے۔ ان شعراء میں ارزانی خویشکی کو خاص مقام حاصل ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ارزانی کا ذکر اخون درویزہ بابا نے اپنے تذکرے میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک اچھے عالم تھے اور چار زبانوں میں شاعری کیا کرتے تھے وہ بایزید کی عرفانی تعلیمات کے شارح تھے اور نظم کی شیریں اور ملائم زبان میں ان تعلیمات کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ جیسے کہ کہتا ہے ؎

د فقیر پښتو دیوان دے　　　دا دیوان حقانی خوان دے
دے د ریخته په څلور ژبے　　　دے بیان په څو الوان دے
دا کلام د هغه دل دے　　　چه د عشق په اور بریان دے

"فقیر کا پشتو دیوان ہے جو خوانِ حقانی کی طرح ہے۔ اس دیوان کو چار زبانوں میں تحریر کیا گیا ہے اور رنگا رنگ بیانات سے مزیّن ہے۔ یہ اُس دل کا بیان ہے جو آتشِ عشق سے بریان ہے۔"

توحید کا بیان یوں کرتے ہیں ؎

د اثبات په سرائے د ننه　　　غیر نیشته اِلّا الله
یو الله دے وړاندے بیرته　　　ښئی او کینڼ تل و بالا
د مولا په یاد کښے اوسه　　　په ملا هم په خلا

"اثبات کی سرائے کے اندر سوائے اللہ کے اور کچھ نہیں آگے پیچھے، دائیں بائیں اللہ ہی اللہ ہے۔ اس لئے بغیر ریا کے ظاہری اور باطنی طور پر اللہ کو یاد کیا کر۔"

پشتو ادب اور پشتونوں کی تاریخ پر روشانیوں کے عرفانی اور سیاسی مسالک کے اثرات اس قدر زیادہ اور اتنے گہرے ہیں کہ ادب اور تاریخ دونوں کے بارے میں اس تحریک نے پشتونوں کے ملّی نظریات بدل ڈالے ہیں۔ اگر ایک طرف اس نے پشتو ادب کو صوفیانہ اور عرفانی تصورات و افکار سے مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف روشانیوں کے معرکوں نے انہیں مغلوں کے تصرّف کے خلاف قومی طور پر صف آرا کیا۔ اور اس طرح اُن میں قومیت کے جذبات ایک ملّی تحریک کی صورت میں بیدار کئے۔ اور اسی تحریک نے پشتون قبائل کے لئے ملّی یک جہتی کے راستے ہموار کئے۔

یہ صحیح ہے کہ بایزید کی سیاسی تحریک وہ حتمی نتائج حاصل نہ کر سکی جو ایسی تحریکوں کی کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچنے سے حاصل ہوتے ہیں پھر بھی پشتو زبان اور پشتون قومیت پر ان کے احسان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

"روشانیوں کی ادبی خدمات"

روشانیوں کا سیاسی مسلک ادبیات کی تاریخ کا موضوع نہیں لیکن اُن کے علمی اور ادبی افکار کا مختصر تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

بایزید روشان کی خیرالبیان کے علاوہ پشتو میں ارزانی مخلص دولت اور مرزا خان انصاری کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سبھی صاحب دیوان شعرا گذرے ہیں۔ اور میاں روشان کی تعلیمات کی روشنی میں انہوں نے وہ بامعنی اور پُر لطف شاعری کی ہے جس نے پشتو ادب کو بجائے جمود کے فعالیت کی راہ پر گامزن کیا ہے جیسے مرزا خان انصاری کہتا ہے ؎

کڈ ریښتیا د گل په مینه یگانه یئ
د مرزا په آواز ویښ شه عندلیبه

"اگر واقعی تم پھول کی محبت میں یگانہ ہو تو اے بلبل! مرزا کی آواز پر جاگ اُٹھو" جیسا کہ کہا گیا ہے۔" اِس مسلک کے شعراء کے کلام کے تمام موضوعات بحر وجود، وحدت الوجود، وحدت الشہود، ہمہ اوست اور ہمہ از اوست" کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اسلام کے دوسرے صوفیا اور عرفا کی طرح پیر روشان کے اِن خلفا اور مریدوں کے تصورات بھی اُن افکار کی ترجمانی کرتے ہیں جو انہوں نے قرآن و حدیث سے میدانِ معرفت میں حاصل کئے تھے۔ اور اپنے مریدوں کو اپنے مخصوص انداز میں سکھائے تھے جیسے کہ

"ان اللہ محیط بالعباد"

کی تشریح خیرالبیان نے یوں کی ہے ؎

"کب چہ او بو کښے گرځی ځنے داوبو تہ شی هسے هر لورتہ وُجار وځی

مخ ئے وماتہ شی د آدمیان ..... آدمیان زما په هستئ کښے زما هستی

ده په آدمیان ۔"

"مچھلی جب پانی میں گھومتی ہے ۔ تو اُس کا چہرہ پانی کی طرف ہوتا ہے ۔ اِسی طرح کوئی انسان چاہے جس طرف بھی رُخ کرے اُس کا چہرہ میری ہی سمت ہوتا ہے .... آدم میری ہستی میں ہے ۔ اور میری ہستی آدم میں ہے ۔"

مولانا جلال الدین رومی ۔ مولانا جامی اور دوسرے بڑے صوفیائے کرام بھی بحر وجود کی تشریح اِسی کے مطابق کرتے ہیں ۔ مرزا خان انصاری پیر روشان کی تعلیمات کے بارے میں کہتے ہیں ؎

د مخلوق ژوند ون په ده دے ۔۔۔ په اوبۀ ژوندون د کب

چه شپه ورځ ئے په اوبۀ کښے ۔۔۔ ماهی گرځی تشنه لب

کۀ مشتاق ئے لرے مځه ۔۔۔ دے ترتاو تا اقرب

"مخلوق کی زندگی کا انحصار اِس پر ہے اور مچھلی کی زندگی پانی پر مبنی ہے دن رات پانی میں رہ کر بھی مچھلی تشنہ لب پھرتی ہے ۔ اگر تم اُسے اپنا مشتاق رکھنا چاہتے ہو تو مت جاؤ وہ تجھ سے بڑھ کر تیرے قریب ہے ۔"

اور میاں روشان خود کون ہے ؟ مرزا کہتا ہے ؎

چه د افهم محبت وبله ور شی ۔۔۔ تور شپه ئے رترا ورځ شی له تالیف

د روښان ثنا په کوم ژبه وایم ۔۔۔ هر آوازئے دلالت دے له تعریف

"جب ان میں آپس میں فہم محبت پیدا ہو جائے تو اُن کی شب دیجور اُس کی تالیف کو جسے روزِ پرُ نور میں بدل جاتی ہے ۔ کونسی زبان سے میں روشان کی تعریف کروں اُس کی ہر صدا اُس کی تعریف پر دال ہے ۔"

روشانی ذاتِ الٰہی کو وجودی صفات کا منبع گردانتے ہیں اور تمام موجودات کو اُس کی قدرت کا مظہر شمار کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ سبھی حواس اُس کی قدرت پر مبنی ہیں ۔ سننا ہو ۔ چاہے دیکھنا ، پینا ، چھونا کرنا یا سونگھنا ہو ۔ مثلاً سننے کے بارے میں خیر البیان کی عبارت یہ ہے :۔

"هر آواز زماله آوازه دے ۔ زما آواز دے اروی لکه اوریدهٔ به شامعان آدمیان ۔"

" ہر آواز میری آواز سے ہے ۔ میری آواز سنا کریں جیسے کہ سننے والے لوگ سنا کرتے تھے "
ارزانی خویشکی نے اِس کی تشریح اپنے دیوان میں یوں کی ہے ۔

چارے یو کنندہ کاندی آدم تشہ بہانہ دے
یو احد شو پہ ثو نامہ دا فلانہ ھغہ فلانہ دے
خلیفہ ئے دا انسان کڑ دے بادشاہ تردا میانہ دے
د زرہ علم فقیر کښلے پہ قلم دو زبانہ دے

" کام تو ایک ہی کرنے والا سرانجام دیتا ہے ۔ انسان کا تو محض بہانہ ہے ایک احد کے کتنے نام رکھے گئے ۔ یہ فلاں ہے اور وہ فلاں' اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا گویا درمیان میں وہ ہی بادشاہ ہے ۔ اس فقیر نے سینہ چاک قلم سے باطنی علم تحریر کیا ہے "

جیبتی نے اِس آخری شعر کی تشریح میں لکھا ہے ۔ کہ ارزانی نے یہ فیض اور سِر وحدت کا اصلی رمز فقیر سے لیا تھا ۔ اور اُس کی اصطلاح میں فقیر سے مراد بایزید روشان ہے "[1]

عارف اہل نظر ہوتے ہیں ۔ اور اہل نظر کا کام مشاہدہ اور تماشہ ہوتا ہے ۔ اگرچہ وہ ہر وقت فطرت اور عالم رنگ و بو کے تماشائی ہوتے ہیں، لیکن یوں جیسے کہ ایک شاہد اپنے معشوق کا متلاشی ہو ۔ یہ سب کچھ وہ اُس صانعِ حقیقی کی دلیل سمجھتے ہیں اور انہیں اُس کے وجود اور اُس کی ذات کا پرتو اُن میں دکھائی دیتا ہے ۔ اور خیرالبیان کے اس مضمون کے مطابق :۔

گورہ پہ معرفت کښے پہ واحد داور موندن دی چہ ھیڅ لہ ماشریک نۂ کنری ۔ ھرچہ شتہ پہ دوارہ جہان ۔ پہ ھر نظر د زرہ پہ سترگے و ماتہ نظر کا ۔ پہ ھر څہ کښے دے زما ھستی بے رنگ وینی ۔ نکہ لیدہ عارفان ۔ زما آواز دے آوری نکہ اوریدہ پہ سامعان آدمیان او خوبس دروسی

---

[1] تاریخ ادبیات پشتو جلد دوم صفحہ ۳۲۶

په دا په هر حال - په هر ځائے مکان - نښان د عارف واجد دا چار ده په

تا دِ وی اعلام "

معرفت میں ایک عارفِ واجد پہ لازمی ہے کہ کسی چیز کو اُس کا شریک نہ بنائے دونوں جہانوں میں جو کچھ بھی ہے اُسے دل کی نگاہوں سے دیکھے۔ اور اُس کی ہستیٔ بے رنگ کا مشاہدہ کرے جیسا کہ عارف دیکھا کرتے تھے۔ میری آواز سنے جیسے سننے والے آدمی سنا کرتے تھے اور ہر حال میں ہر جگہ صابر و شاکر رہیں۔ جان لو عارفؔ واجد کی پہچان کا یہی طریقہ ہے تجھ پہ یہ بات آشکار ہونی چاہیئے "

بایزید نے روشنی اور تاریکی کی تشریح یوں کی ہے۔

کم عقلی، منکری، گناه، غفلت، جاهلی، نادانی مے خپلے تاریکئی کړی دی، عقل

ایمان، جاروانهٔ، نغتهٔ او یاد او علم مے د خپلے روشنایئ کړی دی عیان "

" کم عقلی، منکری، گناہ، غفلت، جاہلی اور نادانی میں نے اپنی تاریکی سے کی ہے، عقل، ایمان کی طرف لپکنا، سننا، یاد کرنا اور علم میں نے اپنی روشنی سے پیدا کئے ہیں۔"

یہ وہ تضادات ہیں جن کا تذکرہ پشتو شاعری میں تصوف کے موضوع پر پہلے کیا گیا ہے۔ ایک بات جو خاص اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ میاں روشان کے مسلک اور متقدمین کے افکار اساساً اسلامی تصوف کے نظریات اور تعلیمات پر مبنی تھے نہ تو ان میں افلاطونی تصورات موجود تھے نہ ہندوؤں کا ساجوگی پن اور نہ عیسائیت کی رُہبانیت، جیسا کہ مرزا خان انصاری کہتا ہے۔ ؎

د مرزا حکم پښتو دے

کل معنی ئے لہ عربؒ

" مرزا کا حکم پشتو ہے لیکن اُس نے سبھی معنی عرب سے لئے ہیں "

ارزانی کے کلام کے جو نمونے اُن کے قلمی دیوان سے پروفیسر حبیبی نے اپنی تاریخ میں پیش کئے ہیں۔ ان میں

لہ خیر البیان ص ۲۶۳

ذکر و فکر انسان کی ذات وجود اور عبادات میں مسلسل جہد کی اہمیت آشکار کی گئی ہے۔ اور اس طریقے سے اُن مراحل سے گزرنے اور سفر کرنے کا تذکرہ ہے جن کی وساطت سے انسان وصالِ حق اور مقامِ سکوت تک جا پہنچتا ہے کہتا ہے۔

د حق یاد خاصه جوهر دے　　　　کهٔ خفیه دے کهٔ جهر دے
د حق یاد فرض دایم دے　　　　نهٔ په وخت ساعت پهر دے
کهٔ خفیه ذکر هر دم دے　　　　د جلی وخت په سحر دے

"اللہ کو یاد کرنا ہی اصل جوہر ہے۔ چاہے ظاہری طور پر ہو یا باطنی طور پر، یادِ الٰہی فرضِ دائم ہے۔ یہ وقت گھڑی یا پہر پر منحصر نہیں۔ اگرچہ ذکرِ خفی ہر گھڑی کے لئے ہے مگر ذکرِ جلی کے لئے صبح کا وقت ہے۔"

اور انسانی وجود کی اہمیت یوں بیان کی ہے:۔

دا صورت د خاورو ټیلے　　　　په دم سور او په دم پلے
په دا خلی کښے بسیا دے　　　　دے دواړو کونو کلے
حق په دواړو کونو علم　　　　د صورت په کتاب کښلے
دا کتاب دے هغو لوستے　　　　چه ئے خپل صورت کتلے
دا صورت لوح محفوظ دے　　　　له لوئے نون قلم وتلے

"یہ انسانی صورت گویا مٹی کا ڈھیر ہے کبھی سوار اور کبھی پیادہ کونین کا قریہ مٹی کے اس ڈھیر پر آباد ہے۔ حق نے ہر دو کون کا علم انسانی صورت کی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب وہ لوگ پڑھ سکتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو پہچانا ہو۔ یہ صورت لوحِ محفوظ ہے جو بڑے ن والقلم سے نکلی ہے۔"

جو اپنے آپ کو پہچان نہ سکے وہ اللہ کو پہچان نہیں سکتا۔ اور جو خود کو پہچانے وہ اپنے خالق اور پالن ہار کو بھی پہچان لیتا ہے۔ اِسی مطلب کی تشریح میں دولت اللہ لوانڑی رقمطراز ہے:۔

د دیدار لذت چه موهی په نظرے　　　　د جنت لذت په سهل بے مقدار شی
ترا ابده به پرے مست وی بے خبر تل　　　　پرے یکسان به غم خوشی لیل و نهار شی
د جنت په حور غلمان به مینه نهٔ کا　　　　چه دیدار ورته خرکند د پاک غفار شی

اے دولتہ تہٗ نظر پہ غیس مہٗ کرہ   د عارف د وړاندے درست جہان یو پاشی

" جو اُسے دیکھ کر لذت دیدار سے محظوظ ہوتا ہے ایسے شخص کی نظروں میں جنت کی لذت ایک بے مایہ سی چیز بن جاتی ہے ۔

وہ ابد تک اِس سے ہمیشہ مست و مسرور ہو جائیں گے ۔ اور ان کے لئے شب و روز کا غم اور خوشی یکساں ہو جائینگی ۔

جنت کے حُور و غلمان سے وہ محبت نہیں کرے گا جس پر اللہ تعالیٰ کا دیدار عیاں ہو جائے ۔

اے دولت ! تو غیروں پر نظر نہ ڈال عارف کے سامنے یہ ساری دنیا ایک شاہد مطلق بن جایا کرتی ہے" ۔

مرزا خان انصاری اسی مفہوم کا اظہار کچھ اور ہی انداز سے کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

کہٗ جہان د حقیقت پہ نظر وینے   زیان و سود وی د ھر چا لہٗ چلے مینے

د نایان پہ ھر ظاھر ےٗ باطن کوری   د جاھلو زړونہ تور شو ستر ګے پینے

" اگر اس دنیا کو حقیقت کی نظروں سے دیکھو تو ہر کوئی اپنی محبت کے مطابق نفع یا نقصان حاصل کرتا ہے ۔ ہر ظاہر میں داناؤں کو باطن دکھائی دیتا ہے ۔ جاہلوں کے دل سیاہ اور آنکھیں بے فائدہ سفید ہو گئیں"۔

" ذکر "

ذاکروں کے ذکر کے بارے میں کہتا ہے[1]۔

کہٗ قرار دے پہ زړہ ذکر و مذکور دے   ناپوھی بہ د ے بیدلہ پہ شعور شی

مہ غیږ چے لہ تو بہ دُ تو بہ بیدار شی   پہ سحر جرس د تلو پہ وخت نارہ کا

د لرا ز چے د غفلت لہ خوبہ وینش شو   د نفس و چلیدہ دُ تہ نظارہ کا

" اگر قرار چاہتے ہو تو دل میں ذکر الٰہی کیا کرو ۔ تمہاری ناسمجھی سمجھ بوجھ میں تبدیل ہو جائیگی ۔

---

[1] دیوان مرزا خان انصاری صفحات ۱۳۱ ، ۱۹۸

مسافر جب میٹھی نیند سے بیدار ہو جائے تو جرس صبح کے وقت کوچ کی صدا دیا کرتا ہے۔

ذاکر جب خواب غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں تو سانس کے آنے جانے کا نظارہ کیا کرتے ہیں "۔

ذکر دو قسم کا ہے، خفی اور جلی۔ اور جیسے کہ ارزانی نے واضح کر دیا ہے اگر خفی ذکر ہر گھڑی کیا جاتا ہے تو چاہیئے کہ صبح کے وقت ذکرِ جلی کیا جائے۔ دولت نے اس کا اظہار اس طرح سے کیا ہے ؎

محبان دخدائے ولاړے و ته یولی ۔۔۔ وربناؤ هیشه یادخفی ذکرونه

دخفی ذکر تاثیرے زوره ورد ے ۔۔۔ د ذاکر د زړهٔ به ئے لرے شی زنگونه

" عاشقان الٰہی کو صراط مستقیم کی دعوت دیتے ہیں اور ہمیشہ اذکار خفی سمجھا کر یاد کرایا کرتے ہیں۔

ذکرِ خفی کی تاثیر بہت زبردست ہے۔ اس سے ذاکر کے دل کا زنگ دور ہو جایا کرتا ہے۔ ذکر کی برکت سے آئینہ دل صیقل ہو جاتا ہے اور سبھی زنگ دور ہو جایا کرتے ہیں"۔ اور جب تمام کے تمام زنگ اُتر جاتے ہیں اور دل کا آئینہ صاف ہو جاتا ہے تو حسن کا جلوہ جھلکتا ہے جیسے کہ عارف کہتے ہیں ع

" پاک شو اول وپس دیده بر آن پاک انداز "

" پہلے اپنے آپ کو پاک کر اور پھر اُس پاک ہستی پر نظر ڈال " تو یہی تزکیہ پیہم ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔

" توبہ "

روشانیوں کے مسلک کے مراتب میں سب سے پہلا عمل توبہ خیال کیا جاتا ہے ارزانی کہتا ہے :۔

" هغه څوک چه توبه اوباسی له ګناه پاک شی ۔ داسے چه هیڅ ګناه ئے کړے نه ده ۔ طالب د غسل وکا تروچه اوبه په ځان اچوی هسے د وائی ۔ اے خدایه لکه مے تن په اوبو پاک شو زړهٔ مے د تا په یاد کښے پاک کړ ۔ تر دے وروستو دے استغفار اولولی او توبه دے کاندی چه له ګناه خلاص شی "

" جو توبہ کرے وہ گناہوں سے صاف ہو جاتا ہے۔ یوں جیسے کہ گناہ کیا ہی نہ ہو۔ طالب غسل کرے اور جب تک اپنے جسم پر پانی ڈالتا رہے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا رہے کہ اے اللہ! جیسے کہ میرا جسم پانی سے

صاف ہوگیا ویسے ہی اپنی یاد سے میرا دل بھی پاک کردے تاکہ اس کے بعد استغفار کہہ کر توبہ کرے تاکہ گناہوں سے چھٹکارا پالے۔

دولت لوانڑے کہتا ہے ؎

پہ گناہ د دوست لہ رحمہ نومید مۂ شہ — خود پہ خود درتہ نارے وہی چہ راشہ

د توبے پہ آب تیر شوے گناہ وینځہ — د غفلت لہ وارہ زنګہ مصفا شہ

"گناہ کی وجہ سے دوست کے رحم سے نااُمید مت ہونا وہ خود بخود تمہیں اپنی طرف بُلاکر کہیگا کہ اس طرف آجاؤ۔ ماضی کے گناہ کو توبہ کے پانی سے دھولے اور غفلت کے سارے زنگ اُتار کر پاک اور صاف ہو جا۔"

"نفس کشی"

عارف اپنے نفس کو کسی وقت بھی سرکشی کرنے نہیں دیتے۔ وہ ہمیشہ اپنے دل کی بھی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں اور انہی کو اپنا پہلا دشمن خیال کرتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ جب تک انسان اپنے نفس پہ غالب نہ آجائے اور نفسانی خواہشات کا قلع قمع نہ کرے اس وقت تک وہ راہِ معرفت پر کامیابی سے گامزن نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ شر کا سارا منبع نفس ہے جیسے کہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

مادرِ بتہا بُتِ نفسِ شما است

زانکہ آن بُت مار و این بُت اژدھا ست

"تمھارے نفس کا بُت۔ دوسرے تمام بتوں کی ماں ہے اس لئے کہ وہ بُت سانپ اور یہ اژدہا ہے۔"

روشانیوں کے مسلک میں بھی نفس کے خلاف جہاد کرنا اور اس پر فتح اور برتری پانا راہِ طریقت کا سب سے اہم مرحلہ ہے۔

میاں روشان خیر البیان میں لکھتے ہیں:۔

"هر چه د نفس له بدئ پناه غواړي تروځ بويه چه د نوس هوس د عقل په رڼا

فهم لری د نه نفتے د مشقت په تیغ دے دوژنی عیان"

"جو بھی نفس کی بدی سے پناہ مانگے اُسے چاہیئے کہ نفسانی خواہشات کو عقل کی روشنی میں جانچے اور اپنے اُکسانے والے نفس کو مشقت کی تلوار سے تہ تیغ کر دے"

نفس کے خلاف اِس جہاد کے بارے میں قرآن کریم اور حدیثِ نبوی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو شیطان کے مکر و فریب سے پناہ مانگے اُسے چاہیئے کہ شیطان کے حربے کو ناکارہ کر دے۔ لوگ شیطان سے دشمنی میں ثابت قدم رہیں"

میاں روشان کے معتقدین کے دواوین میں اِس بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور شاید یہی اُن کی تبلیغ کا اولین مقصد تھا۔ جیسے کہ مرزا خان انصاری کہتا ہے ۔

نوس نادان دے مہ ئے نغوږه ته دانش په فهم زیر کړه
له خناسه خاطر ژغوره دخدائے یاد باندے تحریر کړه

"نفس نادان ہے اِس کی نہ سُن تو دانش اور فہم و فکر سے کام لے۔ اپنے دل کو خناس سے بچالے۔ اور اُس پر یادِ خدا کو ثبت کر دے"

دولت لوانڑی کہتا ہے ۔

نوس او تړه په بند کښے روح بادشاه جاودانی کړه
د خناس په نغوته مهٔ ځه پس روی د روحانی کړه
بد دِ نوس دے کهٔ دے بندکا په هوا سلیمانی کړه
له دښمن سره دښمن شه په خپل دوست مهربانی کړه
کهٔ دِ دا فتحه ریښتیا شی تل تر تله کامرانی کړه

"نفس کو باندھ کر قید میں ڈال دے اور روح کو ہمیشہ کے لئے بادشاہ بنا دے شیطان کے پھسلاوے میں نہ آنا اور اپنے روحانی پیشوا کی پیروی کرتے رہنا۔ تیرا نفس بُرا ہے اگر تُو اُسے قابو میں کرلے تو تو بھی سلیمان علیہ السلام کی طرح ہوا میں اُڑے گا اور بادشاہی کرے گا۔ دشمن کے ساتھ دشمن بن جا اور اپنے دوست

کے ساتھ مہربانی کیا کر۔ اگر تمہاری یہ فتح یقینی ہو جائے تو تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کامران رہو گے۔"
اسی طرح پیر کامل کی متابعت اور اُس کے کہنے اور رہنمائی کے مطابق اُس راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کی پہلی منزل شریعت ہے اور بعد ازاں منازل طریقت شروع ہو جاتے ہیں یہ وہ منازل ہیں جو مرزا خان انصاری کی ایک نظم میں پہلے بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں ضمناً دولت لوانڑی کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں تاکہ طریقت کا راستہ اور بھی واضح ہو جائے کہتا ہے ؎

شریعت د پیغمبر د پیغمبر د ے ریښتیا گفتار د پیغمبر دے — حذر کړه له غلا، زنا، له غیبتونه

پنځه بنا حرام حلال پیښ سند ګلی ده — عمل کړه په واړه حکم په دکتونه

طریقت فعل کردار دایم فرض شوی — د صانع طاعت په واړه اندامونه

"شریعت پیغمبر کی سچی بات ہے، تو چوری، زنا اور غیبت سے بچ کر رہنا پانچ ارکانِ اسلام پر عمل پیرا ہو جاؤ طریقت، فعل، کردار ہمیشہ فرض کئے گئے ہیں اور اپنے سارے اعضا سے اپنے بنانے والے اللہ کی فرمانبرداری کیا کر۔"
شاید پشتونخوا کی تاریخ میں روحانی اور فکری انقلاب کی صرف یہی ایک تحریک ایسی تھی جس کی جامع اور مکمل تعلیمات پشتو ادبیات میں موجود ہیں، اس لئے پشتو زبان کو وہ فعال اور زندہ ادب ملا ہے۔ جس کے باعث فکر و عمل کے ساتھ ساتھ اُس میں روحانیت کی رعنائی اور چمک جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس تحریک کی مخالفت اور موافقت دونوں نے پشتو ادب کو خاصی تقویت بخشی ہے۔ اور اپنے وقت میں پشتو زبان کے ادب کو ایرانی ادب کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔

"اخون درویزہ"

روشانیوں کی تحریک سے اختلاف رکھنے والوں کے گروہ کی سربراہی حضرت اخون درویزہؒ کرتے تھے۔ حضرت اخون درویزہؒ، حضرت سید علی ترمذیؒ کے مرید تھے۔ اور اُن سے وہ جام جہان نما پایا تھا جس نے انہیں راہِ سلوک پر گامزن کیا۔ اور جب فکر و سلوک کے مراحل سے گذرے تو کہا۔

"پوهے شوم پرے چه څه د پوهیدو وو، او معلوم مے کړل چه څه د معلومولو

وُو، سره دد ے چه هیڅ مے معلوم نهٔ کړو او په هیڅ پوهٔ نهٔ شوم لکه چه چاوئیلی دي چه "معلوم شد که هیچ معلوم نه شد"

"جو سمجھنے کا تھا میں اُسے سمجھ گیا۔ اور میں نے معلوم کیا جو کچھ معلوم کرنے کا تھا۔ مگر اس کے باوجود کچھ معلوم نہ کر سکا اور نہ کچھ سمجھ سکا جیسا کسی نے کہا ہے کہ "معلوم ہوا کہ کچھ بھی معلوم نہ ہوا"[1]

پروفیسر سید تقویم الحق کاکاخیل لکھتے ہیں کہ "غالباً یہی دن تھے کہ پیر باباؒ کو وحدت الوجود اور حلقہ پیری میں شمولیت کے لئے ایک دوسرے علمبردار سے شامل ہونیکی دعوت پہنچی۔ میرا اشارہ بایزید انصاری کی طرف ہے۔ یہ سال ۹۵۵ھ ۱۵۴۸ء کا واقعہ ہے"۔ سید صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ " خدا جانے بایزید کے دعوت نامے میں ایسی کونسی بات تھی جسے پیر باباؒ "قومی بلا" سے تعبیر کیا اور بادشاہِ اسلام کا فرمان کیا۔ اس اختلاف کی بنیاد سیاسی ہے یا روحانی! یہ ایک طویل بحث ہے۔ اور ادبیات کی تاریخ کی بجائے سیاست اور مذہب کی تاریخ سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ان دونوں تحریکوں سے جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں متصادم تھیں۔ اور جن سے پشتو ادبیات کا کچھ بھلا ہوا وہ خیرالبیان اور مخزن کے دو مکاتبِ فکر ہیں جن کی بدولت اب تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان ہر دو مکاتبِ فکر نے اس زبان میں بہت بلند پایہ ادیب اور شاعر پیدا کئے ہیں۔

مخزن جس طرح روشانیوں کے عقائد کی بنیادی کتاب بایزید انصاری کی "خیرالبیان" ہے۔ اسی طرح اخون درویزہؒ کے مریدوں اور طرف داروں کے لئے ان کی کتاب "مخزن الاسلام" ہے۔ خوشحال خان خٹک نے اس کتاب کا نام مخزن الاسرار بتایا ہے۔ یہ کتاب دراصل کئی کتابوں کا مجموعہ ہے اور اس خیال سے لکھی گئی ہے کہ پشتون تعلیماتِ اسلام سے آگاہ ہو جائیں۔ ان میں سے کچھ حصے تو اخون درویزہ کے اپنے لکھے ہوئے ہیں اور بعض دوسری اسلامی کتابوں سے ماخوذ ہیں جن میں پروفیسر سید تقویم الحق کے خیال کے مطابق کچھ اپنی طرف سے اضافے بھی کئے گئے وہ لکھتے ہیں کہ " اس کتاب میں قرأت کا رسالہ اخون درویزہؒ کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ کچھ حصہ حضرت ابوالحفص نجم الدین نسفیؒ[2] کی کتاب العقائد کا ہے۔ اس میں تیسری کتاب شرف الدین محمد بن سعید البوصیری کا قصیدۂ بردہ ہے۔ چوتھی کتاب

---

[1] دیباچہ مخزن (مطبوعہ پشتو اکیڈیمی) [2] المتوفی ۵۳۷ھ ۱۱۴۲ء

مُلا کیدانی کا "خلاصہ" شامل کیا گیا ہے۔ جو فقہ کی مشہور کتاب ہے"۔

کہتے ہیں کہ مخزن میں اخون درویزہ کا اپنا کلام "الف نامہ" ہے۔ یہ کلام منظوم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں الف نامے کا رواج مذہبی شاعری میں خاص مقام رکھتا تھا۔ میاں روشان کے مسلک کے بعض شعراء نے بھی اِس میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان میں مخلص روشانی کا انداز کچھ اس طرح سے تھا ؎

م مهدی هادی خاور شه — بے ظاهر اصغر احمر شه
دا احمر رنگ د نیک بختو — دا اصغر د بد اختر شه
ن نور د پیغمبرؐ شو — د جمله عالم پدر شه
د ے بابا د ارواحانو — د صورت ابو البشر شه
و وحدت د ے منتشر شه — د کثرت په موے بیر شه
د ے لطیف دریا بے حدّ — د کثرت په ؤک اغبر شه
ه هادی د زنده سزشه — د ے دانا په هر نفر شه
ځنے بیائی و بهشت ته — ځوک لائق د بد سقر شه
لام الف د لا خنجر شه — پرے عدم غیر اثر شه
چه اثر ورک شی د غیر — د توحید خر کند قمر شه
ی یو د کل باور شه — هم خیمه هم ے بستر شه

د هر چا د ذرهٔ تکیه د ے
هم د هر مکان مقر شه

"م مہدی سورج کی طرح مشرق سے نمودار ہوا تو دو قسم کے لوگ دکھائی دینے لگے ایک اصفر اور دوسرے احمر، احمری رنگ نیک بختوں کا اور اصفر بد اختروں کا ہے۔ ن نور پیغمبرؐ کا ظہور ہوا جو کائنات کا باپ ہے۔ ارواح کا بابا اور صوری لحاظ سے ابوالبشر کہلایا۔ و وحدت کو اُس نے پھیلایا اور کثرت کے بادلوں نے اُسے چھپا دیا وہ ایک لطیف دریائے ناپیدا کنار ہے جسے کثرت کے گرد و غبار نے خاک آلود کر دیا ہے

تھ ہر ذی روح کا ہادی اور ہر کسی سے بڑھ کر دانا ہے بعض کو جنت لے جاتا ہے۔ اور بعض بروں کو دوزخ کا سزاوار ٹھہراتا ہے۔ لام اور الف لا کی تلوار بنی جسے کل ماسوا کو ختم کر کے رکھ دیا اور جب غیر کا اثر باقی نہیں رہتا تو توحید کا چاند نمودار ہوتا ہے۔ یؔ وحدہٗ لاشریک کا عقیدہ ہے اور یہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہی ہر دل کا سہارا ہے اور ہر مکان کے لئے جائے قرار ہے"۔

"مخزن الاسلام" کے الف نامے کے بارے میں پروفیسر سید تقویم الحق لکھتے ہیں"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر میں کمی بیشی کو اس زمانے میں عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر یہ عیب خارج کر دیا جائے تو اس الف نامے کے اشعار شعر کے عمدہ نمونوں کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ اس میں اخون درویزہ کا صوفیانہ مسلک ظاہر کیا گیا ہے اور شریعت اور طریقت کے راستوں کے علاوہ اخلاقیات، دینداری، علماء سے محبت، رفض اور دوسری بدعتوں سے توبہ کرنے اور خود کو بچانے سے بحث کی گئی ہے۔

اخون درویزہ کے الف نامے کا آغاز یوں ہے۔

الف اسم د اللہ دے لہ ټکی مبرا دے
ھر چہ پہ دا اسم مشغول شہ ھغہ سالک اللہ دے
ھر سالک چہ موافق پہ شریعت ځی
د حدیث لہ قرآنہ دے دکل جھان پیشوا دے
ب۔ پاکی د مصطفےٰ دہ پہ ټو پاکہ دہ را غلے
چہ پہ شرع مستقیم شو د نبی لار ھغو نیولے
ھر چہ تجاوز نہ کا لہ شرعے
د باور سپینہ خیمہ ئے پہ زړہ کوټی دہ وھلے
د شریعت روندے منھالہ کړہ پہ زړہ کښے
چہ خبر شے لہ بنا غو نو ھم لہ ولے

" الف اسم اللہ کا ہے جو نقطے سے مبرا ہے۔ جو اس اسم سے مشغول ہو گیا وہ اللہ کا سالک ہے۔ ہر وہ سالک

جو راہِ شریعت پہ چلے تو از روئے قرآن و حدیث یہ شخص پورے جہان کا پیشوا ہے۔ تمام پاکیوں میں حضورؐ کی پاکی مسلم ہے۔ جو راہِ شریعت پہ استقامت سے چلا تو گویا وہی راہِ رسولؐ پہ گامزن ہوا جو شرع سے تجاوز نہ کرے تو گویا اُس نے اپنے چھوٹے سے دل میں یقینِ محکم کا صاف ستھرا خیمہ تان لیا۔ شریعت کا پودا اپنے دل میں لگالے تاکہ تجھے شاخوں اور پورے درخت کا پتہ چل جائے"

وحدت الوجود کے بارے میں بھی اخون درویزہ کا عقیدہ اسی الف نامے میں موجود ہے ؎

ح۔ دے حی لا یموت دے — دے لہ عقلہ ماورا دے
ھر چہ دے پہ عقل غواړی — د ھغۀ دلیل خطا دے
ھر چہ تول ایمان لرینہ — دے دِ دومرہ او منینہ
چہ خالق د کل عالم دے — ھم کارساز د کل اشیا دے
او خپسر ورسپا رینہ — کل اغیار نفی کوینہ
دے کۀ غیر نہ وبنیٔنہ — پوھیدلے پہ فنا دے
ولے ھر چہ نفی ھم شوہ — ځنې ورکہ
د توحید تر مقام تیر شو — پہ وحدت کښې دے بسیار دے
ھلہ پسہ پہ الماسی تیغ — پہ دۀ کار اوسنۀ کا
چہ د شیخ بایزید لہ احواله — دے آګاہ دے

او دا ھسے حال لہ خدایہ کاہ کاھے وی
چہ پہ عقل بہ ئے غواړی پائے وئی ھغہ گمراہؔ

"ح۔ وہ حی لایموت ہے اور ماورائے عقل ہے۔ جو عقل سے اُسے جاننا چاہے تو اُس کی دلیل ناقص ہے۔ جو ایمانِ کامل رکھتا ہو تو صرف اتنا مان لے کہ وہ کُل عالم کا خالق ہے۔ اور سبھی اشیاء کا کارساز ہے۔ تو اگر خود کو حوالے کردے اور اغیار کی نفی کردے، غیر کی نشاندہی نہ کرے تو گویا تُونے فنا فی اللہ کے راز کو پالیا ہے۔ لیکن جسے نفی کرنے کی بھی سدھ بدھ نہ رہے تو وہ گویا منزلِ توحید سے گزر کر وحدت میں جا ٹھہرا ہے۔ الماسی

تلوار اس پر اس لئے اثر نہیں کرے گی کہ وہ شیخ بایزید کے احوال سے آگاہ ہے۔ اور اللہ کیطرف سے ایسی حالت کبھی کبھار ہی ہوتی ہے۔ اور جو اس کی دلیل از روئے عقل طلب کرے وہ گمراہ ہے۔"

جذب و استغراق کی حالت میں جب سالک کی محویت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو یکسر گم کر دے۔ اور ہر طرف اور ہر چیز میں اُسے وجودِ مطلق کا جلوہ دکھائی دے تو ایسی حالت میں ایسی باتوں پر جیسے بایزید بسطامیؒ یا منصور حلاج نے کی تھیں۔ اُس کی گرفت نہیں کی جا سکتی وہ جو اس کیفیت سے سرشار ہو جائے نہ تو دار و رسن کی پرواہ کرتا ہے۔ اور نہ تیغ و تفنگ سے ڈرتا ہے۔ اس بارے میں اخون درویزہ کی رائے یہ ہے۔

ھر چہ دار نہ قبلوینہ د منصور دعویٰ دِ نہ کا ؎

ھر چہ ویرہ کالہ دارہ دے ملحد حال ئے تباہ دے

"جو دار قبول نہ کرے تو پھر منصور جیسا دعویٰ بھی نہ کرے۔ اور جو دار سے ڈرے وہ ملحد ہے اور اُس کی حالت تباہ ہے۔"

"مخزن میں کریمداد کا حصّہ"

مخزن کا کچھ حصہ حضرت کریم داد بن اخون درویزہ کا ہے جو اُن کا بڑا لڑکا تھا۔ اور جس نے اُن کی ساری مانیں مرتب کی ہیں۔ پروفیسر سید تقویم الحق کہتے ہیں کہ کریم داد بڑے عالم محقق اور صوفی شاعر تھے۔ اُن کی پشتو تصانیف میں مخزن کا کچھ حصہ شامل ہے۔ یہ بھی بحر خفیف کا الف نامہ ہے جو چار سو ستر (۴۷۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر میں بحر اور وزن ساقط ہوا ہے۔ اور مسجع مقفیٰ نثر کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے کہ کہتے ہیں۔

شریعت دپاک رسولؐ دجنت لار تہ پرے روان شہ

قدم سم بزدہ چہ نہ شے لہ مکرھانو

؎ یہاں بایزید بسطامیؒ کے بارے میں ایک تلمیح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جب انہوں نے عالم استغراق میں کہا "سُبحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ۔" تو مریدوں نے انہیں چھرا گھونپ دیا لیکن اُن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا

خدا ئے آگاہ کنرہ لہ حالہ
د غفلت لہ خوبہ ویبنس شہ
نفس شیطان د ے غلیمان نغوتہ ئے مہ کرہ
لہ بنادئ دِ اویاسی لکہ آدم چہ ئے ایستلے لہ جنان وو
زندہ سرھمہ مشغول پہ تسبیحات ترجمادات و نباتات دی۔
او دوئ وارہ دی فانی۔
تاسو ٹولا پہ ذکر فکر مشغول اوسئ۔
اے انسانو د بندہ مخ روښری پہ خدمت وی ھم ئے قدر.....

"پاک رسول کی راہ شریعت سے جنت کی راہ پر روانہ ہو جا۔ قدم ٹھیک رکھو، تاکہ تم گمراہوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ اللہ کو اپنے حال سے آگاہ جانو خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔ نفس و شیطان تیرا دشمن ہے۔ ان کا کہا نہ مان۔ یہ تیری مسرتیں چھیننا چاہتے ہیں جیسے آدم کو جنت سے نکالا اور آدمؑ کی خوشیاں چھین لیں۔ سب جمادات و نباتات تسبیح کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کچھ فانی ہے۔ تم تو ذکر و فکر میں مصروف ہو۔ اے انسانو! خدمت ہی سے انسان کا چہرہ روشن ہوتا ہے اور اُس کی قدر ہوتی ہے[1]۔"

مخزن میں میاں کریمداد کے کچھ متفرقات بھی ہیں، یہ عارفانہ کلام ہے۔ کلام میں تغزل موجود ہے۔ زبان سادہ اور روان ہے۔ اشعار کا یہ نمونہ مذکورہ صفات کا حامل ہے کہتے ہیں کہ ؎

ص طالب چہ د شہباد خال ھوس کا
کمینی دِ کا اختیارہ ځان دِخس کا
بے ھودہ نظر دے پر یرږدی ......
ھیشہ دے پاسبانی دخپل نفس کا

---

[1] مخزن الاسلام صفحہ ۱۲۸

کوڅ زاغ دپلیتې پہ زمکہ کرځي
قناعت پہ خپل جالہ کښې ققنس کا

(۲) پہ خپل جانان هسې عاشق یم چہ هر دم مې یادیږي
پہ هر لوري چہ ئې ګورم دده مخ را جلوه کیږي
جان مې دې شي پیروزه شہ چہ مې تل پہ شونډو وولګیږي
یا مې زلفې شہ شب رنګې چہ مې تل پہ مخ زنګیږي

(۱) "ہر طالب جو اپنے محبوب کے خال کی خواہش کرتا ہے تو عاجزی اختیار کرکے خود کو پرکاہ کی مانند بے قیمت بنا دے۔

اِدھر اُدھر بیہودہ دیکھنا چھوڑ دے اور ہمیشہ اپنے نفس کی پاسبانی کرے۔

کوے کو دیکھو کہ گندی زمین پر پھرتا ہے۔ اور ققنس اپنے گھونسلے پر قانع رہتا ہے۔

۲ "میں اپنے محبوب کا ایسا عاشق ہوں کہ مجھے ہر گھڑی اُس کی یاد ستاتی ہے۔
اور جس طرف بھی میں دیکھوں اُسی کا جلوہ مجھے نظر آتا ہے۔ کاش میرا محبوب میری جان کا فیروزہ بن جائے تاکہ سدا میرے ہونٹوں سے لگا رہے۔ یا پھر وہ میری زلفِ شب رنگ بن جائے جو سدا میرے چہرے پر لٹکتی رہیں۔"

اِس کتاب میں عبدالحلیم ابن عبداللہ ابن اخون درویزہ کے ملحقات بھی ہیں۔ سید تقویم الحق کاکاخیل کی تحقیق کے مطابق[۱] "مخزن الاسلام" آخری دفعہ مصطفیٰ محمد نے ۱۲ محرم سال ۱۱۱۲ھ میں مرتب کی ہے اور کریمداد اور عبدالحلیم کے الف نامے اور کچھ عبارتیں بڑھائی ہیں بعد میں یہی نسخہ لوگوں نے نقل کیا ہے اور اسی طرح شائع ہوا ہے مصطفیٰ محمد میاں نور بابا کا بیٹا اور کریمداد کا پوتا تھا وہ آگے چل کر کہتے ہیں۔

"جب تک مخزن ایک علمی کتاب کی حیثیت سے پڑھی جاتی تھی تو اس اشتراک میں شاید اس قدر نقصان نہیں تھا لیکن مخزن کا اپنا ایک ادبی مقام بھی ہے اور اُس اعتبار سے ان دونوں حصوں کو الگ کرنا بہت ضروری ہے۔"

---

[۱] دیباچہ مخزن الاسلام صفحہ (ع ط)

خیر البیان اور مخزن کا فکری اور ادبی مقام اور مختلف ادوار میں پشتونوں کی معاشرتی زندگی پر اس کے اثرات، تاریخ اور معاشرت کے طلباء کے لئے تحقیق اور تدقیق کا ایک بڑا اہم میدان ہے۔

ان گذشتہ صفحوں میں دونوں کتابوں کے فکری اور ادبی پہلوؤں پر کچھ مختصر سی بحث کی گئی ہے۔ اب چاہیئے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس انقلابی دور کے فوراً بعد جب قلم اور تلوار کے دھنی خوشحال خان خٹک پشتو کے میدان میں داخل ہوئے تو انہوں نے بحیثیت نقاد اپنے ان پیش روؤں کے علمی اور ادبی مقام کو کن نظروں سے دیکھا!

"خوشحال خان اور متقدمین"

خوشحال خان خٹک نے دستار نامے کے نام سے جو علمی کتاب پشتو نثر میں لکھی ہے اس میں اس نے کسب اور کمال کے جن بیس ہنروں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں بہ ترتیب اہمیت، شعر کا ہنر چوتھے نمبر پر پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے[1]:

" دا هنر چه د شعر د نظم دے هم داخل د کسب کمال دے اما شعر دے لہ شعور،
چه جبلی طبیعت د شعر لری۔ شعر د هغه دے۔ فنونه، صنعتونه ئے په کسب حاصلیږي
کۀ ډیر تحصیل وکا صنائع بدائع د شعر زده کا چه طبیعت د شعر جبلی نۀ لری،
خبره به نظم نۀ کا۔ د شعر طبیعت په مثال د تند باد دے۔ لوئے ونے طاقت لری
چه ورته ودریږی او کۀ نه چه بنیاد محکم نۀ لری صفه ونے لہ بیخه او لوړوی۔
قوت د علم بویه چه ویخے ئے پرے محکم وی۔ او کۀ نه ئے فته مضرته به پاتو
نۀ شي۔ چه بے علمه شعر واٸ تو نقصان لری۔ اول خو به ئے درست او نۀ
واٸ۔ د شعر عیب حاسوسان ډیر دی ځان به دخندا کا بل دا چه که فقط
د شعر صنائع بدائع د عروض علم زده کا قوت ئے د نورو علم نۀ وی خطا به ورځنې

---

[1] دستار نامہ ص ۴۳

واقع شي - ایمان به بائےٌ کا - بل دا چه د شعر مستي ډیره ده چه تابےٌ د مستئ د علم په زور دا نهٔ وړی مخبط به شي - که له دے واړو کارونو تیر شي کمالےٌ حاصل شي هغه سړے که شعر وائیٌ هغه علم، حکمت، فضیلت دے۔ و هغهٔ و ته که رخصت نهٔ دےٗ هم رخصت دے۔ رباعی ؎

کهٔ شعر دے، هغه دے چهٔ اووائیٌ دانا
هغه څه شعر نهٔ دے چهٔ جوړ کا ندی کانا
دواړه تو که څهٔ دی در ته وایم په معنیٰ
یو آواز د خره دے بل آواز دے د سُرنا ،،

،، یہ ہنر جو شعر کہنے کا ہے یہ بھی کسب کمال میں داخل ہے۔ شعر شعور سے ہے۔ جو شعر کہنے کی جبلت رکھتا ہو شعر اُسی کا ہے۔ فنون اور صنعتیں اکتساب سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بہت علم حاصل کرلے، شعر کے صنائع بدائع سیکھے لیکن اگر شعر کہنے کے لئے جبلی طبیعت نہ رکھتا ہو تو کسی خیال کو نظم نہیں کرسکے گا۔ شعر کی طبیعت تیز ہوا کی مانند ہے۔ بڑے درخت تو یہ طاقت رکھتے ہیں کہ اس کے سامنے مضبوطی سے ٹھہر جائیں لیکن اگر بنیاد محکم نہ ہو تو درخت کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہے۔ اس کے لئے علم کی قوت ہونی چاہیئے کہ جڑ مضبوط ہو۔ ورنہ بے آفت اور بے نقصان ہرگز نہیں رہے گا۔ اگر کوئی بے علم شعر کہے گا تو ضرور اس میں قباحتیں ہوں گی۔ پہلے تو اُسے درست لکھ نہیں سکے گا۔ شعر کے عیب کے جاسوس بہت ہیں اس لئے جگ ہنسائی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اگر صرف شعر کے صنائع بدائع اور علم عروض سیکھے اور مزید علم کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اُس سے غلطی سرزد ہوگی۔ اس میں ایمان ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ شعر کی مستی بہت زیادہ ہے اگر علم کے زور سے وہ مستی کو قابو میں نہ لائے تو پاگل ہو جائیگا۔ اگر کوئی اِن تمام مرحلوں سے گزر کر کمال حاصل کرلے۔ اور وہ شخص شعر کہے تو وہ علم بھی ہے، حکمت اور فضیلت بھی ہے اور اُسے اگر اجازت نہ ہو تو بھی اجازت ہے۔ رباعی :۔

،، شعر وہی ہے جو دانا کہے۔ وہ شعر کیا جو کسی جاہل کی فکر کا نتیجہ ہو۔ یہ تو میں تمہیں بتاؤں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ ایک آواز گدھے کی ہے اور دوسری شہنائی کی ؛

خوشحال کے کلام میں شعر کو "حیض الرجال" کہا گیا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے[1]۔ ؎

کہ د شعر ویل هم ثو د صفت وی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بیا په شعر کښې پیدا شی انفعال
د خبره بده نه ده چا ویلی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ په تحقیق چه شعر حیض دے د رجال
په جهان تر شاعری بد څه نیشته ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ خدائے اخته مه کړه سړے په دا جنجال
بل که هر څو د رکوهر پیی په شعر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عیب جوئی ئے جاسوسی کا دا فعال
دا هم د خپلے پوهے نتیجه ده ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چه شاعر د فکره نه وی فارغ بال
ما دا څو توکه چه اولید ل د شعر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ هغه توبه د شاعرئ دا فعال
که د شعر مذمت عیبونه ډیر دی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ څوک چه بنه وکا د شعر استعمال
دانائی علم حکمت پکښے زیاتیږی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ څوک اطلس وو دی په شعر کښے شال
کرامت دے یا اعجاز دے یا جادو دے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چه په شعر را پیدا شی له قوال
شعر کار یا د سالک یا د مالک دے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ د عاشق دے د درد مند دے د ابدال
بند و بست د پښتو شعر ما پیدا کړو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کنړه شعر د پښتو وو غیر سال
نه ئے وزن نه تقطیع نه ئے عروض وو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ د وه مصرعے ئے خفیف بحر د وه د طال
د غزل نه ئے مطلع نه ئے مقطع وه ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نه صنعت نه ئے تشبیه نه ئے مثال

"ہر چند کہ شعر کا کہنا قابل تعریف ہے پھر بھی شاعر کو ایسا کرنے سے بسا اوقات خفت اور شرمندگی بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ کسی نے بے جا نہیں کہا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ شعر حیض الرجال ہے۔ اس دنیا میں شاعری سے بڑھ کر کوئی بری چیز نہیں۔ خدا کسی کو بھی اس جنجال میں مبتلا نہ کرے۔ شعر میں چاہے جس قدر بھی کوئی ہیرے موتی نظم کرے، عیب جو اس کے افعال کی جاسوسی کرتا ہی جائے گا۔ یہ سب کچھ اپنی سمجھ کا نتیجہ ہے۔ اور شاعر تفکر سے کبھی فراغت نہیں پاتا۔ میں نے شعر کے ان چند ایک لوازمات کا جو کچھ اندازہ کیا تو سمجھ گیا کہ شعر و شاعری کے کاروبار سے تو توبہ کرنی ہی بھلی۔ اگرچہ

---

[1] کلیات خوشحال خان ص ۵۳۶

شعر کی برائیاں اور عیوب زیادہ ہیں۔ پھر بھی شاعری کا ہنر اقبال مندی کا حامل ہوتا ہے۔ اِس سے دانائی اور علم و حکمت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شعر کا استعمال صحیح طریقے سے کرے تب باتوں کے تانے بانے جب بُنے جاتے ہیں تو بعض اطلس بُنتے ہیں اور بعض شال، یہ کرامت ہے، اعجاز یا جادو جو شعر کہنے پر کسی قوال سے ظاہر ہوتا ہے۔ شعر یا تو سالک کا کام ہے۔ یا مالک کا۔ یا یہ عاشق درد مند یا ابدال کو زیب دیتا ہے پشتو شعر کو میں نے منظم کیا ورنہ یہ سلاست و روانی سے عاری تھا۔ نہ اس کی کوئی تقطیع تھی اور نہ عروض۔ اگر دو مصرعے بحر خفیف کے ہوتے تو دو بحرِ طویل کے۔ غزل کا تو نہ مطلع تھا اور نہ مقطع۔ نہ صنعت نہ تشبیہ اور نہ مثال"۔

ایک دوسرے قصیدے میں کہتے ہیں۔ ؎

(۱) پہ پښتو شعر چہ ما علم بلند کړو — د خبر و ملک مے فتح پہ سمند کړو
مدعی د تورے شپے اود اورکے وو — د سهیل غوندے مے ځان بانسے څرګند کړو
یو پہ حال او پہ ماضی کښے هسے نہ وو — چہ ښکارہ مے د خبرو راتہ څوند کړو

(۲) لہ چانہ پہ پښتو کښے میزان لیدلے نہ دے — مرزا پہ دا زبان کښے ویل کړی دی تللی
مخزن مے دا نون چہ تمامی پہ نظر کښیوت — پہ دہ کښے نہ عروض شتہ نہ مے بحر موندلی

(۳) درویزہ چہ لہ یو لوره را پیدا شو — پہ لږ علم پہ دا ملک کښے لوئے ملا شو
چہ مے حال د دے عالم مشاهده کړو — خپل کتاب مے پہ کاغذ مسوده کړو
د روښان خیر البیان مے وو لیدلے — صفا هم مجهول بیان وو ناپسند لے
دہ چہ توښے میدان بیا موند سخنګوئی شو — پہ ویل کښے مے چہ زړهٔ وو هسے توئی شو
پہ دا فن مے درست د سوات عالم مطیع کړو — د عالم و تہ مے خپل کتاب ودیع کړو

(۴) یو کتاب د ے درویزه سره جوړ کړے — د سوات خلق مے لہ کل عالم موړ کړے
نامعقول مجهول بیان پکښے بے ځایه — پکښے بد د سید و ا یه یزید ستایه

۵ درویزه چه بیان کړے خپل کتاب دے — نوم مے مخزن الاسلام ایښے جناب دے
هم بیان مے ناموزون مجهول بے رنګه — خالی پاتو له دا نشه لہ فرهنګه

کۀ یوه مصرعه په شل بله په سل ده — ناموزونه نامربوطه په وئیل ده

قافیه د لام و دال سره وهلے — په ردیف کښې نون او واؤ سره پیلي

قصیده د بوصیري ترجمه کړے — عربي ئے تر پښتو مضحک راوړے

هر هر بیت د قصیدے چه درمرجان دے — په پښتو کښې تر وربشو لا ارزان دے

معماد آزري ترجمه کړے — تصوف ئے وعالم وته نومړے

ترجمه د شاه ناصر یوځو اشکاله — وعالم ته ئے جوړه کړے لمقاله

مسئلے کۀ نظم کړے په پښتو دي — درته څۀ وائیم چه څۀ دي د بستوري

په دا صے شان کتب ئے مهابات دے — د جامي هفت اورنگ ورته ناویات دے

گنده پزد گنده غور سره تبو پرېزي — خاص په خاص او عام په عام ویل نوښیږي

(۶) بل د موږ مخزن نه شعر نه بیان دے — بیان شوے نظم نۀ دے په بل شان دے

کۀ ئے گوره ئے درست په شان د صحیفو دے — چه راغلے به له آسمانه له هغو دے

په پښتو کلام موزون دے بیان شوے — په معنی کښې د گوگړن دے بیان شوے

(۷) د مرزا دیوان مے او منډو په گوډي — مسخره مے ارزاني خویشکے زمند کړ

کۀ دولت دو کۀ واصل دو کۀ دانوړ وو — په خبرو مے د هر یوه ریشخند کړ

(۸) چه زموږ ده په حساب دے — هیڅ مے نۀ دے واصل هیں

بل دولت فقیر درے پاوه — زۀ ترے څو شیر شاهي تیں

(۹) دوه څیزه دي په سوات کښې کۀ خفي دي کۀ جلي

یو مخزن د درویزه دے بل دفتر د شیخ ملي

(۱) میں نے جب پشتو میں شاعری کا علم بلند کیا تو شاعری کے رہوار سے اقلیم سخن کو فتح کیا۔
مدعی سیاہ رات کے جگنو کی مانند تھا میں اُس کے مقابلے میں سہیل کا ستارہ بن کر نمودار ہوا۔
ماضی اور حال میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنی شاعری سے مجھے متاثر کرسکتا۔

۲۔ میں نے پشتو میں کسی کے متوازن اور معیاری اشعار نہیں دیکھے۔ صرف مرزا نے اِس زبان میں اچھے تلے اشعار کہے ہیں۔

پوری مخزن (کتاب) میری نظروں سے گزری ہے۔ نہ تو اُس میں کوئی عروض ہے اور نہ اس کی کوئی بحر معلوم کرسکا۔

۳۔ اس ملک (سوات) میں کہیں سے درویزہ نمودار ہوا اور باوجود قلیل علم کے وہ بہت بڑا مُلّا بن گیا۔ جب اُس نے یہاں (سوات) کے لوگوں کا حال دیکھا۔ تو کاغذ پر اپنی کتاب لکھ ماری۔ اُس نے روشان کی کتاب "خیرالبیان" دیکھی تھی۔ وہ بھی مجہول اور ناپسندیدہ بیان تھا۔ جب اس نے میدان کو خالی پایا تو سخن ساز بن بیٹھا جو کچھ اُس نے کہنا چاہا وہی کچھ کہہ گیا۔ اور تمام سوات کے لوگوں کو اِس فن سے مطیع کیا۔ اور دُنیا کے سامنے اپنی کتاب کو نسخۂ نایاب بناکر پیش کیا۔

۴۔ درویزہ نے ایک کتاب تالیف کی ہے اور اس کے ذریعے سے تمام اہل سوات کو ساری دنیا سے بیزار کر دیا ہے۔ اس کتاب میں اُس کا بیان نامعقول، مجہول اور بے محل ہے اور اِس میں سّید کی بُرائی اور یزید کی ستائش ہے۔

۵۔ درویزہ نے جو کتاب مرتب کی ہے تو جناب نے اُس کا نام "مخزن الاسرارؔ" رکھا ہے۔ اُس کا سارا بیان ناموزون، مجہول اور بے رنگ ہے اور دانش و فرہنگ سے عاری ہے۔ اگر ایک مصرعہ بیس ماتروں کا ہے تو دوسرا سو کا۔ یہ کتاب پڑھنے میں ناموزوں اور نامربوط ہے۔ قافیہ میں لام دال برابر کر دیتے ہیں۔ اور ردیف میں ن اور واؤ کو باہم یکساں کیا ہے۔ بوصیری کا قصیدہ ترجمہ کیا ہے لیکن عربی کا یہ پشتو ترجمہ مضحکہ خیز ہے۔ قصیدے (بوصیری) کا ہر ایک شعر دُر و مرجان ہے۔ مگر اِس کا پشتو ترجمہ جَو سے بھی زیادہ ارزاں ہے۔ آزری کے معمہ کا ترجمہ کر کے اسے تصوف کا نام دیا ہے۔ شاہ ناصر کی توضیحات کر کے مقالے کی صورت میں اسے لوگوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر اُس نے پشتو میں کچھ فقہی مسائل نظم کئے ہیں تو کیا کہنے بس طاق نسیاں میں رکھنے کی چیزیں ہیں۔ اپنے اس کارنامے پر اُس کو فخر بھی ہے اور اپنی اس کتاب کے مقابلے میں جامی کے

؎ اصل نام مخزن الاسلام ہے۔

بھنت اور ننگ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ خراب پکا ہوا اس کے کھانے والے کے ساتھ جُڑتا ہے۔ خاص لوگوں کے ساتھ خاص اور عام لوگوں کو عام باتیں زیب دیتی ہیں۔ (۶) اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارا مخزن نہ تو شعر ہے اور نہ نثر۔ اور اس کی نوعیت نظم کی نہیں بلکہ کچھ اور شے ہے۔ کوئی دیکھے تو یہی اس کا انداز سراسر آسمانی صحیفوں کا سا ہے۔ یہ پشتو میں کلام موزون ہے اور معنی کے لحاظ سے اُس کا بیان کچھ انوکھے ڈھنگ کا ہے۔[1]

۷۔ مرزا کے دیوان کو میں نے طاق نسیان میں رکھدیا اور ارزانی، خویشکی اور زمند کے کلام کو میں نے مضحکہ خیز ٹھہرایا۔ دولت، واصل یا کہ دوسرے شعراء سب کو میں نے سخنگوئی میں بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارے نزدیک اگر کسی کی کچھ اہمیت ہے تو (۸) واصل جو شاعری ہیں ہمارے معیار کا ہے اُسے ہم نہیں بھلا سکتے پھر دولت فقیر جو وزن میں تین پاؤ ہے اور میں شاید ان سے چند ماشے زیادہ ہوں۔

۹۔ سوات میں خفی اور جلی دو ہی چیزیں تو ہیں ایک اخون درویزہ کا مخزن ہے اور دوسرا شیخ ملی کا دفتر۔

خیرالبیان اور مخزن دونوں مسالک پر مذکورہ بحث و تمحیص اور خوشحال بابا کے اس تنقیدی تجزیئے کے بعد قارئین خود وہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں جو پشتو ادب کے میدان میں اس پُر آشوب دور سے رونما ہوئے ہیں لیکن وہ چند اہم نکتے جو تاریخ ادبیات کا مطالعہ کرنے والے شائقین کے لئے لمحۂ فکریہ بنتے ہیں وہ یہ ہیں:

(الف) اب تک شعر و نثر دونوں میں تقلیدی ادب اُس مقام تک جا پہنچا تھا کہ اسکے بعد شعر و ادب کی مستعار اصناف میں تخلیقی رجحان نمودار ہونے لگا۔

(ب) عقائد اور تصوف نے پشتو شاعری پر اس قدر غلبہ پالیا کہ فطری جذبات اور افکار کو اُس وقت کے ادب سے خارج کر دیا گیا۔

ایک متنازعہ کتاب

خان علیین مکان کی تنقید یا تو محض بایزید انصاری اور اخون درویزہ کے مسلکوں تک محدود تھی اور یا جیسا کہ

---

[1] میاں نور بابا کا بیان جو خوشحال خان نے سوات نامہ میں نقل کیا ہے۔

پشتو شعر و ادب کے وہ قدیم نمونے جن کا ذکر محقق و دانشور حبیبی کی دریافت کردہ کتاب "پٹہ خزانہ" میں آیا ہے اور جن کے ساتھ پشتو نخوا کے مشرقی حصے کے وہ لوگ مانوس نہیں تھے جنھوں نے چند صدی قبل قندہار، غور اور پھر "غوڑہ مرغہ" سے مشرق کی طرف ہجرت کی تھی[1]۔ اس میں حیران کن بات یہ بھی ہے کہ "پٹہ خزانہ" کے بعض پرانے شاعر وہ سڑبنی پشتون تھے جن کی آبادی کا زیادہ تر حصہ سولہویں صدی عیسوی کے اوائل سے خیبر سے دمغار تک اور دریائے کنڑ سے دریائے سندھ کے کنارے تک آباد تھا۔ اور جو خوشحال بابا کے زمانے میں بھی ان علاقوں پر قابض رہا۔ اس سے قبل یہ لوگ کہاں پر مقیم تھے مزید سڑبن غور، غوشت اور بٹن قبائل نے اپنے مقبوضہ علاقوں کی تقسیم کیسے کی تھی؟ یہ باتیں محمد ہوتک کی کتاب "پٹہ خزانہ" میں ذکر شدہ شعراء سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ان کی تلاش ضروری ہے۔ اس بارے میں خان علیین مکان خوشحال خان خٹک نے کہا ہے ؎

پښتون په اصل سړبنړ دے   یا غور، غوښتے دے یا بیټنے دے
لودی غلجے دے د بیټ له لوریه   په سړبن پورے بیا کرلانړے دے

(پشتون اصلاً سڑبن غور غوشت اور بیٹن کی اولاد ہے۔ لودھی اور غلجی بیٹنیوں سے منسوب ہیں اور کرلانڑی سڑبنیوں میں شمار کئے جاتے ہیں)

اس زمانے میں اگر ایک طرف سڑبن اور کرلانڑ کا رشتہ استوار تھا تو دوسری طرف باقی ماندہ قبائل بھی ایک دوسرے سے اس قدر بیگانہ نہیں تھے کہ زبان و ادب کے بارے میں وہ مکمل طور پر بے خبر رہتے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خوشحال بابا پشتو تخلیقی ادب کا یہ شاندار اور اعلیٰ معیار یکسر نظر انداز کرتا۔ حالانکہ یہ دور ایک لمبے عرصے پر محیط ہے۔

دورِ اسلامی کے آغاز سے لے کر حضرت شیخ ملی بابا کے زمانے تک اتنے بڑے عرصے میں گذرے ہوئے کسی بھی پشتو شاعر یا ادیب کا ذکر خوشحال خان کی تمام کتابوں میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ متقدمین میں سب سے پہلی شخصیت جس کا ذکر خان نے کیا ہے سولہویں صدی کی عظیم شخصیت حضرت شیخ ملی مندنڑ یوسفزئی سڑبنی کی ہے جس کا اسم گرامی آج تک ہر کسی

---

[1] مقالہ "پٹہ خزانہ فی المیزان" ماہنامہ "پشتو" (پشتو اکیڈمی) مارچ ۱۹۷۶ء

کو معلوم ہے۔ پھر اس ملی شاعری کا کیا بنا جو مرزا الغ بیگ اور بابر کے زمانے سے لے کر اورنگ زیب بادشاہ کے زمانے تک پشتو زبان میں کی گئی تھی۔ اُسے عقائد کے غلبے، یا مذہبی تعصبات اور فرقہ بندیوں نے محو کر دیا، یا عربی فارسی علوم و ادبیات کے فروغ نے اسے دبا دیا۔ جب تک پشتو ادبیات کے چاند کے گرد اس ہالہ نے احاطہ کیا تھا اور خوشحال بابا کا علم شاعری ابھی بلند نہیں ہوا تھا اس وقت تک پشتو ادب کا چاند اس گرہن سے باہر نہیں آسکا تھا۔ اور جونہی خوشحال بابا اِس اعلان کے ساتھ پشتو زبان کے اُفق پر نمودار ہوا۔ کہ ؎

ما خوشحال چہ پہ پښتو شعر بیان کړو — د پښتو ژبہ بہ اوس پہ آب وتاب شی

"اب جب کہ میں (خوشحال) نے پشتو میں شعر کہے تو اس زبان کو آب و تاب حاصل ہو جائیگی۔"

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ محمد ہوتک کی کتاب "پٹہ خزانہ" میں ایسا کوئی شعر نہیں ملا جو بابر اور الغ بیگ کے زمانے کے اِن ملی سانحوں کی طرف اشارہ کرتا ہو جن کی وجہ سے پشتون من حیث القوم تنازع للبقا کے لیے جد وجہد کرنے میں مشغول رہے۔ اِس طویل کشمکش کا حتمی نتیجہ بھی یہی ہوا کہ پشتو شاعری کے جمود کا زمانہ آخر گذر گیا۔ اور خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمان مہمند کی آفاقی تخلیقات کا دور شروع ہوا۔

محمد ہوتک کے قدیم پشتون شعراء کے تذکرے پر عبدالرحمان بابا کے اِس شعر کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے! یہ بھی ایک لمحۂ فکریہ ہے وہ کہتا ہے ؎

یو کتاب پہ سړبن کښے چا ونہ کړو — بے رحمانہ چہ ئے اوکړو دا کتاب

"سڑبن میں (اِس سے پہلے) ایک بھی کتاب کوئی تصنیف نہ کر سکا سوائے رحمان کے جس نے یہ کتاب تصنیف کی"۔

حالانکہ محمد ہوتک کے تذکرے میں انکے کہنے کے مطابق اکثر پشتون شعراء سڑبنی ہیں۔

اس کے بعد پشتو ادبیات کا وہ سفر شروع ہوا جو عشقیات، روحانیات، اجتماعیات، اخلاقیات اور ہمہ گیر عوامی اور معاشرتی افکار کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے تمام محاسن اور خوبیوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحال بابا سے لے کر احمد شاہ بابا کے دوران تک کے زمانے کو پشتو ادب کے درخشاں دور سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس دور میں نہ صرف یہ کہ پشتو زبان میں وہ عظیم شعراء پیدا ہوئے جن کا اِس زبان کی تاریخ کے کسی ایک دور میں بھی ہمسر اور ثانی نہیں۔ بلکہ اس زمانے میں اِس زبان میں تراجم تصانیف، تالیفات

اور مزید برآں مثنوی میں پشتو کی عشقیہ داستانوں کے ایسے شاہکار تخلیق کئے گئے جنہیں دیکھ کر فارسی دان بھی انگشت بہ دندان رہ گئے لیکن افسوس کہ اِس دور کی پشتو مثنوی کا یہ قابلِ رشک معیار متاخرین برقرار نہ رکھ سکے اور اسی لئے اس نے " بدلہ " کا روپ دھار لیا۔

باوجود اس کے کہ بَدلہ کو پشتو ادب کا ایک پُرلطف اور ہر دلعزیز صنف گردانا جاتا ہے تاہم اِس کے پیکر میں وہ تخلیقی حُسن رنگینی اور رعنائی پیدا نہ ہو سکی جو متقدمین کی مثنوی اور عروضی شاعری میں تھی۔ یا شعر کی جو خوبیاں ان عوامی اصناف میں موجود تھیں جن کی قدامت پشتو ٹپہ کی طرح نامعلوم ادوار کے اندھیاروں میں مخفی تھی، اس کا ایک سبب تو شاید یہ تھا کہ بَدلہ کہنے والے اخوندوں کی عامیانہ جبلت شاعری کے اُس معیار پر پوری نہیں اترتی تھی جس معیار پر عبدالقادر خان خٹک، صدر خان خٹک اور عبدالحمید مہمند نے یوسف زلیخا، آدم درخانئی تورد دے شہتی اور شاہ وگدا کی مثنویاں نظمائی تھیں۔ اور جیسا کہ خان علیین مکان نے کہا ہے کہ شاعری کے لئے علم کی قوت درکار ہوتی ہے تاکہ اس کی بنیاد مضبوط رہے۔ ورنہ نقصان اور ضرر سے محفوظ نہیں رہے گی اور اگر کوئی علم کے بغیر شعر کہے تو اُس میں کئی نقائص ہونگے۔ پہلے تو وہ درست کہہ نہیں سکے گا، شاعری کے عیوب کے جاسوس بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے جگ ہنسائی ہوگی۔ لیکن پھر بھی پشتو ادبیات میں گذشتہ تین سو سال میں مثنوی یا بدلہ نے جسقدر پیش رفت کی ہے اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ شاید ہی شاعری کی کسی دوسرے صنف ے حاصل کی ہو۔

" تصوف میں عوام کی تربیّت "

باوجود اِس کے کہ عام پشتون تصوف کے مطالعے سے ناآشنا تھے پھر بھی کسی نہ کسی رنگ میں اِس کے بعض مطالب آہستہ آہستہ ہمارے اِس عوامی ادب کا حصہ بنے، جو ہر ادب پارے سے عوام کے دلوں کے زیادہ قریب تھا۔ پشتو ٹپہ نارہ، بدلہ، چاربیتہ، عوامی غزل اور رباعی پر اِس کا گہرا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ مخصوص وزن میں کہی گئی خاص قسم کی صوفیانہ غزل جو عبدالرحمان بابا اور ان کے مکتبِ فکر کے دوسرے شعراء نے لکھی بخصوصیت کے ساتھ

پشتو عوامی ادب میں رباعی کے نام سے یاد کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رحمان بابا کے زمانے سے قبل جب پشتون قوال اور سرود نواز موسیقی کی محفل جماتے تو آغاز مجلس یونانی تمثیل کی طرح کورس یا ترانے سے کرتے لیکن جب یہ صوفیانہ غزل رباعی کے نام سے مقبول ہوئی تو اس نے ترانے کی جگہ لے لی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پشتو عوامی شاعری کے سبھی اصناف کی طرح پشتو کے مخصوص سازوں کے نام بھی ہیں۔ اس لحاظ سے شاعری کے مذکورہ عوامی اصناف پشتو موسیقی کے ساز بھی ہیں۔ یہاں ٹپے، بدلے، رباعی (صوفیانہ غزل) کی کچھ مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جائیگی کہ تصوف نے کس حد تک پشتونوں کے لاشعور میں گھر کر لیا ہے۔

ے تلہ د نمر آسمان تہ لاړه   ما چہ د ستا حسن د نمر سره تالہ نہ

"جب میں نے تیرے حسن کو سورج کے ساتھ تولنا چاہا۔ تو سورج کا پلڑا ہلکا ہو کر آسمان کی طرف چلا گیا۔"

صوفیانہ غزل (رباعی):-

ے لہ دے کتہ لہ پوزیہ تہ بہ لاړ شے   تر و بیا خدا ے خبر چہ کوم خواتہ بہ لاړ شے
پہ ظاهر صورت تہ هسے معلومیږی   چہ بہ خس غوندے و پښتو لاندے لتاړ شے
دا آسمان زمکہ بہ وی او تہ بہ نہ ئے   پہ ودانہ ودا نئ کښے بہ ویجاړ شے
د بهار د گلو عمر مُدام نہ وی   عندلیب غوندے بہ پاتے پہ اهاړ شے

کہ لیلیٰ غواړے بانُدہ دی دا رحمٰن!
چہ مجنون غوندے ساکن د کوہ و کاړ شے

"تو بالآخر اس چار پائی اور چٹائی سے (وفات پا کر) چلا جائیگا۔ لیکن اللہ ہی جانے کہ تو کس طرف چلا جائیگا۔
ظاہر میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پر کاہ کی طرح پاؤں کے نیچے روند ڈالے جاؤگے۔
یہ ارض و سما برقرار رہیں گے لیکن تو نہیں ہوگا۔ اور اس آباد دنیا میں تو اُجڑ جائیگا۔
بہار کے پھولوں کی زندگی کو دوام نہیں۔ تو بھی عندلیب کی طرح پیچھے تابستان کے تپتے مہینوں میں اکیلا رہ جائیگا۔
اے رحمان اگر تجھے لیلیٰ کی طلب ہے، تو چاہیئے کہ تو مجنون کی طرح کوہ و بیابان کو اپنا مسکن بنالے۔"

مثنوی (بدلہ) ؎

زړهٔ د یار په مینه نوږ کړه | بل هوس په خاطر څوز کړه
کۀ بل څۀ نۀ وی چه تۀ شے | پرے مینُ دردمند په زړهٔ شے
یار له کانړي بوتے ساز کړه | پرے مینُ شه ځان گداز کړه
روغ بنۀ نۀ ئے ځان دردمند کړه | په هغه دردکښے انند کړه
کۀ په دا نوږو آگاه شے | له هر څۀ به نا ویسا شے
څو دا نوږ دتا زیاتیږی | لا به ستا خاطر خوښیږی
چه له دیو نوږو خالی شی | اهل دل وته ایلی شے

" اپنے دل کو محبوب کی یاد میں زخمی کر دے اور کوئی دوسری خواہش اپنے دل پر حرام کر دے۔ کوئی ایسی دوسری چیز اگر نہ ہو جس پر تو عاشق ہو کر حقیقی طور پر دکھی ہو جائے تو پھر اپنے لئے مٹی یا پتھر سے کوئی محبوب تراش لے۔ اور اُسی پر عاشق ہو کر اپنی جان کو گداز کر دے۔ تو سکھی اچھا نہیں لگتا اس لئے خود کو دکھی بنا لے۔ جب تو ایسا ہو جائے تو پھر اس درد میں بھی تو آرام اور فراغت محسوس کریگا۔ اگر تو اُن دکھوں کی لذت سے ایک بار آشنا ہو جائے تو پھر ہر چیز سے بیزار ہو جائیگا۔ تیرے اِس درد میں جس قدر بھی اضافہ ہوگا اُسی قدر تو خورسند ہوگا (یہاں تک کہ) جو دل اس دکھ سے خالی ہو جائے اہل دل کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔"

عام پشتونوں کو ان افکار کی تعلیم کتابی ادب کے پڑھنے سے نہیں دی گئی لیکن اِن کی معاشرتی زندگی میں اسے اس قدر فروغ ملا ہے کہ یہ افکار سینہ بہ سینہ ایک دوسرے کو مسلسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور عوام کے خیالات اور احساسات میں گھر کرتے رہے ہیں۔

پشتون ادیب اور شاعر بہت پہلے سے اس راز سے واقف ہیں کہ فن کی تخلیق میں دوام ہے۔ فنکار سنگ تراش ہو یا مصور، ادیب ہو یا شاعر یہ سبھی فن کے خالق سمجھے جاتے ہیں انکے دوام اور بقا کا راز انکے فن کے کمال میں مضمر ہے۔ گیارہویں صدی ہجری میں خان علیین مکان خوشحال خان خٹک نے اپنے ایک بیٹے صدر خان کو یہ کہا تھا۔

ہ " کۂ دِ پاتو فرزندان شی — بیا بہ ورک لہ دے جہان شی
کۂ دِ پاتی بنہ کلام شی — ستا بہ تل پرے ژوندہ نام شی
ٹو زڑینی لاٹوانیڑی — دے کلام کۂ څوک پوھیڑی "

" اگر تجھ سے تیرے بیٹے باقی رہ جائیں تو انجام کار وہ بھی دنیا سے معدوم ہو جائیں گے ۔ لیکن اگر تجھ سے کوئی اچھا کلام پیچھے رہ جائے تو تیرا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا ۔ یہ کلام جتنا قدیم ہوتا جائیگا اتنا ہی جوان نظر آئیگا بشرطیکہ اس کلام کو سمجھنے والا بھی کوئی ہو ۔

" ترکِ دُنیا کے رجحانات کا سبب "

عجم کی صوفیانہ شاعری میں نا امیدی ، ڈر ، محرومی ، یاس و حرمان ، بے ثباتیِ دُنیا اور اس سے کنارہ کشی کے رجحانات دراصل منگولوں اور تاتاریوں کے ظلم و ستم اور تباہ کاریوں کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے ۔ انہوں نے زندگی کے بارے میں مثبت اندازِ فکر کی بجائے منفی راستے کو اپنایا تھا ۔ شاید ان رجحانات میں ارمنی عیسائیوں کی رہبانیت کے اثرات بھی شامل ہوئے ہوں ۔ لیکن درحقیقت اس وقت کے علماء و شعراء اور مفکرین جنہوں نے اُن لاتناہی مظالم کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور نہ صرف یہ کہ اس وحشت اور بربریت کے ہاتھوں ان کے اپنے گھرانے اُجڑ گئے تھے ۔ بلکہ تاج و تخت اور شان و شوکت رکھنے والوں کا عبرت ناک انجام بھی دیکھ چکے تھے ۔ وہ قدرتاً دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور اس دُنیائے ناتمام کے مذموم کرتوتوں پر ماتم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے ، اس لئے اس سے فرار اور اپنے لئے سکون کے راستے تلاش کرتے تھے ۔ وہ زندگی کی مثبت اقدار اور انسانی مدافعت کے مقابلے اور قوائے خود شناسی کو بیدار کرنے کی بجائے منفی اقدار ، خود فراموشی ، ترکِ دنیا ترکِ عمل اور ترکِ جدوجہد حتیٰ کہ تقدیر اور تسلیم و رضا کی غلط ترجمانی کے درپے ہو گئے تھے ۔

منگولوں کے حملوں نے نہ صرف یہ کہ مرکزی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کے تمدن اور عظمت کے آثار نیست و نابود کر دیئے بلکہ اس تمام علاقے کی زبانوں اور ادب کی فعالیت کو بھی مجروح کر دیا اور سوچ بچار کی تمام تر

روش اور انداز بدل ڈالے۔

اپنی قدیمی قیام گاہوں سے پشتون قبائل کے کوچ کا زمانہ بھی منگولوں اور تاتاریوں کے ان حملوں کے ساتھ ساتھ تھا۔ جیسا کہ اخون درویزہ نے لکھا ہے[1]۔

• چون مردم افغانان مملکت قندہار را درمیان یکدگر قسمت کردہ بودند حصہ مردم ترین درمیان مردم کند وزمند افتادہ بود، تاکہ حمایتی این دو برادران در نیک و بدی بیکدیگر می رسید۔ و از میان مردم کوند مردم شینخی ہنوز نزدیکت تر بدترین بودند چہ ایشیان جوئے بود ارغستان نام و آن نزدیک حدود ترین بود۔ تا درمیان مردم شینخی و ترین عداوت افتاد۔ آخرالامر مردم ترین غالب آمدہ مردم شینخی بعضے را کشتہ و بعضے را بیجا ساختہ، ہیچ کدام از مردم زمند و از مردم غوری بہ حمایتی ایشاں نہ رسید۔

القصہ چون مردم شینخے از جوئے ارغستان بے جا شدند التجا بہ مردم غوریخیل آوردند پارۂ زمین محدود را التماس نمودند زمین ناقابل و نامناسب، چنانکہ رسم اعطائے اغنیا بہ غربا یا سائلان است دادند ایشاں قانع آمدند۔

سماع است کہ در حدود قندہار در زمانۂ نوبہار چو باراںہا بارد نباتِ بسیار و علف نادرے شمار رو ئیدن گیرد۔ بعدہٗ چون گرمی تموز در رسید ہمہ خشک شدہ فرو ریزد۔

اما مواشی تا بہ سال دیگر ہمان گیاہِ خشک را میخورند و قت نود سازند اگر باران برشگال نہ باشد و اگر باران برشگال باریدن گیرد ہمان گیاہِ خشک را بہ تمامی سیلاب می برد ویران میکنند و گیاہ دیگر نمی روئید پس درآں سال مواشئی ایشان ہلاک می گردد۔

تا درآں ایام قضا و قدر در حدود غوریاخیل باران برشگال باریدن گرفت تا گیاہ مملکت ایشان تلف شدہ بعدہٗ بہ اتفاق اولس حسد بردہ اجتماع نمودہ مملکت مردم شینخے را بہ جنگ و جدل گرفتہ

---

[1] تذکرہ اخون درویزہ ص ۱۴۲

مردم شنخے از اں جاے جا شدہ در مملکت کابل رسیدہ ۔

و مردم عثمان خیل :۔ مدودتک وگول بہ مردم شنخے ہمراہ آمدہ اند و در مدد وحمایت این مردم بودہ اند ۔ الی یومنا ہذا ۔ و مردم جھند زنئی اصلاً از مردم زمنداند ، اما بہ حادثۂ از حوادث از برادران خود غصہ کردہ بہ مردم شنخے ہمراہ شدند ۔ باز از آن تا بہ این غایت ہمراہی و برادری دادند ۔ القصہ چون سالے چند بہ فراغت در کابل ماندند ا غنیائے روزگار و از اقویائے آن دیار آمدند چہ مواشئی ایشان بہ فراغت در علف زارہائے بے حساب می چریدند و اولاد ایشان در عین فراغت روز بہ روز تمزید بودند ۔"

ترجمہ :۔ " جب پشتون قندہار کے علاقے میں مقیم ہوئے اور آپس میں علاقے تقسیم کئے تو ترین کا حصہ کند و زمند کے مابین آگیا ۔ اور یوں ان دونوں قبیلوں کو حسب ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنے سے دور کر دیا گیا ۔ لیکن کند کے گھرانے میں سے شنخے ترینوں کے اور زیادہ نزدیک ہو گئے کیونکہ جوئے ارغستان کا علاقہ ان کے حصے میں آیا ۔ ترین کی حد ان کے نزدیک تھی ۔ اس وجہ سے شنخے اور ترینوں کے مابین رنجش پیدا ہوئی ، آخر ترین شنخے پر غالب آگئے اور شنخے کے بعض افراد قتل کئے گئے ۔ اور بعض کو ملک بدر کر دیا ۔ لیکن زمند اور غوریا خیلوں کی طرف سے کسی نے بھی ان کی مدد نہ کی ۔ جب شنخے کو جوئے ارغستان سے اٹھا دیا گیا ۔ تو وہ نقل مکانی کر کے غوریا خیلوں کے پاس چلے گئے اور اُن سے اپنے لئے کچھ علاقہ طلب کیا ۔ انہوں نے بھی از راہ کرم جیسا کہ اغنیا کا دستور ہے کچھ بنجر اور غیر آباد زمین ان کو دے دی ۔ اور انہوں نے بہ امر مجبوری اسی پر صبر کیا ۔

کہتے ہیں کہ قندہار کی چراگاہوں میں جب بہار آتی ہے اور بارش خوب برستی ہے تو بے اندازہ گھاس اُگ آتی ہے ۔ لیکن جب گرما کی تمازت کا آغاز ہوتا ہے تو ساری گھاس سُوکھ جاتی ہے اور زمین پر گر جاتی ہے اور دوسرے سال تک مویشی اُسی گھاس پر بسر اوقات کرتے ہیں لیکن اگر برسات میں بارش ہو جائے تو ساری سوکھی گھاس سیلاب کی نذر ہو جاتی ہے اور مزید نہیں اُگتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باقیماندہ مدت میں مویشی بھوکوں مر جاتے ہیں ۔

خدا کا کرنا تھا کہ اُس زمانے میں غوریا خیل کے علاقے میں برسات میں شدید بارشیں ہوئیں اور ان کی چراگاہوں کی گھاس تلف ہو گئی اس لئے سب نے شنخے پر دھاوا بول دیا اور حسد کرنا شروع کیا اور اکھٹے ہو کر جنگ و جدل

کے ذریعے انہیں عطا کردہ اُس خطۂ زمین سے دوبارہ چلے جانے پر مجبور کیا اور شنخے قبائل وہاں سے نقل مکانی کر کے مضافات کابل میں جا بسے۔ اُن کے ساتھ اتمان خیل قبیلہ والے بھی ٹانک اور گومل سے نکل آئے اور بعد ازآں ہمیشہ اُن کی مدد کرتے رہے۔

جمند زئی قبیلہ بھی اصلاً زمند کے گھرانے سے ہے۔ لیکن کسی حادثے کی وجہ سے اپنے خویش واقارب سے الگ ہوا ہے۔ اور شنخی قبائل کے ساتھ آن ملا ہے۔ اور اُس وقت سے اُن کا ہمراہی ہے۔

مختصر یہ کہ کئی سال مضافات کابل میں آرام سے گذارے تو خاصے مالدار اور طاقتور ہو گئے۔ ان کے ڈھور ڈنگر چراگاہوں میں نہایت اطمینان کے ساتھ چرا کرتے اور اُن میں اضافہ ہوتا رہتا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ ان کے دن پھر گئے اور آل و اولاد میں اضافہ ہوا۔"

لیکن یہ ایک عارضی دور تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ دور کتنے عرصے تک رہا۔ اس لئے کہ نہ تو اخون درویزہ نے کسی حتمی تاریخ کی نشاندہی کی ہے اور نہ مورخ خواتجو نے۔ لیکن حالات و قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور سلاطین غزنویہ کے زمانے سے لے کر الغ بیگ کے دور کے اختتام اور بابر کے عہد حکومت کے ابتدائی چند سالوں تک تھا۔ اس لئے کہ بعد کے دنوں میں شنخے اور غوری معہ دوسرے ہمراہی قبیلوں کے کابل سے چلے آئے تھے۔ اور پشاور، سوات، بنیر اور باجوڑ میں آباد ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں تواریخ حافظ رحمت خانی کے مولف نے خواتجو مورخ سے یہ بیان نقل کیا ہے[1]

ع لہ غوری سری پوښتی چہ د یوسفزو ډوکوم ملکونہ
ملک ئے نشکے مینہ ئے کاڑکے غوریاخیل کا تر اوسہ پیغوردنہ
غوریاخیلہ پیغور مہ کرہ تہ ښنخے یئ سرہ وروڼړہ
ښنخے ستالہ لاسہ راغی ھالہ تہ زور ور وے پہ مرونہ

" اگلے لوگ پوچھتے ہیں کہ یوسف زئیوں کے ملک کونسے تھے۔ اُن کا ملک نشکی اور گھر کاڑہ میں

---

[1] تواریخ حافظ رحمت خانی ص ۴

تھے۔ غوریاخیل ابھی تک طعنے دیتے ہیں۔ اے غوریاخیل طعنے نہ دو۔ تم اور شنخے آپس میں بھائی ہو شنخے تو تیری وجہ سے آیا۔ اس لئے کہ اُن دنوں تو طاقتور تھا۔

اِس آخری ہجرت کا پس منظر اور اس کے سبھی نتائج و عواقب، تواریخ حافظ رحمت خانی میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ ان تمام حالات و واقعات سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان قبائل کی تاریخ و ادب دونوں پر اُس وقت کی معاشی زندگی کا بہت بڑا اثر تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان میں اگر ایک طرف قبیلوی حمیت بہت زیادہ تھی، تو دوسری طرف ان مُسلسل حوادث نے انکی طبیعت کو روحانی سکون حاصل کرنے کی طرف مائل کر دیا تھا۔ اور جب انہوں نے سمہ سوات اور باجوڑ کے علاقے میں زندگی کے ان حوادث سے قدرے فراعت حاصل کر لی تو اہل شریعت و طریقت لوگوں کی تبلیغ اور تعلیم کی طرف رُجوع کیا اور یوں تصوّف اُن کے ادب و زندگی دونوں میں رچ بس کر انکی عمومی زندگی پر اثر انداز ہونے لگا۔

"انقلاب انگیز دور"

یہ وہ زمانہ تھا کہ پہلے سید علی ترمذیؒ (پیر بابا) پھر بایزید انصاری اور بعد ازاں اخون درویزہ نے ان کی توجہ شریعت اور راہ سلوک کی طرف مبذول کرانی شروع کی اور اسی طرح خیر البیان اور مخزن کے وہ دونوں مسالک پیدا ہوئے جنہوں نے پشتو زبان اور اُس کے ادبیات کی راہ یکسر بدل ڈالی۔

حضرت سید علی ترمذی نے پشتو ادبیات کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں رکھا لیکن بایزید انصاری کی کتاب خیر البیان باوجودیکہ پشتو، فارسی، عربی اور ہندی کا آمیزہ تھی۔ اور سقیم زبان اور تکلف اسمیں بہت زیادہ تھا، تاہم یہ پشتو زبان میں طریقت اور سلوک کے راستے کی ایک انقلاب انگیز کوشش تھی۔ بایزید کی تحریک کی مخالفت میں اخوند درویزہ اُٹھ کھڑے ہوئے مگر نظریے اور عقیدے کے اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی نظم و نثر دونوں کے سلسلے میں اِن دونوں مسالک میں واضح مماثلت موجود تھی۔ اگرچہ پروفیسر سید تقویم الحق کے خیال کے مطابق اخون درویزہ کے مسلک کا زیادہ زور اس بات پر ہے کہ شریعت اور طریقت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور طریقت شریعت

کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ مگر اس کے برعکس روشانیہ مسلک کے علمبردار کہتے ہیں کہ ؎

شریعت ریښتیا گفتار د پیغمبرؐ دے — حذر کړه له غلا زناله غیبته نه
پنځه بناحرام حلال پیژندګلی ده — عمل کړه په واړه حکم په رکنو نه
طریقت فعل کردار دائم فرض شوی
د صانع طاعت په واړه اندامو نه

"شریعت پیغمبرؐ کی سچی گفتگو ہے چاہیئے کہ تو چوری، زنا اور غیبت سے اجتناب کرے۔ پانچ ارکانِ اسلام اور حرام حلال کی پہچان ضروری ہے۔ ان ارکان اور احکام پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے۔ اپنے جسم کے تمام اعضاء سے کردار و عمل دونوں کے ذریعے صانع حقیقی کی بندگی کرنا فرض دائم ہے اور یہی راہِ طریقت ہے۔"

خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کی بھی جیسے یہی رائے ہو کہ میاں روشان کے مکتبۂ فکر اور اخون درویزہؒ صاحب کے مسلک میں اختلاف فروعی تھا۔ اس لئے سوات نامہ میں لکھا کہ ؎

درویزه چه بیان کړے خپل کتاب دے — نوم ئے مخزن الاسرار کړے جناب دے
د روشان خیر البیان ئے وولیدلے — هغه هم مجهول بیات وو ناپسندلے

" درویزہ نے جو اپنی کتاب لکھی ہے تو جناب نے اُس کا نام مخزن الاسرار رکھا ہے۔ اس نے میاں روشان کی خیر البیان دیکھی تھی وہ بھی ایک ناپسندیدہ اور مجہول قسم کا بیان تھا۔"

جو کچھ بھی ہو اِن دونوں مسالک نے مجموعی طور پر پشتو زبان اور اُس کی ادبیات کو عصری تقاضوں کے مطابق بڑی وسعت دی ہے۔ اور شرعی اور روحانی علوم کے میدان میں اسے بہت سے الفاظ، اصطلاحات اور محاورے دیئے ہیں۔ یہ الفاظ اصطلاحات اور محاورات اگرچہ اکثر عربی اور فارسی سے لئے گئے تھے مگر ان کے مکرر استعمال کیوجہ سے اِس زبان میں ایسا گھر کر لیا۔ کہ تمام کے تمام الفاظ محاورے اور اصطلاحات عام پشتو بول چال کا حصہ بن کر رہ گئے۔ اسی طرح اِس زبان کا وہ عوامی ادب جو کتابی ادب کے ساتھ متوازی جارہا تھا۔ اُس میں بھی ان کا استعمال عام ہوگیا۔

"پشتو نثر کا ارتقاء"

ادبیات کے تاریخ نگار اکثر نثر کی تاریخ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ "ویسے تو عام بول چال میں نثر شعر سے پہلے آتی ہے۔ لیکن تحریر میں شعر عموماً نثر سے پہلے آتا ہے"۔ زبانوں کے ادب کی تواریخ میں بھی اکثر تحریر شدہ نثر کی پیدائش اور ارتقاء کا عمل بعد میں آتا ہے۔ اس کی تین قسمیں نثر عاری، نثر مرجز، نثر مسجع ہیں۔ پہلی قسم سادہ۔ دوئم بے بحر لیکن موزوں وزن کی حامل اور تیسری بے وزن لیکن بحر میں موزوں کی گئی۔ پہلی قسم زبان کی عام اور سادہ بات چیت کا انداز ہے۔ دوسری وہ نثر ہے جسے مذہبی تقدس حاصل ہے اور اس کا قرآنی انداز مسلمانوں کی نثر اسلامی دنیا کی دوسری زبانوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں، متوازی، مطرف اور متوازن۔ پہلی شکل میں دو متواتر باتیں ہم وزن اور برابر لائی جاتی ہیں۔ دوسری میں دو یا زیادہ باتیں ہم وزن اور برابر نہیں ہوا کرتیں۔ تیسری صورت میں دو یا زیادہ مسلسل باتیں ایک دوسرے کے برابر تو ہوتی ہیں لیکن ہم وزن نہیں ہوتیں۔ نثر کا یہ تقلیدی انداز پشتو میں بھی اس وقت سے رائج ہے جب سے پشتو میں اسلامی تعلیمات اور تبلیغ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس لئے کہ پشتو کی وہ پرانی نثر جس کا مذہبی تعلیمات کے ساتھ تعلق نہیں رہا وہ تحریری شکل میں موجود نہیں۔ البتہ ضرب الامثال، قصوں اور نقلوں میں اس قسم کی نثر کا کچھ نہ کچھ وجود باقی ہے۔ مگر یہ صرف لوگوں کی یادداشت پر مبنی ہے۔ اس لئے نثر کی تاریخ کے سلسلے میں اس کی اہمیت محض اس قدر ہے کہ اگر اسے جمع کر دیا جائے تو ایک ایسا بڑا ادبی ذخیرہ ثابت ہوگا جس سے نہ صرف پشتونوں کی روایات اور معاشرتی زندگی کے حقیقی خدوخال ہمارے سامنے آجائیں گے بلکہ پشت ہا پشت سے ہمارے عوامی افکار اور خیالات کے موازنے کے لئے دلچسپ مواد بھی ہاتھ آجائیگا۔

ہر زبان میں قدیم ادوار ہی سے ادبی فن پاروں کی بقا کے لئے شعر کے وسیلے بروئے کار لائے جاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ادب کے ضمن میں ہندی آریائی زبانوں کے شاہکار ہیں یا ویدوں کے علاوہ رامائن اور مہابھارت کے قصے، زرتشت کی اوستا اور ژند و پاژند کے صحیفے ہیں یا سامی زبانوں کی الہامی کتابیں ان سب کی زبان اور

اور انداز میں کسی نہ کسی وزن اور شعری انداز کا خیال رکھا گیا ہے۔

قدیم یونانی ادب کا حال بھی کچھ اسی طرح کا رہا ہے۔ محقق سینکلیئر اِس بارے میں لکھتا ہے کہ "اِس زبان کی نثر کے آغاز کا وقت معلوم نہیں اور یہ قدرتی امر ہے کہ عام بول چال کے لئے رائج شدہ وسیلہ سادہ نثر تھی۔ لیکن یہ ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئی۔ اس لئے یونانی ادب کے ضمن میں بھی یہ مقابلتاً نئی ایجاد ہے۔ مزید کہتا ہے کہ "یونانی ادب میں ادبی مواد کا سب سے پُرانا نمونہ جس میں کوئی واقعہ یا قصہ محفوظ کیا جانا مقصود ہوتا وہ عموماً چھ ماتروں کا منظوم بیان ہوتا۔ ہومر اور ہیسوڈ دونوں یونانی زبان کے قدیم ترین مورخین اور فلسفی شاعر شمار کئے جاتے ہیں۔ غالباً اِس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ نثر کے مقابلے میں نظم آسانی سے اور اچھی طرح سے یاد رہتی ہے اور باقی تمام روایتیں جیسے اس کے حق میں تھیں۔ دیو مالا، تاریخ، ہیئت وغیرہ سبھی اِس انداز میں محفوظ کی گئی ہیں۔ ہیئت کے بارے میں خصوصاً اِس روایت کو زیادہ استحکام ملا ہے"۔ وہ مزید لکھتا ہے۔ "کہ یہی چھ ماتروں والے مصرعے چھٹی صدی قبل مسیح تک یونانی نثر کا ایک قومی انداز تھا جس میں ادبی افکار محفوظ کئے جاتے، لیکن چونکہ دیو مالا اور تاریخ دونوں کی اہمیت یکساں تھی اس لئے اِن دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پشتو میں بھی اس قسم کے بیانات کا رواج موجود تھا۔ جو غنائیہ شاعری کے ضمن میں مروت قبیلہ کی "کسر" اور "غگونہ" اور "نارہ" کے نام سے بیان کئے گئے ہیں۔ شاید اسی طرح پشتو میں بھی موزوں طرزوں کے اُن بیانوں نے رواج پایا ہو جو آخر میں نثر اور نظم کے مختلف اقسام میں ارتقاء پذیر ہوئے ہوں۔ لیکن چونکہ نثری ادب کا یہ قدیمی دور پردۂ اخفا میں ہے لہذا اس غنائیہ انداز کے نمونوں کے علاوہ کسی دوسری قسم کی پشتو نثر کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔"

روشانیہ تحریک کے بانی اور پیشوا کو دورِ اول کے نثر نگاروں کا سرخیل شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اُن کی کتاب "خیر البیان" پشتو زبان کی دستیاب نثری کتابوں میں سب سے پہلی کتاب خیال کی جاتی ہے جو تحریری شکل میں موجود ہے۔ باوجود اس کے کہ پروفیسر حبیبی کے دعویٰ کے مطابق سلیمان ماکو ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء کی تذکرۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب نثرِ مرسل میں تھی۔ پشتو نثر نویسی کا یہ انداز تادیر مقبول اور مروج رہا۔ حبیبی نے اُس نثر کا کچھ نمونہ اپنی تاریخ ادبیات میں یوں دیا ہے :-

"د پہ دولس او شپږ سوه د هجری تلل وم او د پښتونخوا په راغو او کلیو گرځیدم او مراقد د اولیاؤ او د واصلینو مے پلټل او په هر لوری مے کاملان موندل۔ او د دوئ په خدمت خاکپلے وم او هر کله په سلام ورته ولاړ۔ چہ له دے سفره په کور کښیناستم او تنزاکے او چاوُدلے د پښتو بیا پاڅیدلم او له خښتنه مے مرستون شوم چہ احوال د دغو کاملانو وکاږم ۔"

" ۶۱۲ ھ میں میں نے جاکر پشتونخوا کے سطح مرتفع اور مواضعات کا سفر کیا اور اولیاء اور واصلین کے مراقد تلاش کرتا رہا۔ ہر سمت مجھے بزرگان کامل ملے ۔ اور انکی خدمت میں خاک پا بنا رہا۔ اور سلام کے لئے ہر دم مستعد، جب اس سفر سے گھر لوٹا اور پاؤں کے چھالے پس گئے تو پھر اٹھا اور اللہ پاک سے مدد مانگی تاکہ ان اولیاء عظام کے حالات کا سراغ لگاؤں "

پھر محمد علی البستی نے ۷۵ھ / ۱۲۸۲ میں تاریخ سُوری لکھی ان دونوں کتابوں کا ذکر محمد ہوتک کے "پٹہ خزانہ" میں موجود ہے ۔

فاضل حبیبی سلیمان ماکو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " وہ بارک خان کا بیٹا تھا۔ اور قوم کے لحاظ سے ماکو صابزئی تھا وہ چھٹی صدی ہجری کے لگ بھگ تھا قندہار کے موضع ارغسان میں مقیم تھا۔ مؤرخ سیاح اور جہاں گشت انسان تھا وہ خود لکھتا ہے کہ " ۶۱۲ ھ میں جاکر پشتونخوا کے سطوح مرتفع اور مواضعات میں گھومتا رہا، اور بزرگوں کے مراقد دیکھتا اور تلاش کرتا رہا "۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان اس مفید اور باعث منفعت سفر کے بعد آمادہ ہوا کہ نامور پشتونوں اور بزرگوں کے احوال میں " تذکرۃ الاولیاء " لکھے ۔ ان کے فرمودات اور انکے اشعار اس کتاب میں درج ہیں ۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب اب ناپید ہے ۔ لیکن اس کے پہلے آٹھ صفحے مجھے (۱۳۱۹ ش سال میں) خوش قسمتی سے قندہار میں مل گئے ۔ اور انکے عکس میں نے کابل کے سالنامہ اور پشتون شعراء کے پہلے حصے میں شائع کئے ۔"

پروفیسر حبیبی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ سلیمان ماکو پشتونوں کے ایک قدیم مؤرخ ہیں اور ان کی عمدہ اور مفید کتاب کے وہ چند اوراق پشتو زبان اور افراد کی تاریخ کے لئے ایسے سود مند ثابت ہوئے کہ پشتو زبان و

ادب کی تاریخ تا ابد اُن کی مرہون منت رہے گی۔ یہ کتاب صرف اولیاء کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ پشتو شعر و ادب کا ایک گرانقدر مرقع بھی ہے۔ پشتو نثر کی تاریخ بھی اِس صاحب نظر مؤرخ کے احسان کو نہیں بھول سکتی۔

تاریخ سُوری کے مؤلف کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہے لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بست کے مشہور تاریخی شہر کے باسی تھے۔ "پٹہ خزانہ" کے مؤلف محمد ہوتک نے جو قدیم ادبی آثار اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ ان کا ماخذ شیخ کٹہ کے "لرغونی پښتانہ" نامی کتاب کے ذریعے تاریخ سُوری میں بیان ہوا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ :۔

(۱) پشتو کا بہت پرانا شعر اور احوال امیر کروڑ۔ (۲) شیخ اسعد سوری کے احوال اور کلام (۳) شکارندوئے کے احوال اور کلام ان تینوں کا ماخذ ایک ہے۔ مطلب یہ کہ پشتو کا قدیم ادبی اثاثہ دراصل تاریخ سُوری سے ماخوذ ہے۔ یہ اس بات کو یقینی بنا دیتا ہے کہ تاریخ سوری فقط جنگ و جدل اور سیاسی واقعات پر مبنی کتاب نہ تھی بلکہ ادبی رنگ اور محاسن کی بھی حامل تھی۔

میجر راورٹی نے اخون دَرویزہ کے "تذکرۃ الابرار" کے حوالے سے یوسف زیوں میں مراح نامی ایک پرانی کتاب کی موجودگی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں اخون درویزہ کا اپنا بیان کچھ یوں ہے کہ :۔

"در زمان توجہ اکبر بادشاہ باین مردم۔ میاں عیسٰی بہ سرداران این مردم نوشتہ کہ اگر کتاب مراح از مخزن ملا شاخانی صواتی فرستید ضمین مملکت شما گردم۔ واز توجہ این بادشاہ برہانم۔ تا این مردم بہ جبر و اکراہ از ملا فیض اللہ گرفتہ فرستادند۔ چون من در مجمع آن مردم رسیدم گفتم یگان برکت در شما این کتاب بودہ۔ اکنون ویران ویران خواہید شد۔ آخرالامر ویران شدند۔"

"جب اکبر بادشاہ کی توجہ اسطرف ہوئی تو میاں عیسٰی نے ان لوگوں کے سرداروں کو لکھا کہ اگر مراح نامی کتاب مُلا شاخانی سواتی کے کتب خانے سے لے کر بھیج دو تو میں تمہارے ملک کی حفاظت کروں گا اور تمھیں بادشاہ سے چھٹکارا دلاؤں گا۔ انہوں نے نہایت ظلم و جبر کے ساتھ وہ کتاب مُلا فیض اللہ سے لے لی اور بھجوا دی۔ جب اُن سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں کہا کہ تم میں باعث برکت چیز رہی ایک کتاب تو تھی۔ اب تمہارے دن اچھے

نہیں ہوں گے ۔ اور اُن کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔"

اخون درویزہ بابا کے بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کس موضوع پر کس زبان میں لکھی گئی تھی! راورٹی کہتا ہے کہ یہ کتاب چند پشتوں سے اس قبیلے میں موجود تھی اور ان کی نظروں میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اگر یہ صراح نامی عربی قاموس نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوسف نامہ کے شجروں اور نسب ناموں کی مکمل دستاویز تھی ۔ اور شاید شیخ ملی کے دفتر کے حصے اسی کی بنا پر مرتب کئے گئے تھے ۔ متراوی قبائل کے نسب ناموں کی دستاویزات بھی جیسے کہ صراح ہی کا حصہ تھے ۔ جس کا تذکرہ پیر معظم شاہ نے خواجو موٴرخ کے حوالے سے تواریخ حافظ رحمت خانی میں کیا ہے اور شاید اسی وجہ سے یہ لوگ اپنے آپ کو یوسف زئیوں کے عزیزوں میں شمار کرتے تھے ۔

بایزید انصاری ۹۲۲ ہجری مطابق ۱۵۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے ۔ قومیت کے لحاظ سے اُرمڑ تھے دوسری بے شمار کتابوں کے علاوہ انہوں نے تصوف اور سلوک کے موضوع پر ایک مشہور کتاب " خیر البیان" لکھی ہے ۔ ان کے عقائد اور مسلک کے بارے میں تفصیلی ذکر پہلے گذر چکا ہے ۔ یہ کتاب پشتو کی پُرانی نثری ادب کے سلسلے میں سب سے اہم اور قدیم دستاویز ہے جو ایک عرصے سے نایاب تھی ۔ اور آخر ۱۹۵۹ء میں مرحوم مولانا عبدالقادر نے مغربی جرمنی کے دورے کے موقع پر ٹیونگن کے کتب خانے میں دریافت کی ۔

بایزید جیسا کہ کہا گیا ہے روشانی تحریک کے پیشوا تھے ۔ اِس تحریک نے تصوف و سلوک کے عقائد کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی سیاسیات میں بھی اہم کردار ادا کیا ۔ اِس تحریک کا پشتون قبائل میں کچھ عرصے تک بہت گہرا اثر رہا ۔ اس کے خلاف سید علی ترمذیؒ (پیر بابا کے خلیفہ اخون درویزہ اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ روشانی تحریک کے طرفداروں اور مخالفین کے اِن دو گروہوں نے پشتو نظم و نثر کے دونوں میدانوں کو بہت کچھ دیا ۔ ساری پشتو نخوا میں کافی عرصے تک اِن دو گروہوں کا اختلاف جاری رہا ۔ خیر البیان کے جواب میں اخون درویزہ نے اپنی کتاب مخزن الاسلام لکھی ۔ اِن دونوں کتابوں کا متن زیادہ تر نثر میں تھا ۔ عبارت کے کچھ نمونے یہ ہیں :۔

خیر البیان کا نثری نمونہ :۔ " او بایزید ! او کښه په آغاز د کتاب په درست حرفونو بسم اللّٰه تمام ۔ زهٔ نه درکوم مزدوری

و هیغو چه کښي بیا ورانوي یو حرف یا ټکی بیائې کښي چه درستېږي بیان ـ
او بایزید! او کښه صفحه حرفونه چه په هره ژبه سازېږي د فاسدے دپاره
د آدمیانو ـ ته دانائے له هر څېز ـ مانه زده بیرون حرفونه د قرآن او سبحان ـ
د حرفونو کښل په تادي د حرفونو څرګندول او نمون او بسودل په مادي ـ
وکښه زما په فرمان په مانند د حرفونو د قرآن او کېږده ـ په څېنو حرفونو
ټکي یا غروندي یا نورے نښانے بے له حرفونو زربه وېږني آدمیان ـ څېنے
حرفونه ښلوه، څلوه، وکښه عیان ـ زه به ئې زده کا چه ئې لولي ـ ساه ورسره
باسي د څېنو دور ستړ یو سره آدمیان ـ"

"مخزن الاسلام کا نثری نمونه"

دا په نامه د خدائے آغاز کړم اوس له دے علم کلامه دے رحمٰن رحیم خدائے
دے ـ بله چارے شي تمامه ـ بادشاه د بادشاهانو تر معتبر و معتبر دے ـ د
ده صفت دے د بزرګئ تر حمله وُ عقلونو بر دے ـ"
په آغاز د املي ئې دا بنده فقیر بیان کا ـ له توحیده به څه وائي ـ لکه دُر
چه له صدفه ئې رو بنان کا ـ خداوند د کل عالم دے ـ زمونږ څښتن قدیم
دے بے زواله ـ په خپل صفت دے صفت شوے ـ هر صفت ئې له کماله ـ
بے روحه دے زنده دے ـ کل ترتیب ئې په کمال دے ـ لائق دے ـ خدائے
هر چار په اندازه کا ـ خداوند ذوالجلال دے ـ خواهنده دے د نیکئ
د بدئ چه دے زښت په نیکئ راضي په بدئ نه دے" ـ

نثر کی ان ہر دو طرزوں کو خوشحال خان خٹک نے "ناموزوں، مجہول اور ناپسندیدہ" قرار دیا ہے۔ پشتو میں بیشک اِس قسم کی نثر اِس تقلید کیوجہ سے وجود میں آئی تھی۔ جو پشتون اہل قلم نے فارسی عربی کی علمی اور دینی کتابوں کے مطالعے سے حاصل کی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر چاہیئے تھا کہ پشتو نثر اِس روزمرہ اور محاورے سے بنتی جس میں عام لوگ آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے یا مائیں اپنے بچوں کو میٹھی میٹھی کہانیاں سنایا کرتی تھیں اور زبان بھی وہی قصہ کہانی والی ہوا کرتی تھی، جو اُنکے گھروں اور حجروں میں بولی جاتی تھی۔ اور نامعلوم زمانے سے جس زبان کے ضرب الامثال چلے آرہے تھے، ضرب الامثال کی زبان کا انداز اور خیر البیان کی طرز بیان کا فرق ظاہر کرنے کے لئے یہ چند ضرب الامثال اور ان کی زبان ملاحظہ ہو:۔

"اشتڼ وران سهی چه امرودین لالا نارے وهی"

"اختر چه تیر شی منګیرے په دیوال او تپه"

"اخبلی در بخبلی خو چه وچ مے لامده ؤ منګرې"

"بدی چه نۀ کړے بدے چارے، بدے به چا واژۀ په لارے"

"برخه کوم مه بده ده، چه ورشکاره ئے کړے او ورے نۀ کړے"

ترجمہ:۔ "دیہاں ختم ہونا ہی بہتر ہے اس لئے کہ مجھے امرودین لالا بلا رہا ہے"

"عید گزر جائے تو پھر مہندی دیوار پر تھوپ دی جائے"

"میں تجھے گوندھا ہوا آٹا بخشتی ہوں مگر سوکھے آٹے کو نہ گھول"

"اگر بدی برے کام نہ کرتا تو اُسے راستے میں کون قتل کرتا"

پشتو نثر متاخرین تک

یہ عجیب بات ہے کہ جو پشتو جو عوام کی زبان ہے پشتو کی پرانی نثر کی کسی ایک کتاب میں بھی دستیاب نہیں خود خوشحال خان بابا کی نثر بھی اُس روایتی راستے سے گزری ہے۔ جو پرانی نثر کا خاصہ خیال کیا جاتا ہے۔ خیر البیان اور

مخزن کی جس طرزِ نگارش کو خان بابا نے مجہول اور بے رنگ کہا ہے اور اُس پر زبردست تنقید بھی کی ہے، وہ خود بھی تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اُسی طرز کے لکھنے والے ہیں۔ مثلاً دستار نامے کی نثر کا یہ انداز آغاز سے لے کر اختتام تک ساری کتاب پر حاوی ہے :۔

"د خصلتونو او هنرونو په طریق چه منحصر د دستار د قابلیت دے، د دستار د لائقت موقوف په هغو خصلتونو هنرونو دے۔ نقصان ئے په عدم محصول کښے دے۔ هنرونه کسبونه فنونه حرفتونه، صنعتونه خصلتونه ډیر دی۔ تو شمار تیر دی که په وار وپسے ئے تو زغلے عمر د نوح بویه چه په تعلیم ئے حاصل کا۔"

ترجمہ :۔ خصائل اور ہنروں کی رو سے وہ فہرست جو دستارِ فضیلت کے لئے لازمی ہے دستار لیاقت بھی اُن ہی خصائل اور ہنروں پر مبنی ہے۔ اِن کا نہ ہونا باعث نقصان ہے۔ ہنر کسب، فنون حرفت۔ صنائع۔ خصائل و عادات بہت سے ہیں۔ اور بیشمار ہیں۔ اگر اِن سب کے حصول تعلیم کے درپے ہو گے تو اُسکے لئے عمرِ نوح درکار ہوگی۔"

لیکن پھر بھی اِس نثر میں ایک گونہ روانی اور تواتر موجود ہے اور بے تکلف پڑھی جا سکتی ہے صرف فارسی عربی لغات کے وافر استعمال نے دستار نامے کی عبارت میں ثقالت پیدا کی ہے اور قاری اُس میں وہ لُطف اور مزہ نہیں پاتا جو درحقیقت دستار نامے کی روح ہے۔

خوشحال خان کے گھرانے میں خان علیین مکان کی نثر نویسی کی اِس طرز کو فروغ ملا تھا۔ اُنکے تتبع میں اُنکے بیٹوں عبدالقادر خان۔ صدر خان اور گوہر خان اُسی راستے پر گامزن ہوئے۔ اِس قسم کی نثر میں عبدالقادر خان نے گلستان سعدی کا ترجمہ کیا اور کتاب کو گلدستہ کے نام سے موسوم کیا۔ عبدالقادر خان کی نثر کا نمونہ یہ ہے :۔

"پس لہ ډیرو فکرونو مصلحت دا اولیدو چه باقی عمر خان تہ ناستے پښے د قناعت په لمن کښے نغښتے بهتر دے۔ مشغول لا کتاب، ورتله په لوری د مسجد چه سعادت د دنیا او آخرت دے۔ غنیمت گڼلے بویه۔ اکثر په تنها ناست وم۔ کلا کلہ

په بعضے یاران راغلۀ استفاده به د علم عربي د فارسی کوله ۔ بعضی دوستانو
را څخه گلستان کتاب لوست ډیر ډیر به و میل چه د عربي او فارسي کتابونه
ډیر دی اما په پښتو ژبه کښے کتابونه د پښتو نیشته ۔"

"بہت سوچ بچار کے بعد میں نے مصلحت اسی میں جانی کہ باقی عمر تنہا رہ کر اور قناعت کے دامن میں پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جانا ہی بہتر ہے ۔ کتاب سے مصروفیت، سوئے مسجد جانا جو دنیا و آخرت کی سعادت ہے) کو غنیمت سمجھنا چاہیئے ۔ اکثر تنہا بیٹھا رہتا ۔ کبھی کبھار بعض دوست آجاتے اور فارسی، عربی علوم کا استفادہ کیا کرتے ۔ بعض احباب مجھ سے کتاب گلستان پڑھتے ۔ اور اکثر کہا کرتے کہ عربی فارسی کتابیں بہت زیادہ ہیں لیکن پشتو زبان میں پشتو کی کتابیں موجود نہیں ۔"

عبدالقادر خان کے بھائی صدر خان کی پشتو نثر بھی یہی رنگ لئے ہوئے تھی ۔ جیسا کہ کہتا ہے :۔

مناظره د درخانئ د آدم خان سره ۔ چه درخانئ ترے امتحان د سوال او کړو ۔
یعنی چه فضیلت د آدم زاد په سائرحیوانات په څۀ سبب دے ۔ مدعا
دے سوال د دُرخانئ اگر چه ضمناً اصل کار وو، اما ظاهراً ئے د آدم فضیلت
د علمیت وو یعنی چه د آدم فضیلت او علمیت به له دے سوال په بل څۀ
معلوم نۀ کړم ۔ او جواب با صواب مستدل له آدم خانه او آفرین یاد د درخانئ
په آدم خان چه دا هسے یارے له حضرت مِنان بیا مومن ۔"

"درخانی کا آدم خان کے ساتھ مناظرہ ہوا درخانئ نے سوال پوچھ کر اُس کا امتحان لیا ۔ کہ آدم کی فضیلت باقی تمام ذی روح پر کس سبب سے ہے ؟ اس سے درخانئ کا مدعا اگرچہ ضمناً اصل کام تھا ۔ لیکن بظاہر آدم کی علمی فضیلت معلوم کرتی تھی یعنی کہ آدم کی فضیلت اور علمیت سوائے اس سوال کے کسی اور طرح سے معلوم نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس نے آدم خان سے جواب با صواب پایا ۔ اور آفرین ہو دُرخانئ کے آدم خان پر کہ اللہ پاک کی جانب سے اُسے ایسا محبوب ملا ۔"

قلب السیر کے مؤلف گوہر خان ابن خوشحال خان کی نثر کا نمونہ یہ ہے :۔

" دا چه اکثر کتابونه له عربئ فارسی دانو بزرگانو وخپل عالم ته چه په تازی ژبه کښے بہ ئے فهم پرے بنه نه کیده و په فارسئ ئے د دوئ دپاره ترجمه کړل سهولت ئے شو- او ښه مینه ئے پرے پیدا کړه- مطالعه به ئے کړه- ډیر کتابونه د فقهے د مسائل داخلاق وغیره بزرگانو فارسی وانو بیان کړل چه معلوم دی- په پښتو کښے دا رواج نهٔ وو- اخون درویزه یو کتاب مخزن ویلے دے- حق تعالیٰ دِ ئے او بخښی اکثر خلقو ترے فیض بیا موندو- زموږ پلار مرحوم خوشحال خان خټک الله دِ ئے په قبر نور کا- هر لکونه کتابونه ئے تصنیف کړل- دا دے د فصاحت او بلاغت د پښتو ژبے ورکړ فارسی وته ئے په لذت نژدے کړه "

" اور یہ کہ بیشتر بزرگوں نے اپنے فارسی بولنے والے عوام کے لئے جو عربی زبان بخوبی نہیں جانتے تھے ۔ بیشتر کتابیں فارسی میں ترجمہ کیں تو انہیں سہولت ہوگئی ۔ اور انہوں نے کتابوں سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ۔ وہ اُن کا مطالعہ کیا کرتے ۔ بہت سی کتابیں فقہ کے مسائل اور اخلاقیات وغیرہ فارسی گو بزرگوں نے بیان کیں ، ملتی ہیں پشتو میں یہ رواج نہ تھا ۔ اخون درویزہ نے ایک کتاب مخزن لکھی ہے ۔ حق تعالیٰ اُس کی مغفرت کرے ، بیشتر لوگوں نے اُس سے فیض حاصل کیا ۔ ہمارے والد مرحوم خوشحال خان خٹک (اللہ تعالیٰ اُس کی قبر منور کرے) نے ہر طرح کی کتابیں لکھیں ۔ اور پشتو کو فصاحت و بلاغت سے مزین کیا ۔ اور لذت میں فارسی سے ہمکنار کیا ۔"

" افضل خان خٹک "

غالباً پشتو کے پرانے نثر نویسوں میں بحیثیت مورخ سب سے اونچا مقام افضل خان خٹک بن اشرف خان ہجری کا تھا ۔ اپنے دادا خوشحال خان خٹک کی زندگی میں انہیں اپنے قبیلے کی سرداری کی دستار پہنا دی گئی

قبیلے کی سرداری اور اُس دور کی سیاسی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ افضل خان علم و ادب کے لحاظ سے بھی بڑی قابلیت کے مالک رہے ہیں۔ اور تاریخ اور اخلاقیات کے موضوع پر اپنے زمانے کی بے مثل کتابوں کی تصنیف، تالیف اور ترجمے نہ صرف خود کئے ہیں بلکہ دوسرے علماء اور دانشوروں کو بھی اس پر آمادہ کیا ہے۔ افضل خان کی اپنی تالیفات میں تاریخ مرصّع اور علم خانہ دانش (ترجمہ انوار سہیلی) بہت شہرت رکھتے ہیں افضل خان کے چچا گوہر خان نے اپنی "تالیف" "قلب السیر" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"اور دوسرا سبب کتاب کا یہ تھا، کہ افضل خان ولد اشرف خان مرحوم جو کہ خوشحال خان خٹک کا نواسہ غفر اللہ کا پوتا ہے جس کا سن ہجری ۱۱۲۰ھ ہے باپ اور دادا کی جگہ قائم مقام ہے۔ جو ایک اچھا سردار ہے اُس کی نظر نیک نامی اور آبادانی پر ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں یہ بھی غنیمت ہے "اَللّٰھُمَّ زد احسانہ" حق تعالیٰ اثر رکھے۔ مزید کوشش کرتا ہے کہ ہر طرح کی پشتو کتابیں جیسے کہ فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ مرتب ہوں۔"[1]

گوہر خان کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کا دیوان بھی جو اس وقت متفرق بیاضوں میں بکھرا پڑا تھا۔ اور خان کی تمام دوسری کتابیں بھی اُس کے اس قابل پوتے نے الگ الگ کتابیں مرتب کیں۔ اور کاتبوں سے لکھوائیں۔ وہ کہتا ہے "اور دادا کی بیاضیں مزید بیاضوں میں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ تلاش کر کے جو کچھ ملا کوشش رہی کہ ہر کسی سے اور جہاں کہیں بھی مل سکے جمع کر کے دیوان کو مرتب کیا جائے بلکہ جو کلیات شعر تھے نظم و نثر جیسے دستارنامہ، فراقنامہ، فضل نامہ، دیوان وغیرہ تمام کتابیں کاتبوں سے بار بار لکھوائیں اور تشہیر کے لئے گرد و نواح میں بھجوا دیں۔

گوہر خان کی کتاب "قلب السیر" بھی افضل خان ہی کے کہنے پر ۱۱۲۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اِس خوش قسمت گھرانے کے علمی ادبی اور دینی کارناموں میں سے ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے مؤلف نے اپنے بھتیجے افضل خان کو اس کتاب کے لکھنے کا محرک گردانا ہے۔ اس مذکورہ بیان سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ خوشحال خان کا دیوان اور انکی دوسری کتابیں جسطرح قلمی شکل میں اب موجود ہیں اُنکی ترتیب و تدوین

---

[1] قلب السیر قلمی پشاور میوزیم

افضل خان کے ہاتھ کی ہے۔ اگر افضل خان خٹک یہ سعی نہ کرتے، تو خدا جانے خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کا دیوان اور دوسری کتابیں ایسی مکمل شکل میں ہم تک کیونکر پہنچ سکتیں۔!

افضل خان کے نثر کا انداز :-

"پہ طبقاتِ اکبری کښے راوړی دی چہ ھر کلہ چہ راجا مان سنگھ پہ حکومت د کابل سرفراز کړ لہ امراکانو د کابل ځو تنہ ئے پہ رکاب ظفر انتسا کښے ووساتل۔ باقی امراکان ئے پہ ملک د راجامان سنگھ سرہ رخصت کړہ۔ ھر کلہ چہ پہ پیښور داخل شہ حقیقت د جلال الدین ورتہ معلوم شہ چہ پہ تیراہ کښے جماعہ د قطاع الطریق سرہ دہ، راجامان سنگھ تہ دا فکر د ثواب شہ چہ اول د فعہ د دے فساد کړے بویہ پس لہ ھغہ پہ جمع خاطر کابل تہ تلل بویہ"

"طبقاتِ اکبری میں کہا گیا ہے کہ" جب راجہ مان سنگھ حکومت کابل پر سرفراز ہوا۔ تو کابل کے چند اُمراء کو رکاب ظفر انتساب میں رکھا۔ باقی اُمراء کو راجہ مان سنگھ کی ہمراہی میں رخصت کیا۔ جب راجہ مان سنگھ پشاور میں داخل ہوا تو اُسے جلال الدین کی حقیقت معلوم ہوگئی کہ تیراہ میں اس نے ان کا راستہ روکنے کی خاطر لوگوں کو جمع کیا ہے۔ راجہ مان سنگھ کو یہ بات مناسب معلوم ہوئی کہ پہلے اِس فساد کا قلع قمع کیا جائے اور اُسکے بعد پوری دلجمعی کے ساتھ کابل جائے"

"تاریخ مرصّع"

موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ تاریخ کے عمومی موضوعات اور پشتونوں کی ملی تاریخ کے علاوہ اِس تاریخ میں خوشحال خان خٹک کی زندگی کا تذکرہ اور افضل خان کے زمانے تک اِس گرانقدر گھرانے کے حالات موجود ہیں۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی پانچ قلمی نقول کے علاوہ جو ڈاکٹر بیلو، پادری ہیوز، میجر راورٹی اور مسٹر آرسکن نے اُن مذکورہ

کتاب خانوں کو دی ہیں۔ اس کتاب کے بعض قلمی نسخے موضع اکوڑہ خٹک اور لاہور کی پبلک لائبریری میں بھی موجود ہیں
پشتو نحوا کے نامور محقق اور مؤرخ جناب دوست محمد خان کامل نے یہ کتاب مع اپنی مستند تحقیق و حواشی کے ساتھ
تاریخ و ادب کے شائقین کے استفادے کے لئے مرتب کر کے شائع کی ہے۔

علم خانۂ دانش

فارسی اور عربی زبانوں میں اخلاقیات کے موضوع پر بہت عمدہ اور دلچسپ کتابیں موجود تھیں پشتون طلباء ان کتابوں کو پڑھتے اور اُنکے محاسن سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ بعض فارسی کتابیں مثلاً اخلاق ناصری، اخلاقِ جلالی، اخلاق محسنی، علمی گھرانوں میں خصوصی طور پر بہت مقبول تھیں۔ ان کتابوں میں انوار سہیلی ایک ایسی کتاب تھی کہ جس میں سبھی موضوعات، پرندوں اور جانوروں کی کہانیوں کے روپ میں پیش کئے گئے تھے۔ یہ نثرادیوں کو درسِ اخلاقیات دینے کا ایک بڑا دلچسپ انداز تھا۔

انوار سہیلی کا اصل کلیلہ و دمنہ ہے۔ جو عبداللہ بن المقفع نے پہلوی زبان سے دوسری صدی ہجری میں عربی میں ترجمہ کی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب نوشیروان عادل کے لئے شطرنج کے کھیل کے ساتھ ہندوستان سے ایران بھجوائی گئی تھی۔ اور سنسکرت سے پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی تھی جسطرح یہ کتاب عربی ادب کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اِسی طرح فارسی ادب میں بھی اِسے ارفع و اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے۔ موضوع کی دلچسپی اور کتاب کی اس تاریخی اہمیت کے لحاظ سے افضل خان خٹک نے بھی یہ کتاب "علم خانۂ دانش" کے نام سے پشتو میں ترجمہ کی۔ اِس ترجمہ میں افضل خان نے ہو بہو مُلا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کی پیروی کی ہے۔ افضل خان کے پشتو ترجمے اور مُلا کاشفی کے فارسی متن سے کچھ نمونے قارئین کے استفادہ کے لئے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:-

مُلا کاشفی کا انداز	افضل خان خٹک کا انداز
دمنہ گفت آوردہ اند کہ روباہے در	دمنه اووے چه یوه لومبړه په

بیشهٔ مے گشت۔ بہ پائے درختے رسید
کہ طبلے از پہلوئے آن آویختہ بودند
و ہرگاہ بادے بوزید شاخے از آن
درخت در حرکت آمدہ بروئے طبل
رسیدے و آواز سہمگین از آن
بر آمدے۔ روباہ بہ زیر درخت
مرغ خانگی دید کہ منقار در زمین
میزد و قوطے مے طلبید۔ روباہ در
کمین نشستہ خواست کہ اورا صید
نماید۔ کہ ناگاہ آواز طبل بہ گوش او
رسید نگاہ کرد۔ جثۂ دید بغایت
فربہ و آواز وے مہیب بہ استماع
افتاد۔ طامعۂ روباہ در حرکت آمد
با خود اندیشید کہ ہر آئینہ گوشت و
پوست او فراخور آواز خواہد بود از کمین
مرغ بیرون آمد و روئے بر درخت نہاد
مرغ از آن واقعہ خبردار شدہ بگریخت
و روباہ بہ صد محنت بہ درخت بر آمد
بسے بکوشید تا آن طبل را بدرید جز پوستے و
پارہ چوبے ہیچ نہ یافت آتش حسرت در
دل وے افتاد و آب ندامت از دیدہ

یو ځنګل ګڼے پہ بوټیں د طمعے ھر طرف
ګرځیدو۔ بالاخرہ یوې ونے تہ ورسید
چہ یو طبل پرے راځوړند وو او چہ
کلہ بہ باد لګیدو نو د ونے څانګہ بہ
جویان او یو یان وہ۔ نظرے پہ یو
مرغ خانګی او لګیدہ چہ تر اونے لاندے
ے مښوکہ پہ زمکہ وھلہ، داورتہ
پہ څاؤ شوہ چہ ښکار ے کاپہ ھغہ
رونہ پورے یو طبل باز اویزان وو
چہ د ھغے رونے څانګہ پرے لګیدہ۔
د طبل بازنہ بہ آواز سہمګین نوت۔
تورړی فکر اوکړو چہ پہ دا اواز بہ
دا قوی جثہ بھتر تر چرګ دے۔ شاید
چہ دا پہ غوښہ تورب او پہ طعم زیات
وی۔ د چرګ لہ څوہ پاسیدہ پہ طبل باز
وزغاښتہ۔ چرګ پہ دا واقعہ خبردار
شہ، ځغے پہ کریز اونیو لہ تھلکے د تروړی
خلاص شہ۔ دا پہ سل محنت پہ رونہ
اوختہ۔ طبل بازئے څیرے کړو۔ غیں
لہ پوستے نور ھیڅ پکښے بیانہ موندل
اورے د ندامت پہ ملن د مذلت
او لګید۔ نم ئے د زړہ د کباب تر
سترګو جاری شو، اوئے ویل دریغہ
چہ لہ اصل کارہ پہ بیھودہ جثہ

باریدن گرفت گفت۔ دریغ کہ بہ واسطۂ این جُثہ قوی کہ ہمہ باد بود آن صید حلال از دستِ من بیرون شد و ازین صورت بے معنی ہیچ فائدہ بہ من نہ رسید ۔ نظم :۔

دہل در فغانست دایمُ ولے ۔ چہ حاصل کہ اندر میانش ہیچ نیست
گرش دانشے ہست معنی طلب ۔ بہ صورت مشو غرہ کان ہیچ نیست

نابودہ باندے غلط شوم ۔ قطعہ
دہل در فغانست دایم ولے ۔
چہ حاصل کہ اندر میان ہیچ نیست
گرش دانشے ہست معنی طلب
بہ صورت مشوغرہ کان ہیچ نیست

ترجمہ :۔ دمنہ نے کہا " کہ ایک لومڑی جنگل میں جا رہی تھی اور خوراک کی خوشبو کی لالچ میں ہر طرف سرگرداں تھی وہ ایک درخت کے پاس پہنچی جسکے پہلو میں ایک ڈھول لٹک رہا تھا۔ جب بھی ہوا چلتی تو درخت کی ایک شاخ جنبش کرکے ڈھول پر آن لگتی۔ اور ڈھول سے ایک مہیب آواز بلند ہوتی۔ لومڑی نے اُس درخت کے نیچے ایک خانگی مرغ کو دیکھا جو زمین پر اپنی چونچ مار رہا تھا۔ لومڑی اُس کی گھات میں بیٹھ کر چاہتی تھی کہ اُسے شکار کرے۔ کہ اچانک ڈھول کی آواز اُس کے کان میں پڑی۔ جب اُس نے نظر ڈالی تو ایک موٹا تازہ جسم نظر آیا۔ اُس کی آواز سننے میں اور بھی زیادہ خوفناک تھی۔ لومڑی کی لالچ حرکت میں آئی اور دل میں سوچنے لگی کہ ایسی آواز کے ساتھ یہ بھاری بھرکم جسم کھانے کے لئے امرغ سے کہیں بہتر ہوگا۔ مرغ کی گھات سے نکل آئی۔ اور درخت کی طرف رُخ کیا۔ مرغ کو پتہ چلا تو وہ بھاگ گیا۔ لومڑی بہ دقت تمام درخت پر چڑھی۔ بڑی کوشش کرکے اُس ڈھول کو پھاڑ دیا مگر سوائے پوست اور لکڑی کے اُس ٹکڑے کے کچھ بھی نہ پایا۔ اُس کے دامن دل میں ندامت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور اس کے دل بریان سے اشک ندامت چھلک پڑے۔ اور کہا کہ افسوس ہے اِس مضبوط جُثہ کی وجہ سے جو محض ہوا ہی ہوا ہے میرے ہاتھ سے صید حلال نکل گیا۔ اور اس صورت بے معنی سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔" قطعہ ڈھول سدا آہ و فغاں کرتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ کہ اُس کے اندر کچھ بھی نہیں۔ اگر تجھ میں عقل ہے تو اِس سے مطلب حاصل کر کہ صورت پر دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ صورت کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

---

[1] انوار سہیلی مولفہ ملا کاشفی (کتب خانہ پشتو اکیڈیمی)

روشانیوں کے دور سے پشتو نثر کا ارتقائی عمل اس زبان کی نظم کے ساتھ متوازی جاری تھا۔ ۱۱۸۱ھ میں یہ سفر پیر معظم شاہ کی نثر تک آن پہنچا۔ اُسی سال اُس نے نواب حافظ رحمت خان بڑیچ کی کتاب تواریخ افاغنہ کی تلخیص تواریخ حافظ رحمت خانی کے نام سے کی۔ یہ کتاب پشتو ادبیات میں سادہ اور رواں نثر کا ایک دلچسپ نمونہ ہے لیکن اس کی عبارت میں جگہ جگہ فارسی عبارت کے پیوند موجودہ دور کے پڑھنے والوں کے لئے اس کی افادیت گھٹا دیتے ہیں۔ جیسے کہ کہتا ہے۔

"دا مستي او بدي د دوئ په مرزا او په مغلو هم بده او لګیده اما له ملاحظے د یوسفزیو نے اصلاح نه شو واهه نو د مرزا او د مغلو قهر غصه یو سفزیو ته لا زیاته شوه۔ بارے نکه یوسفزي واره مسلح راغلي وو۔ د مرزا او د مغلو وار او لاس پرے بر نشو او قابو ئے پرے او نه رسیده۔ نو په دا ګذار ئے زړه ورکړ۔ به خانه خود رخصت فرمودند۔ چونکه مردمان یوسفزی خیلے سرفراز شده به اولوس خود هارسید خوش وقت شده زیاده از آن بد مست و متکبر گشتند و تسلط و تغلب از آن زیاده کردند"[1]

"ان کی یہ مستی اور تجاوز میرزا اور مغلوں کو بھی بُرا لگا۔ لیکن یوسفزیوں کی لحاظ داری کی وجہ سے دم نہ مار سکے۔ لیکن میرزا اور مغلوں کا غصہ اور قہر یوسفزئیوں کے لئے اور بھی بھڑک اُٹھا۔ چونکہ اس دفعہ یوسفزئی مسلح ہو کر آئے تھے تو مرزا اور مغلوں کا بس ان پر نہ چلا اور انہیں قابو نہ کر سکے۔ اس لئے انہیں دلیر بنانے کے لئے انعام و اکرام دے کر اُنکی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اور انہیں اُن کے گھروں کو رخصت کیا۔ یوسفزئی زیادہ دلیر ہو کر اپنے عوام کے پاس آئے اور فرطِ مسرت کی وجہ سے زیادہ بدمست اور متکبر ہو گئے اور پہلے سے زیادہ تسلط اور تغلب حاصل کیا۔"[2]

---

[1] علم خانہ دانش نقل شدہ انڈیا آفس قلمی نسخہ کتب خانہ پشتو اکیڈیمی۔ [2] تواریخ حافظ رحمت خانی مطبوعہ پشتو اکیڈیمی ص ۱۶

لیکن پشتو میں نئی نثر نگاری کا آغاز اُنیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا ہے اس دور کی نثر اگرچہ اردو زبان کی نثر کے نئے رُجحانات سے متأثر ہوئی تھی اور اس پر انگریزی ادب کا براہ راست اثر ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس کی اپنی انفرادیت بخوبی عیاں تھی۔ زبان و بیان کی رُو سے اِس دور کے نثر نگاروں کا انداز بڑا دلچسپ اور منفرد تھا۔ اگرچہ یہ قدیم روایتی اور تقلیدی اُسلوب سے یکسر آزاد نہیں تاہم مقابلتاً جدید اور موزون ڈگر پر رو بہ ترقی تھا۔

پشتو کی نئی نثر میں غالباً پہلی کتاب میجر راورٹی کی تالیف "قیصی د ایسپ الحکیم" ہے۔ یہ پادری جیمز کی کتاب ایسپ فیبلز (AESAB FABLES) کا پشتو ترجمہ ہے۔ اِسی زمانے میں افغان مشن کے پادری ہیوز نے پشتو نثر کے جو نمونے اپنی مرتب کردہ کتاب "کلید افغانی" میں پیش کئے ہیں اُنمیں نئی نثر نگاری کا اولین عمدہ نمونہ مولوی احمد کا ہے۔ مولوی احمد کی بعض کتابیں مثلاً "تاریخ سلطان محمود" اور "گنج پشتو" ایسی نثر میں لکھی گئی ہیں، کہ ہم اُسے جدید نثر کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں ان میں گنج پشتو عمدہ قصوں کی ایک خوبصورت کتاب ہے۔ یہ کتاب یورپین افسروں کے لئے پشتو سیکھنے والے نصاب میں شامل تھی۔ پلاوڈن نامی ایک انگریز نے ۱۸۷۵ء میں اِس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا شاید مولوی احمد کی نثر نگاری پر اُن کے انگریز دوستوں اور شاگردوں کا اثر موجود تھا۔ اور اِسی نئے پشتو زبان میں نئی نثر نگاری کا رجحان پیدا ہوا تھا۔ محقق خیال بخاری اِس ضمن میں لکھتے ہیں کہ "پشتو کی جدید نثر نگاری کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی احمد نے پہلی دفعہ پشتو نثر کو مسجع وغیرہ اور بہت زیادہ فارسی عربی مشکل الفاظ کے استعمال سے آزاد کر کے ایک نئی ڈگر پر گامزن کیا۔ فطری انداز میں روزمرہ محاورے کے مطابق سادہ آسان اور رواں زبان میں پشتو نثر کی پہلی ابتداء اِن سے ہوئی۔ رضوانی نے اِس میں طنز و مزاح کی چاشنی پیدا کی اور منشی احمد جان نے اِسے منتہائے کمال تک پہنچایا۔

میاں نعمان الدین کاکاخیل

جدید پشتو ادب کے اِس ارتقائی سفر میں میاں نعمان الدین احمد کاکاخیل کو منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ مردان

میں سُرخ ڈھیری کے رہنے والے تھے ۔ والد کا نام میاں امیرالدین تھا۔

میاں نعمان الدین پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (E.A.C) تھے پشتو زبان کی ترقی کے بڑے خواہشمند تھے۔ خود بھی اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ اور پشتو شعراء اور اہل قلم کے قدردان اور سرپرست بھی تھے۔ "ظفر النساء" نامی کتاب علم کی ضرورت اور اہمیت پر لکھی۔ میاں صاحب کے گھرانے کے دوسرے افراد نے بھی اُن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے پشتو نثر میں اچھی اور عمدہ کتابیں لکھیں۔ انکی بیگم نے "زینت النساء" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ دراصل اُردو زبان کی ایک کتاب "رفیقِ عروس" کا ترجمہ ہے جس کا مقصد پشتون خواتین کو اُمورِ خانہ داری اور درسِ اخلاقیات دینا تھا۔

میاں نعمان الدین کے ایک بھانجے میاں محمد یوسف نے ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب توبۃ النصوح کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۳۲۲ھ میں چھپی اور ان کے ایک اور عزیز میاں بشیرالدین نے فارسی کی ایک اخلاقی کتاب "خجستہ بہار" "مشیر الاخلاق" کے نام سے سادہ پشتو میں ترجمہ کی۔ یہ کتاب ۱۳۰۸ھ میں ترجمہ ہو کر ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوئی۔

میاں نعمان الدین کاکاخیل کے خاندان کے تمام لکھنے والوں کی نثر اُن خصوصیات کی حامل ہے۔ جن سے کچھ عرصے کے بعد پشتو کی نئی نثر کی ابتداء ہوئی ہے چاہے کچھ بھی ہو یہ نثر مجموعی طور پر مولوی احمد، شمس العلماء رضوانی اور منشی احمد جان کی طرزِ نگارش سے ہمسری نہیں کر سکتی پھر بھی جیسا کہ خیال بخاری صاحب نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ "اِس دور میں ایک طرف سرزمین ہند میں جب سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی اور حافظ نذیر احمد جیسے خیرخواہانِ ملت نے ہندی مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اُن کی اخلاقی تربیت اور اصلاح کے لئے قلمی جہاد کیا۔ مقالے، مضامین اور دلچسپ کتابیں لکھیں۔ تو یہی ضرورت اِس علاقے میں میاں نعمان الدین احمد نے بھی محسوس کی اور اس قسم کی کتابوں کو پشتو میں لکھنے کو رواج دیا۔

موصوف نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کی کتابوں کو شائع کرنیکا ذمہ اپنے سر لیا تھا۔ بلکہ اِن کتابوں کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی چھپوایا گیا کہ "وہ علم جلد حاصل کیا جا سکتا ہے، جو اپنی مادری زبان میں ہو" اِس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ علوم و فنون پشتو زبان میں بیان ہوں لہذا اگر کسی نے کسی علم یا فن کی کوئی کتاب پشتو زبان میں تصنیف یا تالیف کی ہو۔ تو میں بقدرِ کوشش اور حسبِ ضرورت و مناسبتِ مضمون اپنی حیثیت کے مطابق اُسے

انعام دوں گا۔ اور کتاب کی اشاعت میں اُس کا ہاتھ بٹاؤں گا۔"

درحقیقت یہی جذبہ اور احساس تھا جس کی رُو سے اُس دور کے کاکاخیل قبیلہ میں اچھے اچھے شعراء کے علاوہ صاحب طرزِ نثر نویس اور اہلِ قلم پیدا ہوئے اور اُن کی بدولت پشتو میں جدید نثر کا آغاز ہوا۔ میاں حبیب گل، میاں حلیم گل، میاں مسرود گل اور میاں آزاد گل[1] مرحوم بھی کاکاخیل کے جدید نثر کے ہراول دستے کے صاحبِ قلم گزرے ہیں۔

"دورِ متقدمین کا شفاہی ادب"

روشانیوں کی تحریک سے تقریباً دو پشت قبل پشتونوں کی تاریخ کا وہ ہنگامہ خیز دور شروع ہوا تھا، جس نے یوسف زئی اور مغلوں کی ہٹ اور مخالفت کو توڑ دیا تھا۔ اور سڑبنی قبائل، بنیخے اور غوری کے تمام گروہ اور خیلوں کو کابل اور غور کے قرب و جوار سے دریائے کونڑ اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا پُر آشوب دور تھا۔ کہ پشتونوں کا ایک قبیلہ بھی مکمل طور پر سکون خاطر اور دلجمعی کے ساتھ کسی ایک مقام پر قیام پذیر نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اِنکے وہ ملی گیت اور عوامی ادب ٹپے، نارے، غگونہ اور غاڑے ان کے رزم و بزم میں انکے ہمراہ رہے۔ جو ان کی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم تھے۔ یہاں تک کہ مغل بادشاہ الغ بیگ کے حکم سے حسن ابن چنگا اور سلیمان شاہ ابن رنڈ مندنڑ یوسف زئی کے قتل کے وقت کی رجزیہ غگونہ بھی شفاہی ادب کی دلچسپ اور پُر لطف مثالیں ہیں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لیکن کسی نے کہا ہے کہ "کبھی کبھار بھولی بسری کہانی دہرا لیا کرو" سات سو یوسفزئی سرداروں کا ایک ہی مقتل میں بے گناہ قتل ہونا۔ ایک بڑا ہی افسوسناک اور عبرتناک تاریخی المیہ تھا۔ لیکن تاریخ نے اس واقعے کو اس لئے فراموش کر دیا ہے کہ

---

[1] میاں ابو المعانی آزاد (آزاد گل) کاکاخیل عمدہ نثر نگار اور شاعر تھے۔ نثری نمونے اُن کے اپنے رسالے ماہنامہ "افغان" میں ہیں اور نظم میں "ترانۂ آزاد" مسدس کی شکل میں لکھی ہے۔

پشتونوں نے کسی دور میں بھی اپنی تاریخ مرتب کرنیکی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تحقیقین اور مورخین اکثر اُن شہادتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ایک دو کتابوں میں یا توضمناً آئی ہیں یا اُن درباری مورخین نے یکجا کی ہیں۔ جو عموماً اُنکے خلاف تھے اور اُن سے بغض و عناد رکھتے تھے۔

شاعر جو ہمیشہ ترجمانِ حق، نقیبِ عصر اور مظلوموں کی طرفداری کا داعی ہوتا ہے۔ وہ بھلا کب یہ المیہ یوں نظر انداز کر سکتا تھا۔ لیکن گردشِ زمانہ میں اُن تین نوحوں کے سوا جو پیر معظم شاہ نے اپنی تالیف[1] میں پیش کئے۔ اس واقعہ کی باقی تمام روداد اگر کہیں 'بدلہ'، چاربیتہ، یا پشتو شعر کے کسی اور صنف میں محفوظ تھی۔ تو وہ بالکل معدوم ہو چکی ہے۔ پھر بھی اُس وقت کے عوامی ادب کی تخلیقی رعنائی کے یہ خوبصورت جواہر پارے اپنے وقت کے شفاہی ادب کے ستھرے پن کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہیں۔ اِس ضمن میں ایک دوسرا تاریخی واقعہ جو ۱۱۲۲ھ میں گل خان اور جمال خان کا المیہ ہے جن کا دوست محمد خان کامل نے اپنی کتاب "رحمان بابا" میں تفصیلی ذکر کیا ہے[2]

اِس واقعہ نے بہت سے پشتون شعراء کے دل دُکھائے ہیں۔ اور اس سے عبرت اور مکافاتِ عمل کا ایک ناقابل فراموش درس لیا ہے۔ جیساکہ یوسفزئی بزرگوں کے قتل کا واقعہ اپنے پس منظر میں کچھ مخصوص اقتصادی اور سیاسی عوامل رکھتا تھا۔ اسی طرح اس واقعے کی بنیاد بھی کچھ ایسے ہی پس منظر سے بنی ہے۔ یہ لسان الغیب رحمان بابا اور انکے ہمعصر شعراء کا زمانہ تھا اس لئے اِس زارستان کی رُوداد کو شعر کا لافانی جامہ پہنایا گیا اور شعراء کی بیاضوں میں بھی محفوظ کیا گیا۔

اس کے علاوہ پشتو کے لوک گیتوں کے ایک بڑے حصے نے بھی اِسی قسم کے معاشی اور اقتصادی حالات سے جنم لیا تھا۔ کہیں احتجاج کے انداز میں اور کہیں نفع و نقصان کی صورت میں۔

پشتونخوا میں الگ الگ قبیلوں کی ایک دوسرے کے ساتھ علاقوں پر قبضے کی کشمکش تادیر جاری رہی ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں وہ عمل تقریباً اب تک جاری ہے، جو قبیلہ آج جس سرزمین پر مقیم ہے کچھ عرصہ پہلے یہی قبیلہ

---

[1] تواریخ حافظ رحمت خانی صفحات ۲۳ - ۲۴ مطبوعہ پشتو اکیڈیمی۔

[2] رحمان بابا مصنفہ کامل مومند صفحات ۹۲ تا ۹۵۔

یہاں پر آباد نہیں تھا۔ ہر قبیلے نے دوسرے کو اٹھا کر اس کی جگہ ہتھیالی ہے۔ تصرف اور قبضہ کا یہ سلسلہ دریائے آمو کے کنارے سے لے کر دریائے سندھ، پنجاب حتیٰ کہ ہند کے میدانوں تک جا پہنچا ہے اس سلسلے میں مشہور روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں شہید لکھتا ہے کہ "سرزمین پشتونخوا کے کئی شریف زادے رزق کے نصیبے کی تلاش میں اپنے ملک سے اٹھ کر یہاں ہندوستان آکر آباد ہوئے ہیں۔[1]"

ادب اپنے عصری تقاضوں کا آئینہ دار ہوتا ہے

فن اور ادب، خصوصاً شعر اپنے عصری تقاضوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر شاعر کے کلام میں سکے عوام کا معاشی اور معاشرتی پرتو بہت واضح اور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ پشتو ادبیات کی تاریخ کے دو طویل ادوار میں ویدوں کے زمانے سے لے کر رجب کہ پشتو اس زمانے میں بھی عوامی افکار و احساسات کی ترجمان تھی۔ نئی شاعری تک ایسی بیشمار شہادتیں ہماری ادبیات میں موجود ہیں جو ان تقاضوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ قدیم ادوار میں "سوما بوٹی" کی معاشی اہمیت کے بارے میں پشتون شاعروں نے اپنے گیتوں میں فکر و نظر کے ایسے خوبصورت موتی بکھیرے ہیں کہ ایک تو ان سے اِس بوٹی کی افادیت اجاگر ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی زندگی کی اس رعنائی اور رومانیت کی بھی ترجمانی ہوتی ہے جو تاریخی شواہد کی رو سے سوما بوٹی کی کٹائی سے وابستہ تھے۔

پشتو کے بیشمار عوامی گیتوں میں اس قسم کے خیالات کے اظہار کے نادر نمونے موجود ہیں خصوصیت کے ساتھ پشتو ٹپہ اور لوبہ میں اس کی دلکش اور دلچسپ مثالیں بے شمار ہیں۔ جیسے کہ کہا ہے۔ ؎

۱	سپو بہ میہ سر و ھہ راخیژہ	یارے د کلولوکوی کوتے ریبینہ
۲	پہ جوبہ تلے یارہ مے راغے	مالہ ئے داوړی دی د غارے امیلونہ
۳	ٹوک پہ رضا د ملکہ نہ ځی	یا ډیر غریب شی یا دیارہ د غمہ ځینہ

---

[1] خلاصۃ الانساب ص ۲۲ (مطبوعہ پشتو اکیڈیمی)

ھندوستانے شہ دوپیٔ راوڑہ — پہ کوڅ نو روپوے موڼہ دړکوینہ
پہ مادِ تیں دخوانئ واڅ کړو — ستا دِ دانہ شی ددکنہ مہراںونہ

اے چاند! ذرا جلدی سے نکل کر آ، میرا محبوب پھولوں کی کٹائی کر رہا ہے۔ اور اپنی انگلیاں کاٹ رہا ہے۔
ہمراہیوں کے ساتھ سفر پہ گیا ہوا میرا محبوب واپس آ گیا اور میرے لئے گلے کے ہار لایا ہے۔
اپنی مرضی سے کوئی بھی اپنا ملک چھوڑ کر نہیں جاتا' یا تو وہ بہت مفلس ہو جاتا ہے یا پھر اپنے محبوب کے غم کیوجہ سے وطن چھوڑ جاتا ہے۔
ہندوستان جا کر دولت کما لاؤ، کیونکہ گھر میں موجود دولت پر میری ماں تجھے میرا رشتہ ہرگز نہیں دیگی۔
اب خدا کرے کہ دکن سے تیرے سونے کے سکے اور اشرفیاں نہ آئیں تو نے میری جوانی کا زمانہ ویسے ہی ضائع کر دیا۔

(پہلے مصرعہ میں سوما بوٹی کی کٹائی کے اُن ابتدائی رسومات کیطرف اشارہ ہے کہ "کنواری دوشیزائیں پورن ماشی (پورے مہینے کا چاند) یا چودھویں کے چاند کی روشنی میں ادا کرتی تھیں۔ اس موقع پر وہ گیت گاتیں، رقص کرتیں۔ اور اس بوٹی کی افادیت اور محبوب کی ستائش کیا کرتیں۔ دانشور جیبی نے لکھا ہے[1] کہ "قدیم آریائی قومیں جو افغانستان کے پہاڑوں میں بستی تھیں، وہ ایک مقدس بوٹی سوما کو جلایا کرتیں۔ اور اُس کا ایک مشروب بنایا کرتیں۔ جسے عبادت کے وقت استعمال کیا کرتیں۔ اوستا میں اُس کا نام ھَوما اور ویدی زبان میں سوما آیا ہے۔ جسے عرب بھی "صوم المجوس" کہتے ہیں۔ یہ کلمہ اب پشتو میں اُومہ یا ہومان کی شکل میں رہ گیا ہے اور اپنی قدیمی شکل کو چھپائے ہوئے ہے۔ دانشور جیبی کے اس بیان کے ساتھ مطابقت رکھنے والا بیان مستشرق پادری انولڈسن کا ہے۔ وہ کہتا ہے[2] کہ "پشتو نخوا میں رات کے وقت پھولوں کی کٹائی کا مخصوص دستور جواب اِس زمانے میں تو نہیں لیکن یہ شاید ویدی دور کے اُس مرکزی دستور کی طرف اِشارہ ہو۔ کہ جس میں سوما بوٹی

---

[1] تاریخِ ادبِ پشتو ص ۵ (چھاپ شدہ کابل ۱۳۴۸ ش)
[2] چاند دھوم دھڑکے کے ساتھ طلوع ہو جاؤ۔ (دیباچہ جنز انولڈسن)

کاٹی جاتی ہے۔ اور اُس سے ایک خاص قسم کا کیف اور مشروب تیار کیا جاتا ہے "۔

سوما بوٹی کی اِس تاریخی اور ثقافتی اہمیت کی رو سے جو قدیمی ادوار میں اُسے حاصل تھی۔ اِس بُوٹی کے بعض خواص جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بڑے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر نوازش علی قزلباش کی تحقیق نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچائی ہے۔ کہ بعض مخصوص کیمیاوی اجزا کی وجہ سے جو انہوں نے دریافت کئے ہیں۔ اُس زمانے میں اس بوٹی کو اتنا بڑا تقدس حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ سوما بوٹی کی کٹائی کے موقع پر ایسے رسیلے گیت گائے جاتے۔ یہ مثال بالکل ایسی ہے جیسے پچھلے ادوار میں ایرانی اور عربی ادب میں "دختِ رز" کی تعریف، شاعری کا ایک بنیادی موضوع گردانا گیا تھا۔

اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر پشتو زبان و ادب کا گہرا مطالعہ اِس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو بعید نہیں کہ ہر دور کے پشتونوں کی عوامی زندگی، معاشرتی ادب، قومی مسائل روابط اور فکری ارتقاد کا پورا پورا اندازہ لگایا جا سکے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ کس دور کے پشتون کس طرح کے بنیادی مسائل سے دوچار تھے نیز یہ کہ ہر دور کے مسائل آپس میں کچھ مشترک اقدار رکھتے تھے یا نہیں۔

دفترِ شیخ ملیؒ

جب یوسفزئی کابل کے قرب وجوار سے نقل مکانی پر مجبور کئے گئے اور سوات اور پشاور کے میدانی علاقوں پر قابض ہو گئے، تو یوسف نامہ کے ایک بڑے بزرگ شیخ ملی بابا نے سرُبنی قبیلوں، خصوصاً شنخی کے گروہوں، خیلوں اور خیلخانوں میں یہ نئے مفتوحہ علاقے تقسیم کر دیئے اور اپنے دفتر میں اُن کا اندراج کیا۔ شیخ ملی بابا کا مذکورہ دفتر کتابی شکل میں اس دور کی سب سے اہم تاریخی دستاویز ہے جو اب نایاب ہے۔ خوشحال بابا نے اِس کتاب کا تذکرہ یوں کیا ہے ؎

دوه خیز ه دی په سوات کښے که خفی دی که جلی
یو مخزن د درویزه دے بل دفتر د شیخ ملی

"سوات میں دو چیزیں ہیں، چاہے خفی ہوں یا جلی، ایک درویزہ کا مخزن ہے اور دوسرا شیخ ملی کا دفتر"۔ یہ کتاب پشتونوں کی تواریخ، انکی عوامی اور اقتصادی زندگی اور اُس دور کے نظام معیشت پر ایک منفرد اور غیر معمولی یادداشت ہے، "تواریخ حافظ رحمت خانی کے مؤلف پیر معظم شاہ کے قول کے مطابق

"شیخ ملی نهایت متدین قائم اللیل صائم الدهر سړے وو۔ هر چرته چه به تهٔ خو متکاړه به کوزه د اوداسهٔ ورسره کړ ځوله او دے ماتحت د ملک احمد مقتدا د درست یوسف منډنړ وو۔ دے دهرے چارے دهر مهم غمخوړ وو۔ هسکی کلی سلکوړنه تپه په تپه کوړ په کوړ دده په دفتر ختلی دو او دهٔ ویشلی وو۔ او تر اوسه پورے هم دده هغه تقسیم په یوسف منډنړ کښے جاری دے۔ حکه دیوسفزو چه چرے په زمکه مباحثه شی سره وواتی چه دا تاله شیخ ملی راوړے دے۔ یعنی شیخ ملی ورکړے دے چه دعوی ئے کوے۔ غرض دا چه دده ورکړے تر اوسه منظور دے۔"

ترجمہ :۔ "شیخ ملی نہایت متدین، متقی، قائم اللیل اور صائم الدھر آدمی تھا۔ جہاں کہیں جاتا وضو کے لئے نوکر لوٹا ساتھ پھرایا کرتا۔ اور وہ ملک احمد کا ماتحت اور پوری یوسف منڈنڑ قوم کا پیشوا تھا۔ وہ ہر کام کا مسیحا اور ہر مہم کا مشکل کشا تھا۔ سبھی علاقے گاؤں، گروہ اور گھر نام بہ نام اِس کے دفتر میں محفوظ تھے۔ اور اُس نے تقسیم کئے تھے۔ اور آج تک اُس کی وہی تقسیم یوسف منڈنڑ میں رائج ہے اس لئے جب یوسفزئی کے مابین زمین کا کوئی تنازعہ رونما ہوتا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ تو نے کیا شیخ ملی سے پایا ہے۔ جس کا تو دعویٰ کرتا ہے؟ غرضیکہ اس کی دی ہوئی (زمین) اب تک تسلیم کی جاتی ہے۔"[1]

حضرت اخون درویزہ نے اس اہم دستاویز کے بارے میں تذکرۃ الابرار والاشرار" میں لکھا ہے[2]۔

---

[1] تواریخ حافظ رحمت خانی صفحہ ۱۳۵ ، [2] تذکرۃ الابرار والاشرار ص ۱۳۶

مدچون اولس یوسفزئی مملکت سوات را گرفتہ ملک شیخ ملی مصلحت بر آن دیدہ کہ تمامی اولس را از خورد و بزرگ، نر و مادہ در حساب آرند بر آن مضمون سوات را قسمت نمایند۔ مردم اکوزئی با عیسیٰ زئی شش ہزار آمدند و مردم ملیزئی والیاس زئی نیز شش ہزار آمدند۔ تا مردم یوسفزئی دوازدہ ہزار آمدند و مردم مندنڑ نیز دروازہ ہزار آمدند اما مردم ننگرہاری ولغمانی و کابلی کہ با ایشان بردہ داخل حساب ساختہ و مردم این حدود را داخل حساب نکردہ مر بر آن مضمون تقسیم نمودہ۔ الیٰ یومنا ہذا۔ این تقسیم شیخ ملی تغیر و تبدیل وانفساخ نمی نماید۔

سماع است کہ شیخ ملی در زمان نزع روان حاضران مجلس را بر احوال خود گواہ گرفتہ بر آنکہ ہر کار و بار را ہتمام اولس را کہ من بجا آوردہ ام فالعشہ للہ و صلۃ الرحم واز روئے شفقت بر قرابت آوردم پس اگر صادق ام درین گفتار امید از جبار جہاندار آن کہ رسم وآئین تقسیم من تا ہفت پشت از اولس من نرود۔ واگر کاذب باشم اللہ تعالیٰ بہ زودی نابود گرداناد بالبنی والہ الامجاد ہم از آنست کہ الیٰ یومنا ہیچ سردارے این قسم را تغیر نہ میتوانداد "

" جب یوسفزئی عوام نے سوات پر قبضہ کیا تو ملک شیخ ملی کو اِس بات میں مصلحت دکھائی دی کہ سب لوگ چھوٹے بڑے، مرد عورتیں گنی جائیں۔ اور اس حساب سے سوات کو تقسیم کیا جائے اکوزئی، عیسیٰ زئی کے ساتھ چھ ہزار اور ملیزئی الیاس زئی سمیت بھی چھ ہزار شمار کئے گئے، یعنی تمام یوسف زئی ۱۲۰۰۰ خیال کئے گئے اور اسی طرح سارے مندنڑ بھی ۱۲ ہزار شمار ہوئے۔ اور ننگرہاری، لغمانی اور کابلی جو اُنکے ساتھ تھے وہ بھی گنتی میں لائے گئے۔ لیکن اِس خطے کے مقامی لوگوں کو شمار سے خارج کیا گیا۔ اور تقسیم کچھ اس طرح سے کی گئی کہ بغیر کسی رد و بدل کے آج تک یہ تقسیم جاری ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شیخ ملی کی آخری ہچکیاں تھیں تو حاضرین کو اِس پر گواہ کیا گیا کہ جو کچھ بھی میں نے لوگوں کے انتظام اور انصرام کے سلسلے میں کیا ہے یہ خاص اللہ کے لئے صلۂ رحمی اور اپنے خویش و اقارب سے محبت کی خاطر کیا ہے۔ پس میں اگر اپنے اِس کام میں سچا ہوں تو اللہ سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میری تقسیم کا یہ طریقہ اور یہ آئین سات پشتوں تک اِس قوم سے نہ جائے اور اگر میں جھوٹا ہوں تو اللہ اِس طریقے کو جلد از جلد نابود کر دے یہی

سبب ہے کہ اس وقت تک کوئی سردار بھی اس تقسیم کو تبدیل نہیں کر سکا۔

اخون درویزہ صاحب کے[1] مذکورہ بیان سے جو ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء کے لگ بھگ کا ہے عملاً ۱۶۹ سال بعد ۱۱۸۱ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں اسی قسم کا اقتباس پیر معظم شاہ نے لکھا ہے۔ "کہ آج تک وہ تقسیم برقرار ہے[2]" یہی تقسیم سوات میں بیسویں صدی عیسوی میں ۱۹۶۹ تک بالفعل مستحکم طریقے سے قائم رہی۔

جیبتی نے شیخ ملی کے نام کو آدم ملی کہا ہے اور اس کا شجرہ یوں پیش کیا ہے۔ آدم معروف بہ شیخ ملی یوسف کا بیٹا ہے۔ یوسف مندنڑ بن شیخے بن کند بن خرشبون ہے[3]۔ حالانکہ تواریخ خان کجو کے حوالے سے پیر معظم شاہ اسے شیخ ملی بن پیر کے اکازئی، مندنڑ یوسفزئی کہتا ہے[4]۔ اور اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"ونور ملک احمد سردار کل و خان مستقل بود و شیخ ملی بن پیر کے اکازے مندنڑ کہ از مشاہیر وقت وثانئ ملک احمد بود۔"

ترجمہ:۔ اور یہ کہ ملک احمد سردار کُل اور ایک مستقل خان تھا۔ اور شیخ ملی بن پیر کی اکازئی مندنڑ مشاہیر وقت میں سے تھا۔ اور ملک احمد کا ہمسر تھا۔"

جیبتی کہتے ہیں کہ شیخ ملی ہوشیار جنگجو اور صاحب سیف وقلم تھا۔ تقویٰ داری اور ارفع کردار کی وجہ سے شیخ ملی بابا کو اپنے عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ عوامی معاملات اور چپقلشوں میں وہ منصف و قاضی ہوا کرتا تھا۔ شیخ ملی نے یوسفزئیوں کے لئے مفتوحہ علاقوں کی تقسیم اور ان کا بندوبست کیا اور تقسیم کے قاعدے اور قوانین وضع کئے۔ اور اپنے دفتر میں ان کا اندراج کیا۔ بعض مورخین یہ قیاس کرتے ہیں کہ اس کے دفتر میں زمینوں کے بندوبستی گوشواروں کے علاوہ یوسفزئیوں کی پیش قدمی اور فتوحات اور اس قوم کے تاریخی واقعات بھی لکھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس دفتر کی علاقہ یوسفزئیوں خصوصاً سوات میں بڑی اہمیت تھی۔ جیبتی ناروے کے مشہور مستشرق "مارگن سٹرین" کے حوالے سے کہتے ہیں کہ راورٹی نے لکھا ہے کہ "شیخ

---

[1] تذکرۃ الابرار اخون درویزہ۔
[2] تاریخ ادبیات پشتو حصہ دوم ص ۲۳۵
[3] تواریخ حافظ رحمت خانی ص ۱۳۶
[4] تاریخ حافظ رحمت خانی ص ۳۱

ملی کا دفتر ۸۲۰ ہجری کے لگ بھگ لکھا گیا۔ یہ کتاب مجھے ملی ہے جو پشتو زبان کی ایک اہم ترین قدیمی دستاویز ہے۔ اب یہ کتاب ناپید ہے۔ اور اس کے اصل متن کا کوئی نمونہ بھی ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ لیکن اس کے وجود، اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ خواجو مورخ نے شیخ ملی کی وفات کے لگ بھگ اسی سال بعد ۱۰۳۲ھ میں اپنی تواریخ افاغنہ تالیف کی ہے اس لحاظ سے مورخ پیر معظم شاہ نے اس کے حوالے سے جو بیان نقل کیا ہے، وہ اس سلسلے میں باقی تمام بیانات سے زیادہ مستند صحیح اور پائیدار دکھائی دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ "تمام دیہات، املاک، قبیلہ وار۔ گھر گھر اس کے دفتر میں درج تھے"۔ اس مورخ کا یہ بیان شیخ ملی کے دفتر کی کتابی شکل کی دلیل ہے، لیکن اصل کتاب کے متن کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ وہ کتاب اصلاً کس زبان میں تھی۔ اس دور کی ایک اور اہم کتاب خواجو ملیزئی کی لکھی ہوئی کتاب "تواریخ افاغنہ" ہے۔ جس کا ذکر اپنی جگہ آئیگا۔ یہی کتاب تواریخ خان کجو کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اسی کتاب کی تلخیص ۱۱۷۲ھ پیر معظم شاہ نے نواب حافظ رحمت خان روہیلہ شہید کے لئے تواریخ حافظ رحمت خانی کے نام سے کی ہے۔ جو ۱۹۷۱ء میں پشتو اکیڈیمی نے شائع کی ہے۔

"اس عبوری دور پر سرسری نظر"

اس عبوری دور کے اکثر پشتون بزرگ فن شعر سے واقف تھے۔ رجز اور قول دونوں کا رواج جنگوں اور جرگوں میں عام تھا۔ ملک احمد کے چچا سلیمان شاہ رنڈ کی سخن وری اور سخندانی کے علاوہ حسن بن چنگا، شیخ موتی ملیزئی قدس سرہ قدوۃ المکاشفین، شیخ عثمان کی کہی ہوئی یہ ضرب المثل آج تک دیار افغانستان میں زبان زد خاص و عام ہے۔ کہ "الم نشرح وبی الم نشرح ہے لیکن زبان ملا عثمان کی نہیں[1]"۔

سلیمان شاہ رنڈ اور شیخ عثمان بن موتی ملیزئی دونوں کے مزار "خطیرۂ شہیدان یوسفزئی" میں "سیاہ سنگ"

[1] پشتو ضرب الامثال مطبوعہ کابل۔

کے مقام پر کابل میں موجود ہیں۔ اِن کا ایک اور ہم عصر شاعر دادی ملیزئی ہے دادی کا یہ رجز اِس کی بہادری، شجاعت اور زورِ کلام کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ؎

کهٔ د نورو نیزے لنډ ے — د دادی نیزه ده لویه
کهٔ سوارهٔ ھر څو مره ډیر دی — د دادی ورتلهٔ نو بویه

"اگر دوسروں کے نیزے چھوٹے ہیں مگر دادی کا نیزہ تو بڑا ہے چاہے اس کے مقابلے میں دشمن کے سوار کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں پھر بھی دادی کا میدان میں جاکر لڑنا لابدی ہے"۔

شیخ تپور کی تاریخی لڑائی جو سرٹ بن نامے میں غوری اور شنخے کے درمیان ہوئی تھی اور اس کا اخون درویزہ نے یوں تذکرہ کیا ہے کہ :۔

"دوم آنکہ سردارانِ و ملکان ایشان از آمد و رفت و دیدن خانۂ بادشاہان منع نہ گشتند تا کہ ملک احمد از صواتِ بہ کابل رفتے و خدمت حضور بجا آوردے تا زمانے کہ نوبت بسرداری این بہ خان کجو آمد۔ در این ایام این مردم یوسفزئی را بہ مردم غوریاخیل محاربۂ عظیم افتاد در موضع شیخ تپور"۔[1]

"دوم یہ کہ اُن کے سردار اور ملک آنے جانے اور بادشاہوں کے درباروں پر حاضری دینے سے باز نہ آئے ملک احمد سوات سے کابل جاتا اور حضور کی خدمت بجالاتا۔ یہاں تک کہ اس کی سرداری خان کجو کو ملی۔ ان دنوں یوسف زئیوں کا غوریاخیل سے ایک بڑا معرکہ موضع شیخ تپورؒ کے مقام پر پیش آیا"۔

اِس موقع پر جب خان کجو اور یوسفزئی سرداروں نے صلاح مشورے کے لئے ایک جرگہ طلب کیا تو اِس جرگے میں کچھ بزرگ جنگ کرنے پر راضی نہیں تھے۔ اس مخالفت اور مدافعت کی وجہ سے خان کجو نے اپنے نوکروں میں سے دو قوالوں کو جن کے نام ادو اور جونڑا تھے مخاطب کیا۔ انہوں نے حاضرین جرگہ کے سامنے

---

[1] تذکرۃ الابرار والاشرار صفحہ ۱۳۹۔

خان کجو سے کہا کہ[۲] :-

"خان کجو د قرا زویہ! خیمہ دِ کرہ ولاړ لویہ
اوس پہ ھر شان شیخ تپور تہ ستا تلۂ بویہ
او کۀ نۀ وی دا خیمہ بہ دِ پیغور شی تر لر غویہ"

"اے خان کجو قرا کے بیٹے! اب تو تُو نے بڑا خیمہ تان لیا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی پیش آئے تجھے شیخ تپور تک جانا ضروری ہو گیا ہے۔ اگر نہیں جائے گا، تو تیرا یہ خیمہ تیرے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باعثِ ملامت بن جائیگا۔"

اور جونڑا قوال نے بارا خان یوسف زئی کو یوں مخاطب کیا:-

"بارا خان د موسیٰ زویہ گُل بنیخے درسرہ کو دکرہ لور دړلوړ
کۀ مو دا وار غوئے پریښو دے بہ شی ھر گورغرہ لہ خپلہ زورہ"

"اے موسیٰ کے بیٹے بارا خان تمام بنیخے زیوں کو ہر جانب سے اکٹھا کرد۔ اس دفعہ بھی اگر تم نے غوری کو چھوڑ دیا تو وہ ہر لحاظ سے اپنی طاقت پر مغرور ہو جائیگا۔" اسی طرح یوسف زئیوں کے مشہور قومی سربراہ ملک احمد کے بارے میں مؤرخ خواجو کے حوالے سے پیر معظم شاہ مؤلف تواریخ حافظ رحمت خانی لکھتا ہے :-

"دیر فصیح زبان او خوش آوازہ سخنور وو۔ سیاست دان فارسی گوئی وو۔"

"وہ بڑے فصیح البیان اور خوش آواز سخنور تھے سیاست دان اور فارسی گو تھے۔"

ملک احمد بابا کا مزار سوات رانی زئی کے ڈھیری الہ ڈھنڈ نامی گاؤں کے قریب سڑک کے کنارے ہے۔ اِس مقام کو گلینگسو گھڑی کہا جاتا ہے۔

۲۔ تاریخ حافظ رحمت خان صفحہ ۱۶۵ - ۱۶۶ -

"خواجو مؤرخ"

یہ مشہور مورخ خان کجو کے دور کے کافی عرصے بعد گذرا ہے۔ قبیلے کے لحاظ سے یہ یوسفزئی[1] تھا۔ انہوں نے تواریخ افاغنہ کے نام سے ایک تاریخ لکھی ہے۔ (یہ کتاب آج کل ناپید ہے) جس میں یوسفزئیوں کی ہجرت اور پشاور کے میدان اور سوات اور سمہ پر انکے قبضے اور آباد ہونے کے مفصل حالات و واقعات لکھے ہوئے تھے۔ اُس دور کے پشتو نخوا کے ایک سو پینتیس (۱۳۵) مشاہیر کے کارناموں اور قومی مبارزوں کی تفصیل اس کتاب میں موجود تھی۔ یہ کتاب تواریخ خان کجو کے نام سے مشہور تھی جو پیر معظم شاہ کی تحریر شدہ تاریخ کا اصل ماخذ ہے۔

خواجو مؤرخ نے یہ تاریخ ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۲ء میں شروع کر کے ۱۰۳۳ھ مطابق ۱۶۲۳ء میں ختم کی۔ یہ جہانگیر بادشاہ کا دور تھا۔ اس لئے کہ ملک شاہ منصور کے بارے میں ایک بیان کے ضمن میں وہ کہتا ہے :۔

"د ملک احمد د تربور شاہ منصور پہ اولاد کښې یو څو کسان لا نن هم په هندوستان کښې د نور الدین محمد جهانګیر بادشاه په دربار کښې دي۔"

"ملک احمد کے چچازاد بھائی شاہ منصور کی اولاد میں چند اشخاص آج بھی ہندوستان میں نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ کے دربار میں ہیں"

اور اس کے بعد ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

"چنانچه از آن جمله سودا نام چه د ملک زیو ملک دے او ډیر موقر معمر دے۔ نن ورځ چه سن هجری زر درے دیرش (۱۰۳۳) دے حیات دے۔"

"چنانچہ اُن میں سے سودا نام جو ملک زیوں کا ملک ہے اور بڑا موقر اور معمر ہے۔ جب کہ سن ہجری ۱۰۳۳ ہے آج زندہ ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتا ہے :۔

---

[1] بعض محقق اس سے اتفاق نہیں کرتے جیسے ڈاکٹر سید چراغ حسین، دیکھئے "دلس ۶/۱۹۷۷ء"

" درین وقت کہ سن الف و ثلثین است"

"اب جبکہ ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۶ء ہے ۔" یہ ظاہر کرتا ہے کہ خواجو مورخ جہانگیر بادشاہ کے ہمعصر تھے جنہوں نے شیخ تیمور کے جنگ کے نتائج تک کے واقعات اپنی اس مشہور تاریخی کتاب میں تحریر کئے تھے ۔ تواریخ افاغنہ کا یہ مصنف اُس دور کا ایک اچھا شاعر اور صاحب قلم تھا۔ مورخ پیر معظم شاہ لکھتا ہے کہ تاریخ افاغنہ اخوند درویزہ کے تذکرۃ الابرار نامی کتاب کی طرز پر لکھی گئی تھی وہ کہتا ہے :۔

" اتفاقاً روزے کتابے تواریخ افاغنہ مسودہ طریق مشعر بر احوال اقوام شیخی وغوری غالباً بر احوال یوسفزی بہ زبانِ افغانی فارسی آمیز مطابق اخبار تذکرہٴ عارف بے بدل سالکِ شاہراہِ علم وعمل اخوند درویزہ علیہ الرحمۃ ۔"

" اتفاقاً ایک دن ایک کتاب تواریخ افاغنہ مشعر مسودہ کی صورت میں جو کہ شیخی اور غوری قبائل اور بالخصوص یوسفزیوں کے حالات پر مشتمل تھی فارسی آمیز افغانی زبان میں عارف بے بدل سالکِ شاہراہ علم وعمل اخوند درویزہ علیہ الرحمۃ کی کتاب تذکرہ کی مانند ۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورخ غالباً کہ خود بھی یوسف زیوں کی اُن لڑائیوں میں شریک تھا۔ جو سمہ سوات کے مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے بعد ہوئی تھیں ۔ اگرچہ اُس علاقے میں روشانیوں اور اخون درویزہ کے طرفداروں کے مابین جھگڑے ہوئے تھے یا اکبر کی مغلیہ فوج نے اُس علاقے پر حملے کئے تھے اور شکستیں کھائی تھیں یہ تمام واقعات اگرچہ نسبتاً اِس مورخ کے دور کے زیادہ قریب تھے لیکن پھر بھی اُس نے اپنی تاریخ میں اُس کا ذکر تک نہیں کیا ۔ اِس کتاب کا سارا مقصد جیسا کہ ظاہر کرتا ہے خان کجو کے وقت تک ان قبائل کے باہمی معاملات تک محدود تھا ۔ باوجود اس کے کہ پیر معظم شاہ نے اس کتاب کو شعری بیان کا نام دیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ نثر کے اقسام کے بارے میں کہا گیا ہے یہ نثر بھی اُس مروجہ انداز میں تھی جس میں مخزن اور خیرالبیان کا متن ہمارے سامنے ہے ۔ اِس مورخ کے کلام کا کچھ نمونہ جو تواریخ حافظ رحمت خانی میں موجود ہے یہ ہے :۔

" خدائے ترخدایہ شم پہ داھسے قدرتونہ — چہ آدم توا لا نہ وو تا ھالہ کشل قلمونہ

قدرتونہ دِ ښکارہ کړہ — تا پیدا کړہ اووہ زمکے آسمانونہ

دغہ زمکے قرار نہ کړو — تا پرے کیښنول درانہ لوئے غرونہ

ترد ے غرڈنو دیر درانۂ دی — معتبر د دین مرونه
لرغونی سری پو ښتی — چه د یوسفزو وو کوم ملکونه
ملک ے ئ نشکے مینه ے ئکار کے — غوریا خیل کالا تروسه پیغورونه

غوریاخیله پیغور مه کړه — ته ښنخ یئ سره ورو سره
ښنخ ستاله لاسه راغے — هالهٔ ته زور ورو ے په مرونه

" اللہ پاک کی ایسی قدرتوں کے قربان جاؤں کہ ابھی آدم وحوا پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ اے خدا تو نے قلم پیدا کئے۔ اور اپنی قدرتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے سات زمین اور سات آسمان تخلیق کئے۔ زمین کو چونکہ قرار حاصل نہ تھا تو اس پر بھاری بھرکم پہاڑ رکھدیئے۔ ان پہاڑوں سے بھی زیادہ معتبر اور مقتدر خداوند دین ہیں۔ عہد حاضر کے لوگ پوچھتے ہیں کہ یوسف زئیوں کے کون کونسے ممالک تھے۔ ان کا ملک نشکی اور گھرگاڈہ میں تھے۔ اور غوریاخیل ابھی تک طعنے دیتے رہے ہیں۔ غوریاخیل طعنے نہ دو۔ تم اور اہل ښنخ تو آپس میں بھائی بھائی ہو ښنخ تمھاری وجہ سے یہاں آئے کیونکہ لاؤ لشکر کے لحاظ سے تم اُس وقت زیادہ طاقتور تھے۔"

خواجو کے یہ آخری چار مصرعے تاریخ کے ایک بلے دور اور قبیلوں کی ہجرت کا ایک دلکش نقشہ پیش کرتے ہیں۔ پشتون تاریخ کے یہ مسودے طلباء اور محققین کی تحقیق و تدقیق کے لئے ایک بڑے ہی دلچسپ موضوع کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شاعر اور مورخ ہر دو لحاظ سے اس دور کی پشتو ادبیات میں خواجو مورخ کا مقام بہت بلند ہے۔

"اِس دور کے ادب میں خواتین کا حصّہ"

غالباً دنیا کی ہر زبان میں شعر کے سحر انگیز جذبات کا پہلا محرک بذات خود وجود زن ہے۔ عرب میں

اِس کے ساتھ محبت اور رازونیاز کی بات چیت سے غزل بنتی ہے۔ اور یہی غزل عجمی شاعری کی مقبول ترین صنف گردانی گئی ہے۔ شعر شدید احساسات اور ہیجانی جذبات سے جنم لیتا ہے۔ اِس پر یہی اُصول ماضی حال اور مستقبل کی ہر گھڑی میں صادق آتا ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عورتیں جو مردوں کے مقابلے میں زیادہ جذباتی اور حساس دل رکھتی ہیں انکی ذات میں نہ صرف یہ کہ ایک محبوبہ کی حیثیت سے محبت کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ یہ مائیں بیٹیاں اور بہنیں بھی ہوتی ہیں۔ ان تمام حیثیتوں سے اُن کے دل میں لازوال محبت کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ اسی کے باعث رسیلے گیتوں کے اس روپ ساگر نے جنم لیا ہے۔ ہماری پُرلطف لوک موسیقی کی ان گنت رنگینیاں اس سے وابستہ ہیں۔ باقی دنیا کی ادبیات میں عموماً اور پشتو ادبیات میں خصوصاً شعر کے ملی اوزان کے حصے میں پشتون خواتین کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

پشتو شعر کی بعض اصناف تو بالکل عورتوں کے اثر انگیز جذبات کا مظہر دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں :-

(الف) وہ تمام گیت جو وہ بحیثیت ماں اپنے بچے کو سلانے، کھلانے یا چپ کرانے کے لئے سناتی ہے۔

(ب) وہ ٹپے جو بحیثیت محبوبہ اُس کی محبت کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(ج) وہ نارے۔ غگونہ۔ بوبیے۔ نیمکئے وغیرہ جو وہ شادی بیاہ میں گاتی ہیں اور عام اصطلاح میں انہیں وہ سندرے کہتی ہیں۔

(د) وہ نوحے اور بین جو وہ اپنے کسی محبوب یا عزیز کے غم کے موقع پر فی البدیہہ اور برمحل سناتی ہیں۔

پشتو زبان کے شعری ادب کا یہ حصہ بہت زیادہ ہے۔ یہ پُرلطف بھی ہے اور فطری بھی۔ درحقیقت یہ ہمارے تخلیقی ادب کی ایک حقیقی شکل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سے پشتو زبان میں گویائی کا آغاز ہوا ہے اور ماؤں اور بہنوں نے اس میں اپنے بچوں اور بھائی بہنوں کی تربیت شروع کی یا یہ کہ اِس زبان میں پشتون نے سوچ اور فکر کرنے کی ابتدا کی تو اُس وقت سے پشتون خواتین نے بھی اِس زبان میں اپنے جذبات، احساسات اور محبت کے اظہار کی راہیں اشعار میں وضع کرنی شروع کیں۔

پشتو شعر کے یہ ابتدائی نمونے کس قسم کے تھے؛ اس بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن

ادبیات کے بیشتر محقق اس بات پر متفق ہیں کہ اُن قدیمی گیتوں کی پُرانی تہذیب اور شائستہ شکل موجودہ ٹپے ہیں جو کوہ و صحرا اور گھر گھر تمام پشتونخوا میں ہر موقع اور ہر سانحہ میں اُنکے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

پشتو ٹپہ میں خواتین کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ ایک تو ان میں تصنع اور ظاہرداری نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ آسانی کے ساتھ یاد کئے جا سکتے ہیں اور عموماً ان کے لکھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی ہر ٹپہ اپنا ایک خاص موضوع رکھتا ہے۔ اور اپنے وجود کو ایک حیثیت سے قائم اور زندہ رکھتا ہے۔ اس لئے نہ تو ترتیب و تسلسل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اور نہ اِس تسلسل کی عدم موجودگی کی بنا پر موضوع پر کچھ اثر ہوتا ہے۔

بالائی اور پائین پشتونخوا میں ماضی و حال کے سبھی ادوار میں بیشمار ٹپے بنے اور پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن کی زندگی اور دوام بھی ضرب الامثال کی طرح زبان کی صفائی خالص خیالات، اور افکار کی فطری ترجمانی پر مبنی ہے اور جس طرح پشتون خواتین اکثر پشتو ضرب الامثال کی بنانیوالی اور تحفظ کرنے والی ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ ان ٹپوں کو بھی جنم دینے اور پھر حفاظت کرنیوالی ہوتی ہیں۔

پشتونوں کے لوک ادب کی بیشتر اصناف براہ راست یا بالواسطہ پشتون خواتین کی مرہون منت ہیں۔ ان کی مقبولیت اور دوام ان ہی کی بدولت ہے۔ پشتون خاتون کے ارمان بھرے دل کے گیتوں میں زندگی کے اُس احساس کا دخل ہے جس سے نسلِ انسانی نے فروغ پایا ہے۔ اور ترقی کی ہے۔ یہ بحیثیت ماں بقائے نسلِ انسانی کی ضامن اور آرزومند ہے اور اُسی طلب اور آرزو سے وہ تمام گیت جنم لیتے ہیں جس کا وہ غم اور خوشی ہر دو مواقع پر اظہار کرتی ہے اور اپنے اُن ارمانوں اور آرزوؤں کو ظاہر کرتی ہے۔ جو نسلِ انسانی کو زندہ رکھنے کے لئے اُس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موجزن رہتے ہیں۔ اِس ارمان کی پہلی شکل اُس کی ماں بننے کی وہ خواہش ہے جس کا تقاضا اُسکی فطرت کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے ؎

ځوک مے دکاوز دکاوز پہ لیندہ ولی   خدائے ھسے زوے راکا چہ بابابا کوی
پہ شودوے ملبوی پہ غوړوے غوړوی   جماعت لوہ ئے بیائی ملایان ئے لولوی

دے پہ هر چا باندے گران وی
پہ قربان ئے بنسکلوی

"کوئی بارہ سنگھا کے شکار کرنے والی کمان سے مجھ پر تیر چلاتا ہے۔ خدا مجھے ایسا بیٹا دے جو بابا، بابا کہکر اپنے باپ کو پکارے۔ میں اُسے دودھوں نہلاؤں گی اور گھی سے مالش کراؤں گی۔ پھر اُسے مسجد بھجواؤں گی۔ اور وہاں اُسے مُلّا پڑھائیں گے۔ وہ ہر کسی کا لاڈلا ہو اور اُسے "قربان" کہکر چومتے رہیں۔"

انکی یہ فطری آرزوئیں ازل سے ابد تک جاری رہیں گی۔ ان آرزوؤں نے شعر و ادب میں کب سے جگہ پائی ہے؛ اِس کا جواب فقط یہ ہو سکتا ہے کہ انہی کی بدولت تو شعر و ادب کے سوتے پھوٹے ہیں۔ اور یہی ہر زبان کے ادبیات کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ اِسی سرچشمہ نے گلستانِ پشتو ادب کو بھی سیراب کیا ہے۔

باوجود اِس کے کہ وقت اور زمانے کی گردشوں نے پشتو ادب کے اُن خالقوں کے نام کب کے بھلا دیئے ہیں اور اُن خواتین کے ناموں نے اُن کے رسیلے گیتوں کے ساتھ دوام نہیں پایا جنہیں اُن کے صاف ستھرے احساسات اور افکار نے جنم دیا ہے۔ پھر بھی یہ تمام گیت ہماری اُن گمنام شاعرات کی ہستی پر دال ہیں۔ اور ان میں اکثر گیت اُن خواتین کے ہیں جن کی بدولت پشتو روایات، زبان اور لوک ادب زندہ ہے۔ پشتون خواتین کی شاعری اگر ایک طرف ماں کی حیثیت سے "اللہ ہُو" کی آواز بن جاتی ہے۔ تو دوسری طرف یہ "باولالا" کی پکار بن جاتی ہے جو شادی کے گھر میں وردِ زبان ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

(۱) ناوے بنئ ولے دِ تخت دے ۔ کُمے جان تہ خدائے زوے ورکرو
ناوے ستاد تندی بخت دے

(۲) ناوے سورے دِ ببر دے ۔ پہ رنگ نتو بنائستہ ئے
پہ عمل دِ خدائے خبر دے

(۳) ناوے مۂ ژاړہ مابنام دے ۔ زماجان پہ خدائے لوړے
پہ مابل وادۂ حرام دے

(۴) ناوے مۂ شہ دا سے خوارہ ۔ دلالی د زړۂ د پارہ
پہ مونږ سرو ستڼ کے دوارہ

(۵) ناوکئ سین و دریا ہے اے د پلار د کور سردار ے
د میرۂ د کور بادار ے

(۶) ناوے پہ اخلہ سودین ہ زما جان درتہ ولاړ دے
پہ څوانئ ئے ھوسین ہ

" اے دلہن تمہارا داہنا کاندھا گویا تخت ہے۔ اگر میری جان کو اللہ نے بٹھا دیا۔ تو اے دلہن یہ تمہاری پیشانی کی خوش بختی کی وجہ سے ہوگا۔

اے دلہن! تمہارا سایہ بڑا گھنا ہے۔ رنگ روپ کے لحاظ سے تو تم خوبصورت ہو لیکن تمہارے اعمال کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔

شام کا وقت ہے دلہن مت رونا۔ میری لاڈلی کو خدا نے خوبیوں سے نوازا ہے، اس لئے مجھ پر (اس کے لئے) دوسری شادی کرنا حرام ہے۔

اے دلہن تیری عزت و آبرو قائم رہے۔ اپنے لاڈلے کی خاطر تم ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو۔

اے دلہن تمہاری مثال دریا اور سمندر کی سی ہے۔ اپنے والد کے گھر کی تو سردار تھی اور اپنے شوہر کے گھر کی مالکن ہے۔

دلہن رکاب میں پاؤں رکھ کر سوار ہو جاؤ۔ میرا پیارا تمہارے انتظار میں کھڑا ہے جاؤ اس کی جوانی پر اتراتی رہو۔"

یہ گیت کبھی خوشی اور ارمانوں کے ترجمان ہوتے ہیں اور کبھی غموں اور رونے دھونے کے زمین۔ اس سے ماتم کرنے اور نوحوں کے وہ بیشمار دلگداز اور رقت انگیز غاڑے اور نوحے بنے ہیں جن میں پشتو ادب کی سبھی رنگینیاں بھی ہیں اور عوامی اور معاشرتی اقدار و روایات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ غم انگیز جذبات کی صحیح اور فطری ترجمانی بھی موجود ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ۔

څو لګئ د مرګ پہ سوک ماتیږی زۂ پتہ څُلہ د مرګ د غمہ کرځومہ
زما پہ خپلہ زړګے نہ ورځ دے څکہ د بل پہ غم کښے اوښکے تویومہ

د دنیا کڅې بازار دې وران شي　　چه ناآشنا خلق راځي آشنا تره ځینه
پرون دنیا وه نن قیامت دے　　چه زهٔ ولاړه لالے غواړي رخصتونه
که په ژړا لالے راګرځي　　او چه ګیاه به زر غونه په اوښکو کړمه

" بھولا سایہ منہ موت کے مُکّے سے آخر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے میں اسی ڈر سے اپنے منہ کو چھپا کر پھرتی ہوں۔
میرا اپنا دل خود زخمی ہے اسی لئے تو میں دوسرے کے غم میں آنسو بہایا کرتی ہوں۔
کاش کہ اس دنیا کا یہ بازار اُجڑ جائے کیونکہ یہاں نا آشنا لوگ آتے ہیں اور جانے پہچانے لوگ چلے جاتے ہیں۔
کل یہ دنیا آباد تھی، مگر آج روزِ قیامت ہے۔ کیونکہ میں کھڑی ہوں اور میرا محبوب (ہمیشہ کے لئے) رخصت ہوا چاہتا ہے۔
اگر رونے سے محبوب لوٹ کر آسکتا ہے تو میں اس قدر روؤں کہ سوکھی گھاس میرے آنسوؤں سے ہری بھری ہو جائے۔"

پشتو　ملی ادب کی ان ہر دو قسم کی شاعری میں پشتون خواتین کا حصہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مگر افسوس کہ انکی شاعری کے اس قدر بڑے ذخیرے کی کسی شاعرہ کا نام معلوم نہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پشتو شاعری کا وہ حصہ جو پشتون خواتین کا تخلیقی کارنامہ ہے، ان سب کی مشترکہ میراث ہے۔ جو وقت کے پھیر اور زمانے کی گردشوں سے محفوظ ہے اور پشتو　ملی ادب اِسکے لطف اور خوبیوں پر جتنا بھی فخر اور ناز کرے کم ہوگا۔

" میرمن زرغونہ "

مؤرخینِ ادبیات نے "پٹہ خزانہ" کے حوالے سے پشتو کی جس پہلی خاتون شاعرہ کا ذکر کیا ہے وہ نویں صدی ہجری کی زرغونہ کاکڑہ ہے۔ یہ مُلا دین محمد کاکڑ کی بیٹی اور سعد اللہ نورزئی کی بیوی تھی۔ اس نے مروجہ علوم اپنے والد سے گھر پر ہی حاصل کئے تھے۔ اور اپنے ہمعصر شعراء میں اسے شہرت حاصل تھی کہتے ہیں کہ اس نے شیخ سعدی شیرازی کی کتاب بوستان کا پشتو شعر میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ فنِ خوش نویسی سے بھی واقف تھی۔ اور اپنی کتابیں خود

لکھا کرتی تھی جو فنی لحاظ سے خطاطی کے نادر نمونے خیال کئے جاتے تھے۔ زرغونہ کے کلام کا کچھ نمونہ محمد ہوتک کی کتاب "پٹہ خزانہ" میں محفوظ ہے اور وہ "بوستانِ سعدی" کی ایک حکایت کا ترجمہ ہے۔ ؎

؎ اوریدلے مے قیصه ده   چه له شاتو نه خوږه ده
د اختر په ورځ سحار   بایزید چه وو روېدار
له حمامه راووتلے   په کوڅه کښې تېریدلے
ایرې خاورې چا له بامه   راچپه کړلے ناپامه
مخ او سر یې سو ککړ   په ایرو په خاورو خړ
بایزید په شکر کښېو سو   د خپل مخ په پاکیدو سو
چه زه ورېم د بل اور   چه په اور کښې سم نسکور
له ایرو به څه بد اوړمه   یا به لږ شکوه کومه
هو پوهانو ځان ایرې کړ   له لویۍ یې ځان پرې کړ
څوک چه ځان ته ګوري تل   خدای ته نه سي کړای یې کتل
لویي تش په ګفتار نه ده   لو خبره پکار نه ده

تواضع به دِ سر لوړ کا
تکبر به دِ تل ځوړ کا

"میں نے ایک قصہ سنا ہے، جو شہد سے بھی زیادہ میٹھا ہے۔ عید کے دن صبح سویرے حضرت بایزیدؒ حمام سے نکلے اور گلی میں سے گزر رہے تھے کسی نے چھت پر سے راکھ اور مٹی کا ایک بڑا تھال اُس کے اوپر بے خیالی میں پھینک دیا۔ اُس کا چہرہ اور سر مٹی سے لتھڑ گئے اور راکھ اور مٹی سے وہ خاک آلود ہو گئے۔ حضرت بایزیدؒ نے خدا کا شکر ادا کیا اور چہرہ صاف کرنا شروع کیا اور کہا کہ میں تو جلتی ہوئی آگ کے قابل ہوں اور چاہیئے کہ مجھے آگ میں جھونک دیا جائے۔ بھلا میں راکھ کی کیا بُرائی کروں گا۔ یا معمولی سا بھی شکوہ کروں گا۔ سچ ہے کہ اللہ والے ہمیشہ بڑائی جتانے سے اجتناب کرتے ہیں وہ جو مدام اپنے آپ کو دیکھتے

ہیں وہ اللہ کو ہرگز دیکھ نہیں سکتے بڑائی صرف باتوں پر موقوف نہیں بڑا بول نہیں بولنا چاہیئے۔ تواضع ہی سے تجھے سرفرازی حاصل ہوگی اور تکبر تجھے ہمیشہ خوار اور ذلیل کرے گا۔"

"میرمن رابعہ"

اِس کے بعد ۹۲۰ھ کے لگ بھگ ایک دوسری شاعرہ جس کا نام رابعہ ہے، کا تذکرہ آیا ہے۔ رابعہ اُس زمانے میں قندہار میں مقیم تھی بابر بادشاہ کی ہمعصر خیال کی جاتی ہے۔ بقول محمد ہوتک رابعہ نے بہت سے شعار وضع کئے تھے۔ مگر مرور زمانہ کیوجہ سے ناپید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "پٹہ خزانہ" میں اُس کی ایک رباعی نقل کی ہے۔

آدم ئے مزکے دتہ راستون کا   پہ اور د غم ئے سوے لرمون کا
دوزخ ئے دوغ کا پہ مخ دمزکے   نوم د ھجے د لتہ بیلتون کا

" آدمؑ کو زمین میں بھیج کر اُسے آتش غم سے سوختہ جگر بنا دیا اور روئے زمین پر دوزخ بنا کر اُس کا نام ہجر رکھدیا۔"

اِسی ایک رباعی کے معیار سے پڑھنے والا آسانی کے ساتھ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ میرمن رابعہ کے اشعار کس پائے اور کس درجے کے ہوتے ہونگے

"میرمن نیک بختہ"

نیک بختہ جو پند و موعظت کی شاعری کیا کرتی تھی۔ ۹۶۰ھ کے لگ بھگ ہشتنگر کے علاقے میں قیام پذیر تھی۔ اور ایک علمی اور روحانی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد کا نام شیخ اللہ داد تھا۔ جیسی نے شیخ امام الدین کی کتاب "اولیائے افغان" کے حوالے سے لکھا ہے، کہ نیک بختہ بھی عارفہ اور زاہدہ خاتون تھی۔ اُس نے

دینی علوم حاصل کئے تھے۔ اور عبادت و ریاضت کی زندگی بسر کیا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ شیخ متی غوریا خیل کے خاندان کے ایک عارف شیخ قدم بابا کے نکاح میں دی گئی تھی۔ یہ میاں قاسم افغان کی ماں تھی۔ نیک بختہ نے ایک کتاب "ارشاد الفقراء" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب کا موضوع اخلاقیات اور نصائح پر مبنی تھا۔ ان کی شاعری کا یہ نمونہ محمد ہوتک کے "پٹہ خزانہ" میں موجود ہے۔

"د خدای حق ته غاړه کېږده — نور ہے نور ہے ویںا پرېږده
دنیا پاتے له هرچا ده — په اخلاص کښے ځنے لیږده
ځان له بده خویه ژغوره — زړهٔ په ذکر د یار بلیږده
ګل دنیا به دِ دېښمنهٔ شی — اوس له ویرے ځنے ریږده
تول غواړی حساب له — کهٔ دِ اوښے دی کهٔ میږده
دُنیا ترک وهه کهٔ پوهٔ یے
د بقا په لوری پښے بږده"

"حقوق الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو اور دوسری باتیں چھوڑ دو۔ دنیا ہر کسی سے رہ جانے والی شے ہے۔ اس لئے اخلاص کی سمت قدم بڑھاؤ۔ بُری عادتوں سے خود کو بچاؤ اور اپنے دل میں یادِ الٰہی کو سمیٹ لو۔ ساری دنیا دشمنی پر اتر آئیگی تو پھر مارے ڈر کے کانپا کرو۔ تمھاری اونٹنیاں اور تمھاری بھیڑ بکری سبھی تم سے اپنا حق اور حساب مانگیں گی۔ اگر تم سمجھ دار ہو تو دنیا کو ترک کر دو اور سوئے بقا قدم بڑھاؤ۔"

پشتو شعر و ادب میں خواتین کا حصہ تاریخ ادبیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ انہوں نے اس زبان کو زندہ رکھنے کے لئے اور اسکی ادبیات کے ارتقاء میں بڑی مدد کی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ زبان کو ماں کی نسبت اس لئے دی جاتی ہے کہ یہ ماؤں سے سیکھی جاتی ہے اور مائیں ہی اسکی اولین امین ہوتی ہیں۔ زبان کا روزمرہ، محاورہ، ضرب الامثال، قصے، اصوات، چیستان، چٹکلے، نارے، غگونہ، نقلیں اور لوک گیت سب خواتین کی برکت سے زبان کے پیکر میں زندہ رہتے ہیں جسطرح مائیں اپنی اولاد کی نگہداشت اور پرورش کرتی رہتی ہیں، اسی طرح وہ اپنی زبان کو زندہ رکھنے اور اپنی آنیوالی نسلوں کو منتقل کرنے کا حق ادا کرتی ہیں۔

میرویس خان بابا کے گھرانے میں بھی ایک شاعرہ گزری ہے جس کا نام "خاتون نازو تھا۔ یہ رباعی اُس نے کہی ہے ؎

"سحر صبا وو د نرگس لمہ لامدۂ
څاڅکے څاڅکے ترے نہ لاندے څڅیدۂ
ما ویل څۂ دی ښکلی گلہ ولے ژاړے
دۂ وے ژوندمے دے یوہ خُلہ موسیدۂ"

"صبح سویرے نرگس کی آنکھ تر تھی۔ اور قطرہ قطرہ اُس سے نیچے ٹپک رہا تھا۔
میں نے کہا! اے خوبصورت پھول کیوں روتے ہو! اُس نے کہا (اس لئے) کہ میری زندگی فقط ایک مسکراہٹ تک ہی محدود ہے۔"

حصّہ دوم

پشواد بِ عالیہ

حصّہ دوم

پشتو ادبِ عالیہ

متقدمین پر خوشحال خان کی تنقید

خوشحال خان خٹک پشتو لوک ادب کے ذخیرے سے شاکی نہیں تھے، بلکہ اُن کا تمام تر شکوہ اپنے پیش رؤوں کی تخلیق کردہ کتابی ادب سے تھا اور یہ وہ لوگ تھے جو فارسی زبان کے منفی ادب سے متأثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خان علیین مکان نے اپنے کلام میں جا بجا متأسفانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار بھی کیا ہے اور اُن پر اپنی برتری اور سخنوری جتائی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

ے

پہ پښتو ژبہ چہ ما علم بلند کړو	د خبرو ملک مے فتح پہ سمند کړو
مدعی د تورے شپے اور وُورکے وو	د سهیل غوندے مے ځان باندے څرګند کړو
د مرزا دیوان مے او منډو پہ کوڅی	مسخرہ مے ارزانی خویشکی زمند کړو
کہ دولت وو کہ واصل وو کہ دانورا وو	پہ خبرو مے د هر یوه ریشخند کړو
پہ فارسۍ ژبہ مے هم ژبہ گویا دہ	پہ پښتو ژبہ مے خلق بهرہ مند کړو

"جب میں نے پشتو زبان میں اپنا علَم بلند کیا۔ تو گویائی کے ملک کو میں نے اپنے سمندِ (سخنوری) سے مسخر کیا۔ مدعی اندھیری رات میں کرمکِ شبتاب کی مانند تھا میں نے سہیل ستارہ بن کر اس پر اُس کی حقیقت واضح کر دی۔ مرزا کے دیوان کو میں نے طاقِ نسیان میں ڈلوا دیا۔ دولت، واصل، ارزانی، خویشکی اور زمند وغیرہ کا میں نے مذاق اڑایا۔ فارسی میں بھی میری زبان طاقت گویائی سے عاری نہیں ہے۔ لیکن پشتو شاعری سے میں نے اپنے لوگوں کو بہرہ ور کیا۔

خان کے مذکورہ قصیدے میں بالعموم اور مندرجہ اشعار میں بالخصوص ایسے نکات موجود ہیں۔ جو ایک زمانے میں انحطاط پذیر پشتو تقلیدی ادب کی تصدیق کرتے ہیں۔ خوشحال بابا نے واضح الفاظ میں اس دورِ انحطاط کو تاریک رات سے تشبیہ دی ہے۔ انہوں نے اگر ایک طرف شعرائے عصر کو کرمکِ شب تاب کہکر حقیر جانا تو دوسری طرف اپنے آپ کو سہیل ستارہ کہا۔ مگر اس کے باوجود اُن نامور اور مشہور و معروف پشتون شعراء کو فرداً فرداً یاد بھی کیا ہے۔ جو خان موصوف سے قبل ساری "پشتونخوا" میں اپنی شاعرانہ عظمت کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہ سبھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ اور لوگ اُنکے دواوین کو تبرکاً اپنے پاس رکھا کرتے تھے اسکے ساتھ ساتھ خان علیین مکان خوشحال بابا نے زمانے کی اُس روش کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن حالات کا بھی رونا رویا ہے جن کی وجہ سے پشتون اپنی زبان کے تقدس اور اہمیت سے بیگانہ ہوکر فارسی زبان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ تعلیم و تعلم کے میدان میں فارسی ان کے لئے ذریعۂ نجات بنی ہوئی تھی۔ اور اسے سیکھنا اور سکھانا وسیلۂ معاش بھی خیال کرتے رہے۔

اس سلسلے میں خوشحال خان بذاتِ خود دوسرے پشتونوں سے الگ نہیں تھے۔ خود بھی وہ اس بات کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

ے په فارسي ژبه ے هم ژبه گويا ده
په پښتو ژبه ے خلق بهره مند کړو

" فارسی زبان میں بھی مجھے قوت گویائی کا ملکہ حاصل ہے۔ لیکن پشتو شاعری سے میں نے اپنے لوگوں کو بہرہ ور کیا۔"

خوشحال بابا فارسی میں بھی شعر کہتے تھے جن میں شعری محاسن کی کچھ کمی نہیں تھی۔ اُنکے دور کے علم و فن، شعر و ادب اور شاہی درباروں کی زبان فارسی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی قدرتاً اسی زبان میں ہوئی تھی۔ مگر اسکے باوجود بھی خان موصوف نے اس روایت سے بغاوت کی اور اپنی مادری زبان پشتو سے پشتونوں کو بہرہ مند کیا۔

صاحب بصیرت خوشحال خان

اگر خان علیین مکان کی طبعی خاصیت اور فطری میلان انہیں اس ڈگر پر گامزن نہ کرتا تو پھر شائد وہ بھی بایزید انصاری اخون درویزہ حتیٰ کہ سید جمال الدین افغانی کی طرح اپنے فکری میدان کے لئے فارسی یا اسی قسم کی کوئی اور زبان منتخب کر لیتے جو علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ مذہبی تقدس کی بھی حامل ہوتی۔ اور جسے دربار شاہی کی تائید اور سرپرستی بھی میسر ہوتی۔

اپنے پیغام کی عالمگیر اساس کی خاطر بعض مفکرین مثلاً سید جمال الدین افغانی یا علامہ اقبال وغیرہ اس بات پر مجبور نظر آتے ہیں کہ اپنے افکار کے اظہار کے لیئے کسی عالمگیر زبان کو منتخب کریں۔ لیکن خان علیین مکان بنیادی طور پر ایک پشتون قہرمان اور قومیت پرست انسان تھے۔ اُنکی فکر و نظر پشتونوں کی سرفرازی اور سربلندی کی خواہاں اور طلب گار تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اسلام کے شیدائی تھے۔ لیکن وہ اس بات کو بھی بخوبی جانتے تھے کہ بے علمی کی مثال گھٹا ٹوپ اندھیرے کی سی ہے۔ اور جب تک کسی قوم کے اذہان علم کی روشنی سے منور نہ ہوں تو چاہے وہ اسلام کی شیدائی ہی کیوں نہ ہو اُسکی مثال اُس مچھلی جیسی ہے جو پانی میں رہنے کے باوجود پانی کو دیکھ نہیں سکتی۔ اس لئے اُنکے پیش نظر ایک ہی راستہ تھا اور وہ اپنے عوام کو اپنی مادری زبان میں دین و دنیا کے علوم سے بہرہ ور کرنا تھا۔ اگر اُن کا مقصد صرف اپنے ذہن رسا کی علمی عظمت، اور اپنے نادر افکار کی نمائش ہوتا تو وہ اپنی ساری توجہ اُس وقت کی درباری زبان پر مرکوز کر دیتے اور اپنے لئے مغلیہ درباری شعراء کی ارفع منصب داری میں کوئی اعلیٰ مقام پیدا کر لیتے۔ اور علم و حکمت کے ساتھ حکومت میں بھی شریک ہو جاتے یقیناً خان درباری آداب سخنوری میں اپنے نابغہ کمالات کی برکت سے بام عروج تک پہنچ جاتے۔ لیکن پشتو زبان اور "پشتونوالی" کی خاطر وہ اس راستے پر گامزن نہ ہو سکے۔ اُن کا فطری میلان اور توجہ پشتو کی طرف تھی اور پشتو ہی میں اپنے وارداتِ قلبی کے اظہار کو وہ زیادہ موزوں اور مناسب سمجھتے تھے۔

خان کے شعری موضوعات، حمد و مناقب، مناجات و تصوف بھی تھے۔ ساتھ ہی ساتھ قومی و ملی شاعری، اخلاقیات و عشقیات کے علاوہ علمی اور روحانی زندگی کے سبھی اقدار کا احاطہ کئے

ہوئے تھے۔ وہ اگر ایک طرف افکار عالی اور زوردار زبان کے مالک تھے تو دوسری طرف اُنکے کلام میں وہ سبھی شعری محاسن موجود تھے جن کیوجہ سے فارسی زبان میں فارسی گو شعراء داد سخنوری حاصل کیا کرتے تھے۔ ہر قسم کی تشبیہات استعارے، تجنیسات، ایہام اور دیگر صنائع و بدائع خوشحال خان کے خصائص کلام میں شمار ہوتے ہیں۔ غزل، رباعی، قصیدہ۔ قطعہ نظم ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مسدس، معشر، مثنوی، غرضیکہ عروضی شاعری کی کوئی ایسی صنف نہ تھی جس میں خان نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

صاحب سیف و قلم خوشحال خان خٹک کا کلام ہزارہا اشعار پر مشتمل ہے، مشہور محقق، مورخ اور مؤلف کامل مومند کے کہنے کے مطابق "خوشحال خان خٹک اپنے افکار و نظریات کی رو سے ہر دور کے سب سے بڑے پشتون مفکر اور صاحب بصیرت انسان گزرے ہیں"۔ اس بات کی تصدیق کے لئے خان کی نظم و نثر کی سبھی کتابیں موجود ہیں اور تفصیلِ مزید کے لئے کتابوں کے انبار لگائے جاسکتے ہیں۔

مگر پشتو ادب کے اس انقلابی دور سے قبل جس کی ابتداء خوشحال بابا سے ہوتی ہے حقیقتاً پشتو زبان کان میں پڑے ہوئے اس لوہے کی مانند تھی۔ جس سے خام کار کاریگر کدال درانتی کلہاڑی، چھری وغیرہ عام قسم کی ضروریات پوری کرتے۔ ورنہ یہ حاجی گگ کے لوہے کے نہ ختم ہونے والے ذخائر کی مانند اپنی جگہ یونہی بے مصرف پڑی رہی۔

پشتو ادب کی سرزمین قوتِ نمو سے عاری نہ تھی۔ اور نہ یہ کہ اس گلستان کے پودوں میں پھول آنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ اس صلاحیت کا اظہار تو بقول پروفیسر جیبتی سینکڑوں سال قبل امیر کروڑ، تکارونے، ملک یار غرشین اور اُنکے ہمعصر شعراء کے کلام و بیان میں ہوچکا تھا۔ مگر اس کے رکھوالوں اور مالیوں کی بے توجہی کیوجہ سے اس باغ کی نشوونما رک گئی تھی۔ اور اسے غیر آباد اور بنجر ہونا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے عروس پشتو اپنے قدر دانوں سے پردہ نشین ہوچکی تھی، اور یا اس نے اپنے چہرے پر ایسا پلو ڈال لیا تھا کہ اس زبان کے شہسوار شعر و ادب خوشحال خان کو یہ کہنے پر مجبور کردیا تھا کہ:-

چائے پلو لہ مخہ وا نخست
پښتو لا هغسے مکرہ پر تہ دہ

"کسی نے اِس کا گھونگھٹ نہیں اٹھایا۔ پشتو زبان ابھی تک کنواری ہے"
اور پھر خود اُس نے نوشہ کا کردار ادا کیا۔
خان بابا پشتو کی عظمت اور سربلندی کے ہراول دستے کے پیش رو تھے۔ اور جب انہوں نے اِس دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا تو انتہائی فخر سے سبھی پشتونوں کو یہ کہتے ہوئے خبردار کیا کہ

ما خوشحال چہ پہ پښتو شعر بیان کړو ؎
د پښتو شعر بہ اوس پہ آب وتاب شی

"میں (یعنی خوشحال خان) نے جب پشتو میں اشعار بیان کئے تو اب پشتو شاعری میں آب وتاب پیدا ہو جائیگی۔"

اِس لئے نئے دور کے پشتون ادباد صاحبان فہم وذکاد شعراد اور اہل قلم محققین ومستشرقین یک زبان ہوکر خوشحال بابا کو نئے دور کی ادبیات پشتو کا باوا آدم خیال کرتے ہیں اور "بالائی پشتونخوا" کے بعض سیاسی مدبرین مثلاً محمد عثمان انوری یوں رقمطراز ہیں "پشتو کے باوا آدم کا یہ صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ یہ ایک روشن حقیقت ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک طرف خوشحال خان کو ایک ماہر حقیقت شناس کہا جاتا ہے تو دوسری طرف وہ میدان عمل کے ایک قومی مجاہد بھی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ملی مفکر اور صاحب جمعیت حاکم پشتو بولتے۔ پشتو لکھتے، اور خود سچے پشتونوں کی طرح غیرت وحمیت کے کام سرانجام دیتے۔ اِس لئے انہیں اپنی کوشش اور سعی وکاوش پر یہ اعتماد تھا کہ انکی وساطت سے پشتونولی اور پشتو زبان و ادب کو فروآب وتاب نصیب ہوگی۔ پشتونوں کی سرزمین پر نور اسلام کے پھیلنے سے لے کر خوشحال بابا کے زمانے تک کے تمام عرصے میں صرف خوشحال خان ہی کو پشتو اور "پشتونولی" کی نشأۃ ثانیہ کا بانی گردانا گیا ہے اور درحقیقت جدید پشتو ادب کی ابتدا انہی سے ہوتی ہے"۔[۱]
خوشحال خان کو ایک پشتون ملی بزرگ، مفکر اور صاحب سیف وقلم کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔

---

[۱] ننگیالے پختون مطبوعہ کابل صفحہ ۶

اسی لئے انہیں پشتو شعر و ادب کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے۔ درحقیقت اگر دیکھا جائے تو سرزمین افاغنہ نے اگر کسی نابغۂ عصر کو جنم دیا ہے۔ تو وہ خوشحال خان خٹک ہی کی ذات ہے۔

خان کے بعض ناقدین انکے کلام و افکار کو مجموعۂ اضداد سے تعبیر کرتے ہیں لیکن جس طرح کوئی بھی انقلابی تحریک یا نظریہ ایسا نہیں جو ارتقائی منازل سے نہ گزرا ہو اسی طرح کوئی بھی بڑا مفکر یا نابغۂ عصر ابھی تک ایسا نہیں گزرا جس کی زندگی اور افکار تضاد سے یکسر عاری ہوں پھر بھی یہ صاحبان فکر و نظر صحیفۂ ادوار کے چہرے پر ایسا نقش چھوڑ کر جاتے ہیں جو لازوال ہوتا ہے۔ پشتو میں خوشحال خان کا یہی مقام ہے۔ وہ ایک ایسے نابغۂ عصر ہیں جن کا سارا کلام اعلیٰ بصیرت کی غمازی کرتا ہے۔

انیسویں صدی کے مستشرقین اور بیسویں صدی کے محققین کے خیال میں تو وہ اپنے افکار و خیالات کی روشنی میں یقیناً روئے زمین کی اُن چند گنی چنی چیدہ ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جو بیشک ابدی نابغہ کے مقام تک جا پہنچے ہیں۔ خوشحال خان خود فرماتے ہیں۔

دا رنگینے معنے چرے دی خوشحاله
چه رادرومی لکه ګل په بیاض ستا

"اے خوشحال! یہ رنگین معانی کہاں سے پھول بن کر تیری بیاض پر وارد ہوتے ہیں" خان علیین مکان نے شعر و شاعری پر اپنا بصیرت افروز تبصرہ جس قصیدے میں کیا ہے وہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

زهٔ د شعر په کار هیڅ نهٔ یم خوشحال
وے خدائے ہے کړو په غاړه دا مقال

"میں کاروبار شاعری سے ہرگز خوش نہیں ہوں لیکن اللہ پاک نے یہ طوق میرے گلے میں ڈال دیا ہے"۔ یہ تبصرہ ہر لحاظ سے دلچسپ اور مکمل ہے۔ انہوں نے اس قصیدے میں شعر کو "مردانہ حیض" کہا ہے۔ شاعری کے سبب شرمندگی اور انفعال کے مکافات پر اُن کی نظر تھی نیز بیجا

اور نامناسب تنقید کے خطرات سے بھی وہ آگاہ تھے ۔ یہ اُنہیں بخوبی معلوم تھا کہ بلحاظ شاعری چاہے وہ بہت بڑا (ایک من) اور دوسرا چھوٹا (ذرہ برابر) ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی شعر پڑھتے وقت موخرالذکر اول الذکر کے کلام میں میخ نکالتے اور اُس پر انگلیاں اٹھانے سے نہیں ہچکچائے گا مگر اس قصیدے میں شعر و شاعری پر مدلل بحث کے بعد ان کا یہ بیان کس قدر حقیقت افروز ہے ۔

پہ چہ د شعر و شاعرئ مذکور وشہ	ځځه نو غوږ باسه زما په حسب حال
قصیدے لوم غزا له ھرہ بابہ	پہ حکمت پہ نصیحت کښے مالا مال
پہ تعریف د دلبرانو غزلونہ	پہ صفت د ستر گو وروزو زلفو خال
رباعی دہ کہ قطعہ کہ مثنوی دہ	ھسکی وارہ گوھر دی دُر د لال
پہ فارسی ژبہ کہ نور ترما بھتر دی	پہ پښتو ژبہ مے مہ غوارہ مثال

طبیعت مے عطائی نہ د تحصیل دے
کہ خبر یم د املا پہ استعمال

"جب شاعری کا تذکرہ ہو چکا، تو اب ذرا میری عرض حال بھی ملاحظہ ہو۔ ہر باب اور انداز کا قصیدہ لکھنا گویا میری غذا ہے ۔ جو حکمت و نصیحت سے مالا مال ہوتا ہے حسینوں کی تعریف میں غزلیں لکھتا ہوں جن میں آنکھوں، ابروں، زلفوں اور خال (تل) کی ستائش کرتا رہتا ہوں۔ چاہے میری رباعی ہو، قطعہ یا مثنوی ہو سبھی گویا موتی اور لعل و جوہر کے مترادف ہیں ۔ فارسی زبان میں دوسرے اگر مجھ سے بہتر ہوں ۔ لیکن پشتو (شاعری) میں میری ہمسری کرنے والے کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کر۔ اگرچہ میرا تحریر کا فن اکتسابی ہے ۔ مگر شعر و شاعری کے لئے میری طبیعت کا میلان عطائے خداوندی ہے"۔

یہ وہی خوشحال ہے جو "بابائے پشتو" ہے اور جس نے نظم و نثر کے ہر دو میدانوں میں اس زبان پر پشتو کے دوسرے ہر ادیب اور شاعر سے بڑھ کر احسان کیا ہے ۔

خوشحال خان کی سیاسی اور معاشرتی شخصیت کے ہر پہلو پر اُنکی سوانح کی کتابوں میں تفصیلی اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں ۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے مؤرخین نے "پشتونخوا" کی تاریخ میں اس

نابغہ عصر کا مقام متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور محقق کامل مومند کی طرح اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِس حیثیت سے بھی خان ہر دور کی پشتون شخصیات میں سب سے بڑے تھے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے سب سے پہلے پشتون قبائل کو "پشتون قومیت" کا شعور دیا۔ ادب تاریخ اور سیاست کے طالب علم اُنکے بحرِ افکار میں جتنی بھی غواصی کریں گے۔ نئے نئے موتی برآمد کرینگے اِس لئے کہ یہ وہ دائمی فیض ہے جو وقت اور زمانے کی بندشوں سے آزاد ہے۔ خوشحال خان کے فرزند صدر خان خٹک اُن کی ہمہ گیر شاعری کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

"پښتو شعر ناموزون وو
له شعری صفت بېرون وو

که حروف د قوافي وو
ویاند وروستو تر روی دی

د هر یک مقام معلوم دے
درست په شعر کښې منظوم دے

ښتانه پرے آګاه نه وو
ړونده په دا لار نه وو

یا څه نور شعری مضمون دے
یائے خیال باریک مضمون دے

له همه وُ بے خبر وو
د جهالو په لار سر وو

ده درست شعر په قانون کړ
آراسته ئے په مضمون کړ

په دقیق شعر دقاق وو
ور معلوم همه اغراق وو

که غلو په دوه اقسام دے
یا په دوه رنګه ایهام دے

تناسب دے که لزوم دے
که تشبیه په خپل خپل نوم دے

که تمثیل دے که ترصیع دے
یا چه نور صفت بدیع دے

په همه واړه قائل وو
په همه اشعار کامل وو

ښائسته ئے درست اشعار کړو
په مضمون ئے استوار کړو

ړونده شعرے لار کړه
چارے تبوره دا شعار کړه"

پشتو شعر ناموزوں اور شعری صفات سے عاری تھا۔ حروف و قوافی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح بدمزہ تھے۔ اگرچہ ہر ایک کا مقام معلوم ہے مگر شعر میں درست کلام منظوم سے پشتون آگاہ نہیں تھے۔ اور نہ اس راہ کے وہ راہی تھے۔ شعر و شاعری کے اصول و قواعد تھے یا خیالات و افکار کی باریکیاں سبھی سے یہ لوگ ناآشنا تھے۔ اور گنواروں کی راہ پر گامزن تھے۔ انہوں نے (خوشحال خان) اشعار کو قواعد و ضوابط کے سانچے میں ڈھالا اور حسن مضمون سے انکو آراستہ کیا۔ وہ دقیق شعر گوئی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اور تمام اغراق سے بخوبی واقف تھے کہ وہ غلو اور ایہام ہر دو اقسام سے واقف تھے۔ تناسب لزوم اور تشبیہہ کے اپنے اپنے مقررہ ناموں۔ تمثیل ترصیع، صنعت بدیع سبھی کے ماہر تھے۔ اور ہر قسم کی شعر گوئی میں کامل۔ اسی لئے تو خوبصورت اور درست اشعار کو مضمون سے استوار کیا۔ انہوں نے رواں اور سلیس اشعار تحریر کئے۔"

خوشحال خان محبت کا ترجمان آزادی کا شیدائی، پشتونیت کا مظہر، اخلاقیات کا شارح، سیاست کا رازداں اور اقلیم ادبیات کا سلطان تھا۔ وہ پشتو کی دنیائے ادب کی وہ بے مثال شخصیت ہیں جن پر انکی اپنی مندرجہ پیشن گوئی حرف بحرف صادق آتی ہے۔

نۀ به زما غوندے بل ننګیالے راشي　　نۀ به زما غوندے بل توریالے شي

خټک لا پریږده په درست افغان کښے　　عجب که شي فرهنګیالے راشي

"نہ تو میری طرح کوئی دوسرا صاحب ننگ و حمیت آئے گا اور نہ ہی میری طرح کوئی اور شمشیر زن پیدا ہو گا۔ خٹک قبیلہ تو درکنار پوری افغان قوم میں بھی بمشکل مجھ جیسے صاحب فرہنگ کا پھر کبھی ظہور ہو سکے گا۔"

خوشحال خان خٹک پشتو ادبیات میں اپنا مخصوص مکتب فکر، طرز نگارش اور ایک منفرد دور متعین کرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک دور ہیں۔ ایک ایسا دور جس نے پشتو زبان کو آب و تاب سے نوازا۔ انہی سے اِس زبان میں اُس معیاری شاعری کا آغاز ہوتا ہے جسے اُس وقت مرکزی ایشیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا لیکن انکے بعد شعرائے متاخرین چاہے وہ اُنکے اپنے

گھرانے کے تھے یا باہر کے ان میں سے کوئی بھی اس معیار اور اُس مقام تک اپنے آپ کو نہ پہنچا سکا جس معیار اور جس مقام پر خان کھڑے تھے ۔ حق تو یہ ہے کہ افکار و خیالات کی ہمہ گیری کے علاوہ خان کے کلام میں زبان پر عبور، جدت آفرینی اور اصنافِ شاعری کے الگ الگ میدانوں میں اُنکی رواں طبیعت کی موزونیت کے معیار تک آج تک کوئی بھی دوسرا پشتون شاعر نہیں پہنچ سکا ہے ۔

مختصر یہ کہ پشتو زبان علوم و ادبیات کے سلسلے میں اب تک ایک ایسے محسن و مربی کی منتظر تھی جس کے دل میں دوسری زبانوں کے ساتھ ہمسری کا جذبہ، اور علوم و فنون کو اپنی زبان میں فروغ دینے کا ولولہ اور احساس رواں دواں ہو۔ ایسی شخصیت نہ تو پشتو زبان کو پشتون بادشاہوں اور امیروں کی ذات اور انکے شاہی درباروں میں ہاتھ آئی اور نہ ہی پشتونوں کی سرزمین کے عوام میں اُس وقت تک مل سکی ۔ جب تک کہ یہ عظیم مفکر اِس اعلان کے ساتھ میدان میں نہ آیا کہ ؎

په پښتو شعر چه ما علم بلند کړو — د خبرو ملک مې فتح په سمند کړو
یو په حال او په ماضي کښې داسې نه وو — چه ښکاره ئې د خبرو داته نوند کړو
په تازه تازه مضمون دې پښتو ژبې — په مغزو مې د شیراز و د خجند کړو
په فارسي ژبه مې هم ژبه گویاده — په پښتو ژبه مې خلق بهره مند کړو
هم دې زار دې هم دې سخ که فهم او کړې — زړه چه تا د شاعرۍ په کار خورسند کړو

تر قیامته به یادیږي په جهان کښې
هر سړې چه خدای ئې په فضل ارجمند کړو

"جب میں نے پشتو میں شاعری کا عَلَم بلند کیا۔ تو سخنوری کی اقلیم کو اپنے رہوار سے فتح کیا ماضی و حال میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اپنے کلام کی شیرینی کو مجھ پر اجاگر کرتا پشتو شاعری کو تازہ مضامین دے کر میں نے اُسے شیراز و خجند (کی شاعری) کا ہم پلہ بنا دیا۔ فارسی زبان میں بھی میری زبان قوتِ گویائی پر حاوی ہے لیکن میں نے پشتو زبان سے لوگوں کو بہرہ ور کیا۔ اگر تو سوچے تو یہ تیری خوش بختی کا مقام ہے کہ تو نے اپنے دل کو شاعری کے شغل سے خورسند کیا۔ ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم

سے ارجمند کیا۔ وہ "تا قیامت دنیا میں زندہ و پائندہ رہے گا"

اور اللہ پاک نے اپنے اسی فضل و کرم سے خوشحال خان کو بھی ارجمند کیا تھا۔ جناب دوست محمد خان کامل کہتے ہیں [1]

"جو مقبولیت اور بلند مقام خان علیین مکان خوشحال خان خٹک اور عارف ربانی عبدالرحمان مومند کو پشتونوں اور پشتو ادب میں ملا ہے وہ ابھی تک کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو نہیں ملا۔ جب تک پشتون قوم اور اُن کا ادب زندہ رہے گا بلکہ روئے زمین پر ایک بھی پشتو بولنے والا باقی ہوگا اس وقت تک خوشحال خان اور رحمان بابا کے نام فراموش نہیں کر سکے گا"

خان کی نثر نگاری کے بارے میں دانشور حبیبی کہتے ہیں۔

"منظوم کلام کے علاوہ خوشحال خان نے پشتو نثر کی طرف بھی توجہ دی یعنی اس نے سلیمان ماکو کی طرح نثر لکھنے کا راستہ پسند کیا اور کوشش کی کہ پشتو زبان کے محاورے کے استعمال کے ساتھ اپنا مطلب سلیس اور رواں پشتو میں تحریر کرے۔ خوشحال خان کی کتابوں میں دیوان۔ باز نامہ، صحت البدن۔ اخلاق نامہ، ہدایہ، فضل نامہ، سوات نامہ، دستار نامہ، فرخ نامہ، فراق نامہ، آئینہ، بیاض اور زنجری [2] شامل ہیں"

افضل خان خٹک کی تاریخ مرصع میں خوشحال خان کی وفات پر اسکے بڑے بیٹے اشرف خان ہجری کا کہا ہوا مرثیہ موجود ہے۔ اُس وقت اشرف خان دور دکن میں بیجاپور کے قلعے میں مغلوں کی قید میں تھے کہ یہ اندوہناک خبر اُن تک پہنچی۔ اور اُنہوں نے یہ غم انگیز مرثیہ تحریر کیا جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ جو فنی محاسن اِس مرثیہ میں پائے جاتے ہیں پشتو زبان کے بہت کم مرثیے اُس کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ اس مرثیے میں کل اکیاون اشعار ہیں اور ہر شعر جیسے خان جنت نشان اشرف خان

---

[1] کلیات خوشحال خان خٹک (تمہید) صفحہ ج

[2] کلیاتِ خوشحال خان خٹک (خان کے حالات) صفحہ الف ح

ہجری نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہو۔"

اِس مرثیے میں خان علییّن مکان (خوشحال خان خٹک) کے شخصی محاسن حوادثِ زیست، بیٹوں، بھائیوں اور خویش و اقارب کی سرد مہری سب کچھ فرداً فرداً بیان کئے گئے ہیں۔ "پشتونخوا" کے اِس غیور قہرمان کی بے وقت موت کا یہ مرقع افسوسناک بھی ہے اور عبرت خیز بھی! اِس مرثیہ کا مطلع یہ ہے[1]

ھمہ غم لرہ موجودہ داد نیا دہ — پہ خطہ ئے تل ژرا کمہ خندا دہ

نہ نہ ځائے د خندا نہ غلطے اووے — بلکہ دا ھمہ ژرا لرہ پیدا دہ

" یہ دنیا سراسر غم کے لئے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس کی قسمت میں رونا زیادہ اور ہنسنا کم ہے۔ نہیں نہیں یہ ہنسنے کی جگہ نہیں، میں نے غلط کہا بلکہ یہ سراسر رونے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔"

اور ساتویں شعر کے بعد کہتا ہے۔

یعنی نن ھغہ امام د ننگیالیو — پہ د نبرۂ غریب لاړ د کہ ئے خوا دہ

مسافر شو ھغہ شیں دجبالا نو — چہ زھرۂ ځنے اوبہ د اورنگ شاہ دہ

نہ ئے زوے پاندے حاضر نہ ورادہ وو — ساہ ئے تیغہ لہ غمونو پہ صحرا دہ

" یعنی آج وہ غیوروں کا امام ڈنبرہ کے مقام پر بصد یاس و حرمان اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ کوہساروں کا وہ ضیغم جس سے اورنگ زیب بادشاہ کا پتا پانی ہو گیا تھا، آج مسافر ہو گیا۔ اُس کی وفات کے وقت، نہ تو اُس کا کوئی بیٹا حاضر تھا اور نہ بھائی اور صحرائے غم و اندوہ میں اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔"

پھر سولہویں اور سترہویں شعر میں یوں کہتا ہے

ماوے څہ بیھودہ شور لرے باطلہ — واقعہ چہ تہ کوے کلہ سزا دہ

لہ حیا بہ تن دخان نوړلے نہ شی — پہ دا خوئی کڼہ ھر ثوز مکہ بیحیا دہ

---

[1] تاریخ مرصع افضل خان خٹک کا فوٹو سٹیٹ و دیوان اشرف خان ہجری ص ۲۴

"میں نے کہا اے باطل یہ تم کیا بیہودہ شور و غل مچاتے ہو اور جو واقعہ تم بیان کر رہے ہو کیونکر ممکن ہے ۔ یہ کب خان کے شایان شان ہے ! خصلت کے لحاظ سے یہ زمین چاہے جس قدر بے حیا کیوں نہ ہو پھر بھی شرم کی وجہ سے خان کے وجود کو کھا نہیں سکے گی ۔"

ستائیسواں اور اٹھائیسواں شعر ہے ؎

نظام پور په ژړا ماتې کړې مانړۍ — له هوډیانو ئې پرې کړې تمنا ده

د مجلس ځمکه له هغه مهرۍ لاړه — په ارمان ئې آلوده هره ګیاه ده

یو ځل ورشه د مجلس کوټ ئې اوګوره

چه له غمه څنګه رنګ تو یې په فنا ده

"نظام پور نے رو رو کر اپنی تمام آبادیاں زمین بوس کر دیں اور صاحبان عزم و حمیت سے اُمید قطع کر لی ۔ وہ زمین جہاں پر اُن کی محفل جما کرتی تھی اب وہ صاحب مہرو وفا سے خالی ہو گئی اس لئے وہاں کا سبزہ یاس و حرماں سے نم آلود ہے ۔ ایک دفعہ جا کر قلعے میں اُس مقام کو ذرا ایک نظر دیکھ آؤ جہاں پر وہ مجلس آرائی کرتے تھے ، کہ غم و اندوہ کی وجہ سے اب وہ جگہ کس طرح رو بہ زوال ہے ۔"

اور پھر خان کے بعض صفات یوں بیان کئے ہیں ؎

"غښې خط د ویزارۍ کمان ته ورکړو — لېنده لا د زړۍ د وصله مېرّا ده

هغه غرچه ئې له اسمه عنقاء وو — ترکېدره ئې نن نامه بتره لا ده

ډال روغن له تاوه ویلې په تنه کړو — مېرّا د شرم توره له بریښنا ده

د خوبۍ معدن چه تالیده خاطره — په صحراې د عزت نمونه تنها ده

هغه واف چه به وکړې دُر افشان وو — نن ئې ګونګه په هر لوري ژبه ګویا ده

چه چراغ د هنر مزے پوشیده کړو — کټے زه په ژړا سر کړمه سزا ده

نور به سترګے په مخ وا د بنادۍ نه کا

کړه په تا د هجرۍ مینه په ریښتیا ده

"تیر نے کمان کو اپنی بیزاری کا پروانہ لکھ کر دے دیا، کمان بھی بندھی ہوئی رسی کی قربت سے متنفر نظر آنے لگی۔ وہ پہاڑ جس سے شیر ببر منسوب تھا اب اُس کا نام گیدڑ سے بھی بدتر ہے۔ (غم و اندوہ) کی تپش کی وجہ سے ڈھال نے اپنے رنگ و روغن کو بھی پگھلا دیا ہے۔ اور تلوار نادم ہو کر چمک سے عاری ہو گئی۔ اسے دل وہ معدن خوبی جسے تو دیکھا کرتا تھا۔ اب صحرا میں اُسکی باعزت ذات تنہا ہے وہ ابر عظمت جو کبھی انسانوں پر دُر افشانی کیا کرتا تھا۔ اُسکی زبان گُہر بار اب بالکل گنگ ہو چکی ہے۔ اس زمین نے مجھے اگر یوں اشکبار کر دیا ہے تو یہ بالکل جائز ہے اور مناسب ہے اِس لئے کہ اس نے تو علم و ہنر کے چراغ کو بھی گل کر دیا ہے۔ ہجری کے دل میں اگر آپ کے لئے واقعی سچی محبت موجود ہے تو آئندہ وہ کسی بھی خوشی اور شادمانی کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔"[1]

خان کا گھرانہ

خوشحال خان خٹک کے دور کے آغاز ہی سے پشتو ادب حقیقی آب و تاب اور چمک دمک حاصل کرنے لگا۔ پشتو نحو میں نئے تصورات، نئے افکار اور نئے خیالات رنگین پھولوں کی طرح کھلنے لگے۔ ملی شعور نے انگڑائی لی شعراء اور ادباء کا میلان ایک بار پھر پشتو کی طرف ہونے لگا۔ اور آورد کی شاعری کی بجائے آمد کی شاعری کا دور دورہ ہوا۔

خان کی اولاد کو پشتو زبان اور پشتو ادبیات کی خدمت اپنے نامور باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اُنکی اولاد میں پشتو کے صف اول کے شعراء اور اُدباء پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر قابل ذکر ہے۔ جناب کامل مومند نے خان کے بیٹوں میں اشرف خان ہجری، سعادت خان، بہرام خان، نظام خان، عابد خان، عبدالقادر خان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور صدر خان، سکندر خان

---

[1] خان کی تاریخ پیدائش مئی جون ۱۶۱۳ء اور تاریخ وفات ۲۰، فروری ۱۶۸۹ء مطابق ۱۰۲۲ھ مطابق ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۰۰ھ ہے۔

اور گوہر خان کو بھی اچھے شعراء کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ان میں اشرف خان ہجری، عبدالقادر خان اور سکندر خان کے کلام کے مکمل دیوان موجود ہیں۔ صدر خان کی دو مثنویاں "مثنوی آدم درخانئی" اور مثنوی "ذ لے شہئی" چھپ چکی ہیں۔ اور غزل کے چند نمونے "گلشن روہ" نامی کتاب میں موجود ہیں۔ گوہر خان کی نثری کتاب "قلب السیر" میں اُس کے اشعار کے نمونے بھی ہاتھ آئے ہیں[1]۔ سعادت خان۔ بہرام خان، نظام خان اور عابد خان کے بارے میں اور اُن کی سخن شناسی کی تحریری شہادتیں خان کی بیاض اور اشرف خان ہجری کے دیوان میں موجود ہیں۔ محقق حبیبی کہتا ہے۔ کہ "پشتو ادب کی تاریخ میں اگر کوئی کسی گرانقدر اور فعال گھرانے کا متلاشی ہو تو وہ خوشحال خان کا گھرانہ ہے جس نے پشتو نظم و نثر میں اول درجہ کے آثار چھوڑے ہیں[2]۔ ان میں ہجری کے دیوان میں لگ بھگ چار ہزار اشعار ہیں۔ عبدالقادر خان کی منظوم شائع شدہ کتابیں عام ہیں جن میں ان کا دیوان "حدیقہ خٹک" اور گلستان سعدی کا ترجمہ "گلدستہ" شامل ہے۔ اُن کے علاوہ اُنکی ایک خوبصورت مثنوی یوسف زلیخا بھی قلمی نسخے کی صورت میں موجود ہے۔ اشرف خان ہجری نے اپنے خاندان اور اپنے بعض ہمعصر شعراء کے بارے میں ایک نظم چھوڑی ہے جس سے بعض دلچسپ حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ؎

پښتون ذات چہ خدائے پیدا کړو لا ازل   دود د علم د هنر پکښے کمتر دے

که هم قوم ئے پره کړے سر له سره   دا حکمت په څو مکانه مقرر دے

"روز اول ہی سے جب اللہ نے پشتون نسل کو پیدا کیا تو اُسے علم و ہنر کے دستور سے بیگانہ رکھا۔ اگر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اُس کی ساری قوم کا جائزہ لیا جائے تو علم و حکمت صرف چند گھرانوں تک ہی محدود نظر آئیگی۔"

"شعر خوشحال"

اولاً په دا استاذ له حاله وایم   چه ئے شعر جهانګیر لکه قمر دے

---

[1] گوہر خان کا "قلب السیر" نامی ایک نایاب نسخہ راقم نے پشاور میوزیم کے کتب خانے میں دریافت کیا تھا [2] تاریخ ادب پشتو کے عالم حبیبی کابل ۱۳۴۷ ش م

پہ پښتو ژبہ چہ شعر چابیان کړو ... دهٔ وُ نظم ستوری دده نمر دے
څهٔ خوبی د هغے نمر وائے مهجوره ... چہ ئے نام د هر نیولے سر بہ سر دے
او س ئے وایہ حقیقت د شاګردانو ... چہ هر یو لہ دے هنره بهره ور دے

" پہلے تو میں اُستاد (خوشحال خان) کا حال بیان کروں گا جس کے اشعار چاندنی قمر کی مانند تمام عالم کو منور کئے ہوئے ہیں۔ پشتو زبان کے دوسرے شاعروں کے اشعار اگر ستارے ہیں تو خوشحال خان کے اشعار سورج کے مترادف ہیں۔ اے مہجور تو اُس سورج کی تعریف کرتا ہے جس کا نام دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیلا ہے۔ بارے اُن کے شاگردوں کا بھی کچھ ذکر ہو جائے جن میں ہر ایک اس ہنر سے بہرہ ور رہا ہے۔

" عبدالقادر خان "

قادر خان کہ بحر بولم دروغ نہ دی ... چہ ئے فکر دا صلی دُرو مصدر دے

" قادر خان کو اگر بحر کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا جس کا تخیل سچے موتیوں کا خزینہ ہے۔

" سکندر خان "

د سکندر شعر لہ څهٔ سره مثے کړم ... طبیعت ئے ډیر تر دُرو منور دے
د اشعارو ملک ئے ټول پہ نظم چل کړو ... پہ سرید د نظم شاه بل سکندر دے

" سکندر کے شعر کو کس سے تشبیہ دوں! اُس کی طبیعت موتیوں سے زیادہ منور ہے اُس نے تمام اقلیم سخن کو اپنی نظم سے مسخر کر ڈالا۔ اور شاعری کے تخت کا وہ بجا طور پر سلطان بھی ہے اور سکندر بھی۔

صدر خان، عجب خان۔ گوہر خان اور عبدالرحمان خٹک کے بارے میں کہتا ہے ؎

صدر خان، عجب، گوهر، سخن شناس دی ... رحمان لا پہ دے میدان د تورو غر[1] دے

---

[1] د تورو غر:۔ علاقہ خٹک میں ایک اونچے پہاڑ کا نام ہے۔

پس لہ دے بہ کیفیت لہ نورو وایم — چہ د چا شعر شمشیر د چا خنجر دے

" صدر خان، عجب خان اور گوہر خان سخن شناس ہیں مگر رحمان اِس میدان میں بے مثل کوہِ خارا ہے۔ انکے بعد دوسروں کی کیفیت بیان کروں گا جن میں سے بعض کے اشعار مثل شمشیر اور بعض کے خنجر کے مترادف ہیں "

شاعران د پښتو گویا خیرہ دی — د مرزا شعر شملہ بلکہ افسر دے

تکلف پہ دا کښے نشتہ باور اوکړه — پہ دا فن ئے گوئے ورے لہ یو هر دے

" مرزا خان انصاری کے آگے شعرائے پشتو گو نادم ہیں۔ اس لئے کہ ان میں مرزا کے اشعار جیسے پگڑی کے شملہ بلکہ تاج کی طرح ہیں۔ تکلف برطرف! یقین کیجئے کہ وہ اس فن میں سب پر سبقت لے گیا ہے۔

" قلندر "

نن پہ دا دور کښے شاعران غواړے — کہ دوہ درے تنہ د کړیو قلندر دے

اگر موجودہ دور میں اچھے شاعر ڈھونڈتے ہیں تو اُن میں دو تین اگر اور ہوں تو ایک قلندر بھی ہے

" عبدالرحمان بابا "

خوږ ژبان پہ زمانے شکرے لونی — هغہ واف چہ مستقر ئے پیښور دے

د رحمن پہ ویل ځلیځی دلقب نشتہ — چہ ئے ماشعر منظور کړو معتبر دے

" وہ خوش گفتار جو سارے زمانے میں شکر ریزی کرتا ہے اور وہ ابر کرم جس کا مسکن پشاور ہے۔ رحمان ہی تو ہے جس کے کلام پر کوئی انگشت نمائی نہیں ہو سکتی اب جب کہ میں نے بھی اُس کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کر لیا ہے تو اس لئے کوئی شک نہیں کہ اُس کا کلام معتبر کہلایا جائے

" ارزانی، دولت "

۵ ارزانی دولت د خپل دور بلال وو نن ئے د ټیلے زمانے د شعر فرد ے
نور قابل دیاد و نهٔ دی په دا ذیل کښے نهٔ ئے شعر سنجیده نهٔ ئے باور ذے

ارزانی اور دولت اپنے دور کے بلال تھے۔ آج بھی زمانے نے اُنکے شعر کے کروفر کو تسلیم کیا ہے۔ دوسرے شعرا اس قابل نہیں کہ انہیں اس تذکرے میں یاد کیا جائے کیونکہ نہ تو اُنکے اشعار سنجیدہ ہیں اور نہ مستند۔

"ہجری اور خوشحال بابا"

تبول ئے او سپارهٔ په ما سرير د نظم
هغه نمر چه نن د خاورو په بستر دے

"وہ سورج جو آج بستر خاکی پر ہے اُس نے سارے کا سارا سریر نظم میرے حوالے کر دیا۔"

"مقتدر ہستیاں"

مذکورہ شعراء کے علاوہ وہ نامور شعراء جن کا تذکرہ اِس قصیدے میں نہیں آیا یا ہجری کے زمانے کے کچھ ہی بعد گذرے ہیں، لیکن جن کی قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت میں کوئی کلام نہیں جیسے عبدالحمید ماشوخیل، مصری خان گگیانړے، معزاللہ خان خان مہمند، علی خان، کاظم خان شیدا، نجیب سربندے کامگار خان وغیرہ یہ سب وہ مقتدر ہستیاں ہیں جنہوں نے پشتو کے شعروادب کے فن پاروں کے دفتر میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ انکی پُر لطف رنگین غزلوں اور صاف ستھری شاعری نے پشتو کی کتابی ادب کو اسی زبان کے عوامی ادب کی طرح لوگوں کے دلوں میں جگہ دی ہے۔

"پشتو غزل کا عروج"

یہ وہ دور تھا جب پشتو کی رومانی شاعری غزل اور مثنوی دونوں عروج کی منزل تک پہنچ گئیں مثنوی کی ارتقاء اور اُس کی عوامی صنف بدُلہ میں بدل جانے کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اسی طرح غزل کا

تدریجی ارتقاء اور اس میں تصوّف کے نفوذ پر بھی ضمنی بحث ہو چکی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا جا چکا ہے کہ غزل دراصل ہمارے تقلیدی ادب کا سب سے اہم حصہ ہے۔ جو فارسی سے پشتو میں آئی ہے۔ یہ صنفِ سخن عروضی ترتیب و ترکیب کی پابند ہے اس میں باقاعدہ قافیہ اور ردیف کی پابندی لازمی ہے۔ اس لئے محض غزل کی خاطر یہ غزل نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس لئے کہ یہ خوبی بہت پہلے سے پشتو شاعری میں موجود تھی جس کی اساس معشوقوں کے ساتھ رازونیاز کی باتوں پر تھی لیکن عشق و محبت کی یہ شاعری عروض کی پابند نہ تھی۔ اس کی شکل لوبہ، نیمکٹی اور خصوصاً ٹپے کی تھی؛ لیکن پھر بھی جس طرح کہ محترم امیر حمزہ خان شنواری ایک جگہ لکھتے ہیں[1]

"پشتون شعراء نے فارسی غزل کا ہُوبہُو تتبع نہیں کیا بلکہ انہوں نے غزل کو پشتو قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ یوں کہ فارسی غزل میں محض تغزل ہے اور اس میں ملی روایات کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے اگر فارسی غزل کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ تو قارئین اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ کہ یہ غزل کس قوم و ملت کے شاعر نے کہی ہے۔ مگر اس کے برعکس پشتون شعراء نے فارسی غزل سے استفادہ تو کیا مگر اس میں اپنے پشتونی وجدان اور روح کو سمو دیا۔ اب اگر پشتو غزل کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو قاری آسانی سے محسوس کرے گا کہ یہ پشتون قوم کے کسی شاعر کا کلام ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پشتو غزل سے پشتونوں کی ملی روایات اور تہذیب و تمدن کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکے گا۔ اور بہت سی ایسی تلمیحات بھی دکھائی دینگی۔ جیسے کہ حمیدؔ ماشوخیل کے یہ اشعار ؎

؎ یو یہ نہ سم مغلوا لہ د رقیب ستا   کہ زو کوے وم ریښتیالہ پښتنے زہ
کہ یہ نوے وکوی ظلم د مغل د ے   خدائے غنو نہ کړو د ا ستا مغل زما

"اگر مجھے واقعی پشتون ماں نے جنا ہو تو میں رقیب کے مغلوں جیسے رویے کبھی برداشت نہیں کروں گا۔"

---

[1] امیر حمزہ خان شنواری کا مقالہ "پشتو غزل" ماہنامہ "اولس" اکتوبر نومبر ۱۹۶۷ء

اگر کسی اوپر کوئی مغل بنکر ظلم و تعدی کئے جا رہا ہے تو خدا تعالےٰ نے تیرے جور و جفا کو میرے لئے مغل بنا دیا ہے ۔

موصوف آگے لکھتے ہیں کہ :۔[1]

" یہ قومی اور ملی جذبہ جو فطرت سے تعلق رکھتا ہے رحمان بابا جیسے مرنجان مرنج صوفی شاعر میں بھی کلی طور پر مفقود نہیں اور اُن کے کلام میں بھی جا بجا اس کا اظہار موجود ہے لیکن خوشحال بابا کے اشعار میں یہ جذبہ ترقی کی معراج تک پہنچ گیا ہے اور وہ شعرائے متاخرین کے لئے ایک روشن مثال چھوڑ گئے ہیں "۔

"عبدالرحمان بابا":۔ غزل کا جیسا کہ خاصہ رہا ہے کہ یہ جس قدر سادہ اور آسان زبان میں ہو اُسی قدر زیادہ اثر رکھتی ہے ۔ لہذا یہ بہتر ہوتا ہے کہ شاعر غزل میں ایسی زبان استعمال کرے جسے سن کر نہ صرف فی الفور سامع کا ذوقِ جمال برانگیختہ ہو، بلکہ اس کا فہم و ادراک بھی اُس سے جلا پائے ۔ اِس وقت جس دور کی پشتو شاعری کا تذکرہ جاری ہے اُس دور میں اُستادانِ فن نے اس بات کا بڑا لحاظ اور خیال رکھا ہے انہوں نے اپنے خیالات کی پرواز کچھ ایسے انداز کے مطابق رکھی کہ مطلب و معانی کے لحاظ سے شعر بغیر کسی زیادہ تکلف کے قارئین و سامعین کے اذہان تک رسائی حاصل کر سکے ۔ اس کے الفاظ تشبیہات و استعارات سبھی ایسے تھے جو نہ تو شعر میں سقم پیدا کرتے اور نہ ذہن پر بوجھ بنتے تھے اگر ایک آدھ شاعر کی غزل بطور استثنیٰ نظر انداز کر دی جائے ، تو یہ خوبی اُس دور کے سبھی غزل گو شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ با ایں ہمہ اِس دور کے سب سے بڑے اور مستقبل کے ہر دور کے مقبول ترین غزل گو شاعر لسان الغیب عبدالرحمان بابا تھے جنہوں نے سارے پشتون خوا میں عمومی مقبولیت کی وجہ سے پشتون عوام سے " بابا " کا خطاب حاصل کیا ہے ۔

پشتو ادب میں ملیت اور روحانیت کے امتزاج سے جو شاعری اسلامی دور کی ابتداء سے شروع ہوئی تھی ۔ اس نے پہلے متقدمین اور بعد میں روشانیوں کے دور میں تدریجی ارتقاء کے منازل

---

[1] مقالہ حمزہ خان شنواری ۔ اولس کوئٹہ دسمبر ۱۹۶۶ء

طے کئے تھے۔ جب وقت وہ معراج اور کمال تک پہنچی تو ایک طرف اس نے خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کے کلام کی صورت اختیار کی اور دوسری طرف رحمان بابا کی معجز بیانی بن گئی۔ اسی بنا پر اگر غزل ایک طرف پشتون ملت کی روح کا منور مرقع بنی تو دوسری طرف اُس نے وہ روحانی تقدس اور طہارت پائی جو ہر لحاظ سے اسلامی تصوف کی ترجمانی کرتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ پشتو غزل پختہ اور کامل ہوگئی اور زبان کی سادگی، خیالات کی بلندی اور رفعت کے ساتھ ساتھ اُس میں وہ سبھی محاسن پیدا ہوگئے جنہوں نے بلحاظ معنویت و تغزل پشتون کی شان کو اونچا کیا۔

اکثر محققین اور علماء کی یہ رائے ہے کہ صوفی شعراء المیہ کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ شعر کی زبان میں غم انگیزی اور بھی دقت آور ہو جاتی ہے، جب ایک عاشق کے لیے اپنے محبوب کا فراق باعث درد و غم بن جائے اور اس درد میں وہ کیف و سرور ہو جس کا عاشق ہر لمحہ آرزومند اور طلب گار رہتا ہے تو اس لحاظ سے اس قسم کا المیہ ایک گونہ باعثِ تسکین بن جاتا ہے۔ اکثر صوفیاء کی طرح رحمان بابا بھی دلِ افسردہ کو باعثِ عزّ و افتخار خیال کرتے ہیں۔ اس لئے وہ استغراق اور مئے خود فراموشی سے سرشار اپنی شعری دنیا میں دنیائے رنگ و بو سے بیگانہ دکھائی دیتے ہیں چونکہ تصویر اور شعر دونوں میں غرض تخلیقِ حسن سے ہوتی ہے اس لئے رحمان بابا نے بیگانگی و استغراق کے باوجود اس سلسلے میں اپنے شعر میں ہر ایک کے دل کی ترجمانی کی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ؎

هم نغمے کوی هم رقص کا هم خاندی
د رحمٰن په شعر تُرکے د باګرام

" رحمان کا شعر سن کر مہوشانِ باگرام نغمے گاتی رقص کرتی اور ہنستی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ رحمان بابا توحید کے شارح، اخلاقیات کے معلم اور گمراہوں کے رہنما تھے۔ ان کا راستہ عشق کا راستہ تھا اور اسی ڈگر پر انہوں نے سیرت و کردار کی تعمیر کا درس دیا ہے وہ خود بھی ارفع و اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شیریں بیانی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔

غزا او شوه کڅ گفتار کوم په ژبه ـــ
زهٔ رحمان چه کردار نهٔ لوم کذاب یم

"زبان سے اگر میں خوش گفتاری کرتا پھروں تو یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں (رحمان) اگر صاحب کردار نہیں ہوں (تو سمجھو) کہ میں کذاب ہوں"

عام لوگ نسب ناموں، خاندانوں اور خیل خانوں سے وابستگی اور روایات کیوجہ سے زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے باپ دادا کے نام کے سہارے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اور اسی وابستگی کی مناسبت سے اپنی آئندہ نسلوں کو زندہ رکھتے ہیں لیکن رحمان بابا کی ذات اس کیفیت سے یکسر عاری ہے۔ یہی سبب ہے کہ انکے گھرانے کے بارے میں صرف اس قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی مٹی مومند اور وہ خود "بہادر کلی" کے باسی تھے۔

زهٔ عاشق یم سریکار مے دے له عشقه ـــ
نهٔ خلیل نهٔ داؤدزے یم نهٔ مومند

"میں عاشق ہوں اور عشق ہی سے میرا سروکار ہے۔ میں نہ تو خلیل ہوں داؤدزئی ہوں اور نہ مومند"
مصری خان گگیانڑے نے انکی اس کیفیت کی وضاحت یوں کی ہے۔ ـــ

زهٔ له عشقه یم زو کړے
عاشق تارک الانساب وی

"عشق ہی نے مجھے جنم دیا ہے اور عاشق تارک الانساب ہوتا ہے"
اور رحمان بابا بالفعل تارک الانساب رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مستشرقین نے اس بات کو مشکوک بنادیا تھا کہ ہزار خوانی کے قبرستان میں رحمان بابا کا مزار کیوں ہے؟[۱] لیکن جب ڈنمارک کے پادری اولڈمن اس ارادے سے اُن کے مزار تک پہنچے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اُن کا دیوان اور اُن کا مزار ایک دائمی

---

[۱] د رحمان بابا موندل ص ۹۴ مجلہ پشتو رحمان نمبر اپریل مئی ۱۹۷۱ء

روحانی رشتے میں منسلک ہیں۔ یہ بندھن اُس دن سے ہے جس دن رحمان بابا نے اُس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ اُن کے دیوان ہی کی وساطت سے اُن کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اس لئے اس کی شناخت عیاں ہے۔

پشتو شعراء میں رحمان بابا واحد شاعر ہے جو گھر، حجرہ اور مسجد تینوں میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔ پشتو معاشرے کے یہ تینوں مراکز پشتون نسل کی تعلیم و تربیت کے قدیمی مراکز ہیں۔ ان کے متوازن امتزاج سے شعور و شعار کے مالک ایسے پشتون جنم لیتے ہیں جن کی شخصیت پر فخر اور رشک کیا جا سکتا ہے۔ ایسے جامع تربیت یافتہ گان کو خوشحال بابا نے پشتون سرزمین کے لئے " فداو ندانِ دستار" کا خطاب دیا ہے۔

رحمان بابا کا کلام عزم، راستی، شرم، حیا، اخلاق حسنہ، ایثار، مروت، عفو، کرم، تمیز، عدل، انصاف، توکل، عصبیت، بیم و رجا، ہمت، تدبیر، تدبر، طاعت و استغفار کا درس لئے ہوئے ہے۔ یہ تمام صفات پشتون کیا بلکہ انسانیت کی اخلاقی نشوونما کے لئے لازمی ہیں۔ پشتون قوم کا ہر نیا پودا گھر، حجرہ اور مسجد تینوں میں اس کی تربیت حاصل کرتا ہے اور رحمان بابا کا کلام شروع ہی سے اس میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رحمان بابا کا کلام پشتونوں کی معاشرتی زندگی پر جس قدر اثر انداز ہوا ہے غالباً دوسرے کسی شاعر یا تحریک نے اس پر اس قدر گہرا اثر نہیں چھوڑا۔ خاص کر پشتو موسیقی میں رحمان بابا کے کلام نے رباعی کے مخصوص نام سے جو مقبولیت حاصل کی ہے یہ مقبولیت ہمارے کتابی ادب میں کسی دوسری صنف کو حاصل نہیں ہوئی۔

پشتو موسیقی کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رحمان بابا کی غزل (جسے عام لوگ رباعی کہتے ہیں) سے قبل پشتون گلوکار اور موسیقار مجلس کی ابتداء یونانی ڈرامے کے انداز سے ترانے کی قسم کے بول سے کیا کرتے تھے۔ رحمان بابا کا ایک ہمعصر شاعر صدر خان اپنی مثنوی آدم درخانئ میں کہتے ہیں [1]

---

[1] مثنوی آدم درخانئ (مطبوعہ پشتو اکیڈیمی)

ہ چہ پیر هسک لہ میانہ شو مجلس جوړ پہ ترانہ شو
میتہ خیلو د با بیو نہ جوړ کړو جوړ د عشق بابونہ

"جب پیر درمیان سے اُٹھے تو مجلس کی ابتدا ترانے سے ہوئی۔ میتہ خیلوں نے اپنے رباب سُر کئے۔ اور ابوابِ عشق کھولدے۔"

مجلس کا یہ طور طریقہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ رحمان بابا کا کلام اس کا متبادل نہ بنا۔ جناب کامل مومند لکھتے ہیں [1]

عبدالرحمان کی غزلیات کو پشتون رباعی کہتے ہیں اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پشتونوں کے ملک میں ایسا کوئی مرد یا عورت ہوگی جو عبدالرحمان کو نہ پہچانتے ہوں۔" ہر غزلخوان کے لئے یہ ضروری ہے کہ غزل سے پہلے وہ رحمان بابا کی ایک رباعی پڑھے۔"

پشتونخوا میں سماع کا رواج روشانی تحریک کے ساتھ عام ہوگیا تھا۔ اگرچہ لوک موسیقی پشتو ثقافت کا ایک اہم جزو ہے لیکن مذہبی تقدس اور روحانیت کے عنصر کو انہوں نے رواج دیا۔ صوفیا کے نزدیک اس قسم کی موسیقی سننا روحانی تسکین کے لئے مباح رہا ہے۔ جیسا کہ خوشحال خان کہتا ہے [1] "بہت سے کامل درویش اس کام میں مستغرق تھے"۔ رحمان بابا بھی اُن صوفیا میں سے ایسے ہی ایک صوفی تھے۔ خود فرماتے ہیں۔ ہ

ھر مطرب چہ غږیږي تاؤ کا د رباب
پہ دا تاؤ کښې زما زړہ کاندې خراب
چہ سامع ږي پہ نغمہ پہ ترانہ شم
دیوانہ شم کہ یوان خیرې مست خراب
همې تار همې کفتار هسې اثر کا
چہ هیڅ څوک نہ طاقت لري نہ تاب

---

[1] رحمان بابا (تصنیف کامل) ص ۶۳

"جب بھی کوئی مطرب رباب کے تار کھینچتا ہے تو گویا میرا دل پائمال کر دیتا ہے۔ جب میں اس کا نغمہ اور ترانہ سنتا ہوں تو دیوانہ ہو کر گریبان پھاڑنے لگتا ہوں اور مست و خراب ہو جاتا ہوں۔ اس کے تار اور اس کی گفتار میں کچھ ایسا اثر ہوتا ہے کہ کوئی بھی تاب و توان نہیں رکھ سکتا۔

رحمان بابا کے کلام میں ذکر و فکر، حُبِ الٰہی، توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ اپنے خالق اور محبوب حقیقی سے قرب و تعلق پیدا کرنے کے لحاظ سے بہت اچھے اور متوازن اشعار موجود ہیں۔ کہتے ہیں ؎

د لته دم او قدم دواړه په حساب دي

پل غلط په لاره مه بدده بے حسابه

"یہاں دم اور قدم دونوں میں احتیاط برتنا لازم ہے خبردار! اس راہ پر بغیر احتیاط کے قدم ہرگز نہ رکھنا" معرفت کے اِن عمدہ بیانات میں حمدِ پاک کے بعد نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم عشق، سلوک اور راہ عشق الٰہی کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اُس راستے میں فرمانبرداری اور خاکساری کے آداب سے خود کو آگاہ رکھنے، خوف و رجا اور جذب و فنا کی کیفیات کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی پسندیدہ تعلیمات بھی اس کے کلام میں بہت زیادہ موجود ہیں۔ اور دُنیا کے خوب وزشت اور اس فانی زندگی کی بے ثباتی پر بھی سبق آموز اشعار ملتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں رحمان بابا کے افکار کا خلاصہ ہنکے یہ اشعار ہیں کہ ؎

دا شه مه کړه د چا سره جفا　　　　لږ ژوندون دے ضائع کیږی بے وفا

په دنیا کښے هیڅ ثوک نږدي پاتے شوی　　　　واړه تلونی دی که نن دی که صبا

"اوْ! اور کسی کے ساتھ جفا نہ کرو کیونکہ یہ تھوڑی سی زندگی وفا کے بغیر اکارت جاہی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ سبھی کو آخر جانا ہے۔ چاہے آج ہو یا کل۔"

رحمان بابا کے نزدیک روح کی دنیا تب آباد ہوتی ہے جب تن بدن کی دنیا کو خاکستر کیا جائے اس لئے

لے تفصیل کے لئے اس مؤلف کا مقالہ "رحمان بابا گھر حیرہ اور مسجد میں" پشتو رحمان نمبر اپریل مئی ۱۹۷۱ء۔

انانیت تو محض اللہ کی ذات کو سجتی ہے ۔ وہ انسان جو مادی زندگی کی کشمکش میں اپنی انا کو باقی اور زندہ رکھنا اپنی ذات اور نسل کی بقا کے لئے لازمی خیال کرتا ہے یہاں پر وہ اسے پائمال اور نیست و نابود کر دیتا ہے ۔ جب یہ حجاب درمیان سے اٹھ جائے ۔ تو حسن کا پھول یا معشوق حقیقی کے نور کی جوت من کی دنیا کو منور کر دیتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ؎

روشنائی په هغه زړونو ده حرامه

چه پرے کښیني ګرد غبار د دے دنیا

"اُن دلوں پر روشنی حرام ہے جو اس دُنیا کے گرد و غبار سے آلودہ ہو جائیں"۔

ان صاف اور ستھری اور ارفع تعلیمات کی وجہ سے رحمان بابا کا کلام ہر پشتون کے نزدیک ایک عارفِ ربانی کا کلام ہے اور اسی لئے اسے عالمگیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے ۔

اپنے ہمعصر سخن فہموں سے لے کر آج تک ہر دور اور ہر زمانے کے سخندان شعراء اور تنقید نگاروں نے رحمان بابا کی آفاقی شاعری کو سراہا ہے ۔ اُن میں خوشحال بابا کے گھرانے کے بعض نامور شعراء مثلاً اشرف خان ہجری اور اُن کا پوتا کاظم خان شیدا بھی شامل ہے ۔ اشرف خان ہجری کہتا ہے ۔ ؎

خوږ ژبان په زمانے شکرے لوتي ... هغه واف چه مستقر ئے پېښور دے

د رحمان په وُمل څائے دلقب لشته ... چه ئے ماشعر منظور کړو معتبر دے

" وہ خوش گفتار (رحمان) جو سارے زمانے میں شکر ریزی کرتا ہے اور وہ ابر کرم جس کا مسکن پشاور ہے ۔ رحمان ہی تو ہے جس کے کلام پر کوئی انگشت نمائی نہیں ہو سکتی ۔ اب جب کہ میں نے بھی اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کر لیا ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس کا کلام معتبر نہ کہلایا جائے ۔

کاظم خان شیدا کہتا ہے ۔

په دا وخت کښے کہ شیدا دواړه مشهور دے ... ثنا خوان به وے هر دم ستا دوېلو

ؔ عبدالرحمان بابا اور عبدالحمید بابا

"اے شیدا اگر اس وقت دونوں مہمند زندہ ہوتے تو وہ ہر وقت تیرے کلام کے ثناخوان ہوتے"۔
رحمت داوی کہتا ہے ؎

هر څوک شعر کا هم لاف د شاعرئ کا
زهٔ قربان تر شیرین شعر د مومند

"ہر کوئی شعر کہتا ہے اور شاعری کی ڈینگ بھی مارتا ہے۔ لیکن میں مہمند (عبدالرحمان) کی شیرین کلامی کے قربان جاؤں"۔

مصری خان گگیانڑے کہتا ہے ؎

شعر د فارسئ د پنم شیرین لکه شکر
شعر د پښتو کړو تر فارسی حمید رحمان لذیذ

"فارسی شعر شکر کی طرح شیرین ہے لیکن پشتو شعر کو حمید اور رحمان نے فارسی سے بھی زیادہ لذیذ بنا دیا ہے"۔

معزاللہ مہمند کہتا ہے ؎

د تمامے پښتونخوا د شاعرانو
معزالله عبد الرحمن دے منتخب

"اے معزاللہ! سرزمین پشتونخوا کے تمام شعراء میں عبدالرحمان بابا یکتائے روزگار ہے"۔

پیر محمد کاکڑ کہتا ہے۔ ؎

کهٔ هر څو وائی نازک شاعران شعر
ولے دوئ ګڼړی معجز د رحمن شعر

سوز ګداز د محبت ئے مگر زیات وو
چه سوزانے ئے هسے شان کړو بیان شعر

جوړ په شعر کښے رحمان لسان الغیب دے
په دا څیز نشته هرگز د انسان شعر

تر مصراعے ئے ذار شه لاړ د ملغلرو
په څهٔ شان ئے آویخته کړو یکسان شعر

"چاہے شعراء جس قدر بھی نازک شعر کہیں لیکن سب لوگ رحمان کے شعر کو اعجاز سمجھتے ہیں کیونکہ سوز و گداز اور محبت کا جذبہ اُس میں سب سے زیادہ تھا۔ اسی لئے اس نے اس قدر پُرسوز اشعار کہے۔ شاعری کے لحاظ سے رحمان گویا لسان الغیب ہیں۔ اور کسی انسان کا شعر ہرگز اس ڈھنگ کا نہیں۔ موتیوں کا ہار اس کے مصرعوں پر قربان ہو۔ دیکھئے کس شان سے اُس نے موزوں شعر نظم کر کے پیش کئے ہیں"۔

شمس الدین کاکڑ کہتا ہے ۔

کہ ھر څو کوی هوس افغان د شعر
ؤ یه نه رسی په شعر له رحمنٔ

" ہر چند کہ کوئی پشتون شعر کہنے کی خواہش کرے مگر وہ ہرگز رحمان کے مقام تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

اپنے شعر کے بارے میں رحمان بابا کی یہ دعا بے شک قبول ہو چکی ہے اور انکے کلام میں وہ تاثیر پیدا ہو چکی ہے جس کی وہ آرزو کرتے تھے۔ اور کہا کرتے کہ ؎

دھر بیت مصرعه هے ذلفے د خوبانو کړے
چه کشور د افغانانو معطر شی

" اے خدا افغانوں کی سرزمین معطر کرنے کے لئے میرے شعر کے ہر مصرعہ کو زلف خوباں بنادے۔"

جناب دوست محمد کامل کہتے ہیں " اس بات میں تو اختلاف کیا جا سکتا ہے، کہ پشتو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے ؛ مگر مشرق و مغرب میں پشتو کے سبھی علماء و طالبین و ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ آج تک رحمان بابا پشتو نخوا کے سب سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہیں " عبدالمجید افغانی مرحوم۔ عبدالروف بینوا۔ عبدالحئی حبیبی۔ مولانا عبدالقادر مرحوم اور وہ تمام محققین جنہوں نے ماضی و حال میں رحمان بابا کے کلام پر کچھ کہا یا لکھا ہے اس پر متفق ہیں کہ رحمان بابا پشتونوں کی سرزمین کے اور سب سے زیادہ ہر دلعزیز شاعر ہیں ۔

پشتو غزل اگر ایک طرف رحمان بابا کی معجز بیانی کی تاثیر کے سبب رباعی کے مقبول نام سے یاد کی گئی ہے تو دوسری طرف غزل کے روپ میں اس نے اپنا اصلی وجود بھی زندہ رکھا۔ پشتو غزل کے بہت سے صاحب دیوان شعراء موجود ہیں۔ ان میں بعض تو خالص غزل گو شاعر تھے ۔ اور انکے دیوان یا بیاض میں شعر کی کوئی اور صنف سوائے غزل کے بہت کم ملتی ہے ۔ اور اگر شعر کی کسی دوسری صنف کا ایک آدھ نمونہ مل بھی جائے تو اسے متفرقات سے موسوم کرنا ہوگا اور وہ بھی آٹے میں نمک کے برابر ہی ہونگے ۔ شعر و شاعری کی یہ کیفیت رحمان بابا کے زمانے سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک اسی طرح قائم رہی ہے ۔ شعرائے متاخرین کی غزلیات کے دو دیوان احمد دین طالب اور میاں جناب کاکاخیل کے مطبوعہ دیوان اس سلسلے کی آخری کڑی معلوم ہوتے ہیں ۔ اس کے بعد مغربی ادب کے زیر اثر پشتو میں خالص

غزل کے دیوان مرتب کرنے کا رواج بدل گیا۔ اور متنوع شاعری کا آغاز ہوا۔ یہاں تک کہ "رئیس المتغزلین امیر حمزہ شنواری کی کتاب "غزوہ" نے" بھی اس متنوع شاعری کا ایک نمونہ بن گئی جس کا ذکر جدید شاعری کے بیان میں آئے گا۔

"ایک بحرانی دور"

جس دور میں پشتو ادب کے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہیں وہی مغلیہ حکومت کے بحران اور انحطاط کا زمانہ تھا۔ اس لئے کہ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں اِس بحران کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ یہ خوشحال خان خٹک کی شاعری کے عروج اور عبدالرحمان کی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ خان علیین مکان خوشحال خان خٹک خود براہ راست مغلیہ سیاست کا ہدف بنے تھے، عبدالرحمان بابا پشاور کے نزدیک بہادر کلی میں پیدا ہوئے تھے اور اُس دور میں پشاور کابل کے مغلیہ صوبے کا ایک اہم مرکزی شہر تھا۔ اسی لئے سلطنت پر ہونے والا اچھا یا بُرا اثر پشاور میں بھی محسوس کیا جاتا اور اُس کی صدائے بازگشت پشاور کے گرد و نواح تک بھی جا پہنچتی۔ یہی سبب تھا کہ اس دور کے سبھی شعراء خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے علاوہ چاہے عبدالحمید مومند، مصری خان گگیانڑے اور معزاللہ خان مومند تھے یا نجیب سرہندی ان سب نے اپنے اپنے وقت میں یہ آواز محسوس کی تھی، کیونکہ ہر چند کہ پشتون مغلیہ شہنشاہیت کے خلاف یک لمبی کشمکش میں اُس وقت سے مصروف تھے جس وقت سے انہوں نے لودھی پشتونوں سے دہلی کا تخت چھین لیا تھا پھر بھی میدانی علاقوں کے پشتون دہلی کی بادشاہت کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خوشحال بابا نے کہا ہے ؎

ما دے زۀ په د مغل په نوکرۍ کښے
رکیبو نه کړم د سرو د سپینو نال

میں یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ مغلوں کی ملازمت میں رہ کر میں (اپنے گھوڑے تک کے لئے) سونے چاندی کے رکاب اور نعل بنوالوں گا۔"

پشتونوں کی سرزمین کے بیشتر میدانی علاقوں پر مغلوں کی بالادستی قائم تھی۔ اور میدانی علاقوں میں بہت کم قبائل ایسے تھے جو مکمل طور پر مغلیہ حکومت سے آزاد اور خود مختار تھے۔ مغلوں کے طویل دورِ حکومت کا پشتو زبان محاورہ ادب اور پشتونوں کی ثقافت پر گہرا اثر تھا" لفظِ "مغل حسن وجمال کے ساتھ ساتھ ظلم، جبر اور زور زیادتی کا مترادف اور ترجمان گردانا جاتا تھا۔ پشتو محاورے میں "گھر پہ مغل کا چڑھ آنا" "مغلوں کا گھر پر حملہ آور ہونا" یا لوٹنا یا" مغل کا زور دہقان پر اور دہقان کا زور زمین پر" یا اسی قسم کے اور کئی محاورے تھے جن میں اکثر زبان کی ساخت کے لحاظ سے حقارت ونفرت کی ترجمانی کیا کرتے تھے یا پھر جیسے کہ آج تک دوشیزائیں ٹپے گاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ

ہ د پورہ تہ رامہ شے مغلہ زما د سر روپئی دا ستا قلنگ کیخے ځینہ
د پیښور سور سات ئے ټول کړو د مغلکئ د نتکئ لال ترے بورینہ
کیږی د مستو پہ دیرو کښے ویش دګلو
د نزاکت آوازے نور شو تر مغلو

"اے مغل تو بالائی سمت سے آنہ جائے، کیونکہ تجھے باج (قلنگ) دینے کے لئے میرے جہیز کا روپیہ غارت ہو جائے گا"

"پشاور کا جبری ٹیکس اکٹھا کیا گیا تاکہ اس سے مغلانی کی نتھ کا لعل بنوائے۔
مستوں کی قیام گاہوں میں پھول تقسیم ہو رہے ہیں اور اس کی نزاکت کی آواز دور مغلوں تک جاپہنچی ہے"
اسی طرح جبر و تعدی کے لیے "مغلوالہ" کی ترکیب اکثر پشتون شعراء نے استعمال کی ہے جیسے عبدالحمید بابا کہتا ہے۔

ہ یو پہ نسم مغلوالہ د رقیب ستا کړ زوکړے وم ریښتیا لہ پښتنے زۂ
کړ پہ نور وکړی ظلم د مغل د ے خدائے عمونہ کړ د ا ستا مغلاوزما

پہ تمام جہان قلارہ قلاری دہ
پہ حمید دغم مغل را و ختانۂ

" اگر واقعی مجھے پشتون ماں نے جنا ہو تو میں تیرے رقیب کا مغلوں جیسا ظلم وستم ہرگز برداشت نہیں کروں گا "

" اگر کسی دوسرے شخص پر مغل ظلم کرتا ہے تو اللہ نے تیرے غم میرے لئے مغل بنا دیئے ہیں "

" ساری دنیا میں امن و آشتی ہے لیکن حمید پر غم کے مغلوں نے دھاوا بول دیا ہے "

پشتونوں میں مغلوں کے اِس ظلم و تعدی اور جبر و اکراہ کے احساس کا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ ان کے اہل بصیرت بزرگ مغلوں کی عملداری کے تنزل کا راز جان چکے تھے۔ خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کے کلام میں اِن سب حالات کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ اِن آثار قدیمہ کے آشکار ہونے کا اعلان انہوں نے اُس زمانے میں کیا تھا جب کہ سلطنت کے ظاہری استحکام میں ابھی کوئی فرق نمودار نہیں ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے

مغل و ته چه گورمه اوس هغه مغل نشته ـ
دتورے وارے تیر دے اوس پاتے یو قلم دے

" مغلوں کو جب میں دیکھتا ہوں تو اب وہ مغل مجھے دکھائی نہیں دیتے۔ اُن کی تلوار کا زمانہ بیت چکا ہے بس اب ایک انکے پاس قلم ہی باقی رہ گیا ہے "

جناب سید انوار الحق جیلانی عبدالحمید بابا کے دیوان "دُر و مرجان" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحمید کے زمانے میں مغلوں کی حکومت پراگندگی، بدنظمی اور بے اعتدالی کا شکار تھی جس وقت کسی قوم سے زمام اختیار چھن جانے والی ہوتی ہے تو اُسکے زوال کے ایسے ہی اسباب پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ یہی مغلیہ حکومت کی آخری ہچکیوں کا دور تھا۔ مغلوں کی بے قاعدگیوں بے اعتدالیوں اور ظلم و تشدد کے واسطے "مغلوالہ" کی اصطلاح مخصوص کی گئی تھی "

اِس ترکیب کو اکثر پشتون شعراء نے استعمال کیا ہے۔ پشتو ادبیات میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو مغلیہ دور کے مرتب شدہ اثرات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جیسے فانی اور ارمانی دنیا سے شاہجہان جیسے شان و شوکت رکھنے والے بادشاہ کا انتقال پشتون شعراء کے لئے سانحۂ عبرت تھا اور عوامی و کتابی ہر دو اقسام کی شاعری میں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں

پہ د نیا مہ نازیږئ خلقہ   د شاہ جہان بادشاہ نہ پاتے شو تختو نہ

څۀ شو سلطان سکندر چہ وو بادشاہ دجہان

څۀ شو دارا څۀ شو اورنگ او شاہ جہاں ورپسے

"لوگو! اِس دنیا پر نہ اِتراؤ شاہ جہان جیسے بادشاہ سے بھی تاج وسریر باقی رہ گئے"۔

"ذرا بتاؤ تو سہی! بادشاہ جہان سلطان سکندر کہاں گئے! اسکے بعد دارا کا کیا حشر ہوا پھر اورنگ زیب اور شاہجہاں کس منزل کے راہی ہو گئے"!۔

یا جیسا کہ عبدالرحمان بابا کہتا ہے ؎

؎ اورنگ زیب او شاہ جہاں غونډے اشراف   صدقہ شہ تر منصور غونډے مند اف

کہ څوک تن پہ لوئی لوئے دے تہ ئے څہ کړی   مہ کړہ خدائے چہ کوہ طوری کوہ قاف

"اورنگ زیب اور شاہ جہاں جیسے اشراف بادشاہ منصور حلاج پر قربان ہو جائیں۔ کسی کی بڑائی جسمانی تن و توش سے ہرگز نہیں ہوتی خدا نہ کرے کہ کوہ قاف پہاڑ ہو کر جسامت کے لحاظ سے بہت بڑا ہے کوہ طور کی جگہ لے لے"۔

رومانوی اور افسانوی ادب کے ضمن میں دورِ اکبری کے تذکرے نے ایک عمومی تلمیح کی صورت اختیار کرلی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پشتو کے موجودہ کلاسیکی ادب کا زیادہ تر حصہ مغلوں کے دور ہی میں لکھا گیا ہے اور اُس وقت کے ادیب اور شاعر نے اُس وقت کے نظامِ حکومت سے جو تاثر لیا ہے اُس کا اظہار کسی نہ کسی رنگ میں اُس کے کلام میں بھی ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اِس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ پشتو ادب کی ترقی کی طرف پشتون ادیب اور شاعر کا یہ میلان مغلیہ دربار کی سرپرستی کی وجہ سے تھا۔ اس لئے کہ پشتونوں نے کبھی مغلیہ دور میں اپنی زبان یا اپنی ملی ثقافت کے لئے کسی قسم کی شاہی سرپرستی کا خیال تک نہیں کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خوشحال خان جو مغلوں کی ملازمت کے زمانے میں اِس کا آرزومند تھا کہ اپنے گھوڑے کے رکاب سونے کے اور نعل چاندی کے بنوائے مغلوں کے بارے میں اُس کی سبھی وفاداریاں یوں اکارت نہ جاتیں اور بالآخر وہ یہ کہنے پر مجبور نہ ہوتا کہ۔

ــہ پښتانۀ لره منصب نۀ دے غضب دے — چه تلاش د اِ صنافو کالاہے دال
کۀ هر او کاندی پښتون مغل به نۀ شی — بویه دا چه له زرهٔ او باسی دا خیال

"پشتونوں کے لیے منصب قہرِ الٰہی بن چکا ہے۔ جو اس میں اضافے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے وہ اور بھی احمق ہے۔ پشتون چاہے ہزار جتن کرے مغل نہیں بن سکے گا۔ اسے چاہیئے کہ اپنے دل سے اس قسم کا خیال ہی نکال دے"

رحمان بابا سیاسی گٹھ جوڑ سے لاتعلق تھے مگر اُن کے دل میں اپنی قوم کی محبت کا جذبہ موجود تھا۔ وہ بھی ایک مصلح کی طرح اپنے دور کے پیش آنے والے واقعات سے بیگانہ نہیں تھے۔ بقول جناب کامل مومند" اُنکی زندگی میں ایسے کم واقعات رونما ہوئے ہونگے جن سے وہ اس قدر زیادہ متاثر ہوئے ہوں جس قدر کہ وہ جمال خان، اُسکے بیٹے جلال خان اور دوست گل خان کی دردناک موت کے واقعے سے متاثر ہوئے تھے۔ اس واقعہ نے اُن کی فکر اور سوچ کی دنیا کو جھنجھوڑا اور اس واقعے کے نتیجے میں ایک اثرانگیز نظم لکھی جس میں ایک جگہ بطور احتجاج یہ کہا کہ ؎

عزیزان ئے خپله او وژل په خپله — دا همه واړه تقدیر دے د سبحان
هسے نۀ چه دا ئے اوکړو نور به نۀ کړی — چه ئے زړهٔ شی هغه کاندی بادشاهان

"اُس نے اپنے عزیزوں کو خود قتل کیا اور یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے نوشتۂ تقدیر تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں کرے گا۔ کیونکہ بادشاہوں کا جو جی چاہے کر گزرتے ہیں"۔
اسی دور کے ایک اور شاعر عبدالحمید بابا اس واقعہ کے ضمن میں کہتا ہے ؎

هر سردار چه دخپل قوم د بد و خیال کا — آئینۀ دِ دخپل ځان حال دجمال کا
پریکوی دخپلو پښتو لاسنے بنافوله — چه بدی دعزیزانو په زرهٔ نال کا
عاقبت هغه سردار شی مردار پاتے — چه ئے نس دخپلو بدو ته نیوال کا

چه د میل وسرو مال وته هوس کری
تر هغهٔ پخوا به وزک خپل سرو مال کا

"ہر وہ سردار جو اپنی قوم کے ساتھ برائی کو مدِنظر رکھتا ہے، وہ اپنے شیشۂ دل میں جمال کا حال دیکھے۔ جو شخص اپنے عزیزوں کے ساتھ عداوت اور دشمنی کا رویہ اپنائے وہ درخت کی اُن شاخوں کو کاٹتا ہے جن پہ وہ خود کھڑا ہوتا ہے۔ انجام کار وہ سردار مردار ہو جاتا ہے جس کا نفس اُسے اپنوں کی برائی کی طرف راغب کرتا ہے جو دوسروں کے سرو مال کی ہوس کرتا ہے انجام کار وہ اپنا سرو مال گنوا بیٹھتا ہے۔"

افراتفری کے اس زمانے میں عاقبت اندیش حاکمانِ وقت مصلحت اسی میں سمجھتے تھے کہ اسی طرح گھر گھر لوگوں کو آپس میں لڑایا کریں۔ اور ایک کو دوسرے اور دوسرے کو تیسرے کے ہاتھوں بے بس بنا کر اپنا محتاج بنالیں۔ ایسے ہی حکام کے بارے میں رحمان بابا کہتے ہیں۔

پہ سبب د ظالمانو حاکمانو

کور او گور او پیښور درے واړه یو دی

"ظالم حکام کی بدولت گھر، قبر، اور پشاور تینوں یکساں ہو گئے ہیں۔

جاگیرداری نظام

پشتو معاشرے کی تشکیل قدیم زمانے سے چھوٹے بڑے کی تمیز کے اُصول پر ہوئی ہے۔ بڑے کے حقوق کی برتری محض اُسکے شخصی احترام کی حد تک تھی اُسکی بات سُنی اور مانی جاتی اور اُس کا حکم چلتا اور مانا جاتا مگر عام معاملات اور ملیت قومیت میں سب کے حقوق برابر ہوتے۔ یکسانیت اور مساوات کی رو سے پشتون معاشرے نے ہر کسی کے یہ حقوق تسلیم کئے تھے۔ اور کوئی بھی اس قدر آسانی کے ساتھ اُنہیں پائمال نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے حقوق کے لئے وہ ہر غاصب کے گریباں میں ہاتھ ڈالنے کا مجاز تھا۔ اور ہر ظالم اور جابر کے سامنے بے خوف ہو کر جا سکتا تھا۔ اس سے آنکھیں چار کر سکتا تھا۔ اور اُسکے اچھے بُرے کام کا محاسبہ اُسکے روبرو کیا جا سکتا تھا۔

چھوٹے بڑے کی تمیز کی اِن روایات اور انکے معاشرے کی اس جمہوری روح نے پشتون کو فطرتاً آزاد رکھا تھا۔ بعض قبیلوں میں یہ آزادی آج تک اِسی طرح موجود ہے۔ مگر پشتونخوا کے وہ قبیلے جو

براہ راست مغلوں کے زیر تسلط تھے یا مغلوں کے بعد نظام شاہنشاہی کے شکنجہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ اُن میں جاگیرداری کے اثرات کا سرایت کر جانا ایک قدرتی بات تھی۔ [۱]

مغلوں نے اپنی مملکت کے نظام میں استحکام پیدا کرنے اور امور سلطنت کو قائم دائم رکھنے کے لئے اپنے تمام قلمرو میں ایک مضبوط جاگیرداری نظام قائم کیا تھا اور اُس کی رُو سے پشتونخوا میں بھی خانی نوابی اور اربابی قائم کر کے ان زمامداروں کے ذریعے میدانی علاقوں کے پشتونوں کو اپنے زیر تصرف لے آئے تھے۔ اسی طرح مغلیہ نظام حکومت ایک مخروطی صورت میں تھی۔ جس میں دہقان نیچے جاگیردار درمیان میں اور حاکم سب سے اوپر تھا یعنی یہ کہ دہقان اور عام زمیندار، خان، نواب اور ارباب کے سامنے جواب دہ ہوتے اور جاگیرداروں کا یہ طبقہ افسر شاہی کو حساب پیش کرتا۔

علاقے کے امن و امان اور باج و خراج کی باز پرس اِن خانوں، نوابوں اور اربابوں سے کی جاتی یہ مہمات کے موقع پر امداد اور کمک بھی بھیجا کرتے۔ جاگیرداری کے اس نظام کی رو سے اِن پشتون قبائل میں جنہیں مغلوں نے قابو کیا تھا۔ طبقاتی کشمکش جاری رہتی تھی اور یہی سبب تھا کہ اُس وقت کے شعراء نے مغلیہ حکومت کے زمامداروں، اہل کاروں اور جاگیرداروں کے جور و ستم کے خلاف اپنے اپنے رنگ میں صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ روشانیوں کی نیم مذہبی انقلابی تحریک سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ یوسفزئی قبائل عملاً مغلیہ تصرف کے خلاف برسر پیکار تھے۔ خوشحال خان خٹک جب تک مغلوں کے منصبدار رہے تو صرف ملک ہی تھے مگر جب اُن سے یہ منصب واپس لے لیا گیا تو انہیں اپنی ذات مَلک یعنی فرشتہ دکھائی دینے لگی اور جبراً کہا ؂

چہ منصب ئے د مغل تو پریو ملک وم
چہ منصب د مغل نشتہ اوس مَلک یم

---

[۱] بعد کے پشتون معاشرے کو مشہور ماہر عمرانیات ڈاکٹر اکبر ایس احمد نے ننگ اور قلنگ کے دو معاشرتی گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

"جب میں مغلوں کا منصب دار تھا تو صرف ملک ہی تھا لیکن جب مغلوں کا یہ منصب باقی نہ رہا تو میں فرشتہ ہوں۔"

عبدالرحمان بابا بھی ایسے بیوقوف سوداگر نہ تھے کہ غلط سودا کرتے، وہ کبھی انسانی عظمت اور سربلندی کو کج کلاہان عصر اور سرداران وقت کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اُن کی شخصی عظمت کی یہ شان تھی کہ وہ برملا کہا کرتے تھے ؎

دد نیا د دولتو نوبے پروا یم — زۀ رحمان د عاشقئ په دا دولت کښے
چه لا به له حرمته سره نۀ دی — خدائے دِ مۀ کړه چاته هسے سیم و زر
دریا خر دے خدائے مۀ کړه په غاړه — رحمان کوږ دستار ترلے قلندر دے

"میں رحمان عاشقی کی دولت کے ہوتے ہوئے دنیاوی مال ومتاع اور جاہ وحشمت سے بے نیاز ہوں۔ اللہ پاک کسی کو وہ سیم وزر نہ دے جو عزت وآبرو اور احترام وحرمت کے ساتھ نہ ہو۔ رحمان ایک کج کلاہ قلندر ہے خدا کبھی اسے ریاکاری کی گودڑی نہ پہنائے۔"

کرامت انسانی کا یہ علمبردار جس کا مسلک عشق اور منزل وصالِ محبوب حقیقی تھا، مخلوق خدا کے ساتھ اُس کی محبت ایک قدرتی امر تھا۔ اسی محبت کا حقیقی اظہار جبر واکراہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کا انداز ایک مصلح کا سا تھا۔ اور وہ یوں کہ بات بنے بھی اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو۔ وہ اپنے ہمعصر اور آنے والے ہر دور کے دنیا داروں کو کہتے رہے ہیں کہ ؎

په آدم کښے د حیوان نوی نه هم شته — بیا هالے آدم بوله چه آدم شی
که سرے دے غرض واره سری هوش کړه — نه چه پټ دے د سرو زرو په لباس
آدمیت خۀ په دولت نۀ دے رحمانه — بت که جوړ شی د سرو زرو نۀ انسان شی

د خلیلؑ تر کعبے دا کعبه ده لویه
که آباد کا څوک دے ویران حرم د زړۀ

"بنی نوع انسان میں حیوانی خصائل بھی ہیں اُسے انسان تب کہو کہ وہ انسان بن کر دکھائے

اگر انسان ہو تو سبھی کام صاحب ہوش بن کر سرانجام دیا کرو۔ صرف یہی کافی نہیں کہ تم نے اپنے آپ کو طلائی لباس سے ڈھانپ رکھا ہو۔

اے رحمان! آدمیت کا انحصار دھن دولت پر نہیں۔ اگر سونے کا بت بنا بھی لیا جائے تو وہ انسان نہیں کہلایا جا سکے گا۔

اگر کوئی کسی کے دل کے ویران حرم کو آباد کر دے تو اُس نے معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے بھی بڑھ کر کارنامہ کر دکھایا۔"

افراتفری کے اس ماحول میں اور اُس وقت کے بے ترتیب نظام کے زمانے میں جب کہ مفکرین اور مصلحین یہ تماشا دیکھ رہے تھے، اس قسم کے تصورات کا جنم لینا اصلاح کے راستے تلاش کرنا اور لبا اوقات یاس و ناامیدی کا اظہار یا گوشہ نشینی اور انفرادیت کی طرف رغبت بیشک اُس وقت کے ظالمانہ نظام کے نتائج کی صدائے بازگشت تھی۔ جو نہ صرف خوشحال خان خٹک جیسی انقلابی شخصیت کے گفتار و کردار سے نمایاں ہوئی بلکہ اِن کیفیات نے رحمان بابا اور اُنکے دوسرے ہمعصر شعراء اور مفکرین کے کلام میں بھی نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ پھر رحمان بابا جیسے گوشہ نشین انسان نے بھی اورنگزیب جیسے وقت کے اُن جابر حکمرانوں کے خلاف آواز اٹھائی جن کی ظاہری فقیری کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

عالمگیر کے دورِ حکومت میں اُن کے ہاتھوں جو ناروا اور ناسزا مظالم سرزد ہوئے تھے رحمان بابا نے وہ بغیر کسی رُو رعایت کے دنیا کے سامنے ظاہر کئے ہیں اور اُس کا حشر مستقبل کے مستبدین کے لئے درسِ عبرت کا نمونہ بنا دیا ہے اور کہا ہے[1] ؎

اورنگزیب هم یو فقیر وو | چه تهوېږے وه په سر
و تهوېږ و ته ئے شاکره | چه ئے اوموندو افسر
خو ئے هومره فقیري وه | چه څه ئے نه وو میسر

---

[1] دیوان عبدالرحمان بابا ص ۱۴۲

کوره څهٔ چارے ئے اوکړے په عیال د خپل پـلـد ر
واړ په وارے ئے تر تیغ تیر کړو د خرم تمام ټبر
یو ټبر د خرم نهٔ وو دیر عالم ئے کړو د بر
تمامی عالم ئے اونغړ د چه ئے لاس شو باندے بر

اورنگزیب بھی ایک فقیر تھا۔ جس کے سر پہ ٹوپی تھی۔ لیکن جب اُسے تاج مل گیا تو ٹوپی کی طرف سے پیٹھ پھیر لی۔ اُس کی فقیری تب تک تھی جب تک کہ اُسے کچھ میسر نہیں تھا۔ دیکھو! اُس نے اپنے والد کی اولاد پر کیسے ستم توڑے۔ خرم کے سارے کنبے کو باری باری تہ تیغ کیا صرف خرم ہی کا گھرانہ نہ تھا بلکہ ایک عالم کو تہ و بالا کر دیا۔ اور جب اُس کا بس چلا تو ساری دنیا کو ہڑپ کر گیا۔"

اورنگزیب بادشاہ کی شخصیت کے اِس انجام کو جب عبدالحمید بابا نے دیکھا تو وہ بھی پکار اُٹھے کہ ؎

درویشي په تخت و تاج باندے زوال توری
تخت و تاج لره زوال تاخت و تاراج

"درویشی تخت و تاج کی وجہ سے زوال پذیر ہو جاتی ہے اور تاخت و تاراج کی وجہ سے تاج و تخت کو زوال آجاتا ہے۔"

برصغیر میں پشتو شاعری کے عروج کا زمانہ ایک زوال پذیر مسلمان شہنشاہیت کا زمانہ تھا۔ وہ بحران جس میں یاس اور نا اُمیدی کی کشمکش جاری تھی۔ شہنشاہ اورنگزیب کی وفات کے ساتھ تیزی سے زوال کی سمت چل پڑا۔ پشتون شعراء اور مفکرین اِس زوال کی عاقبت اور انجام سے واقف تھے۔ وہ چشم بینا اور دل دانا کے مالک تھے۔ اور وقت کے آئینے میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور جو تماشا پیش نظر تھا مگر عوام کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اِس کے انجام پر بھی نظر رکھتے تھے اور کہتے تھے ؎

دا حجاب چه نور عالم ئے حجاب بولي
دا زما او یار تر مینځه حجاب نهٔ دے

"یہ حجاب جسے باقی دنیا حجاب سے موسوم کرتی ہے، میرے اور میرے محبوب کے مابین حجاب

نہیں ہے ۔"

وقت کے یہ نقیب اپنے اپنے انداز میں آنیوالی بربادی کی منادی کرتے رہے اور کسی کی مرضی ہو یا نہ ہو، وہ اپنا فرض پورا کرتے کبھی کبھار یاس اور نا اُمیدی کی کیفیات اس حد تک پہنچ جاتیں کہ ان مصلحین کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو جاتا اور لازماً یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے[1]

چہ نا اھلو تہ د اھل وینا وایم ‌ ‌ ‌ ‌ یمسم یوزے تہ د خرۂ د ګلو ځانګہ

لہ ناکس سرہ ماز غہ مہ تورہ حمیدہ ‌ ‌ ‌ ‌ دم پہ تود شہ د خپل فکر پہ تیال زانګہ

"جب میں نا اہلوں کو اہلوں کی بات سناتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے گدھے کو شاخِ گل سنگھا رہا ہوں" "اے حمید نا اہل کے ساتھ مغز خوری کی ضرورت نہیں اس لئے خاموش ہو کر مکافات عواقب کے بارے میں اپنے آپ کو ورطۂ غور و فکر میں ڈال دے ۔"

زوال پذیر سلطنت کے ذمہ دار، حکام اور کارندے عموماً بڑے خود غرض اور بد دیانت ہوتے ہیں انکے ظلم و تعدی اور زیادتی کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا ۔ وہ نہ تو عدل و انصاف کر سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں اپنی مملکت کے استحکام اور رعایا کے آرام اور سکون کا خیال ہوتا ہے ۔ انکی نظر محض اپنے مفادات ، برتری اور ذاتی نفع و نقصان پر ہوتی ہے ۔ اور ڈوبتی ناؤ کے اُس تختے سے اُس لگائے ہوتے ہیں ۔جس پر وہ خود کھڑے ہوتے ہیں ایسے نظام میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر ایک کا یہی حال ہوتا ہے ۔لیکن ایسے لوگوں کا انجام اور عاقبت عملاً عبرتناک ہوتی ہے ۔ اس کی روشن مثال جمال خان اور گل خان کے المیئے سے ظاہر ہے ۔ اُس زمانے میں یہ پشاور کے گرد و نواح کا ایک اہم تاریخی المیہ تھا ۔ جو میدانی علاقے کے مومندوں میں پیش آیا تھا ۔عیسٰی اور جمال خان کی عداوت کا پس منظر جناب دوست محمد خان کامل نے میجر راورٹی کی کتاب selections from the poetry of Afghans (انتخاب شعرائے پشتون) سے یوں نقل کیا ہے[2]۔

---

[1] درو مرجان (دیوان عبدالحمید) ص ۹۸

"ناصر خان کی کابل کی صوبیداری کے زمانے میں ۱۱۲۲ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں جمال خان جو مومند کی خدرزئی شاخ سے تھا، اپنے عوام کی سیادت پر فائز ہوا اس دوران میں اپنے ایک عزیز عیسٰی کے گاؤں کو لوٹ کر تاراج کیا۔ انہی ایام میں جمال خان کے بیٹے جلال خان کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ اور صوبیدار ناصر خان نے اپنی طرف سے مبلغ دو ہزار روپے بھی بھیجے تھے کہ شادی میں صرف کئے جائیں۔ شادی کی رات کو جب جمال خان وغیرہ غافل تھے عیسٰی نے اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو اکٹھا کرکے جمال خان کے گاؤں پر حملہ کیا اگرچہ جمال خان اس حملے کا جواب دینے کیلئے تیار نہیں تھا پھر بھی وہ مقابلے کیلئے نکل آیا اور زخمی ہونیکے بعد اپنے گھر کی چار دیواری میں پناہ لی۔ عیسٰی نے گھر کو آگ لگادی اور جمال خان کا پورا گھرانہ اور اُس کے ساتھی جنہیں مرد و زن اور بچوں سمیت کل اسّی افراد تھے آگ میں زندہ جل کر بھسم ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ ۱۸ ربیع الاول سے کچھ عرصہ بعد پیش آیا ہے۔ اس لئے کہ رحمان بابا کی نظم میں شاہ عالم اور اعظم کے درمیان جنگِ تخت نشینی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ناصر خان شاہ عالم کی بادشاہت کے آغاز میں کابل کا صوبیدار مقرر ہوا تھا۔ باوجود اسکے کہ رحمان بابا نے ایک مصلح کی حیثیت سے اس واقعہ سے عبرت و سبق کا ایک موضوع اخذ کیا ہے پھر بھی اُس نے اسے "پشتونخوا" کا ایک قومی سانحہ گردانا ہے۔ اور جمال خان جلال خان اور گل خان کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے مغل حکام کو براہ راست اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اور یہاں تک کہا ہے، ؎

چې نه چې دا ئې اوکړل نور به نه ئې کړی
چې ئې ذره شي هغه کاندي بادشاهان

"یہ نہیں کہ اتنا کچھ کر چکنے کے بعد وہ مزید کچھ نہیں کریںگے۔ بادشاہ وہی کرتے ہیں جو اُنکے جی میں آتا ہے"

لیکن دوسری طرف عبدالحمید مومند نے عملاً اُن محرکات کے باعث جو اِس حادثے کا سبب بنے ہیں جلال اور جمال کے گھرانے کو عواقب اور نتائج کا ذمہ دار گردانا ہے اور اُن کو اس حد تک موردِ الزام ٹھہرایا ہے کہ یہ جو کچھ کہ پیش آیا محض کسی کے اُکسانے اور شرارت کی بنا پر پیش آیا، یہ

کون تھے؟ حمید خان بابا کے خیال کے مطابق وہ اغیار تھے جنہوں نے اپنی منشاء اور اغراض کو پورا کرنے کے لئے پشتونوں کو آپس میں مشت وگریبان کروا دیا تھا۔

جمال خان کو مغل حکام نے غدوزئی مومندوں کا سردار مقرر کیا تھا لیکن اُس کی یہ سرداری اُسے مغلوں کے مفاد و منشا کی تکمیل کے واسطے ملی تھی۔ اور اُن کی مرضی تھی کہ مومند قبیلہ کے اس شاخ کو بھی اُسی کلہاڑی سے کاٹیں جس میں اِسی درخت کا دستہ لگایا گیا تھا۔ پشتو کا کیا خوب ضرب المثل ہے۔ کہ "سانپ کو دشمن کے ہاتھ سے مارنا بھلا"۔ اور مغل سیاستدانوں نے بھی عملاً اُنکے ساتھ یہی کچھ کیا۔ حمید بابا نے جیسے کہ وہ مغلوں کی اِس سیاست سے واقف تھے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ؎

چہ لہ خپلو لاسو پښو شي بے مجالہ — لہ غلیم سرہ بہ جنگ بہ کوم مجال کا

بہ پردو مرانہ نہ کیږي بے خپلو — لہ لحدہ دا آواز جمال جلال کا

جب اپنے ہی دست و پا میں سکت باقی نہ رہے۔ تو پھر وہ دشمن کے ساتھ بھلا کیا جنگ کر سکیں گے۔ اپنوں کے بغیر دوسروں کی شجاعت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آواز اپنی اپنی قبر سے جمال اور جلال دے رہے ہیں"

اِس سے ایک بات بخوبی ظاہر ہے اور وہ یہ کہ غدوزئیوں نے جمال خان کو اپنا سردار تسلیم کیا تھا اور اُس کی عزت اور احترام اُس کی سرداری کی حد تک کرتے بھی تھے۔ لیکن جب کسی کے ورغلانے کی وجہ سے اُس نے اپنی سرداری اور برتری کی حد سے تجاوز کرنا شروع کیا اور بڑے چھوٹے کی تمیز کے اُصول کو توڑ دیا۔ اور جب یہ حد فاصل اُنکے گھرانے اور باقی عوام کے مابین باقی نہ رہی۔ تو آخر انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی اور بات اس حد تک پہنچی کہ ؎

دہ سردار چہ د خپل قام دبد و خیال کا — آئینہ دِ د خپل ځان حال د جمال کا

ؔ درو مرجان ص ۹۵

هم دا هسې نتیجه په لاس ور دروي — چه دېښو په بدله کښې ټوک ناتوال کا
نۀ نیکي په ناکسانو څرګنديږي — نه په پټ پاندے اثر آب زلال کا
لکه لوټے کړے لیوۀ بچه دېاند توپلي — حال زموږ او د جمال هم دا مثال کا
لکه ګوم چه په حسین حسن یزید وو — هسې ګوم په موږ جمال وو که ټوک سوال کا

خو بد نام په دا جمال خدا ئے خدرزي کړل
ګنړه هرچار په خلقو څپل اعمال کا

" ہر وہ سردار جو اپنی قوم کی برائی چاہتا ہے تو اپنی ذات کو آئینہ بنا کر اُس میں جمال کا حال دیکھے۔ نیز جو اچھائی کے بدلے برائی کرے اُسے یہی کچھ نتیجہ ملے گا۔ نا اہلوں پر نیکی ظاہر نہیں ہوتی اور نہ خالص پانی پتھر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر تم بھیڑیئے کے بچے کو پال کر بڑا کردو تو وہ آخر کار تم ہی پر حملہ کرے گا۔ ہماری اور جمال کی مثال بھی یہی ہے۔ جیسے کہ یزید حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اور اُنکی آل کے لئے مجرم ہوا۔ اگر کوئی پوچھے تو خدرزئی جمال کے سانحے کا سبب ٹھہرے۔ ورنہ لوگوں کو اُنکے اپنے اعمال کیوجہ سے سب کچھ پیش آتا ہے۔

بسا اوقات خودسری اور ذاتی خود غرضی انسان کو معاملے کے انجام اور نتیجے سے یکسر بے خبر کر دیتی ہے۔ ایسے حالات عموماً اُس معاشرے میں رونما ہوتے ہیں جو کسی مستبد حکومت کے شکنجے میں گرفتار ہو، اور انصاف اور عدل کے اُصولوں کی جگہ ذاتی انا، جبر و استبداد کے در کھول دیتی ہے۔

رحمان بابا اور عبدالحمید بابا دونوں کے اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا اصلی سبب اس کی حکومت کے ذمہ داروں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں تھیں۔ جناب کامل مومند کہتے ہیں کہ ,, شاعر نے جب دنیا کے سود و زیاں کی خاطر کئے گئے ایک حادثے کا (جس میں حکمران طبقے کے اغراض و مقاصد کو بھی عمل دخل تھا) "تذکرہ کیا۔ تو اُس نے کہا کہ " اُس نے یہ کچھ کیا اور مزید کچھ کرنے سے بھی نہیں ہچکچائے گا۔ اس لئے کہ بادشاہوں اور حاکموں نے ذاتی غرض و اقتدار کے

حصول کے لئے اس سے کہیں زیادہ نازیبا حرکتیں کی ہیں۔

مصری خان گگیانڑے جو اس دور کا ایک رنگین نوا شاعر تھا۔ اس افراتفری کے بارے میں کہتا ہے

ملک بہ ذر وران شی چہ عدل ۔۔۔ د ملک او دزیر نہ زدہ
اوس د ھغو امیری شوہ ۔۔۔ چہ خوئی دا میں نہ زدہ

وہ ملک جلد خراب ہو جائے گا۔ اس لئے کہ بادشاہ اور وزیر عدل سے ناآشنا ہیں اور اب امیری انکی ہو گئی جو امیری کی خو خصلت کو بھی نہیں جانتے۔ یا یہ کہ ؎

پہ دا دور دیوانیان نشتہ دیوان دی ۔۔۔ پہ لاحول ترے سا تلے بویہ ځان
ځان پہ وخت ترے پہ عزت اوباسہ مصرہ ۔۔۔ دے روز گار لرہ اوس بویہ بے شرمان

" اس دور میں عدل و انصاف کرنے والے نہیں ہیں بلکہ دیو ہیں۔ اور لاحول کہہ کر ہی ان سے گلو خلاصی کرنی چاہیئے۔ اے مصری خان! تم ہر وقت اپنی جان عزت و آبرو کیساتھ باہر نکال لو، کیونکہ اب تو اس روزگارِ زمانہ کے لئے ڈھیٹوں کی ضرورت ہے "

جناب (ڈاکٹر) خیال بخاری اس شاعر کے دیوان کے دیباچہ میں " مصری خان کے معاصرین " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ مصری خان نے مغلیہ بادشاہوں کے عروج وزوال کا درمیانی دور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خصوصاً عالمگیر کے بعد جب مغلوں کا زور اور ان کی قوت کا سورج زوال پذیر ہوا تو وہ عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ اور اس کے ساتھ ان کی شاعری بھی خاصی بلند پایہ ہو گئی تھی "۔

آپ آگے لکھتے ہیں کہ :۔ " انہی دنوں میں تخت دہلی پر جو افتاد آن پڑی تھی وہ تو تھی ہی۔ لیکن اس کے اثرات پشتونوں کی سرزمین تک جا پہنچے تھے اور اس ملک میں بھی سخت بے سکونی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو آبہ اور ہشتنگر میں گوناگوں قسم کے حملے، لڑائیاں اور ناخوشگوار واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے تھے۔ اگرچہ یہی وقت تھا جب رحمان باباؒ اور حمید باباکی شاعری اپنے کمال تک پہنچی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ اس پرآشوب دور کی سیاسیات اور بدحالی کے اثرات سے خود کو بچانے اور ایک طرح کی گوشہ نشینی اختیار کرنے کے

باوجود بھی خود کو اُس ماحول سے نہ بچا سکے اور ماحول کی اُس زبوں حالی کے بارے میں کچھ اشعار کہنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر بھی مفصل طور پر زیادہ کچھ تحریر نہیں کیا لیکن مصری خان نے اِس ضمن میں بہت کچھ لکھا ہے اور اُن تاریخی حقائق کو اُجاگر کیا ہے۔ جن کی بدولت اُس وقت کے حالات پیدا ہو گئے۔

قومی حیثیت سے مغلوں اور پشتونوں کی چپقلش قدیم سے جاری تھی۔ اس لئے کہ بہت سے تاریخی حوادث اِنکے مابین پیش آئے تھے۔ جن کی وجہ سے وہ کبھی ایک دوسرے پر اعتماد نہ کر سکے۔ یہ حقائق ایسے تھے کہ انہیں کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا یہاں تک کہ رحمان بابا اور اُن کے معاصر شعراء سے بہت پہلے حضرت اخون درویزہؒ نے بھی اِن کیفیات کی طرف اشارہ کیا ہے[1] کہ :۔

دین کا رخنہ اور فساد ابھی باقی تھا کہ اکبر ہمارا بادشاہ بنا یہ پرستار نفس اور دین سے بے خبر تھا۔ اکبر بادشاہ نے یوسفزیوں کو کئی خطوط لکھے کہ تاریک کے گرفتار شدہ گھرانے میرے حوالہ کر دو، اس طرح اکبر نے انکو یوسفزیوں کے قید و بند سے رہا کر کے اور زحمت سے چھٹکارا دلا کر اُن پر احسان کیا۔ لیکن اُسے پس منظر کا علم نہ تھا۔ اُس کابل کے درد اور حکمت سے وہ واقف نہ تھا۔ جلال الدین (روشانی) نے مکاری کر کے اچھا بھلا ہونے کے باوجود خود کو بیمار ظاہر کیا۔ خادموں نے اُسے روانہ کر کے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ اکبر نے اُسے کہا میں نے تجھ پر رحم کیا جب تم تندرست ہو جاؤ تو پھر آنا۔ تیری خدمت میں نے اپنے دربار میں مقرر کی ہے۔ جلال الدین ایک فریبی تھا وہ لاہور سے بھاگا اور جب تک اکبر کو اُس کی خبر ہوئی۔ وہ تیراہ میں اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔"

جلال نے گمراہوں اور بے راہروؤں کی ایک فوج جمع کی۔ جملہ چور اچکوں کو طلب کر کے جمع کیا کہ آجاؤ میں تمھارا بادشاہ ہوں۔ اور یہ ڈینگ بھی ماری کہ میں تمام پشتونوں کا بادشاہ ہوں اور میں پشتونوں کے ساتھ بھلائی کروں گا۔ پشتون گروہ در گروہ اُسکے پاس اکٹھے ہوئے لیکن وہ "پشتونخوا" کے لئے وبال جان بنا۔ اس کی وجہ سے سارے پشتون خوار و زبوں ہو گئے۔

---

[1] مخزن صفحہ ۱۳۴، ۱۳۵۔

یہ نحوست جلال الدین کی تھی کہ امرانے پشاور آکر قیام کیا۔ اور مغل پشتونوں کی طرف متوجہ ہوا، اور خود کو اُن کے اندرونی حالات سے آگاہ کرکے بارے میں اضافہ کیا۔ جلال کی اِس بے جا حرکت سے مغل نے تمام پشتونوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اور پھر جب جلال کی باری آئی تو وہ یلغار کرتا، اور دہقانوں اور مغلوں کے بہانے سے پشتونوں کو بھی قتل کر دیتا تھا۔ یوں پشتونوں کی سرزمین سر سر تباہ و برباد ہو رہی تھی۔ اور مزید خوار ہوتی چلی جائیگی "۔

جیساکہ بعد کے آنے والے تاریخی واقعات اور حالات سے ظاہر ہوتا ہے مغلیہ شہنشاہیت میں دور عالمگیری کے بعد مملکت کے زمہ داروں اربابوں خوانین اور نوابوں کا رویہ عوام کے ساتھ بیحد ظالمانہ رہا اور عوام اُنکے ہاتھوں بہت تنگ تھے۔ اِن ظالم حکام کی وجہ سے بقول رحمان باباؒ قبر، گھر اور پشاور تینوں ایک جیسے تھے۔ اور وہ پیش گوئی جو اخون درویزہ نے سالہا سال قبل کی تھی رحمان بابا اور اُنکے معاصرین شعراء کے دور میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی یہی حالات تھے جن کی وجہ سے اُس دور کے پشتون شعراء نے اپنے اپنے رنگ میں ظلم اور تعدی کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اُس زمانے کے حکام اور زمہ داروں کے رویہ کا رونا رویا ہے۔

مگر اس بحرانی دور نے پشتو ادب کو جو بھاری ادبی ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ خیالات، جذبات، شاعرانہ خوبیوں اور محاسن کے لحاظ سے سب سے افضل اولیٰ ہے اِس لئے اِس دور کو پشتو ادب کا زرین دور کہنا بے جا نہ ہوگا۔

اِس دور کی ابتدا خوشحال خان سے ہوئی ہے اور احمد شاہ ابدالی کے دور پر جاکر اختتام ہوا۔ اس کے بعد شاعری کا معیار خصوصاً غزل میں روبہ تنزل رہا ہے۔ اور وہ رعنائی اور رنگینی باقی نہیں رہی ہے جو اُس دور کی غزل میں موجود تھی۔

بقول علامہ شبلی نعمانی شاعری کی اصل حقیقت اظہار جذبات ہے یعنی شاعر پر کوئی جذبہ طاری ہوا اب وہ اِس جذبے کا اظہار اِس طریقے سے کرے کہ دوسرے دن بھی اُس جذبے کا اثر روز اول کی طرح قائم ہو۔ جیسے کہ رحمان بابا کا کلام یا اُنکے بعض معاصرین کے اشعار۔

اِس دور کی غزل میں سادگی، صفائی، اور روانی تھی۔ اس میں گنجلک انداز اور بے جا خیال آرائی نہیں تھی۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے اُس دور کے پشتو کے ادب عالیہ نے اپنا ایک مخصوص قسم کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ وہ معیار جس تک متأخرین میں سے کوئی شاعر نہ پہنچ سکا۔ متأخرین کے گروہ کے اکثر شعراء نے اُسی زمین میں شاعری کرنیکی کوشش جاری رکھی جو خوشحال خان خٹک، عبدالرحمان بابا اور عبدالحمید ماشوخیل نے تخلیق کی تھی۔ اسی طرح پشتو غزل میں براہ راست یا بالواسطہ اِن تین شخصیتوں کے تتبع میں پیش رفت ہوئی۔ لیکن مجموعی طور پر اِس دور میں عبدالرحمان بابا ایک ایسی شخصیت ہے جو آسان، روان، سادہ اور پُرسوز شاعری کی برکت سے پشتو زبان کے چمن ادب کا بلبلِ رنگین نوا رہا ہے۔

" گگیانی شاعر مصری خان "

اسی دور میں گگیانیوں کے علاقے میں پشاور کے نزدیک کانگڑہ کے مقام پر مصری خان نامی ایک صاحب دیوان شاعر پیدا ہوا۔ اس نے بھی اورنگزیب عالمگیر، بہادر شاہ اور فرخ سیر کا زمانہ دیکھا۔ دوسرے پشتون شعراء کیطرح اِس دور کے سیاسی حالات اور اخلاقی و معاشرتی زندگی کے بارے میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے، چونکہ یہ شاعر کچھ مدت تک براہ راست ملازمت میں تھا اور حکومت کے دستاویزات اسکی نظر سے گذرتے اس لئے ایک شخص جو حساس بھی ہو اور صاحب فہم و ذکا بھی، تو قدرتی طور پر وہ اپنے اُن تاثرات کو قلمبند کرے گا جو اُسکے جذبات و احساسات کو مشتعل کرتے ہوں۔ تاریخ ادبیات کے لکھنے والے یا تنقید نگار اگر کسی شاعر کا ذہنی تجزیہ کرنے لگیں، تو لامحالہ وہ ہر شخص کے کلام میں چند گنی چنی بنیادی باتیں یا مسئلے ڈھونڈ نکالیں گے۔ جو اُس شاعر نے ایک یا دوسرے رنگ میں بیان کئے ہونگے۔ موضوع و مدعا کا مرکزی انداز بھی وہی ایک ہی ہوگا لیکن اس کا اظہار الگ الگ انداز اور پیرایہ میں ہوا ہوگا۔ مثلاً عشق جیساکہ اکثر شعراء کا

بنیادی موضوع اور شاعری کی اساس ہے ۔ لیکن اگر کیفیت عشق اور واردات عشق کا جائزہ لیا جائے اور معشوق کے حسن کے بارے میں بیان کو دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ شاعر کے جذبات آخر کیونکر برانگیختہ ہوئے ہیں ؟ اور محبوب کے حسن جسمانی کے کونسے حصے یا اس کی کونسی ادا اُسے زیادہ بھا گئی ہے ؟

پشتون شعراء میں شاید کاظم خان شیدا کے سوا ایسا کوئی اور شاعر نہیں ہوگا جس کے معشوق کے وجودی مقام کا تعین نہ کیا جا سکے ۔ پشتو میں یہی ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے خیالی محبوب کی محبت میں کلی طور پر دیوانہ ہے لیکن اس نے بھی عشق ، حسن ، اور زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ کا ملاً بعد الطبیعیاتی یا ماورائے ادراک نہیں ۔

مصری خان گگیانڑی کے کلام میں بھی اپنے زمانے کے حالات کے مطابق بعض ایسے مسائل زیر بحث آئے ہیں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اُس کی ذات ، شخصیت ، جذبات ، احساسات اور افکار پر اثر انداز ہوئے ہیں ۔ اِس میں حسن و عشق کے مباحث کے علاوہ اُس وقت کے مقامی حالات اور پیش آنے والے واقعات پر خاصی طویل نظمیں موجود ہیں جو عملاً اِس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ شاعر زمانے کی عمومی روش سے لاتعلق نہیں تھا ۔ مرحوم مولانا عبدالقادر نے اُنکے دیوان کے پیش لفظ میں لکھا ہے[1] کہ :۔

" خوشحال خان کے بعد آج تک جن بلند پایہ شعراء کا کلام چھپا ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصری خان ہی نے زندگی کے عام واقعات اور اپنے وقت کے سیاسی حالات پر لمبی اور طویل نظموں میں تبصرہ کیا ہے اور جیسا کہ اُس زمانے کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ملک تیس انتشار کا شکار تھا اور جو مشکلات اُسے درپیش تھیں یا اُسکے دوستوں ، بزرگوں اور اُس وقت کے علماء اور خوانین پر جو کچھ بیت رہی تھی ۔ اُنہوں نے اُس کا تذکرہ نہایت خوبصورت اور واضح انداز

---

[1] دیوان مصری خان پیش لفظ صفحہ ۲ چھاپ شدہ پشتو اکیڈمی پشاور

میں کیا ہے ۔ اس علاقے کے تاریخی حالات کے بارے میں محققین کو مصری خان کے دیوان میں اتنا تاریخی مواد ہاتھ آئیگا کہ اگر کوشش کی جائے تو اس کی مدد سے اُس زمانے کے تاریخی حالات کا صیحح خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے ۔

اِس شاعر نے بھی تین مغلیہ بادشاہوں یعنی اورنگزیب ، بہادر شاہ اور فرخ سیر کا زمانہ دیکھا تھا اور جیسا کہ کہا گیا ہے یہ تمام کا تمام ایک پُر آشوب دور تھا ۔ اس دور نے اُس وقت کے دوسرے شعراء کی طرح گگیانیوں کے اس شاعر کو بھی اپنے عوام کے سیاسی ، اخلاقی اور معاشرتی زوال کے مسائل پر غور و فکر کرنے پر مجبور کیا تھا ۔ اور اپنے خاص انداز میں ان مسائل کو موضوع بحث بنا رکھا تھا مروجہ علوم پر عبور کیوجہ سے ان کے کلام پر علمیت غالب ہے ۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ ؎

کار مدار په نیک عمل دے مصری خانه
نۀ په فقه مسائل و دَ نکات

" اے مصری خان ! کام کا دار و مدار نیک عمل پر ہے نہ کہ فقہ کے مسائل کے بیان اور دقیق نکات کی تشریح پر ۔"

پشتون شعراء کے کلام میں انکے پیشرووں یا ہمعصر شاعروں کا کچھ نہ کچھ ذکر آیا ہے ۔ یہ سارے خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمان بابا کے نقشِ قدم پر چلے ہیں اور جس طرح کہ انہوں نے دوسروں کے ادبی کلام یا مقام پر تبصرہ کیا ہے اسی طرح اپنے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ رائے قائم کی ہے اور اسے اگر چہ بعض دفعہ خودستائی اور شاعرانہ تعلّی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ لیکن بسا اوقات یہ حقیقت بیانی سے خالی نہیں ہوتی ۔ اور ہر شاعر اپنی جگہ مصری خان گگیانڑی کی طرح اس میں مگن رہتا ہے کہ

؎ د خپل شعر سرود نه غبږ وم لیل و نهار
بیا

هر کلام چه دے د ډیرے ظاهر بندی
هم د مصری د زړه حال دے نور څۀ نشته

"اپنے اشعار کے سرود دن رات بجاتا ہوں"

ہر وہ کلام جو اُس کی زبان سے ادا ہوتا ہے وہ مصری خان ہی کے دل کا حال ہے مزید کچھ نہیں"

مصری خان کے کلام میں بھی اپنے اُن پیش رووں کا تذکرہ موجود ہے جیسا کہ کہتے ہیں ؎

شعر د فارسئ ویہم شیرین لکہ شکرہ
شعر د پشتو کړو تر فارسئ حمید رحمان لذیذ

د خوشحال بلبل د شعر په چمن کښے
نہ گڼړی سرود ے تر ناهیده د آسمان لذیذ

"فارسی کا شعر اگرچہ قند و نبات کی طرح شیرین ہوتا ہے لیکن پشتو شعر کو حمید اور رحمان نے فارسی سے بھی زیادہ لذیذ بنا دیا"

"شعر کے چمن میں خوشحال خان خٹک ایک بلبل ہے جو آسمان میں ناہید تک کے سرود کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا"

بیدل شاعر اپنے پیش رووں اور ہمعصروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

چہ مشهور ے په پښتو ژبه دیوان د
شعر او کښے هغه عبد الرحمن دے

تمال وحال ئے سره سم زیات و کم نه دی
مسلم ځکه دهر دانا نادان دے

په سلطان الشعراء دے ملقب دے
چه ئے بیت مصرع په هر ځائے کښے روان دے

قلندر عبد الحمید خواجه محمد دے
هم غفور اشرف خلیل او کامگار خان دے

مسلم په شعر دا دے وهر چا ته
چه هر یو له دیو وارو نکته دان دے

خصوصاً عبد الحمید په کښے حمید دے
چه و یښته څیری په فکر هسے توان دے

که خوشحال خټک اشرف او که مرزا دے
ارزانی که ورسره بل مصری خان دے

هر چه دی زما د عصر هغه دا دی
چه هر یو په کښے خوشخو په سخندان دے

صاحبزاده محمدی علی خان گوره
هم سعید له میان اکبر سره عیان دے

محمدی تر حمید زیات و یم کم نه دے
هر چه ذره و نه پرے غوځیږی علیخان دے

چه ممتاز زما د عصر دی هم دا دی
نور بے شمار دی دد ے وارو سامان دے

څۀ حاجت چه دِ بیان اوکړم دوارو   اوۀ څلویښت زما د کلي چه آتمان دے

هر یو کا نکته داني په خپله یو هم

بیل په بیله هر یو ۀ کښے دیوان دے

"پشتو زبان میں جس کا دیوان شعرا میں مشہور ہے، وہ عبدالرحمان ہے اُس کے حال و قال میں کمی بیشی کا تفاوت نہیں اس لئے یہ ہر دانا اور نادان کے نزدیک مسلم ہے۔"

وہ سلطان الشعراء کے لقب سے ملقب ہے جس کی ہر بیت اور ہر مصرعہ اپنی جگہ ایک واضح دلیل ہے۔ قلندر، عبدالحمید اور خواجہ محمد (بنگش) غفور، اشرف، قبیل اور کامگار خان (خٹک) بھی بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر دوسرے سے بڑھ کر نکتہ دان ہے۔

ان میں خصوصاً عبدالحمید قابل صد ستائش ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے۔ جو فکر کی باریکیوں کی بدولت جہانِ سخنوری میں موشگاف کہلاتا ہے۔

خوشحال خان خٹک، اشرف خان ہجری، مرزا خان انصاری، دزانی اور اُنکے ساتھ ہی مصری خان سبھی میرے عصر کے جو نامی گرامی شاعر ہیں وہ یہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک خوش اخلاق اور سخن دان ہے۔

صاحبزادہ محمدی، علی خان دیکھئے نیز سعید اور میاں اکبر دونوں بھی نمایاں ہیں۔

میں محمدی (صاحبزادہ) کو حمید سے زیادہ قابل سمجھتا ہوں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے مگر جس کا کلام دلوں کو زخمی کرتا ہے وہ علی خان ہے۔

میرے زمانے کے ممتاز شعراء یہی ہیں۔ اور بھی بیشمار ہیں اور اُن کا کلام بھی اچھا ہے مگر کیا ضرور ہے کہ سب کا بیان کروں۔

میرا گاؤں جو آتمان کہلاتا ہے صرف اُس میں سینتالیس شاعر ہیں ان میں ہر ایک اپنی سمجھ کے مطابق نکتہ دانی کرتا ہے اور ہر ایک نے اپنے پیش رؤں اور شعرائے معاصرین کا تذکرہ کیا ہے۔

بیدل نے اول درجے کے صاحب دیوان شعراء کا تذکرہ ایک ایک کرکے کیا ہے اور آخر میں کہتے ہیں کہ اگر پشتو کے تمام ہمعصر شعراء کو فرداً فرداً گنواؤں تو پھر تو صرف میرے ہی گاؤں میں ۴۷

صاحب دیوان شاعر موجود ہیں۔
اس دور کا ایک اور شاعر عبید اللہ احمدی صاحبزادہ کہتا ہے ؎

د عبدالحمید دیوان هم پروت حاضر وو چه مشتاق ورته په هر ساعت ناظر وو
هم دا د ننګ د مصري خان د علي خان وو د صدیق دیوان څرګند چه په بیان وو

"عبد الحمید کا دیوان بھی موجود تھا۔ اور ہر گھڑی اسے دیکھنے والا اس کا مشتاق نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح مصری خان، علی خان اور صدیق کے دواوین بھی تھے جو سب کے سب اپنے حسنِ بیان کی وجہ سے نمایاں تھے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمدی صاحبزادہ کے وقت تک مصری خان کے دیوان نے پشتو شاعری میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ لوگ بہت دلچسپی سے اسے پڑھتے اور اس کی منقول دوسرے دواوین کی طرح اپنے لئے حاصل کیا کرتے۔

مہمند معز اللہ خان

ادب عالیہ کے اس دور کے ایک اور صاحب طرز شاعر معز اللہ خان مہمند تھے۔ اُنہوں نے پشتو فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اور مکمل دیوان "آئینہ معنی نما" کے نام سے چھوڑا ہے۔ یہ دیوان ۱۹۵۸ء میں پشتو اکیڈیمی پشاور کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس شاعر کے کلام کے زیادہ تر مباحث عشق کے اسرار و رموز ہیں۔ معز اللہ خان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا کہ بقول ڈاکٹر خیال بخاری:

"حکومتِ وقت سے وفاداری اور اطاعت اِس خاندان میں ابتداء ہی سے تھی۔ اور یہ یقینی ہے کہ بزرگوں نے شاہجہان بادشاہ کے لئے کوئی ایسی اہم خدمت سرانجام دی ہو گی کہ اس ملک کا انتظام کرتے وقت انہیں یہ بلند منصب مرحمت فرمایا گیا"[۱]

معز اللہ خان ارباب مستجاب خان کا پڑپوتا عبدالنصیر خان کا بیٹا اور محمدی خان کا نواسا تھا۔ دورِ شاہجہانی

---

[۱] دیباچہ دیوان معز اللہ خان ص ۱۱ (پشتو اکیڈیمی چھاپ

میں اِس گھرانے کو موہمندوں کی اربابی اور نوابی دی گئی تھی۔ جب اورنگزیب کے دورِ حکومت میں خوشحال خان خٹک کو گرفتار کیا گیا اور اُسے دہلی بھجوا رہے تھے تو مستجاب خان ارباب کو اُس کے ساتھ بدرقہ کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ خان علیین مکان اپنی مشہور ترکیب بند ذوالقافیتین میں کہتے ہیں۔ سہ

ھندتہ ئے روان کرم بدرقہ مے مستجاب
ھم ملک ھم خان ھم د تمام غوری ارباب

"مجھے ہند روانہ کیا گیا اور میری حفاظت کے لئے مستجاب کو ساتھ بھیجا گیا جو ملک، خان اور تمام غوریوں کا ارباب بھی ہے۔"

کوئی کے اِن اربابوں کی اس روایتی وفاداری نے جو وہ مغلیہ حکومت کے ساتھ روا رکھتے تھے اِن کی فکر و نظر کچھ ایسی کر رکھی تھی کہ ملی رحجانات کی جگہ بدلتی ہوئی انتظامیہ کے ساتھ انکا تعلق ہمیشہ استوار رہا۔ یہی سبب ہے کہ ہر چند کہ معز اللہ خان کا شعر رنگین اور شیریں ہے لیکن اس کے موضوعات قطعی محدود ہیں۔ اس لئے کہ جو مسائل عوام کو پیش آتے اُن مسائل کو وہ شاہی ملازمت کی بنا پر اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ اور نہ اِس شدت کے ساتھ اُن کے گھرانے کے افراد اسے محسوس کرتے جس شدت سے اُن لوگوں نے ان مسائل کو محسوس کیا تھا۔ جو اُس زمانے میں یا تو براہ راست اُن کی زد میں تھے۔ یا عبدالرحمان بابا، عبدالحمید ماشوخیل اور مصری خان گگیانڑی قسم کے لوگ تھے جو ان حوادث اور واقعات کو جب دیکھتے تو اُن کا دل دُکھتا یہی سبب ہے کہ اُنکے کلام میں کسی ایسے اہم ملی واقعے کا تذکرہ نہیں جو قومی لحاظ سے پشتونوں کے لئے اہمیت کا حامل ہو۔

"اِس دَور کے پسندیدہ موضوعات"

پشتو شاعری کا یہ دور جس کا آغاز خوشحال خان خٹک سے ہوا ہے۔ پشتو ادب عالیہ کے عروج کا دور ہے لیکن پھر بھی جو تنوع اور رنگا رنگی خوشحال باباکے کلام میں ملتی ہے، وہ اُسی کے ساتھ ہی

ختم ہوگئی ہے ۔خوشحال خان کا کلام ہمہ جہتی خوبیوں کا مرقع ہے ۔ زبان کی تراکیب ، صنائع ، اصناف اور موضوعات کی رو سے خان علیین مکان نے اپنی شاعری کمال تک پہنچائی ہے اور پشتو زبان کو اس سے مزین کیا ہے ۔ خان کی شاعری میں متقدمین کی سادگی ، بیان کی پختگی ، عقائد کی تعلیم ، حب وطن ، عشق کے اسرار و رموز ، درس اخلاقیات اور زندگی کے عام مسائل سبھی بڑے دلچسپ انداز اور شاندار پیرایہ میں موجود ہیں ۔ اور ہر موضوع کے اظہار کے لئے شاعری کے خاص اصناف کو منتخب کیا گیا ہے ۔ عقائد ، سیاست ، تاریخی واقعات ، علمی مباحث ، رپورتاژ اور اخلاقیات کو عموماً طویل نظموں ، قصیدوں ، ترکیب بند ترجیع بند اور مسدس میں نظمایا گیا ہے ۔ مختصر نکات اور موضوعات کو رباعیوں اور قطعات میں اور واردات حسن و عشق اور سوز و گداز کی باتیں اکثر غزل میں کہی ہیں ۔

خوشحال خان بابا کے کلام میں ایسی شاعری جس میں فطرت کی منظر کشی کی گئی ہو ۔ کافی زیادہ ہے اس میں پشتونخوا کے قدرتی مناظر کا تذکرہ اور بدلتی رت کے کوائف کے علاوہ ہند اور دکن کے علاقے میں عمومی ماحول کا بیان "وطن پشتونخوا" کے ساتھ اس کا موازنہ اور مقابلہ بہت دلچسپ پیرائے میں موجود ہے ۔ اسی طرح جیل کا ماحول اور نظر بندی کے زمانے میں وطن کی یاد سے پیدا شدہ منظوم جذبات خان کے کلام کا وہ دلکش باب ہے ، جس میں سبھی اشعار مغربی شاعری کی طرح مذکورہ محاسن کی دلاویزی کے حامل ہیں اگر ایک طرف ان میں محبت کے جذبات انگڑائی لے رہے ہیں تو دوسری طرف زخم خوردہ جذبۂ انتقام کا مجسم کر دینے والا لاوا بھی روشن ہے ۔ خوشحال خان کی شاعری کی یہ خوبی انیسویں صدی کے مستشرقین اور بیسویں صدی کے قوم پرست اور تجدید پسند ادباء اور شعراء کی نظر میں باقی مشرقی شاعری کے مقابلے میں انکی شاعرانہ عظمت و فضیلت پر دال ہے ۔ ایسی ہی شاعری کی برکت سے انہیں پشتو کی جدید شاعری کے ہراول دستے کا سردار اور بانی کہا جاتا ہے ۔

ایرانی ادب میں جن خوبیوں کا گلدستہ فردوسی ، حافظ ، سعدی اور خیام کے کلام سے مشترکہ طور پر تیار کیا جا سکتا ہے ۔ وہ اکیلے خان موصوف کے گلستان شاعری میں مزید کئی اور خوبیوں کے

ساتھ موجود ہے۔

عشق اور اخلاقیات اِس دور کی شاعری کا بنیادی عنصر تھا اس لئے کہ اس دور کے ہر شاعر کو یہ یقین تھا کہ "مجازی ہو یا حقیقی محبت سراسر دولت ہی دولت ہے" اور محبت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی سبھی خوبیاں اُجاگر کرتی ہے اور خامیوں کو چھپاتی ہے۔ اسی کی برکت سے انسان لذت زیست سے آگاہ ہوتا ہے اور روحانی ارتقاء پا سکتا ہے۔ یہی حسن و عشق کے رنگین اور دلچسپ بیان ہیں جو لازوال بھی ہیں اور اُکتاہٹ سے مبّرا بھی ؎

چہ تو ئے وایم نہ ختمیږی نہ لنډیږی چرے
دومرہ تونږ د دومرہ اوږدہ دہ دجانان قیصئ

میرے محبوب کی کہانی اس قدر پُرلطف اور اتنی طویل ہے کہ میں جس قدر بھی اسے بیان کروں نہ تو یہ کبھی ختم ہوتے آتی ہے اور نہ مختصر ہونے تیں۔

یہی قصہ خوشحال خان نے بھی کہا ہے اور عبدالرحمان بابا نے بھی یہی اشرف خان ہجری، عبدالقادر خان، سکندر خان، صدر خان، کامگار خان اور کاظم خان شیدا کے کلام کے لئے بھی باعث زینت ہے ور عبدالحمید مصری خان، معزاللہ خان، بیدل، کریمداد، خواجہ محمد بنگش، محمدی صاحبزادہ علی خان، احمد شاہ ابدالی اور اُس زمانے کے دوسرے شعراء کے کلام میں بھی پوری آب وتاب کے ساتھ آیا ہے۔ اگر خوشحال خان نے یہ کہا ہے کہ ؎

ما پہ عشق کښے رسولے دے خپل کار ترھغے حدٔ
لکہ توک پہ مټ د تورے سزاوارشی د خانئ

"عشق میں، میں نے اپنا کام اِس حد تک پہنچا دیا ہے۔ جیسے کوئی اپنے بازوئے شمشیرزن کے طفیل خانی کا مستحق ہو جائے۔"

عبدالرحمان بابا اور اُسکے ہمعصر شعراء کے جذبات اور احساسات بھی اس سلسلے میں اپنی انفرادیت کے حامل ہیں ان کی اس انفرادیت کا ایک ایک نمونہ مثال یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"عبدالرحمان بابا"

زۂ عاشق یم سرو کار مے دے لہ عشقہ

نۂ خلیل نۂ داوُدزے یم نۂ مهمند

"میں عاشق ہوں اور مجھے عشق ہی سے سروکار ہے۔ نہ میں خلیل ہوں۔ داوُدزے اور نہ مومند۔"

"اشرف خان ہجری"

محبت زما دے پیر زۂ دے شاگرد یم

مواعظ دِ قیصے نہ کا سر ور سے

"محبت میرا پیر اور میں اس کا شاگرد ہوں۔ اس میں جو کچھ بھی مواعظ ہیں ان میں کوئی بیکار قسم کی طویل داستان نہیں ہے۔"

"عبدالحمید ماشوخیل"

خان بہ مر د عشق پہ ځیل کرمہ ناصحہ

وا بہ نۂ ورم زۂ حمید هسے پښتون یم

"اے ناصح! عشق کی ہٹ پر میں اپنے آپ کو قربان کردوں گا۔ میں وہ پشتون ہوں کہ راہِ عشق سے ہرگز ہرگز پلٹ کر نہیں جاؤں گا۔"

"سکندر خان خٹک"

د عشق پہ کرانہ لار کښے مشتاقان کلہ پہ پښو ځی

پہ سترګو پہ لیمہ پہ سر پہ لاس نۂ ځی پہ زړہ ځی

"عشق کے کٹھن راستے پر مشتاقانِ عشق بھلا کب پاؤں کے بل چلتے ہیں! وہ تو آنکھ سر اور قدم کے بل بھی نہیں چلتے بلکہ دل ہی کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔"

"صدر خان خٹک"

د عشق یو سبق کافی دے

نور د ټول جهان دفتر هیڅ

"عشق کا ایک ہی سبق کافی ہے اور باقی سارے جہان کا دفتر ہیچ ہے۔"

"معزاللہ خان مومند"

رقیبانو بہ لرغوت وم پائمال کړے

معز اللہ کہ مے یار نۂ کړے حمایت

"اے معز اللہ خان اگر میرا محبوب میری حمایت نہ کرتا تو رقیب مجھے کب کے پائمال کر گئے ہوتے۔"

مصری خان گگیانڑے

زۂ لہ عشقہ یم زو کڑے
عاشق تارک الانساب

"مجھے تو عشق نے جنم دیا ہے اور عاشق تارک الانساب ہوتا ہے۔"

کامگار خٹک

کامگارہ عشقہ نۂ دی څہ لوستلی
تل سبق اخلم د مینے لہ الواحہ

"عشق کے بغیر میں نے اور کچھ نہیں پڑھا۔ میں ہمیشہ الواح محبت سے ہی درس لیا کرتا ہوں۔"

کاظم خان شیدا

التفات مے پہ الواح د خارا بویہ
د میناغوندے مے زیست پہ څیکلو دے

"مشکل ہے کہ سنگدل محبوب، ملتفت ہو اسی لئے تو صراحی کی مانند میری زندگی کا انحصار خون جگر پر ہے۔"

خواجہ محمد بنگش

زۂ خواجہ محمد شاکر پہ دا نعمت یم
چہ د عشق برخہ مے شولہ لہ الستہ

"میں خواجہ محمد اس نعمت پر شاکر ہوں کہ روز ازل ہی سے عشق سے بہرہ ور ہوا ہوں۔"

علی خان

چہ مے زړۂ د عاشقئ پہ طریقت لاړ
ھغہ دم څخہ آرام او فراغت لاړ

"جونہی میرا دل راہ عشق پر گامزن ہوا۔ اسی وقت میرا تمام سکھ اور چین جاتا رہا۔"

احمد شاہ ابدالی

چہ سر پریکړی احمد شاھہ
د ھغو مینہ رینتیا دہ

"اے احمد شاہ! انہی کا عشق صادق ہے جو راہِ عشق میں اپنا سر قلم کر دیتے ہیں۔"

عبدالحمید[1] نازک بیان

جیساکہ کہاگیا ہے، اس دور کی شاعری کے تین بڑے موضوعات عشق تصوف اور اخلاقیات تھے۔ رحمان بابا اور خوشحال خان کے علاوہ اس قسم کی شاعری اس دور میں اکثر شعراء نے کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی طرز اور اپنا انداز ہے۔ لیکن جو لطف اور جو مزہ عبدالحمید بابا ماشوخیل کے کلام میں موجود ہے وہ یقیناً انہی کا حصہ ہے۔

عبدالحمید مومند پشاور کے نواح میں ماشو گگر نامی گاؤں کے باسی تھے۔ قومیت کے لحاظ سے مومند قبیلے کے ماشوخیل شاخ سے تھے جناب سید انوارالحق کے بیان کے مطابق اس نازک خیال شاعر کے حالاتِ زندگی بھی بے قدریٔ زمانہ کی وجہ سے کس مپرسی کے گڑھے میں پڑے ہیں لیکن یہ بات اچھی طرح واضح ہے جیساکہ اس کتاب کے موضوع "نظام جاگیرداری" کی بحث میں آیا ہے کہ عبدالحمید بابا کا اپنے علاقے کی عوامی زندگی سے براہ راست گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ اپنی قوم کی شادی غمی میں عملاً شریک ہوا کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب جلال خان، جمال خان اور گل خان کے قتل کا المیہ پیش آیا تو اس دور کے جو شعرا اس واقعے سے براہ راست یا بالواسطہ متأثر ہوئے انہوں نے اپنے تأثرات عبرت حاصل کرنے کے لئے قلمبند کئے۔ عبدالحمید بابا بھی اُن شعراء میں سے ایک تھے جنہوں نے اس المیہ کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا لیکن آنکے جملہ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی جلال و جمال کے حزب مخالف کا طرفدار تھے اور ہمدردی کی بجائے جلال خان اور جمال خان کو عوام کے ساتھ بدسلوکی کی غلط روش اختیار کرنے والے اور مغلوں کے درغلانے پر پشتونوں پر آنکے جبر و تشدد کرنے کو حقارت

---

[1] پیدائش ۱۰۷۵ - ۱۰۸۰ھ کے درمیان (تاریخ ادبیات: انوارالحق کے اندازے کے مطابق) وفات: ۱۱۴۵ھ (راورٹی کی تحقیق)

سے دیکھتے تھے اور اس حادثے کو ان کے عمل کا مکافات اور نتیجہ خیال کرتے تھے۔ حمید بابا فطرتاً "مغلوالہ" کے دشمن تھے اور اپنی قوم اپنے قبیلے اور "پشتونولی" کے ننگ و ناموس کے سختی سے طرفدار اور حامی تھے۔ اس وجہ سے ایسے لوگوں کا عمل جو اپنوں کی بجائے بیگانوں پر تکیہ کرتے ہیں، انہیں مناسب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسی لئے تو اس واقعہ سے یہ عبرتناک نتائج اخذ کئے ہیں کہ ؎

هر سردار چه د خپل قام د بد و خیال کا — آئینه دِ د خپل ځان حال د جمال کا

چه له خپلو لاسو پښو شی بے محاله — له غلیم سره به جنګ په کوم مجال کا

په پردو مړانه نه کیږی بے خپلو — له لحده د ا آواز جمال جلال کا

هم دا هسے نتیجه په لاس ورددومی

چه د ښو په بدله کښے ټوک ټا ټوال کا

ہر وہ سردار جو قوم کی برائی کا سوچے اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے اعمال کے آئینہ میں خود کو دیکھ کر یہ جان لے کہ اس کا حال بھی بالآخر جمال جیسا ہوگا جب کوئی شخص اپنے دست و پا کی قوت سے محروم ہو جائے وہ کیونکر اپنے دشمن کے ساتھ مقابلہ کر سکے گا؛ اپنوں کے بغیر غیروں کی شجاعت پر اعتماد و انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی آواز جلال اور جمال کی قبروں سے آرہی ہے۔ وہ جو اچھائی کا بدلہ برائی سے دے تو اُسکا آخرکار یہی انجام ہوتا ہے۔"

عبدالحمید بابا کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عالم فاضل شاعر تھے انہوں نے فارسی عربی علوم حاصل کئے تھے۔ انکی مثنوی "شاہ و گدا" کا ماخذ بھی ایک فارسی مثنوی تھی۔ دراصل عبدالحمید حُسن و عشق اور رومان کے شاعر ہیں۔ ان کا عشق زیادہ تر مجازی ہے انکے کلام میں ان کا یہ فطری جذبہ رنگارنگ خیالات کے اظہار کا سبب بنا ہے۔

حمید بابا کے کلام میں متعدد تلمیحات، تشبیہات اور استعارات موجود ہیں جو ایرانی ادب کا خاصہ اور وجہ امتیاز خیال کئے جاتے ہیں یہ زیادہ تر براہ راست فارسی اور بالواسطہ طور پر

عربی ادب کی تعلیم کا اثر دکھائی دیتا ہے لیکن پھر بھی اگر دیکھا جائے تو جیسا کہ امیر حمزہ خان شنواری نے کہا ہے کہ "پشتو شعراء نے ہو بہو فارسی غزل کا تتبع نہیں کیا اور اُسے اپنی پشتون شاعری کے قالب میں ڈھال دیا اور وہ یوں کہ فارسی غزل میں صرف تغزل ہی ہے اور ملی روایات کا شائبہ تک نہیں اس لئے فارسی غزل کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو قارئین اس بات کو نہیں سمجھیں گے کہ یہ غزل کس قوم و ملت کے شاعر نے کہی ہے۔ مگر اس کے برعکس پشتون شعراء نے فارسی غزل سے استفادہ تو کیا لیکن اُس میں اپنی پشتونی روح کی جھلک اُجاگر کردی اور اگر پشتو غزل کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جائے، تو قاری آسانی سے یہ محسوس کرلے گا کہ یہ پشتون قوم کے کسی شاعر کا کلام ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پشتو غزل سے پشتونوں کی ملی روایات اور تہذیب و تمدن کا اندازہ بھی کسی حد تک لگایا جاسکتا ہے۔

حمید بابا بھی اپنے دور کے ایک ایسے ہی غزل گو شاعر گذرے ہیں۔ نمونے کے طور پر اُنکی ایک غزل پیش کی جاتی ہے ؎

چہ زغمم ستا د رقیب بدے فتنے زۂ	یارہ کلہ یم دا ھسے بے کینے نرۂ
چہ رقیب پہ ما کینہ دا ستا د مخ کا	مگر نۂ لوم دا ترینجے بے اینے نرۂ
چہ سھم باندے سل سیخہ ستا جورۂ	دومرۂ زورہ را دَرم لہ کومہ دینے نرۂ
یو بہ نسم مغلوالہ د رقیب ستا	کۂ زو کرے وم رینبتیا لہ پلتنے زۂ
تۂ چہ مخ دمھر واپوے رقیب تہ	پہ کودی کینبے لہ غیں تہ شم نیتے زۂ

کۂ بستۂ را تہ ھزار لوپ ے ژورے

د ذرۂ کـروے بہ لہ تا نۂ کرم بستنے زۂ

یعنی جو میں تیرے رقیب کے فتنہ ہائے بد کو برداشت کرتا ہوں تو اے میرے محبوب اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھ میں غیرت کا احساس مرگیا ہے۔ رقیب تو تمھاری وجہ سے مجھ سے دشمنی کررہا ہے۔ بات یہ نہیں کہ میں بے جگر ہوں یا میرا پتہ پانی ہوچکا ہے۔ لیکن ذرا بتا

تو سہی ایسا جگر کہاں سے لاؤں جس پر تیرے ظلم و ستم کی سلاخوں کے سینکڑوں داغ برداشت کر سکوں؛ اگر مجھے واقعی پشتون ماں نے جنا ہو تو جان لے کہ میں رقیب کے اس معقول جیسے سلوک کو مزید ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ جب تم مہر و محبت سے رقیب کی طرف رُخ پھیر دیتے ہو تو میں مارے غیرت کے دانوں کی طرح ٹھیکری کی بھٹی میں جل بھن جاتا ہوں۔ چاہے تم مجھے عشق کے نشیب فراز (عشق) سے ہزار بار ڈرانے کی کوشش کرو پھر بھی میں اپنی متاعِ دل تجھ سے ہرگز واپس نہیں لوں گا"

اسی طرح اگر عبد المجید کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو بیشتر اشعار میں پشتون ماحول کے تقاضوں انکے اپنی ہٹ پر اڑے رہنے اور "پشتونولی" کی اقدار کی پوری پوری ترجمانی کی گئی ہے۔ حمید بابا نے مکمل طور پر اپنی غزل پشتون روایات کے تابع کر رکھی ہے اور اپنے عشق کے نشیب فراز کے لئے وہ زمین منتخب کی ہے۔ جہاں سے اُس کے عشق نے جنم لیا ہے۔ اُسی زمین اور اُسی ماحول میں عبد الحمید بابا نے غزل کی زبان میں جو موشگافی کی ہے اُسکے بلند معیار کا اعتراف نہ صرف اُسکے ہمعصر شعراء نے کیا ہے بلکہ بعد ازاں شعرائے متاخرین بھی اسکے ثناخوان رہے ہیں۔ متاخرین، تذکرہ نگاروں، ناقدین اور مستشرقین سب نے ایک ہی انداز میں حمید کی شاعری کو سراہا ہے۔ مثال کے طور پر پیر محمد کاکڑ کہتا ہے۔ ؎

پس له دویه موشګاف عبد الحمید دے
چه یے اووے بنهٔ نازک نکته دان شعر

"اُنکے بعد موشگاف عبد الحمید ہے جس نے نازک اور نکتہ سنج شعر کہے ہیں۔

قلندر آفریدی کہتا ہے ؎

د پښتو ژبے په شعر په دا خپله زمانه کښے
پرے دِ نښو قلندره بے حمیده بل حریف

"اے قلندر! تو نے اپنے عہد کی پشتو زبان کی شاعری میں سوائے حمید کے کسی اور کو اپنا حریف اور مدمقابل نہیں چھوڑا۔"

عبدالعظیم رانړیزئ کہتا ہے

بیا رحمت پہ ماشو وال عبدالحمید شہ — چہ جوړ کړے دۀ کتاب دے بنۀ روښان

بحث د عشق دَدَ کتاب دے پہ ھر بیت کښے — د باران پہ دود بہ ژاړی عاشقان

پھر ماشو وال عبدالحمید پر رحمت ہو جنہوں نے بڑا نمایاں اور منفرد دیوان مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے ہر شعر میں عشق کی بحث کی گئی ہے جسے عاشق سن کر بارش کی طرح روتے ہیں۔"

مرزا خان قندہاری کہتا ہے ؎

بل حمید موشگاف د خیال پہ شعر — څۀ بہ وایم ناسفتہ دُرے پیئیل

دوسرا حمید موشگاف ہے جس کی تخیلاتی شاعری میں میں کیا بیان کروں کہ اس نے کیا کیا دُرِ ناسفتہ پرو دیئے ہیں۔"

شمس الدین کاکڑ کا شعر ہے۔ ؎

پس لہ دۀ نہ موشگاف عبدالحمید دے — باریکی د کلام د ده ځان د شعر

"اس کے بعد موشگاف عبدالحمید ہے، باریکئ کلام اسکے شعر کی جان ہے۔"

عبداللہ محزن قندہاری کہتا ہے ؎

د عبدالحمید د ژبے صفت څۀ کړم
موندۀ نۀ شی پہ پښتو کښے سلہ ژبہ

"عبدالحمید کی زبان کی کیا تعریف کروں ؛ پشتو شعر میں ایسی زبان کہیں نہیں ملتی۔"

قاضی میر احمد رضوانی کہتا ہے ؎

بیا پہ دور د تیمور شاہ اودل لہ رویہ
ماشوخیلو کښے را اوختو حمید خان

چہ ئے او ویئیل پہ زور د طبیعت خپل
د الفاظو پہ ځائے ستوری د آسمان

" پھر تیمور شاہ ابدالی کے دور میں ماشوخیل میں حمید خان پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے زور طبع سے الفاظ کی جگہ آسمان کے تارے اکٹھے کئے ہیں۔

میجر راورٹی نے لکھا ہے: " دیوانِ حمید " در و مرجان" پشتو میں بیحد قابل ستائش کتاب ہے، ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: " اس قسم کے حساسات کو مصنفین یورپ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔ مستشرق ایچ ڈبلیو بیلیوز لکھتا ہے: " کہ حمید کے افکار قابلِ قدر ہیں اور ہر یورپین مصنف کی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔ کلام کی پختگی کے لحاظ سے حمید پشتو کے سعدی ہیں۔ اور ان کی غزلیات خوشحال خان کے علاوہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں صفِ اول میں آتی ہیں اور " در و مرجان" کے نام سے موسوم ہیں"۔ الغرض ہر کسی نے اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے انداز میں حمید کے کلام کو سراہا ہے۔

ان اکثر ناقدین نے خیال کی نزاکت اور باریک بینی کی رُو سے " موشگاف" کہا ہے۔ اور اپنی ہمہ گیر خوبیوں کیوجہ سے انہوں نے خود اپنے کلام کو " در و مرجان" کا نام دیا ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ تب ہو سکتا ہے کہ " دیوان حمید" کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

په رموز دیار د شونډو یار پوهیږی
دے خوږ ژدہ سوال ځواب له مے فروش

" محبوب کے ہونٹوں کے اسرار و رموز کو عاشق ہی جانتا ہے۔ کیونکہ میخوار ہی مے فروش سے بات کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے "۔

یہاں نمونے کے طور پر حمید بابا کی ایک رنگین رومانی غزل پیش کی جاتی ہے قاری اس سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ عبدالحمید بابا کا کلام کس قدر پُر لطف، رنگین اور بلند پایہ ہے۔

خط په مخ د صنم راغے که سپوږمۍ شو په هاله کښې
داسے غابښ په خوله کښې زیب کاکه ژاله شوه په لاله کښې

هسے رنګ سحر جادو کړی په نظر د شهلا سترګو
نۀ ئے سیال په هند کښے شته دے نۀ ثانی په بنګاله کښے

لکه و نښلی مرغۍ په سست دام د سلو لو مو
هسے رنګ پریشانه زلفو کښېښتم په کشاله کښے

دا زما د غمه شین زړهٔ په کښے خیال دیار د شونډو
هسے رنګ زیب و زینت کا لکه مے په شنه پیاله کښے

ما وے عین ګنډه ګل دے د غنچے په لمن نغښتے
چه مے کوت یو ګل اندام وو پروت په سبزه دوشاله کښے

بنکلے مخ کړی وے ناسته په مجلس د رقیبانو
په جوار د سپیلو نۀ وی هیڅ آرام په غزاله کښے

سر تر پا یه غم د هجر لکه نے سورے سورے کړم
ځکه یم مدام دا هسے رنګ په آه و په ناله کښے

کڼ یار غواړے همره ژاړه چه ته وی عبدالحمیده
دا په دے چه ډېر موندے شی په دریاب نۀ په ناله کښے

رخ محبوب پر خط آگیا یا چاند نے ہالہ کر لیا ۔ اُسکے منہ میں دانت باعثِ زینت ہیں ۔
یا گلِ لالہ پر ژالہ باری ہوئی ہے ۔ وہ اپنی موٹی سیاہ آنکھوں سے کچھ ایسا جادو ٹونہ کرتا ہے کہ
اُس کا ثانی نہ تو ہند میں ہے اور نہ بنگال میں ۔ جیسے کہ ایک پرندہ سینکڑوں بالوں سے بنے ہوئے
ڈھیلے ڈھالے دام میں پھنس جائے ۔ زلف پریشان نے مجھے بھی ایسے ہی جکڑ کر رکھ دیا ہے ۔
میرا دل جو غم اندوہ کی وجہ سے نیلا ہو گیا ہے ۔ اُس میں لب محبوب کا تصوّر زیب و زینت کے
لحاظ سے یوں دکھائی دیتا ہے ۔ جیسے سبز پیالے میں کوئی سرخ شراب انڈیل دے ۔ میں اُسے
غنچے کے دامن میں لپٹا ہوا پھول سمجھتا تھا لیکن جب غور سے دیکھا تو ایک گل اندام سبز دوشالا

اوڑھے ہوئے تھی ۔ وہ رو دئے حسین رقیبوں کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھ! اگر مرن کے قریب کتے ہوں تو اُسے کبھلا کب آرام و قرار حاصل ہوگا! غمِ ہجر نے مجھے سرتاپا بانسری کی طرح چھلنی کر دیا ہے ۔ اس لئے میں ہمیشہ اِس قسم کی آہ و فغان کرتا رہتا ہوں ۔ اے عبدالحمید اگر تمہیں محبوب کی طلب ہو تو اُس وقت تک روتا رہ جب تک کہ تیرے محبوب کا وصال تجھے حاصل نہ ہو۔ اس لئے کہ موتی اگر ملتے ہیں تو گہرے سمندر میں نہ کہ معمولی جوہڑ میں " ۔

" اخلاقی شاعری "

اس دور کے شعراء کا دوسرا اہم اور مقبول موضوع اخلاقیات ہے ۔جس طرح عشق کے موضوع کو انہوں نے مجاز و حقیقت دونوں میں فضیلت و سرخروئی کا ذریعہ خیال کیا ہے ۔ اسی طرح وہ اخلاقیات کا میدان بھی رنگ ونسل کے امتیاز سے بالاتر شمار کرتے ہیں ۔خیرالامم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں ان تعلیمات کی متابعت کرنے اور اُن اخلاقِ حمیدہ کو پیدا کرنے کی تلقین کی ہے ۔ ان کی نظر میں ایک صاف ستھرے اور بلند کردار پشتون کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ بقول علامہ اقبال ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

" خود کو حضور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دے اور اگر اُن تک نہ پہنچ سکے تو پھر تمام بولہبی ہے "

یا جیسا کہ رحمان بابا نے فرمایا ہے ؎

کہ رنڑا دہ پیروی د محمدؐ دہ
کنہ نشتہ پہ جہان ملہ رنڑا

" اگر کوئی روشنی ہے، تو وہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہے ۔ ورنہ

اِس دنیا میں اور کوئی روشنی نہیں "

ان تعلیمات کی ابتدا، توحید و عبادات سے ہوتی ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو انکی تعلیمات کی روشنی میں پورا کرنے سے انسان اُس راستے پہ چلنے کی اہلیت پیدا کر سکتا ہے۔ جو کوئی بھی یہ اہلیت پیدا کر لے وہی مومن ہے۔ وہی پھر پشتونولی کے اُس معیار پہ پورا اُترتے کے لائق ہوتا ہے جس کا تقاضا اُس سے اُس کا معاشرہ کرتا ہے "

اخلاقی ادب دراصل اُس ادب کے سیکھنے اور اُس میں تربیت پاتے کا ذریعہ ہوتا ہے جس کی برکت سے انسان اپنے معاشرے میں ایک فعال اور باصلاحیت گرانقدر شخصیت کی حیثیت سے زندگی بسر کرنیکی اہلیت پیدا کرلیتا ہے۔ یہ موضوع مشرقی علوم کا ایک اہم میدان ہے جو ارتقاء کے اُن مراحل سے گزرا ہے جن سے متمدن اقوام کی معاشرتی زندگی کے مختلف ادوار گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے تاریخ اخلاقیات بھی کافی طویل پس منظر رکھتی ہے، اس میں وقتاً فوقتاً زمانے کی گردش اور انقلابات کے ساتھ تبدیلی رونما ہوتی رہی ہے اور تمام اخلاقی اقدار کی تکمیل اسلامی تعلیمات ہی پر منتج ہے۔ پشتونخوا کی شاعری کے مزاج کو اسلامی اخلاقی شاعری اس قدر راس آئی ہے کہ اُس کا سارا سرمایہ اخلاقی تعلیمات سے مزین ہے۔ اس قسم کے ادب نے شعر میں خصوصیت کے ساتھ اس کے دوسرے موضوعات کی طرح اپنی ابتدائی نشوونما کے مراحل اور وسعتِ کمال کے منازل دیکھے ہیں۔ اخلاقی شاعری کے خاص عنوانات وعظ ونصیحت اور راہ راست دکھانیکی شکل میں عہد قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ اگر پشتو کتابی ادب کی اساس یہی ہو جو "پٹہ خزانہ" کے مؤلف محمد ہوتک کے حوالے سے جناب حبیبی نے "پشتونخوا" کو پیش کی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ پشتو ادب کا یہ حصہ بھی اِس قدر قدیم تاریخ کا حامل ہے جس قدر اشاعتِ اسلام کے بعد پشتو شعر کی تاریخ پرانی ہے۔

شخصی کردار کی ترجمانی کے لحاظ سے امیر کروڑ کی حماسی نظم ایک پشتون مجاہد کی بے داغ شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ چونکہ اسلامی دور کی ابتداء سے یہ رسم تھی کہ جنگ کے موقع پر

رجز و حماسہ کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی جب غزوۂ خیبر میں مرحب کے مقابلے کو آگے بڑھ رہے تھے تو یہ شعر وردِ زبان تھا[1] ؎

" انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　کلیث غابات کریھۃ منظرہ
اوفیھم بالصاع کیل السندرہ "

ترجمہ: میں وہ ہوں کہ میرا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے۔ میں جنگل کے شیر کی طرح ہیبتناک اور ڈراؤنا ہوں اور میں اپنے دشمن کو جلد تباہ کرتا ہوں۔"

اس لحاظ سے امیر کروڑ کا یہ مذکورہ حماسہ اپنا ایک جواز رکھتا ہے اس میں جن شخصی صفات، استقلال، حمیت اور شجاعت کی ترجمانی ہوئی ہے۔ اسے محض خودستائی یا شاعرانہ تعلی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ واقعی ایک ایسے صاف ستھرے اور بے داغ پشتون کے شخصی کردار کا معیار ہے جو آزادی کا شیدائی ہے اور عوام کی بزرگی اور سرداری کی ذمہ داری اُسکے سر ہے۔ یہ وہ پشتون شخصیت ہے کہ ہر دور میں پشتون عوام اُس کے آرزو مند رہ چکے ہیں اس لئے کہ سرداری کرنا اور بزرگ ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے جیساکہ خوشحال خان کہتا ہے ؎

رباعی:
کړې سرداري غواړې بلا دې دوره　　عقل وهمت راوړه بیا جود بیا توره
لکه آسمان وته ختنه گرانه ده　　سرداري لا ده گرانه منظوره

اگر سرداری چاہتے ہو تو تیری بلا دُور، پہلے عقل و ہمت اور پھر سخاوت اور شجاعت پیدا کر۔ جیسے آسمان پر چڑھنا مشکل کام ہے اسی طرح سرداری اِس سے بھی زیادہ مشکل ہے کیا یہ کام تمہیں منظور ہے۔"

ویسے تو پشتون اِس طبیعت اور مزاج کا مالک ہے جو علی الاعلان کہتا ہے ؎

یو مے هغه سړے د دشمن دے　　چه دے به پاؤ وی ځان به سیرحاوینه

---

[1] اسوۂ حضرت علی از رئیس احمد جعفری ص ۳۳

"ایک تو میرا وہ آدمی دشمن ہے جو وزن میں پاؤ ہو مگر خود کو سیر ظاہر کرے۔"

اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پشتون کی اخلاقی شاعری کا آغاز امیر کروڑ کے حماسہ سے ہوا ہے۔ اس نظم میں عبرتناک اور سبق آموز صفات ایک خاص انداز میں لائے گئے ہیں۔ اخلاقی شاعری کے لئے یہی خوبی ضروری سمجھی گئی ہے۔

اخلاقی شاعری میں بھی پشتون شعراء نے عربی اور فارسی ادب کی بہت زیادہ تقلید کی ہے۔ اور وہ بیشتر اصطلاحات جو اخلاقی موضوعات کے لئے لازمی ہوتی ہیں۔ ان دونوں زبانوں سے اخذ کی گئی ہیں خود اس موضوع کا نام اخلاقیات عربی زبان "خلق" سے مشتق ہے اسی طرح طمع، سخی و منت، قول، نیک خواہی، تواضع، تکبر، ہمدردی۔ حسن سلوک، انتقام، عفو، کرم، ظلم، انصاف شجاعت، خود اعتمادی، انفرادیت، عزم، ثابت قدمی، امید، محبت، رحمت، توکل، صبر، شکر اور کردار و عمل وغیرہ ساری اصطلاحات ان دونوں زبانوں سے پشتو کو منتقل ہوئی ہیں اسی طرح عہد قدیم سے علم الاخلاق کے بہت سے مباحث اور انکے بارے میں اصحاب فکر و نظر علما اور فضلا کے خیالات و افکار سے پشتون طلباء اصحاب فہم و ذکا شعراء اور اہل قلم نے استفادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ جو پہلی دریافت شدہ نظم "پٹہ خزانہ" کے حوالے سے ابوہاشم سروانڑی نے عربی سے ترجمہ کی ہے وہ ابن خلاد کی وہ نظم ہے جو درہم و دولت کی صفت میں طنزیہ طور پر لکھی گئی ہے۔ ابو محمد ہاشم کے ترجمہ شدہ کچھ اشعار اس کتاب کے اوائل میں آچکے ہیں۔ یہاں صرف پہلے شعر پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

زبہ هم بنه وینا کاندی چه یې وینه
د خاوند په لاس کښې زر او دولتونه

"جب کسی شخص کے ہاتھ میں زر اور درہم ہوں تو اسکی زبان بھی خوب چلتی ہے۔"

مطلب یہ کہ زمانہ کسی کی شخصیت اور ہنر کی قدر نہیں کرتا۔ بلکہ قدر اس بات کی کی جاتی ہے کہ اس شخص کے پاس مال و دولت کتنی ہے! اسی طرح اس نظم میں ایک عام انسانی کمزوری کی طرف اشارہ کیا

گیا ہے جس کی حقیقت ہر دور اور ہر زمانے میں ثابت ہے اور ہمارے ادب میں تیسری صدی ہجری سے اس عام اخلاقی کمزوری پر طعن تشنیع جاری رہی ہے۔ کبھی طنزیہ انداز میں اور کبھی رحمان بابا کی طرح صاف ستھری نصیحت آموز انداز میں جیسے کہ کہتا ہے ؎

ناداں بہ د دُنیا غم نہ کا مندی
مرد هغه دے چہ پہ زړہ د خپل خفا شۀ
آدمیتۀ پہ دولت نۀ دے رحمانہ
بت کۀ جوړ شي د سرو زرو نۀ انسان شۀ

"نادان اس دنیا کا غم کیا کریگے! مرد وہ ہے جو اپنی فکر کرے۔ آدمیت کا انحصار دولت پر نہیں، بت اگر سونے کا بھی بنالیا جائے، وہ انسان تو نہیں کہلایا جا سکے گا۔"

اخلاقی شاعری کی جو روایت پشتو ادب میں تیسری صدی ہجری سے چلی آرہی ہے، اس پر اسلامی عقائد کی گہری چھاپ لگی ہے۔ ایک کتاب جس کی اصل سنسکرت ہے لیکن کلیلہ دمنہ کے نام سے ابن المقفع نے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کی ہے اور پھر جب یہی کتاب کبھی اس نام سے اور کبھی انوار سہیلی، دو علم خانہ دانش" یا کسی اور نام سے عربی سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئی تو اس نے اسلامی آداب اور اخلاقیات کی کیفیت اپنے ساتھ برقرار رکھی ہے یہی سبب ہے کہ اس کتاب کے نفس مضمون، موضوعات اور مزاج کے ساتھ پشتون قاری کی محبت بہت زیادہ ہے اور باوجود اسکے کہ درس کے لئے عموماً کلیلہ دمنۂ بہرام شاہی یا واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کا فارسی متن مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھایا جاتا رہا لیکن عام استفادے کے لئے خوشحال خان خٹک کے پوتے افضل خان خٹک نے ملا کاشفی کی انوار سہیلی کا ترجمہ "علم خانۂ دانش" کے نام سے پشتو میں کیا اور اس طریقے سے پشتو ادب میں اخلاقیات کے موضوع پر ایک نادرِ روزگار کتاب کا اضافہ ہوا۔ اس کتاب نے کسی دور میں بھی اپنی افادیت نہیں کھوئی اور آج بھی نوآموزوں کے لئے وہ اُسی قدر لطف وخوبی کی حامل ہے۔ جتنی کہ بیدپائی حکیم، بزرجمہر، نوشیروان عادل، ابن المقفع، رودکی بہرام شاہ، ملا واعظ کاشفی اور افضل خان خٹک کے زمانے میں

تھی یہی سبب ہے کہ جب بیسویں صدی کے ایک پشتون بزرگ مرحوم میاں گل عبدالودود (والی سوات) نے اپنے دور میں پشتو میں علمی، ادبی اور اخلاقی کتابوں کی منتقلی اور ان کے تراجم کی خواہش کی تو یہی کتاب دوسری بار مولوی عبدالغفور قدیمی کی وساطت سے اصل انوار سہیلی سے ترجمہ کرائی گئی۔ اس ترجمے میں بھی یہ بات ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہے۔ کہ کتاب کا متن اسلامی اخلاقیات کا آئینہ دار ہو۔ اسی طرح شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستان کا پہلا پشتو ترجمہ خوشحال خان خٹک کے بیٹے عبدالقادر خان خٹک نے کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں نوشہرہ میں اپنے قیام کا ذکر کرتا ہے کہ یہی تالیفِ کتاب کا باعث بنا تھا۔

عبدالقادر خان کہتا ہے[1]: "میں اکثر تنہا بیٹھا کرتا۔ کبھی کبھار بعض دوست آجاتے اور عربی فارسی علوم سے استفادہ کرتے۔ بعض دوست مجھ سے گلستان پڑھا کرتے بہت سے کہتے کہ عربی فارسی کی کتابیں بہت ہیں لیکن پشتو زبان میں کتابیں نہیں۔ البتہ آپ تصنیف و ترجمہ کی طاقت رکھتے ہیں۔ اگر آپ تکلیف گوارا کریں تو کتاب گلستان جو مطلوب و مرغوب خاص و عام ہے۔ بڑے پڑھ کر نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ بچے بھی پڑھ کر برکت حاصل کرتے ہیں بہت آسان ہو جائیگی۔ اکثر لوگ متن پڑھ لیتے ہیں اور دوسری ذو معنی۔ اگر پشتو میں ترجمہ ہو جائے تو پشتونوں کے لئے سہولت پیدا ہو جائیگی۔"

عبدالقادر خان خٹک کے اس بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں پشتونوں کے لئے علمی زبانیں عربی فارسی تھیں۔ پھر بھی پشتون اس بات کے خواہشمند تھے اور اس راز سے واقف تھے کہ علم جب اپنی زبان میں ہو تو آسان ہو جاتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ ان سے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستان کے ترجمے کا تقاضا کیا جا رہا۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب اخلاقیات کی بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ جو سبق آموز بھی ہے اور دلکش بھی اسکی عمومی مقبولیت کی رو سے عبدالقادر خان خٹک نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کتاب کا پشتو زبان میں ترجمہ کرے۔

گلستان کا ترجمہ جسے "گلدستہ" کہتے ہیں۔ اور "علم خانۂ دانش" دونوں نثری کتابیں ہیں اور دوسری زبانوں

---

[1] عبدالقادر خان کا گلدستہ قلمی نسخہ (کتب خانہ پشتو اکیڈیمی)

سے پشتو کو منتقل ہوئی ہیں لیکن خود پشتو میں اخلاقی شاعری کا رجحان جو زمانۂ قدیم سے چلا آرہا تھا۔ اُس نے بھی فارسی عربی کی اسی قسم کی کتابوں کی بدولت زیادہ ترقی کی۔

جو اخلاقی اقدار روایتی انداز میں پشتون معاشرہ میں موجود تھیں انکے اکثر پہلوؤں کی ترجمانی قدیم زمانے سے اِس معاشرے کی ضرب الامثال اور لوک گیتوں میں ہوئی تھی۔ اور یہ لوگ اپنی عام زندگی میں اُسی پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ چونکہ اخلاقیات کے میدان میں مذہب و عقائد کا بڑا دخل تھا۔ اسی سبب سے پشتو کے اخلاقی ادب کا بیشتر حصہ اسلامی اخلاقی تعلیمات پر مبنی ہے اور پشتو ادب میں صوفیانہ شاعری کا بیشتر حصہ اخلاقی شاعری کے رنگ میں موجود ہے۔ اسی طرح تہذیب اخلاق کے لئے شاعری کے ہر میدان خصوصاً مثنوی، غزل اور رباعی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں اسلامی اخلاق کا درس اور تعلیم بھی موجود ہے۔ اور پشتون معاشرے کی انفرادیت اور تشخص بھی لئے ہوئے ہے

مثنوی میں اخلاقی تعلیمات کا آغاز بظاہر نیند آور کے شاعر اکبر کی شاعری سے ہوا۔ اُس کی مثنوی کا ایک بند ہے ؎

کهٔ غږ نهٔ کا عاشقان ثوک مرهٔ شی دوئی په دا جهان ثوک
نو به دواړه شهيدان وی کهٔ رښتينی مسلمان وی
دلے يار زما تواهان دے بيا په عشق کښے پهلوان دے
ډير نفرت کا له غماز ه رب دِ دے کا سرفراز ه
زهٔ هم ثو چه بانده ےپتو يم خو دد هٔ په پند مامور يم

" اگر عشاق مہر بہ لب اِس دنیا سے کوچ کر جائیں اور عاشق و معشوق ہر دو سچے مسلمان ہوں تو بے شک وہ شہید ہونگے۔ میرا محبوب مجھے چاہتا ہے اور اپنی محبت میں وہ صادق بھی ہے۔ وہ غماز سے بہت زیادہ نفرت کرتا ہے۔ اللہ اُسے سرفراز کرے۔ ہرچند کہ میں اُسکے عشق کے زخموں سے چُور ہوں پھر بھی اُسے نصیحت کرنے پر خود کو مامور سمجھتا ہوں "۔

دانشور حبیبی نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے اشعار اس موضوع کے تواردمیں لائے ہیں۔ لیکن

ان میں فرق یہ ہے کہ مولانا کا کلام عملاً معنوی ہے اور اکبر نے مادی رنگ میں وہی معنوی کیف پیدا کیا ہے
مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ عاشق خود نہ باشد وصل جو ... گر نہ معشوقش بود جویائے او
لیک عشق عاشقان تن زہ کند ... عشق معشوقان خوش و فربہ کند

"کوئی عاشق بھی از خود وصل کا متلاشی نہیں ہوتا جب تک اُس کا معشوق اُس کا متلاشی نہ ہو جائے۔
لیکن عاشقوں کا عشق جسم کو کمان کی زہ کی طرح دُبلا پتلا کر دیتا ہے اور معشوق عشق سے لطف اندوز اور صحت مند رہتے ہیں"۔

اکبر کی مثنوی کے پہلے دو اشعار کے پس منظر میں پشتو کی اخلاقی شاعری کچھ ایسی پروان چڑھی کہ اُس میں اسلامی اخلاق کے ساتھ پشتون کی انفرادیت کو بھی جگہ مل گئی!

اکبر زمینداوری نویں صدی ہجری کے نصف آخر کا شاعر ہے۔ لہٰذا ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ پشتو مثنوی میں اس سے قبل کسی دوسرے شاعر نے بھی اس موضوع پر اور کچھ کہا ہوگا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مثنوی کا ایسا کوئی دوسرا قدیمی نمونہ ابھی تک دستیاب نہیں۔ لیکن اسی دور کی ایک خاتون شاعرہ زرغونہ کاکڑہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اُس کا ذکر اور اشعار بھی بہ روایت "پٹہ خزانہ" ہم تک پہنچے ہیں۔ پروفیسر حبیبی کہتا ہے[1]: "اگر ہم پشتو ادب میں اخلاقی شاعری کے لیے کوئی مخصوص گروہ تسلیم کریں تو زرغونہ اپنی "بوستان" کے ساتھ اس گروہ میں سب سے آگے ہوگی کیونکہ کوئی بھی اخلاقی شاعر جو مستقل اثر کا حامل ہو ہمیں معلوم نہیں اور زرغونہ شیخ سعدی کے بوستان کے منظوم ترجمے کی وجہ سے اخلاقی شعراء کے گروہ کے اولین شعراء میں شمار کی جا سکتی ہے"۔

وہ حکایت جو زرغونہ کاکڑہ کے "بوستانِ سعدی" کے ترجمے سے نقل کی گئی ہے، اور دانشور حبیبی نے محمد ہوتک کی کتاب "پٹہ خزانہ" کے حوالے سے اپنی ادبیات پشتو کی تاریخ میں اُس کا تذکرہ

---

[1] تاریخ ادبیات پشتو ص ۱۸۷ (کابل چھاپ)

کیا ہے درج ذیل ہے ۔

بوستان پشتو سے حکایت :۔

اوریدلے مے قصه ده   چه له شاتو هم خوږه ده
د اختر په ورځ سهار   بایزید چه وو روښدار
له حمامه راوتلے   په کوڅه کښے تیریدلے
ایرے خاورے چا له بامه   را چپه کړلے ناپامه
مخ او سر ئے شو ککړ   په ایرو په خاورو خړ
بایزید په شکر کښو شو   د خپل مخ په پاکیدو شو
چه زهٔ وریم د بل اور   چه په اور کښے شم سکور
له ایرو به ځهٔ بد اوړمه   یا به لږ شکوه کومه
هو پوهانو ځان ایرے کړو   له یو بنے ئے ځان بیرے کړو
څوک چه ځان ته ګوری تل   خدائے ته نشی کړے کتل
لوئی تل په ګفتار نهٔ ده   لوخبره په کار نهٔ ده
تواضع به د سر لوړ کا
تکبر به د تل ځوړ کا

"میں نے ایک کہانی سنی ہے جو شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہے ۔ عید کے دن صبح سویرے حضرت بایزیدؒ حمام سے باہر نکلے اور گلی میں سے گذر رہے تھے کہ کسی نے چھت کے اوپر سے راکھ اور مٹی بے خیالی میں اُنکے سر پر پھینکی ۔ اُن کا سر اور منہ راکھ اور مٹی میں لتھڑ گئے اور آلودہ ہو گئے حضرت بایزیدؒ نے شکر ادا کرنا شروع کیا اور اپنے چہرے کو صاف کرنے لگے ۔ اور کہنے لگے کہ میں تو درحقیقت دوزخ کی آگ میں جھونکنے کے قابل ہوں ۔ راکھ میں کیا برائی ہے کہ شکوہ کروں ۔ واقعی سمجھداروں نے اپنے آپ کو خاکستر کر دیا اور غیر اللہ کے ہر رشتہ سے محبت کا ناتا

توڑ دیا کوئی بھی خود بین اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ گفتار سے کوئی کبھی بڑا نہیں بن سکتا۔ بڑا بول ہرگز اچھا نہیں ہوتا۔ یاد رکھو تواضع ہی تمہارا سر اونچا کر دیگی اور تکبر تمہیں بالآخر نیچے گرادیگا۔

پٹہ خزانہ میں زرغونہ کاکڑہ کے بوستان کی وساطت سے جس اخلاقی کتاب کا ذکر آیا ہے وہ دوست محمد کاکڑ کا "غور غشت نامہ" ہے۔ یہ چھوٹے بحر کی مثنوی میں اخلاقیات کے موضوع پر پہلی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ یہ کتاب دسویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے۔ حبیبی کہتا ہے کہ یہ کتاب بابر خان کے تذکرے "غور غشت نامہ" کی ایک جدید شکل تھی اس لئے کہ یہ کتاب اس زمانے میں نایاب ہوگئی تھی، دوست محمد کاکڑ کی کتاب بھی اُسی قسم کے اخلاقی قصوں اور حکایتوں پر مشتمل تھی۔ اس لئے پشتونوں کی ادبی محفلوں میں جلد مقبول ہوئی اور درسی مقام حاصل کیا۔ اب "غور غشت نامہ" کا پورا متن موجود نہیں اس لئے کتاب کے تمام موضوعات پر زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس بارے میں پروفیسر حبیبی کا یہ بیان قابل توجہ ہے کہ "غور غشت نامہ" پشتو زبان کی اخلاقی شاعری میں زرغونہ کے بوستان کے بعد بہت قدیم کتاب ہے۔ صرف اسی ایک کہانی سے جسے "پٹہ خزانہ" نے نقل کیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحر خفیف کی مثنوی تھی جسکی زبان سلیس اور روان تھی۔

"غور غشت نامہ" سے حکایت :-

لہ نیکانو روایت دے	ھسے توکہ حکایت دے
نور محمد کاکڑ راوی دے	چہ فیض ئے تل جاری دے
دے د نیکو لہ توکے وائی	چہ منبت ئے داتہ بنائی
چہ کاکڑ نیکہ زاھد وو	لوئے خبنتن لہ تل عابد وو
تل تر تل پہ ئے عبادت کا	پہ دے لارئے ریاضت کا
شپے ئے روزے پہ لمانځو	پہ ژرا او پہ نارو وے
نہ ئے خوب نہ ئے خوراک وو	عبادت ئے ژوند او ژواک وو
چہ پہ کبنیناست پہ لمانځنہ	یا پہ کبنیوت پہ ستائنہ

ورځ ئې تېروله په قاعده وه ‌ ‌ ‌ شپه ئې هم یوه سجده وه
تل ئې سیر د لاهوت کا ‌ ‌ ‌ په یوه کولې ئې قوت کا
غرق به تل په ذکر الله وو ‌ ‌ ‌ هر صباح او هر بېګا وو
یوه شپه ئې عبادت کا ‌ ‌ ‌ په ګناه ئې ندامت کا
سترګې پټې شوې له خوبه ‌ ‌ ‌ په شپو شپو ئې اوویستو به
هسې خوب ئې اولید ګرانه ‌ ‌ ‌ چه غورښت بناڅ بنیانه
دا څی اے کاکړه زویه ‌ ‌ ‌ له تا خوښ یمه نیک خویه
ستا قدم زما په لار دے ‌ ‌ ‌ ماسوا کښې دے قرار دے
شپه او ورځ دے د لما څخه ‌ ‌ ‌ د څښتن عبادت کړه نه
ولې یاتے له تا نور دی ‌ ‌ ‌ شپې او ورځې دِ په کور دی
څه جهاد کړه په تا فرض دے ‌ ‌ ‌ دا هم ستا د غاړے قرض دے
یوه ورځ جهاد افضله ‌ ‌ ‌ تر کلو کلو نمه څخه[1]
ځوک چه ترک نمونځ او روژه کا ‌ ‌ ‌ په جهاد به ئې پوره کا
لومړے شرط د دین هم داد ے ‌ ‌ ‌ بیا خدمت د خلق الله دے
له تا یاته دوه اړه دینه ‌ ‌ ‌ ځان خبر کړه بنه له دینه
توره واخله مجاهد شه ‌ ‌ ‌ د لوے خدائے د دین قاصد شه
د خدائے نور په جهان خوره ‌ ‌ ‌ دا خدمت ئې په ځان پورے کړه
چه دے بشپړ عبادت شی ‌ ‌ ‌ ځان دِ خلاص له معصیت شی
چه له خوبه ویښ کاکړ شه ‌ ‌ ‌ د غزا په خوانو مړ شه

زړه خوښ ئې آراسته کړل
د غزا غشی تېر ئې کړل

---

[1] سال بھر نمازوں اور عبادت کرنے سے جہاد میں ایک دن بسر کرنا زیادہ بہتر ہے۔

هرات ته وا ته په تلو تلو شه — د سلطان غیاث له ملو شو
دوئ کړو هوړے جهاد ونه — د سلطان مل شو په ملو نه
څو هوړے تر دنیا تیر شو — د غازیانو په تهول شهیر شو
چه ئے هلته هم وفات شو — ښخ په خاورو د هرات شو
میره ئے هے ژوندون کاندے — مری د خدا ئے په رضا باندے

"نیک لوگوں سے روایت ہے اور اس قسم کی حکایت جس کا راوی نور محمد کاکڑ ہے جس کا فیض سدا جاری ہے۔ وہ نیکوں کی زبانی بیان کرتا ہے جسے ماننا ہمارے لئے ضروری ہے" کہ کاکڑ دادا زاہد تھا۔ جو خداوند بزرگ کی ہمیشہ عبادت اور اس راستے میں ریاضت کیا کرتا تھا۔ نماز کی وجہ سے وہ راتوں کو جاگتا اور آہ و فغاں کیا کرتا۔ خواب و خورش مفقود تھی۔ اُسکی زندگی عبادت سے عبارت تھی جب وہ نماز میں قاعدے پر بیٹھتا یا پھر اللہ کی ثنا کرتا تو دن تمام قاعدے میں گذارتا۔ اور پوری رات ایک ہی سجدے میں بسر کرتا۔ ہمیشہ لاہُوت کی سیر کیا کرتا اور صرف ایک لقمہ کھایا کرتا۔ ہمیشہ ذکر اللہ میں صبح شام غرق رہتا ایک رات وہ عبادت میں مشغول تھا اور اپنے گناہوں پر نادم ہو رہا تھا کہ نیند کی وجہ سے اُس نے آنکھیں موندلیں اور نیند ہی کی حالت میں اُس نے راتوں رات توبہ کی میرے عزیز وہ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ" غور غشت بابا اسے نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ" اے کاکڑ بیٹے اے نیک تو! میں تجھ سے خوش ہوں کیونکہ تیرا قدم میری راہ پر ہے۔ اگرچہ تیرا ٹھکانہ دنیا میں ہے۔ دن رات نماز پڑھ کر تو اپنے مالک کی عبادت کرتا ہے۔ لیکن ابھی کچھ اور بھی باقی ہے۔ کیونکہ تیرے دن اور تیری راتیں گھر پر بسر ہو رہی ہیں۔ کچھ جہاد کرو جو تم پر فرض۔ اور تیری گردن پر یہ بھی ایک قرض ہے۔ کئی کئی سالوں تک نماز پڑھنے سے جہاد میں صرف ایک دن گذارنا افضل ہے۔ جو ہمیشہ روزہ نماز ادا نہ کرے تو جہاد اس کا کفارہ بن جاتا ہے۔ یہ دین کی پہلی شرط ہے اور دوسری خدمتِ خلق ہے یہ دونوں تجھ سے رہ گئے ہیں تم اپنے آپ کو اچھی طرح دین سے آگاہ کر لو۔ تلوار اُٹھا کر مجاہد بنو اور اپنے عظیم پروردگار کے دین کے قاصد بن جاؤ۔ اللہ کے نور کو دنیا میں پھیلادو اور یہ خدمت اپنے اوپر فرض سمجھ کر

ادا کردو تاکہ تیری عبادت کامل ہو اور گناہ سے تجھے رہائی ملے۔ جب کاکڑ خواب سے بیدار ہوا تو وہ جہاد کے لئے کمربستہ ہوگیا۔ اپنے جسم پر زرہ بکتر اور خود آراستہ کیا اور لڑائی کے لئے تیز تیز روانہ ہوا۔ چلتے چلتے وہ ہرات کے گردو نواح میں پہنچا اور سلطان غیاث الدین کے ساتھیوں سے جا ملا۔ وہاں اُس نے جہاد کئے اور سلطان کے مقربین میں سے ہو گیا۔ بالآخر ہرات ہی میں اس دنیا سے چل بسا اور غازیوں کے زمرے میں شمار ہوا۔ جب اُس نے وفات پائی تو خاکِ ہرات میں دفن ہُوا جیالے ایسے ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور محض خدا کی رضا کی خاطر جان دیتے ہیں۔"

یہاں ایک دفعہ پھر نویں صدی ہجری کے شاعر اکبر کے وہ اشعار یاد آرہے ہیں جو پشتو کی اخلاقی شاعری کے اصل الاصول ہیں۔ یعنی ؎

کہ غزنہ کا عاشقان ثموک مرۂ شی دوئی پہ دا جھان ثموک
نو بہ دوارہ شہیدان وی کہ ریښتینی مسلمان وی

"اگر عشاق مہر بلب اِس دنیا سے کوچ کر جائیں اور وہ سچے مسلمان ہوں تو بے شک وہ شہید ہونگے۔"

مندرجہ بالا حکایت میں دوست محمد کاکڑ نے جہاد بالسیف اور جہاد بالعمل دونوں کی تشریح کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ محض عبادت سے کفر و دین کے معرکے میں میدانِ عمل میں نکلنا اور نورِ اسلام پھیلانے کے لئے دشمن کے ساتھ لڑنا اور ہر حال میں انسانیت کی خدمت کرنا بہترین عبادت ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ غورغشت نیکہ نے اپنے عابد اور زاہد پوتے کاکڑ کو حکم دیا کہ ؎

توره واخله مجاهد شه د لوی خدای د دین قاصد شه
د خدای نور په جهان تو کړه دا خدمت په ځان پور کړه
لومړی شرط د دین هم دا دی بیا خدمت د خلق الله دی

"تلوار اٹھاؤ اور مجاہد بنو۔ اور اپنے پروردگارِ عالم کے دین کے قاصد بن جاؤ۔ اللہ کے نور کو دنیا میں پھیلا دو۔ اور یہ خدمت اپنے اوپر قرض سمجھ کر ادا کرو۔ دین کی پہلی شرط

یہی ہے ۔ اور پھر مخلوقِ خدا کی خدمت ہے "

یہ روحانی مثالیت یا ([illegible]) کا دور تھا شخصیت کے کمال کے لئے اخلاقی اور روحانی سربلندی ایک لازمی شرط تھی ۔ یہی سبب تھا کہ اُس زمانے میں اسلامی تصوف نے اِس سرزمین میں بہت ترقی کی اور ہماری ادبیات اور خصوصاً شاعری پر اس نے گہرا اثر ڈالا ۔ پشتو مثنوی میں عبادات و اخلاقیات پر بہت سی درسی کتابیں لکھی گئیں ۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک جاری تھا ۔ خصوصاً عورتوں کی شاعری میں درس اخلاقیات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے ۔ ان میں ایک قدیم شاعرہ میرمن " نیک بخت " تھیں ۔ نمونۂ کلام یہ ہے ۔ ؎

د خدای حق ته غاړه کیږده	نورې نورې د نیا پرېږده
دنیا یا ته له هر چا ده	په اخلاص کښې پښې کیږده
څو قوت لرې په ځان کښې	سر د یار په رضا کیږده
ځان له بده خویه ژغوره	زړه په ذکر د یار بلیږده
کل دنیا به د دښمنه شي	اوس له ویرې پښې ریږده
تیوله غواړي حسابونه	که د اوښ دي که د میږده

د نیا ترک وهه که پوهې
د بقا په لوري پښې بږده

" خدا کے حقوق کے آگے گردن جھکا دو اور دوسری باتیں چھوڑ دو ۔ یہ دنیا ہر کسی سے رہ جانے والی ہے اس لئے اخلاص کی راہ میں قدم رکھ لو ۔ جب تک تم میں طاقت ہو تو رضائے محبوب کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو ۔ خود کو بد خوئی سے بچاؤ اور اپنے دل میں ذکرِ یار کو سمیٹ لو ۔ ساری دنیا بالآخر تیری دشمن بن جائیگی اس لئے اسکے اس رویئے سے ڈرتے رہنا چاہیئے ۔ بالآخر سبھی تیرے ساتھ اپنا حساب چکائیں گے ۔ چاہے تیرے اونٹ ہیں یا بھیڑ بکریاں اگر سمجھدار ہو تو ترک دنیا کر لو ۔ اور عالم بقا کی طرف قدم بڑھاؤ ۔

روشانی دور میں اخلاقی شاعری پر خصوصیت کے ساتھ تصوف کا رنگ غالب آگیا۔ اور اس نے وہی طرز و انداز اپنایا جو ایرانی ادب میں حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ ابوسعید ابوالخیر دسویں صدی عیسوی کے شاعر تھے شیخ ابو علی سینا کے معاصرین میں سے ہیں۔ اور علامہ شبلی کے بیان کے مطابق سلطان شیخ ابو علی سینا کے ساتھ انکی مراسلت بھی تھی۔ اس خط و کتابت میں شیخ اس صوفی سے ادق مسائل کے بارے میں پوچھا کرتے اور وہ (بذریعہ خط) جواب ارسال کیا کرتے۔ ان دونوں کے درمیان یہ خط و کتابت آج بھی موجود ہے۔

ایرانی شعراء کے فلسفۂ اخلاقیات پر عموماً یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ بجائے ترقی کے یہ پستی اور بے قاعدگی کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے۔ جو مسائل بار بار جدا جدا انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ترکِ دنیا، قناعت توکل، تواضع، خاکساری، عفو، حلم، جود و سخا، ان میں بعض باتیں پست ہمتی کا باعث بنتی ہیں۔ بعض اعتدال سے متجاوز دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ تمدن کے اصول کے خلاف ہیں۔ اور علامہ شبلی کے کہنے کے مطابق اس تعلیم کے اثر کی وجہ سے ان ممالک میں آزادی اور حریت کی طلب و آرزو کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔"[1]

ایک حد تک پشتو ادب نے اگرچہ ایرانی ادب کے زیر اثر اس قسم کی اخلاقی اقدار کی ترجمانی کی ہے تاہم پشتون عوام کے تشخص اور انفرادیت نے اسے آزادی کے جذبے اور حریت کی آرزو سے بیگانہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اسکے کہ روشانیوں کی تحریک خالص متصوفانہ عقائد سے ابھری تھی پھر بھی اس نے جو سیاسی موقف اختیار کر رکھا تھا وہ مغلوں کے تصرف سے پشتون کی آزادی کی سب سے پہلی عملی جدوجہد تھی۔ چاہے اخون درویزہ کے خیال کے مطابق اس تحریک کی وجہ سے پشتون قوم آزاد ہونیکی بجائے اور بھی مطیع و منقاد ہوگئی۔ اخون درویزہ لکھتے ہیں:۔

"یہ نحوست جلال الدین کی تھی کہ (مغل) امراء کی جائے سکونت پشاور بن گئی اور مغل

---

[1] شعر العجم حصہ پنجم ص ۱۸۸

پشتون کے اندرون سے باخبر ہو کر اسکی طرف زیادہ متوجہ ہوا۔ اور اُس نے خراج بڑھا دیے اُنہیں شکست و ہزیمت سے ہمکنار کیا۔ اور جلال کی مذموم سازش کیوجہ سے مغلوں نے پشتون پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔"

اس دور میں اخلاقی۔ مذہبی اور عشقیہ موضوعات پر جو مثنویاں لکھی گئی تھیں۔ اخون درویزہ کی "جنت الفردوس" خوشحال خان خٹک کا "فضل نامہ" اور سوات نامہ" صدر خان کی مثنوی "آدم درخانی" اور مثنوی "دلے شہئی"۔ عبدالقادر خان خٹک کی مثنوی "یوسف زلیخا" عبدالحمید ماشوخیل کی مثنوی "شاہ و گدا" خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہی وہ دور تھا جب پشتو غزل میں عشقیہ شاعری، اخلاقی شاعری اور تصوف تینوں ایک میدان میں داخل ہو گئے اور پشتو شاعری کے لطف اور رنگینی میں اضافہ کیا۔ پشتون کی فطرت میں خودسری اور انفرادیت رچی ہوئی ہے۔ اس قوم کو اگر تواضع، حلم اور انکساری کی تعلیم نہ دی جاتی تو اسکے قبائل ہمیشہ اپنے قبائلی ماحول میں انانیت، بے حمیتی اور لاپرواہی کے راستے پر چل پڑتے اور یا محض ایرانی شاہنشاہیت کے ماحول میں پیدا شدہ معاشرتی بے حسی کا شکار ہو گئے ہوتے۔

پشتون واعظینِ اخلاق اس راز سے واقف تھے، اس لئے انہوں نے اپنی اخلاقی شاعری میں اُنکے لئے ایسی تعلیمات چھوڑیں کہ انہیں ارفع درس بھی دیا اور ساتھ ہی اُنکی پشتو اور انفرادیت کو بھی اپنی جگہ برقرار رکھا۔ پشتو شاعری خصوصاً غزل میں اس طرز و انداز کی ابتدا بھی خوشحال خان خٹک سے ہوتی ہے۔ اُنکی اخلاقی شاعری کے اس صاف ستھرے انداز کے کچھ نمونے یہاں لائے جاتے ہیں:

وہ کہتا ہے کہ انسان کے کردار کی عظمت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ؎

غم:- (۱) غم ئے نۂ دے پیدا کڑے بے حکمتہ
د نامرد او مرد پہ مینځ کښے غم محک دے

---

(۲) دا رہ ذرہ نہ فراغت وی پہ ښادئ کښے
چہ پہ غم کښے مردانہ شی زړۂ ھغہ

"غم کو اللہ میاں نے بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا۔ یہ مرد اور نامرد میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہے۔"
"خوشی میں تو سبھی دل بافراغت ہوتے ہیں، دل وہ ہے جو غم میں بھی مردانگی کا مظاہرہ کرے۔"

اُمید:۔ د شپے خپتن دے سحر ته گوری
گورے پرے او خیژی د سحر ستورے

"شب گزیدہ انسان طلوع سحر کا انتظار کرتا ہے اس اُمید پر کہ شاید اُس کی صبح کا ستارہ کبھی نمودار ہو جائے۔"

تدبیر:۔ وائی لار د ختو نشته و آسمان ته
زۀ به لار در ته پیدا کوم بے هنره

"کہتے ہیں کہ آسمان پر جانے کا راستہ نہیں، اے بے ہنر انسان میں تمہارے لئے راستہ ڈھونڈ نکالوں گا۔"

کوشش:۔ (۱) کۀ کوشش کا په اخلاص زۀ یے ضامن یم
کۀ کامران په خپل مراد نۀ شی سړے
(۲) د مردانو په معراج به ورتلے نۀ شی
چه د سعی کوتاهی لري په زړۀ کښے

"اگر کوئی مخلصانہ کوشش کرے تو میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔"
(۲) مردانگی کی معراج تک اُسے رسائی حاصل نہیں ہوگی جس کا دل سعی پیہم میں کوتاہی برتے گا

طلب:۔ څو طلب هومره موندل دی په دا دور
بلکه لا تر طلب بخره موهي بيشه

"اس دنیا میں ڈھونڈنے والے کو اُس کے طلب کے مطابق ملتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات وہ اپنی طلب سے بھی بڑھ کر حصہ حاصل کر لیتا ہے۔"

همت: (۱) کهٔ په زر رنګه خوبئ آراسته دی
چه زلمے په بلا بر نهٔ دی هم هیڅ
(۲) کهٔ آسمان دِ د زمری په خله کښے ورکا
د زمری په خُله کښے مهٔ پرېږده همت

(۱) "ایک نوجوان چاہے ہزار خوبیوں سے آراستہ ہو۔ لیکن اگر وہ مصیبت پر غالب نہ آسکے تو پھر وہ کس کام کا!"
(۲) "اگر آسمان تجھے شیر کے منہ میں دیدے تو بھی ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔"

قوت برداشت: (۱) په جهان کښے کهٔ ځوانان دی هم هغه دی
چه و سختے وته او نیسی ځانو نه
(۲) خدائے دِ وار همت ورک نهٔ کا د مردانو
په دنیا کهٔ بانده راشی ګوانه سخته

(۱) "اس دنیا میں اگر جوانمرد ہیں تو فقط وہ ہیں جو سختیوں کو برداشت کرتے ہیں۔"
(۲) "خدا جوانمردوں کی عزم و ہمت کو کبھی متزلزل نہ کرے۔ چاہے زندگی میں اُن پر کیسی بھی سخت اور دشوار گھڑی کیوں نہ آجائے۔"

لیکن خوشحال بابا نے اسکے لئے ایک اخلاقی معیار کی نشاندھی بھی کی ہے اور وہ یہ کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ راست باز ہو، سخی ہو، صادق ہو، لوگوں کا نیکخواہ اور ہمدرد ہو۔ شجاع اور مستقل مزاج ہو، باہمت، صابر اور صاحب عزم وارادہ ہو، غیرتمند ہو۔ انتقام لینے کی سکت رکھتے ہوئے بھی وہ عفوو درگذر کے جذبے سے سرشار ہو۔ یہی وہ شخصیت ہے جو خوشحال خان کے نزدیک "د وارث دستار" ہو سکتا ہے۔ ورنہ ویسے تو۔ ۔

چه دستار تړی هزار دی
د دستار سړی په شمار دی

"دستار باندھنے والے یوں تو ہزاروں کی تعداد میں ہیں لیکن نہیں صاحب دستار معدودے چند ہی ہوتے ہیں" خان کہتا ہے ؎

چہ دروغ ترې خېژي وباسي کله خُله ده
چه رښتیا ترې خېژي وباسي خُله هغه

"جس منہ سے جھوٹ نکلے وہ بھلا کب منہ کہلایا جا سکتا ہے؟ منہ تو وہ ہے جس سے سچ نکلے۔"

؎ که دې طمع د مخلوق له وره پرېکړه
بادشاهي دې مبارک شه که ګدا ئې

"اگر تم مخلوق کے دروازے سے طمع منقطع کر لوگے تو چاہے تم گدا ہی کیوں نہ ہو، تمہیں بادشاہی مبارک ہو۔"

؎ که ګنجونه د قارون درته انبار شي
په هر لورې ئې غورزوه په سخاوت

"اگر تمھارے سامنے قارون کے خزانے ڈھیر کر دئے جائیں، تو سخاوت سے اُسے ہر طرف لٹاتے جاؤ۔"

؎ د منت دارو که مرهم پکار مې نه دي
که علاج لره مې راشي مسیحا هم

"مجھے نہیں چاہیئے وہ دوائی جو مجھ پر احسان کرنے کی نیت سے دی جائے، چاہے حضرت عیسیٰ کے ہاتھوں یہ علاج کیوں نہ ہو۔"

؎ مرد به خپله وینا ژغوري تو ژوندې وي
د نامرد وینا نن شته، نشته صبا

"مرد جب تک زندہ ہو اپنی بات پر قائم رہتا ہے، اور ایک ناکس کی بات اگر آج ہے تو کل نہیں۔"

چه د خلقو نیکخواهی لرې په زړهٔ
مبارک شه بادشاهی لرې په زړهٔ

"مخلوق خدا کے لئے خیر خواہی رکھتے ہو تو تمھیں اپنے دل کی یہ بادشاہت مبارک ہو۔"

ـه هرچه ستا د زړهٔ رضا واړه هغه کړه
څوچه زړهٔ دچا خوږېږي هغه مهٔ کړه

"تیرے دل میں جو بھی آئے کر، لیکن کوئی ایسا کام جس سے کسی کی دل آزادی ہو وہ ہرگز نہ کر۔"

ـه د هغه قدر، لوم تر ے په ځاریږم
چه په غم کښې چاره جوئي دبے چاره شو

"میں اس پر قربان اور میں اس کا قدر دان ہوں جو غم میں کسی بیچارے کی چارہ جوئی کرے۔"

ـه چه له دوسته له دشمنه ښهٔ سلوک کا
دهغو سړیو ښهٔ ژوند ګانې دی

"جو اپنے دوست دشمن سے اچھا سلوک روا رکھے تو ان لوگوں کی زندگی ہر طرح سے اچھی ہوتی ہے۔"

ـه څو وانخلي له غلیمه انتقام
مرد نهٔ خوب کا نهٔ خوارهٔ کا نهٔ آرام

"جوان مرد اُس وقت تک نہ سوتا ہے نہ کھاتا ہے نہ آرام کرتا ہے جب تک وہ اپنے دشمن سے انتقام نہ لے۔"

ـه وے مے څهٔ دے چه نښان د ځوانمردۍ دے
وے ئے عفو په هنګام د استقلال

"میں نے دریافت کیا کہ جوانمردی کی نشانی کیا ہے؟ تو جواب ملا کہ شجاعت کے ساتھ عفو۔"

ـه کهٔ نوم د حجاج اورے اورے نوم د نوشیروان
په عدل کافر ښهٔ شو ظلم بد کړو مسلمان

"حجاج اور نوشیروان کے نام سنتے آئے ہیں۔ ایک کافر تھا لیکن عدل و انصاف کرنے سے وہ (نوشیروان) نیک نام ہوگیا۔ اور دوسرا مسلمان تھا لیکن ظلم نے اُسے (حجاج) بدنام کردیا۔"

ے مړ هغه چه نه ئے نوم نه ئے نښان شته
تل تر تله په ښه نوم پاتې ښاغلي

"مردہ وہ ہے جس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ قابلِ احترام لوگ اپنے اچھے نام سے سدا زندہ رہتے ہیں۔"

ے د زمریو میړانتوب په لښکر نه دے
متې ئے هر کله پوا ئے په خپل ځان شي

"شیروں کی بہادری کا انحصار لاؤ لشکر پر نہیں ہوتا وہ تو ہمیشہ تن تنہا اپنی قوت بازو پر انحصار کرتے ہیں"

ے تر مطلو به پورے شرط د رسیدو دے
که تمامه لار په وینو شي آلوده

"تمام راستہ چاہے خون آلود ہی کیوں نہ ہو جائے پھر بھی اپنے مطلوب تک پہنچنا شرط ہے۔"

ے نو میدی د لوئے بادشاه په دربار نشته
هر سړے چه خدمت کا نتیجه مومي

"اُس بڑے بادشاہ کے دربار میں نااُمیدی کو بار نہیں، جو شخص بھی خدمت کرتا ہے وہ اُس کا صلہ بھی پاتا ہے۔"

ے چه محنت په ځان قبول کا راحت مومي
رنج او ګنج سره دا دواړه دي تړلي

"جو کوئی محنت کو اپنا شعار بنالے اُسے راحت ملتی ہے۔ رنج اور گنج ہر دو آپس میں لازم ملزوم ہیں۔"

ؔ کۂ تکیه دہ نو تکیه دیوۂ خدائےؔ دہ
چه په بلےؔ کړه خڼۂ حال لری تکیه

" اگر بھروسہ ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کا ۔ ماسوا پر تکیہ کرنے والے کا حال دگرگون ہوتا ہے "

ؔ په ښادئ کښے دےؔ شکر سرے کاندی
په غمو نو کښے د صبر چار فرحت دے

" انسان خوشی میں اُس کا شکر ادا کیا کرے ۔ غموں میں صبر کرنے سے مسرت حاصل ہوتی ہے "

ؔ سر دِ درومی مال دِ درومی پت دِ نۂ ځی
د سړی د چارے کل نو بنځ په پت دی

" چاہے سر قلم ہو جائے چاہے مال دولت جاتی رہے ، مگر عزت و آبرو قائم رہے اس لئے کہ جوانمرد کی تمام خوبیوں کا اصل الاصول عزت ہی تو ہے "

ؔ دے کوم ربښتیا چه او وائي پرے ښیکښی
دےؔ خپل هنر چه وائي دم درحال

" میں نے پوچھا کہ وہ کونسا سچ ہے جو بولا جائے تو سبکی ہوتی ہے ؟ جواب ملا جب کوئی خودستائی پر اُتر آئے "

ؔ چه کردارےؔ له گفتار سره سم نۂ دے
تش گفتار واره په ځان باندے نفرین دے

" جس کی گفتار کردار کے ساتھ لگانہ کھائے ، تو محض زبانی جمع خرچ اپنے اوپر ملامت کے مترادف ہے "

ؔ په معنیٰ پانړے گلونه دی خبرے
د سړی کړده د اونے ثمره دہ

" انسان کی باتیں پھول پتی کی مانند ہیں ، اور اُسکے افعال جیسے درخت کا پھل ہو "

یہ معنی خیز انداز ایک دوسری شکل میں صوفی شاعر لسان الغیب عبدالرحمان باباؒ کا ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی ترک دنیا کے طرفدار نہیں بلکہ اِس دنیا میں فعال اور بھرپور باعمل زندگی گذارنے کے حق میں ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

خاورے د آدم چہ کڑے خمیر فرشتگانو
درست ئے پہ غمو تو پہ دردونو اولاڑۂ

"جب فرشتوں نے آدم کی مٹی کا خمیر بنایا تو سارے کا سارا درد وغم میں گوندھ ڈالا۔"

مگر اسکے باوجود رجائیت، عمل، طلب اور تلاش و تجسس کے خواص بھی سرشت انسانی میں شامل کئے گئے ہیں۔ اسکے لئے محنت اور کوشش کی جو تعلیم رحمان بابا کے کلام میں موجود ہے زندگی کے بارے میں وہ مثبت رویہ کی حامل ہے۔ جناب دوست محمد کامل لکھتے ہیں: "رحمان بابا نے جو کچھ کہا ہے چاہے وہ سب شعوری طور پر عمل کے تمام دائروں اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں نہ بھی ہو، پھر بھی اُصولاً اُن میں بہت کچھ انسانی زندگی اور عمل پر مجموعی لحاظ سے حاوی نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔ ؎

در بخبلے خدائے دھرے چارے توان دے
پہ دیر توان کنبے خپسر بولے ناتوان دلے

"تجھے اللہ تعالیٰ نے ہر کام کرنیکی طاقت دی ہے۔ باوجود اس قدر زیادہ طاقتور ہونیکے خود کو کمزور و ناتوان کیوں سمجھ بیٹھے ہو۔"

اگرچہ یہ انسان کے دین و دنیا دونوں کے اعمال پر صادق ہے۔ مگر اُسکی نظر میں انسان کے اعمال کا مدعا اور مقصد تقویٰ داری یعنی طاعت، عبادت زہد اور ریاضت ہے۔ اس لئے کہ یہی اُس کی اصلاح و فلاح کا راستہ ہے، رحمان بابا کہتا ہے ؎

ؔلہ رحمان بابا د کامل ھنر۔ ص ۲۳۳

د دنیا د سود دپاره غمگین مه شه — غم د دین او د ایمان خوره بې دین مه شه

هر گره کره کشاده لری کم بخته — نا امید له خدایه غو ته جبین مه شه

د ذرې په څیر افتاب په طلب خپل کړه — لکه تیږه هسې پروت په زمین مه شه

کار په تش لستونړی نه کیږی بې لاسه — لاس په بیره کړه بې لاسه آستین مه شه

چه تقوی دیانت نه لری رحمانه

ددې هسې همنشینو نشین مه شه

دنیاوی منفعت کے لئے اندوہگین مت ہو۔ اپنے دین و ایمان کی فکر کرو اور بے دین مت بنو۔ ہر گرہ کے لئے گرہ کشا موجود ہے۔ تو اے کم بخت پھر اللہ سے نا امید ہو کر چین بہ جبین کیوں ہوتے ہو؟ ذرے کی طرح آفتاب کو اپنا مطلوب بنالو، اور پتھر کی طرح بیکار زمین پر مت پڑے رہو۔ ہاتھ کے بغیر خالی آستین سے کام نہیں ہوتا۔ داڑھی پر ہاتھ ہاتھ پھیر کر کام کا آغاز کرو اور بغیر ہاتھ والا آستین نہ بنو۔ اے رحمان! ایسے لوگوں کی ہمنشینی سے پرہیز کرو جو تقویٰ اور دیانت سے عاری ہوں۔"

رحمان بابا کی اخلاقی تعلیمات کے بارے میں مشتے از خروارے کے طور پر یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور جیسا کہ کہا گیا ہے رحمان بابا کا دیوان خصوصیت کے ساتھ مثالی خوبیوں سے اٹا پڑا ہے۔ کم وبیش ہر غزل میں عشقیہ شاعری، تصوف اور اخلاقیات لعل و جواہر کی طرح ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ جس سے انکے کلام میں لطف اور رنگینی پیدا کی ہے جس کی برکت سے رحمان بابا کا کلام "پشتونخوا" کے دوسرے ہر شاعر کے کلام سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہوا ہے۔ جیسا کہ کہتا ہے ؎

که د عشق لاره اغزنه ده هر کوره — د عاشق په پښو څپلۍ ذوی د اور

کله دیدن دیار موندهٔ په انتظار شی — زما سترگې دی شبنم غونډې څلور

تیغ د اوښنې محتاج د نوم آب دے — قرب د حلم یو په سله دے تر زور

له لویئ له سرکشئ زما توبه ده — خدائ ئ ټوک نه کړه د اسمان په څیر نسکوړ
خدائ زده څه سودا به پیښ په بازار شي — د بازار خبرے نشي په خپل کوړ
دا همه وارو عاشق له پیدا شي — که تهمت که ملامت دے که پیغور
جفا ناز و جور و کبر د ښو یا نو — ما په ځان دے قبول کړے لکه پور
راحت بے زحمته ندے چا موندلے — غم ښادي ده دوے د دهر ورور او خور

رحمان هسے په خپل یار پسے غوښ غوښ دے
لکه غوښ په خپل اولاد وي پلار او مور

" ہر چند کہ عشق کا راستہ خار زار کی مانند ہے۔ لیکن عاشق نے اپنے پاؤں میں آتشیں چپلیں پہن رکھی ہیں۔"

اگر دیدار یار کا انحصار انتظار پر ہو، تو میری آنکھیں شبنم کی طرح جاری ہیں۔"

لوہے کی بنی ہوئی تلوار بھی نرم پانی کی محتاج ہوتی ہے۔ زور کے مقابلے میں نرمی کا قرب ہزار درجے بہتر ہے۔"

" غرور اور سرکشی سے میری توبہ ہے۔ خدا کسی کو آسمان کی طرح سرنگون نہ کرے۔"

" خدا جانے بازار میں کس قسم کا سودا پیش آئے، بازار کی باتیں گھر پر نہیں کی جاسکتیں۔"

" تہمت ہو، ملامت یا طعن و تشنیع یہ سبھی کچھ عاشق کا مقدر ہے۔"

" حسینوں کے جور و جفا اور کبر و ناز کو میں نے اپنے تئیں فرض کی مانند قبول کیا ہے۔"

" زحمت کے بغیر کبھی کسی کو راحت نہیں ملی۔ زمانے کی غمی و شادی آپس میں بہن بھائی ہی تو ہیں۔"

" اپنے محبوب کے پیچھے رحمان سرتاپا غم و الم میں ڈوبا ہوا ہے جیسے والدین اپنی اولاد کے لئے ہوتے ہیں۔"

اس پوری غزل سے قاری مذکورہ بالا دعویٰ کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اور اب رحمان بابا کی اخلاقی شاعری کے انداز کا جائزہ لیا جائیگا کہ یہ اپنی جگہ دلپذیر بھی ہے اور نصیحت آموز بھی۔ وہ کہتا ہے۔

کهٔ دِ غم د درست جهان تر زړهٔ چاپیر شی
د نګیں مهٔ شه ســے واړه چه به تیر شی

ځو دِ تیرهٔ تلخابی تر ستونی نهٔ شی
شیرنی به څوند در نهٔ کا به دهان کښے

بے محنته چا راحت موندلے نهٔ دے — د وصال خوښی دهجر په مقدار شی
چه اول ئے خار زرغون شی په پهلو کښے — غنچه هله شګفته شی په ګلزار

په دنیا کښے خوب هغه کا چه نادان وی
هغه زوے چه هوښیار وی څهٔ به خوب کا

د طلب د کوتاهئ نهٔ ویره اوکړه
کهٔ هر څو دِ لار کوتاهه ده طالبه

بے هنرو لره قند زهر قاتل دی — قند ئے اوګنړه کهٔ زهر په هنر خوری
ننګیالے چه یو ځل مخ کا په یو لوری — نور هیڅ نهٔ وینی کوهے وی کهٔ کړنګ

څو دِ حق موندلے نهٔ دے مهٔ حیار ووزه
په دا مرسته کښے جهان واړه لټیت کړه

د مطلوب له طالبانو چه ځان پټ کړے — اے رحمٰنه! اول سیال شه بیائے موم

" اگر ساری دنیا کے غم تمہارے دل پر محیط ہوں، تو آزردہ نہ ہونا جان لے کہ یہ بھی آخر گذر جائینگے۔"
" جب تک کڑواہٹ تمہارے حلقوم سے نہ گزرے تو تمہارے منہ میں مٹھاس کا بھی مزہ نہیں آئیگا۔"
" محنت کے بغیر کسی کو راحت نصیب نہیں ہوتی اور وصال کی مسرت بھی ہجر کی مقدار پر مبنی ہے۔"
" باغ میں غنچہ تب کھلتا ہے جب پہلے اسکے پہلو میں کانٹا پھوٹ پڑے۔"
" دنیا میں نیند اسی کو آتی ہے جو نادان ہو وہ ذی روح جو ہوشیار ہو بھلا کب سو سکے گا۔"
" اے طالب! چاہے تمہارا راستہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، پھر بھی تم اپنی طلب کی کوتاہی سے

ڈرتے رہنا۔"

بے ہنروں کے لئے شکر بھی سم قاتل ہے اور اگر زہر بھی ہنرمندی سے کوئی کھائے تو اُسے شکر سمجھنا چاہیئے۔"

جب کوئی صاحب حمیّت (غیور) کسی سمت اپنا رخ کرلے، تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اُس کے آگے کنواں ہے یا کھڈ۔"

"جب تک تمہیں تمہارا حق نہ ملے واپس ہرگز نہ لوٹو چاہے اسکے لئے تم ساری دنیا کو تہہ و بالا کرڈالو۔"

"جب تم اپنے آپ کو مطلوب کے طالبوں میں شمار کرتے ہو تو اے رحمان! پہلے اپنے آپ میں اہلیت پیدا کرو اور پھر اُسکے متلاشی بنو۔"

یہ صحیح ہے کہ رحمان بابا کے کلام میں جبر و قدر کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا ہے کہ تقدیر کے ہاتھ میں انسان مجبور محض ہے۔ یہ ہر حال میں تابع مشیّت ہے۔ اور جو کچھ روزِ ازل سے اسکے لئے لکھا گیا ہے وہ اسے پہنچیگا۔ کیونکہ ؎

د ازل په وخت د بڼتو تواری وه
اے رحمٰنؔ! چا بائلے چا گټلے

"روزِ ازل جب حصول بخروں کا جُوا کھیلا جارہا تھا تو اے رحمان! کوئی ہار رہا تھا اور کوئی جیت رہا تھا۔" اسی لئے تو ؎

کهٔ تورغول ځایه نوځی او به نوځی
ولے نور به مقدر نهٔ شی هرګز

"کوہِ سیاہ اگر اپنی جگہ سے ٹلے تو ٹل سکتا ہے۔ مگر مقدر کو ہرگز تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔"

هغه چارے چه موقوفے په تقدیر دی
کړے نهٔ شی په محنت په مشقت توک

"وہ کام جو تقدیر پر موقوف ہیں کوئی بھی انہیں محنت و مشقت سے انجام نہیں دے سکتا"

کہ هزار ځله دمونه په ځان پو کا
نور به نهٔ کا په دمونو قسمتو نه

"چاہے ہزار بار کوئی اپنے اوپر دم پھونکے پھر بھی وہ اس سے اپنی قسمت کو تبدیل نہیں کر سکے گا"

له قسمته خلاصیدهٔ دهیچا نشته — کهٔ داخل شي د مکې په حرمو نه

"قسمت سے کسی کو بھی چھٹکارا نہیں چاہے وہ حرم مکہ ہی میں کیوں نہ داخل ہو"

حاصل کلام یہ کہ

سرې کله په کوشش ترځایه رسي — تر څو خدائے لہ لوری نهٔ وي کومونه

"کوئی شخص محض کوشش سے بھلا کب اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے جب تک کہ اللہ کا کرم اُسکے شامل حال نہ ہو" (اس لئے کہ السعیُ منی والاتمام من اللّٰہ)

محترم کامل مومند کہتے ہیں۔ کہ اگر عبدالرحمان بابا محض کوشش ہی کو سب کچھ سمجھتے تو کیوں کہتے کہ کوشش کے باوجود بھی خدا کے کرم کے بغیر کام نہیں ہوتا۔

که جنت په زهد نهٔ دے بے له فضله
هم سړے دِ خپله غاړه کړي ادا

"اگر جنت کا انحصار زہد کی بجائے اُس کے فضل و کرم پر ہے پھر بھی آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنا حق ادا کرے"

اخلاقیات کے بارے میں رحمان بابا کے چند مزید اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں

علمیت د بے عمله عالمانو — کو یا گنج د کتابونو په خرهٔ بار شته

"علمائے بے عمل کی علمیت کچھ ایسی ہے گویا کتابوں کا خزانہ گدھے پر لاد دیا جائے"

علم او کړے هیڅ عمل و د باندے نهٔ کړے — لکه طفل چه لوبے په کتاب کړے

علم تو حاصل کر لیتے ہو لیکن اُس پر عمل نہیں کرتے تم طفلِ مکتب کی طرح کتاب سے کھیل رہے ہو۔"

توکل :-

کہ د خدایہ دے وخلقو وتہ مخ شی
لہ فردوسہ بہ دِ مخ شی وسقر تہ

"اگر خدا کو چھوڑ کر تم اپنا رخ لوگوں کی طرف پھیر لو تو گویا تم نے اپنا منہ جنت کی بجائے دوزخ کی طرف کر لیا۔"

همیشہ بہ دربہ در گرځے د ہیلے
د استو بہ نے ځاے بہ بیا نۂ مومے چرتہ

"ہمیشہ در بدر پھروگے اور دھتکارے جاؤگے اور کہیں بھی تمہیں ٹھکانا نہیں ملے گا۔"

چہ مولا درسرہ مل نۂ وی رحمانہ
کۂ لښکرے درسرہ وی یکتنہا ئے

"اے رحمان! اگر خدا کسی کے ساتھ نہ ہو تو لاؤ لشکر کے باوجود وہ شخص تنہا ہے۔"

احسان :-

بے لہ خدایہ منور دهیچ چا منت مۂ کړه
پہ اوچ کانړی باندے او نہ د کہسار شہ

"خدا کے بغیر کسی اور کے منت گذار نہ ہو اور خشک پتھر پر اُگا ہوا کہسار کا درخت بن جاؤ۔"

بے منتہ جام د زهرو څښلے بنۂ دے
نۂ هغہ چہ منت بار شے وکوثر تہ

" زہر کا جام جو منت کے بغیر ملے۔ اُسے پینا بہتر ہے اور کوثر کے لئے زیر بار احسان ہونا اچھا نہیں۔"

قناعت :-

د دنیا بادشاهان تواست کړی لہ فقیره
تۂ بادشاہ د ہسے ملک شہ فقیر مۂ شہ

" دنیاوی بادشاہ فقیر سے سوال کرتے ہیں، جا تو بھی ایسے ملک کا بادشاہ بن اور سوالی نہ بن۔"

۵ موړ به نۀ شے په حرص بے قناعته
اے په تخت د اورنګزیب ناسته ګدایه

"اے اورنگزیب کے تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے گداگر، تو بغیر قناعت کے اپنی آزو حرص سے کبھی سیر نہیں ہوگا۔"

"فقر":-

چه د تموک په طلب ګرځے خدائے هیر دے
فقیری دا هسے چرے وی فقیره!

"تم جو پارۂ نان کے لئے مارے مارے پھرتے ہو اور اللہ کو بھلا بیٹھے ہو۔ اے نام کے فقیر! بھلا فقیری کب ایسی ہوتی ہے"؟

کسب حلال:-

ما ته ملا په مشقت په محنت ښه ده
نۀ حرامه همیانئ د چا تر ملا

"محنت و مشقت کی وجہ سے شکستہ کمر ہونا بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ انسان حرام روپوں کی تھیلی اپنی کمر کے ساتھ لٹکائے پھرے۔"

آدمیّت:-

آدمیت ښۀ په دولت نۀ دے رحمانَ
بُت که جوړ شی د سرو زرو نۀ انسان شو

"اے رحمان! آدمیت کا انحصار دولت پر نہیں۔ بُت اگر سونے کا بھی بنا ہو، انسان تو نہیں کہلا سکتا۔"

نیک نوئی:-

نیکنامی د نیک نوئ نه پیدا کیږی
دغه چاره نۀ په سوک نۀ په لوړ شی

"نیک نامی نیک نوئی سے پیدا ہوتی ہے یہ کام مار دھاڑ سے نہیں ہوتا۔"

خوش خلقی:-

که ژوندون د ے تو هم داد ے په جهان کښے
چه له چا سره ښیرین ږدی په خندا

"اس دنیا میں اگر کوئی زندگی ہے تو بس یہی ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی خوشی بسر کی جائے۔"

صلح و آشتی:-

ودانی پہ یوہ دم کیبنے شی ویرانہ
مرد هغہ چہ کړی دورانے ودانی

"آبادی تو لحظہ میں بھی ویران کی جاسکتی ہے۔ مردانگی تو یہ ہے کہ کوئی ویرانے کو آباد کر دکھائے۔"

دلجوئی:-

کہ مشکل دی نو د زړهٔ نو غول دی
سهل کار دے کاروبار دد دنیا

"اگر مشکل ہے تو وہ تالیفِ قلوب ہے ورنہ اِس دنیا کا کاروبار تو ایک آسان کام ہے۔"

برائی کے بدلے نیکی:-

کہ بل بد کاندی تہ ښہ ورسرہ اوکړه
هر یو نخل چہ میوه لری سنګسار شی

"اگر دوسرا برائی کرے تو بھی تو اسکے ساتھ نیکی کر کیونکہ درخت وہی سنگسار ہوتا ہے جو پھلدار ہو۔"

خدمتِ خلق:-

هغہ زړهٔ بہ لہ طوفانہ پہ امان وی
چہ کشتئ غوندے د خلقو باربردار شی

"وہ دل طوفان سے محفوظ ہوگا جو کشتی کی طرح لوگوں کا بوجھ اٹھاتا پھرے۔"

مختصر یہ کہ رحمان بابا کے کلام میں پند و نصیحت اور درسِ اخلاقیات کے اس قدر زیادہ موتی موجود ہیں کہ سالکوں کو اِس بیان پر مجبور کیا ہے کہ اگر قرآن کریم کے علاوہ کسی دوسری کتاب پہ نماز جائز ہوتی تو وہ رحمان بابا کے دیوان کو منتخب کرتے۔ اس لئے کہ اس میں ہمدردی۔ انصاف، تقویٰ، دیانت راستی۔ سخاوت، نیک چلنی، شرم وحیا، انکسار و خاکساری، برائی اور دروغ گوئی سے اپنا دامن بچانے کے بارے میں دلآویز اشعار[1] موجود ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ دین و دنیا دونوں

[1] تفصیل کے لئے کامل مومند کی کتاب رحمان بابا صفحہ ۲۳۰ تا ۲۵۲ اور خیال بخاری کی کتاب رحمان بابا ص ۶۷ تا ۶۶۔

کی بھلائی کی ضامن ہیں۔ اور انہی کے ذریعے مخلوقِ خدا تک اچھائی پہنچتی ہے۔
دنیا میں اچھا انسان وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ ؎

ښه تو ښه مې نشي په تش داد د کور د کلي
مرد بويه چه واخلي د غم پيټے له غمګينه

"اڑوس پڑوس کی داد و تحسین کے کوئی معنی نہیں، مردانگی یہ ہے کہ اس کی پرواہ کئے بغیر بھی کوئی غمزدوں کے درد وغم میں شریک ہو جائے۔"

اخلاقیات کا دوسرا بڑا ترجمان عبدالحمید ماشوخیل ہے۔ اسکے کلام میں جس خوبصورت انداز سے یہ موضوع پیش کیا گیا ہے اس نے پشتو غزل میں ایک منفرد حیثیت حاصل کر لی ہے۔ عبدالحمید مخمون آفریدی کے اُستاد تھے۔ عشق اُنکی شاعری کا اصل موضوع تھا، لیکن اخلاقی تعلیم کو بھی اُس میں ایسا سمویا کہ پڑھنے والا کلی طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ ؏

پاک شو اول وپس ديده پر آن پاک انداز

"پہلے خود صاف ستھرے ہو جاؤ اور پھر اُس (محبوب) پاک پر نظر ڈالو"

اسی آرزو اور طلب میں وہ کہتا ہے ؎

که يار غواړے هره ژاړه چه څو وی عبدالحميد
دا په دا چه دُر موندهٔ شي په درياب نهٔ په ناله کښې

"اگر تمہیں محبوب کی طلب ہے تو اے عبدالحمید جتنا بھی تم رو سکتے ہو روتے رہو۔ اس لئے کہ موتی تو سمندر سے ہاتھ آتے ہیں یہ نالی میں نہیں مل سکتے۔"

یوں وہ شخصی کردار کی تعمیر اور انتقاد کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ اور اسکے لئے کم سِنی ہی سے بچے کی مناسب تربیت اور اخلاقی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے ؏

نازولے زوے نهٔ اخلي ادب — او د سويری نخل نهٔ نيسی رطب
ونيومشه هغه زوے په خوا پورے — چه ئے نهٔ نيولے درس وی نهٔ مکتب

پہ غوجل کښے باری خر اوکچر ښۀ وی — نۀ پہ نخونہ کښے جاهل او بے طلب
چہ پیدا شی یو ناکس پہ قبیلہ کښے — وړاندے وروستو هبطہ کاندے نسب
د پسر پہ نیکو بدو پلار یادیږی — دا خبر دے پہ جهان کښے مجرب
پہ سوارۀ باندے دے کتہ شی ایښودۀ — چہ دے اس برابر نۀ ځی پہ جلب
پہ زړۀ مهر پہ خُلہ قهر زوئی تہ بویہ — ځکہ ښۀ واځی چرتہ د ب هلتہ ادب

یوسف صالہ شو لائق د بادشاهئ
چہ دے اونوړے څپیړے د غضب

"لاڈلا بیٹا ادب حاصل نہیں کرتا۔ اور نہ کھجور کا وہ درخت جو سائے میں ہو پھل دیتا ہے۔"

"اُس بیٹے کو گود میں بھی نہ لیا جائے جو درسِ مکتب سے بے بہرہ ہو۔ اصطبل میں بندھا ہوا گدھا یا خچر کنبہ کے ایک جاہل اور بے مدعا شخص سے کہیں بہتر ہیں۔"

"جب کسی قبیلے میں کوئی ناخلف پیدا ہو جائے۔ تو اپنے اگلے پچھلے نسب کو گندہ کر دیتا ہے۔"

"باپ کو بیٹے کی اچھائی برائی کے طفیل یاد کیا جاتا ہے۔ یہی ایک بات ہے جو اس جہان میں بڑی مستند مانی جاتی ہے۔"

"جس کا گھوڑا زمام میں برابر (ایک ساتھ) نہ جائے تو اس کا پالان بالآخر اُس کے سوار کے کاندھے پر لاد دیا جاتا ہے۔

"چاہیئے کہ بیٹے کیلئے دل میں مہر اور بظاہر قہر ہو اور کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جہاں سزا ہے وہاں ادب خود بخود آ جاتا ہے۔"

"یوسفؑ اُس وقت سلطنت کے سزاوار بنے جب اُنہوں نے منہ پر غضب کے تھپڑ کھائے۔"

یہ ہے شخصی تربیت کی بنیاد جس کی نشاندہی پشتو کے اِس نازک خیال شاعر نے کی ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں بعض انسانی کمزوریاں انسان کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ عبدالحمید نے شبستانِ زیست میں تاریکی کے ان دکیلوں کو ٹھوکر سے بچانے کے لئے پند و موعظت کی شمعیں روشن کی ہیں اُن کا انداز کچھ یوں ہے:۔

ھ اے مدام د نس پہ زیرمہ مبتلا — خان تہ ولے ویبنسوے اودے بلا
دانایان لہ د شمنانو صلا نہ کا — تہُ پہ شہٗ کوے د نفس شیطان صلا

پہ حیا کبنے سرے وږے تږے بنہٗ دے
نہٗ پہ شہد و شکر موړ پہ بد رسوا

ھر سړے پہ خپل بنائست بائد ےزیاتے — نہ د مور پہ زیبائی اونہ د آب
درویشی پہ تخت وتاج بائد ےزوال فوری — تخت وتاج لرہ زوال تاخت وتاراج

"تم جو کہ ہمیشہ نفسانی خواہشات کی حمایت میں مبتلا رہتے ہو، اپنے لئے سوئی ہوئی بلاؤں کو خود بیدار کیوں کرتے ہو۔"

"دانا لوگ دشمنوں سے مشورہ نہیں کیا کرتے تو پھر تم کیوں نفس وشیطان سے مشورہ لیتے ہو۔"

"حیادار انسان بھوکا پیاسا اچھا ہے نہ یہ کہ اُس کا پیٹ شہد وشکر سے بھرا ہو اور برائی میں رسوائے زمانہ ہو جائے۔"

"ہر شخص اپنے ہی حُسن کیوجہ سے خوبصورت دکھائی دیتا ہے نہ کہ ماں باپ کی خوبصورتی کیوجہ سے۔"

درویشی تاج وتخت کیوجہ سے زوال پذیر ہوتی ہے۔ اور تخت کے لئے تاخت وتاراج باعث زوال ہے۔"

خلاصہ مطلب یہ کہ اس دور کی شاعری کے تین بڑے موضوعات، عشق تصوف اور اخلاقیات تھے۔ یہی موضوعات ہیں جنہیں اِس دور کے شعراء نے طرح طرح سے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ شاعر چاہے خوشحال بابا کے گھرانے کا ہو یا عبدالرحمان بابا کے مکتب فکر کا۔ عبدالحمید کی طرح نازک بیان ہو۔ علی خان کی طرح رومان پسند یا کاظم خان شیدا کی طرح نکتہ طراز۔ فکر ونظر کی منزل سب کی ایک ہی ہے۔ یہ سبھی محبت کے شیدائی۔ حقیقت کے طلبگار اور معاشرتی اصلاح اور اخلاقیات کا درس دینے والے تھے۔ یہ دور جس کا آغاز خوشحال بابا سے ہوتا ہے، احمد شاہ بابا پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

شاعر بادشاہ احمد شاہ بابا

اور یہ ځان باندے قبول کړه   ځنتر زده کړه له ققنسه

" اپنے لئے آگ قبول کر کے ققنس سے ہنر سیکھ لو۔"

زندگی کے بارے میں اس تصوّر کا حامل احمد شاہ ابدالی ہے۔ یہ اپنے دور کا ایک اولوالعزم پشتون بادشاہ اور ایک بہت بڑا فاتح جرنیل گذرا ہے۔ یہ تاج و سریر کا بھی مالک تھا۔ اور صاحب سیف و قلم بھی تھا۔ رحمان بابا کے بعد یہ دوسری ایسی بڑی شخصیت ہے جسے پشتونوں میں متفقہ طور پر "بابا" کے گرانقدر، میٹھے اور رسیلے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی "دُرِّ دراں" کا ہمعصر مجاہد روہیلکھنڈ کا نواب حافظ رحمتؒ خان روہیلہ شہید انکی شخصیت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔

پشتون قوم خصوصاً سڑ بنی شاخ کے ابدالیوں کے قبیلے میں ایک بڑا بادشاہ پیدا ہوا ہے۔ یہ تاجدار ہندوستان، ایران اور توران کا سلطان ہے اور اس کا نام غازی بادشاہ احمد شاہ دُرِّ دُرّان ہے۔ سارا ایران و توران اور ہندوستان اس کے زیر تصرف ہے۔ آس پاس اور ہر سمت کے لوگ اُس کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔"

مؤرخ پروفیسر گنڈا سنگھ کہتا ہے: "اٹھارویں صدی کے مغربی ہندوستان کی تاریخی تحقیق کے میدان میں اس بات پر بے حد حیران ہوا کہ احمد شاہ ابدالی وسطِ ایشیا کی ایک بہت بڑی تاریخی شخصیت گذرے ہیں۔ اور باوجودیکہ میں نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی جہاں احمد شاہ کے بارے میں بچپن میں ایسے قصے سُنا کرتا کہ وہ ایک ڈاکو تھا۔ جو ہندوستان پر چھپٹا۔ اور منوں سونا چاندی اور ہزاروں غلام قبضہ میں کئے۔ لیکن میرا مطالعہ جس قدر بڑھتا گیا۔ مجھے اس شخص کی زندگی میں عظمت کی باتیں نظر آئیں۔ اور

لے خلاصۃ الانساب تالیف حافظ رحمت خان ص ۸۷۔

ٹے پیدائش ۱۷۲۵ء تاریخ وفات ۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ قندھار مدفن

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر یہ ایران کے نادر شاہ افشار سے بڑا نہ تھا تو کسی طرح اُس سے کم بھی نہ تھا۔"
پروفیسر گنڈا سنگھ نے اس بارے میں بڑی تحقیق کی ہے۔ اور احمد شاہ بابا کی سوانح کے مکمل خاکے کی تلاش کا اہم کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اس محقق کے بیان کے مطابق دوسرے محققین اور اہل قلم نے اس غازی بادشاہ کو تاریخ میں وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا۔ اور نہ کسی نے یہ بات بتائی ہے کہ وہ اس قدر بڑا فاتح نظام مملکت کے اصولوں سے شناسا اور خبردار تھا نیز یہ کہ وہ ایک بڑی ایشیائی قوم کو بیدار کرنے والا تھا۔

یہ غازی بادشاہ صاحبِ دیوان اہل قلم گذرا ہے۔ اگرچہ شعری لوازمات کی رو سے احمد شاہ بابا کا دیوان نامکمل دکھائی دیتا ہے لیکن مولانا عبدالقادر کے قول کے مطابق انکے عقائد، قوت ایمانی، اخلاص، محبت وحمیت اور پھر انکا علم اور صوفیانہ افکار جو بھی انکے کلام میں دیکھے تو انکی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو بھی اُنکے سامنے آجائے گا۔

مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ: "ایک طرف سپاہی اور دوسری طرف صوفی یہ دونوں کیفتیں ایک ہی ذات میں جمع ہونا باعث تعجب ہے۔"

لیکن احمد شاہ بابا کی ذات میں ان دونوں صفات کا یکجا ہونا دراصل پشتونوں کا وہ ملی شعار ہے جو غور غشت نامہ کی ایک حکایت میں اخلاقی شاعری کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پر اسرار غازی تاریخ کے ہر دور میں مجاہدانہ روایات کے حامل رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات کچھ عجب نہیں۔ اگر احمد شاہ بابا نے بھی ان روایات کو زندہ رکھا ہو۔ اور اپنی ذات میں وہ ملی صفات پیدا کی ہوں۔ جو پشتون قوم کا جوہر فطری ہے تو پھر انہی صفات کے لحاظ سے انہوں نے اپنے عوام سے ہر دلعزیزی اور احترام کا وہ نام حاصل کیا ہے۔ جو کسی دوسرے پشتون بادشاہ کو نصیب نہیں ہوا یہ اس لئے کہ وہ ایک پیدائشی سردار اور پکے پشتون، انسانیت دوست

لہ پیش لفظ دیوان احمد شاہ ابدالی ص ۷ پشتو اکیڈمی چھاپ

حاکم۔ اعلیٰ منتظم اور علم و ادب کے سرپرست تھے۔ دوست اور دشمن دونوں اُنکی اِن صفات کے معترف ہیں۔ مستشرق الفنسٹن کہتا ہے کہ "احمد شاہ بذاتِ خود متقی تھے اور اُنکی یہ خواہش تھی کہ تقویٰ کی آخری منزل تک پہنچ جائے۔"

مرحوم قاضی ہدایت اللہ لکھتے ہیں :" احمد شاہ ابدالی کی شاعری کی روحِ روان محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اسلام، قوم وطن اور نسلِ انسانی کے ساتھ محبت۔ مختصر یہ کہ محبت کو اپنے اوپر ایک فرض سمجھتا ہے۔

اے احمده تاچه مینه په ځان پورکړه
نو وفا کړه د دنیا فانی رباط

" اے احمد! جب تو نے اپنی جان پر محبت کا قرض لاگو کیا تو دنیائے فانی کی اِس سرائے نے بھی وفا کا وطیرہ اختیار کیا۔"

احمد شاہ بابا نے اپنے کلام میں انسانیت کے ساتھ محبت کی روایت کو پشتو ادب میں قائم کیا ہے۔ یہ مقلد شاعر نہ تھے۔ اس لئے انکے کلام میں بحر اور وزن کی پابندی کا اتنا خیال نہیں نظر آتا۔ وہ ایک بادشاہ شاعر تھے اور کلامِ ملوک جیسا بھی ہو قابلِ قبول ہوتا ہے۔ تنقید نگار کو چاہیئے کہ اُس جذبے کی قدر کرے۔ جس کے تحت اُن خیالات و افکار نے جنم لیا ہے۔

احمد شاہ بابا کا کلام غزلوں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ یہ زیادہ تر حمد و نعت اور عشقیہ شاعری ہے۔ حُبِّ وطن اور اخلاقیات کے بھی بعض موضوعات ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

حُبِّ وطن:

د ډیلی تخت هیر وم چه رایاد کړم
زما د ښکلي پښتونخوا د غرو سرونه

احمد شاه به د غه ستا قدر هیڅ نه کا
که اونیسی د تمام جهان ملکونه

" جب میں اپنی پشتونخوا کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو یاد کرتا ہوں تو تختِ دہلی کو بھول جاتا ہوں"۔
" احمد شاہ چاہے تمام روئے زمین ہی کو فتح کیوں نہ کرے اے مادرِ وطن! وہ تیری قدر و منزلت

ہرگز فراموش نہیں کرے گا

تصوف:۔ ے
پہ اشنا بہ خبر نۂ شم
ځو خبر نهٔ شم له ذاته

کهٔ له خپلے ځودیٔ تیر شم ځود بہ زهٔ شمه مرآته
معرفت به ے روزی شی کهٔ فانی شوم وفناته
دا د یار مینہ ځوږه ده په پرپکړې سر ده زیاته

"جب تک میں اپنی ذات سے آگاہ نہ ہو جاؤں اپنے محبوب سے خبردار نہیں ہو سکتا۔"
"اگر میں فانی ہو کر فنا کا ماہر بن جاؤں تو مجھے معرفت الٰہی نصیب ہو جائیگی۔"
"محبوب کی محبت بڑی میٹھی شے ہے اس پر طرہ یہ کہ یہ اپنا سر کٹانے میں کہیں زیادہ لطف پیدا کرتا ہے۔"

وحدت الوجود:۔ ے
د وحدت چہ په امر را بیرون شوم
د کثرت په ملکو هر ځوا په ښکار ځم

"جب امر الٰہی سے میں وحدت کے قلمرو سے باہر آیا تو کثرت کے ممالک میں، میں ہر طرف شکار کھیلنے جایا کرتا ہوں۔"

وحدت الشہود:۔ ے
بے حجابہ ده دیار د اغیار په مخ رواکا
د وحدته را بیرون شوه لون لون تماشاکا

"بے حجاب ہو کر یار د اغیار سب کو دعوت نظارہ دے رہی ہے، اور وحدت کے مقام سے خود کو بیرون کر کے وہ گوناگوں نظارے دکھانے لگی ہے۔"

جُہد و عمل:۔ ے
په بریښنا د توره ژوند کوه احمدہ!
د بدیٔ جولان په لوری د هر دیار کا

"اے احمد! تلوار کی چھاؤں میں زندگی گذارو۔ ہر ملک کی طرف کامیابی کی برق رفتاری کیساتھ جایا کرو۔"

"اے احمدہ دنیا تیرہ بہ ھر چادہ — ستا پہ تورہ بہ با وخت فخر پښتنو کا

" ہر ایک سے یہ دُنیا آخر کار رہ جانے والی ہے اور کبھی وقت آئیگا کہ پشتون تیری شجاعت اور دلیری پر فخر کیا کریگا۔"

"مجاہدانہ روح:"

کہ مے برق د پینے تورے بیا بریښنا کړہ
ستا پہ مھر بہ ھر لوری عالمگیر یم

زۂ تسخیر د ولایت د خدائے پہ داد کوم
پہ مدد د حبیبؐ ھرہ خوا تازہ حُم

زۂ احمد د نیا فانی گنړم چہ نیشتہ
دُنیا پاتے لہ ایمانہ بہ سرہ حُم

اگر ایک بار پھر کبھی میری سفید تلوار کی بجلی چمکی تو تیرے فضل و کرم سے جس سمت بھی جاؤنگا عالمگیر رہوں گا۔

یہ اللہ کی دین ہے کہ میں کسی کو تسخیر کر لیتا ہوں اور اُسکے حبیبؐ کے صدقے ہر طرف تر و تازہ ہو کر جاتا ہوں۔

میں (احمد) اس دنیا کو فانی سمجھتا ہوں جیسے یہ ہے ہی نہیں۔ یہ دنیا رہ جائیگی اور میں ایمان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

"مُحبّت اور حمیّت"

مرگ بنۂ دے پہ دنیا کښے — نۂ چہ څوک شی بے وفا
سر پہ تیغ پریکړے بنۂ دے — تر بے پتہ پہ دُنیا
چہ ہے سر پہ مینہ کښنود — ھغۂ یو رہ محبوبا

کسی کے بے وفا ہونے سے تو یہ بہتر ہے کہ اسے موت آجائے
اِس دنیا میں بے حمیّت ہو کر زندہ رہنے سے تو کٹا ہوا سر بہتر ہے۔

جس نے عشق کی راہ میں سر کی بازی لگادی محبوبہ کو اُسی نے حاصل کرلیا۔"

"عشقِ حقیقی":-

؎ دیقین ډیوه د عشق په لار پیدا کړه
په تور تم کښے دا یقین د زړهٔ فلاح

نور عالم کهٔ نو ئې مدح د جنت کا
احمد شاه دے د خپل یار د در مداح

ایقان کی مشعل لئے راہ عشق طے کیا کر تیرہ و تار اندھیرے میں یہ تیقن دل کے لئے باعثِ فلاح ہے۔ دوسرے لوگ اگر جنت کی تعریف کرتے پھریں مگر احمد شاہ تو اپنے دوست کے چوکھٹ ہی کا مداح رہے گا۔

"قضا و قدر":-

؎ د هر چا ده خپله برخه د نصیب
ستا په برخه دے ژړا کړه عندلیب

مادرزاد دے په دا برخه پیدا شوے
که دے برخه د وصال هم ده غریبه

ہر کسی کو اپنے مقدر کا صلہ ملا ہے۔ اے بلبل تیری قسمت میں تو رونا لکھا گیا ہے"

" تیرا یہ حصہ مادر زاد ہے اور تو پیدا بھی تو اسی لئے ہوا ہے۔ اگرچہ وصال یار بھی تیرا ہی مقدر ہے جو اپنے طور پر ایک نادر چیز ہے۔"

چه خدائے لوئے کړلے احمده!
تل د خوارو د دستگیری کړه

" اے احمد! جب اللہ نے تجھے بڑائی دے دی تو زبون حالوں کی دستگیری کیا کرو۔"

انکی بعض غزلوں میں شاہانہ رنگ اور عظمت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایک عام شاعر کے خیالات سے اس قسم کی شاعری اس لئے مختلف ہوتی ہے۔ کہ اسمیں وہی کچھ ہوتا ہے۔ جو مزاج شاہی کی ترجمانی کرتا ہے۔ پشتو کی عام شاعری میں چاہے عوامی ہو یا کتابی، لباس، زیور، آرائش و زیبائش و تزئین کا تذکرہ عوامی زندگی کے معیار کی ترجمانی کرتا ہے۔ جیسے ؎

ځان دے ذرو ځیامو کښے جوړ کړو
لکه په وران کلی کښے باغ د گلو وینه

"محبوب نے پرانے کپڑے پہن کر خود کو آراستہ کیا جیسے کہ کسی ویران قریہ کے کسی باغ میں بہار آئی ہو۔
یا جس طرح کہ عبدالحمید مومند کہتا ہے ؎

ما وے عین گنزه گل دے دغنچے په لمن کښے نغښتے
چه مے کوت یو گل اندام وو پر وت په سبزه دوشاله کښے

"میں نے سمجھا کہ غنچے نے اپنے دامن میں جیسے پھول کو سمیٹ لیا ہے لیکن جب بغور دیکھا تو ایک گل اندام سبز دوشالہ اوڑھے ہوئی تھی۔"

اس قسم کے اشعار میں عام لوگوں کی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے لیکن اسکے برعکس بادشاہوں کے دربار اور انکے حرم کے رنگین ماحول میں خوبانِ زرین پوش کی ایک طرفہ دنیا آباد ہوتی ہے ایسے ماحول کا شاعر جب خود بادشاہ بھی ہو تو اس کا اندازِ شعر بھی مختلف ہونا چاہیئے اور پھر وہ شاعر جو احمد شاہ بابا کی طرح خود اپنے ماحول کا خالق بھی ہو، وہ یہ حق رکھتا ہے کہ یہ کہے کہ ؎

مخ د آئینے دے چه دِ تل و مخ ته گوری
سخ د لونگین دے چه دِ تل په سینه ښوری

نه دی ستا په غوږ د غټے سلغلرے
وصل دی په میاشتے پورے یو سر بل سر ستوری

روغ مے کړه له درنځه چه دخلے بنیں ے دِ وا ورم!
شهد و شکر داکړے چه مے ستا شونډے وزوری

زهٔ که ډوب په غم یم تل دِ ډوب یم چه عاشق یم
تا دِ خدائے دلبره تل له هرے بلا ژغوری

ظلم دے دِ دوؤ ستر گو هر گوره په ما زور شی
غڅه کړم توان مجال دِ د زور نهٔ لری کمزوری

ما و تہ ارزان دی بیا تو مشکو تو عنبرو
ثوک کۂ تورے خاورے ستا دپلۂ پہ بھاپلوی

درو می ستا و لورتہ پہ ارمان ارمان کاتۂ کا
سپین ے پہ کاتۂ شو احمد شاہ دستر گو توری

"یہ آئینہ کی خوش بختی ہے جو تیرے چہرے کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور یہ دوپٹے کی خوش بختی ہے جو تیرے سینہ کے اوپر پھیلا رہتا ہے تیرے کانوں میں لگے ہوئے یہ موٹے موٹے موتی نہیں، یہ تو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چاند کے ساتھ ستارے جُڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بیماری سے صحت مند کر دے تاکہ میں تیری بد دعایئں تیرے مُنہ سے سُنوں۔ تو مجھے شہد و شکر دے تاکہ تیرے ہونٹ مجھے ڈانٹتے رہیں۔ میں اگر غرقِ غم ہوں تو غرق ہی رہوں کیونکہ میں عاشق ہوں۔ اے میرے محبوب! اللہ تجھے ہر بلائے بد سے بچائے رکھے۔ ذرا دیکھو تو کہ تمھاری دو آنکھوں نے ظلم کرنے میں اضافہ کر دیا ہے۔ کیا کروں کہ کمزور و ناتواں ظلم سہنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اگر بہ وقتِ خرام کوئی تمھارے قدموں کے نیچے سیاہ مٹی کو قیمتاً خریدنا چاہے تو میرے لئے وہ مشک و عنبر سے بھی زیادہ قیمتی ہوگی۔ احمد شاہ تمھاری طرف جا رہا ہے اور یاس و حرمان کے ساتھ دیکھ دیکھ کر اُسکی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں سفید ہوگئیں!"

"بلبلِ ہند۔ کاظم خانؔ شیدا"

پشتو ادبیات کا یہ باب بہت عجیب ہے۔ پشتو زبان کے بہت سے نامور شعراء اور ادباء غریب الدیاری میں آبِ حیاتِ شعر و سخن سے زندہ رہے ہیں۔ اپنے محدود ماحول سے نکلنے وسیع و عریض دُنیا کی سیر و سیاحت اور ضرورتِ معاش نے جنوبی ایشیا کے میدانوں کو اُنکی جولان گاہ بنایا تھا۔

لہ پیدائش ۱۱۰۴ھ مطابق ۱۷۲۷ مگ بھگ وفات ۱۱۹۴ھ

اُس سرزمین پر حرب وضرب سے لے کر امارت وتجارت تک ہر حیثیت سے انہوں نے وقت گذارا ہے۔ اکثر یوں ہوا ہے کہ انہیں جو بھی سرزمین پسند آئی وہاں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ پشتونوں کا یہ عمل پنجاب سندھ اور شمالی ہندوستان سے لے کر دکن یا بنگال تک محدود نہ تھا۔ وہ مرکزی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا احاطہ کرتے۔ اور سمرقند بخارا نیشاپور۔ اصفہان، بغداد کے علمی مراکز، حجاز عرب اور فلسطین کے مقاماتِ مقدسہ بھی انکے لئے باعث کشش تھے اسی طرح قلب ایشیا کے مکین جسم کے لہو کی طرح دائمی گردش پر مامور تھے۔ لیکن جب طلب وجستجو کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں خصوصاً فارسی اور عربی سیکھنے نے انہیں اس بات پر مائل کردیا کہ اپنے افکار وخیالات کا اظہار بھی اُنہی زبانوں میں کریں، تو اِس وجہ سے اس خطے کے اکثر وہ مفکرین مورخین، صوفیاء شعراء جو شرقِ اوسط یا ماوراء النہر کی طرف رجوع کرتے، انہوں نے اکثر وبیشتر فارسی یا عربی میں تصنیف وتالیف کا کام کیا اور انہی زبانوں میں دوامی شہرت کے حامل بھی رہے۔ اس قسم کے خراسانی مؤلفین، مصنفین اور مورخین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور شائقین کے لئے تحقیق وتجسس کا ایک وسیع میدان موجود ہے۔ جو بذاتِ خود محتاج بحث ہے۔ اِس لئے کہ اِس موقع پر یہ بحث محض ضمنی ہے اور صرف اُن پشتون شعراء اور ادباء کے ناموں کی نشاندہی کرنی مقصود ہے۔ جنہوں نے کاظم خان شیدا کی طرح مسافرت اور غریب الدیاری کے باوجود پشتو زبان میں شاعری کی ہے۔

اِس قسم کا پہلا پشتون شاعر جس کا نام "پٹہ خزانہ" کی وساطت سے معلوم ہوا ہے زید سروانڑی کا بیٹا ابو محمد ہاشم تھے۔ تیسری صدی ہجری میں پشتو زبان کا یہ فصیح البیان شاعر بغداد میں تھا۔ اور عراق کے ایک عالم اور شاعر ابن خلاد کا شاگرد تھا۔ محمد ہوتک لکھتا ہے کہ ابو محمد ہاشم سروانڑ میں ۲۲۳ھ قدسی میں پیدا ہوئے اور بست میں علماء اور فصحاء سے درس حاصل کیا۔ بعد میں عراق جاکر سالہا سال تک بڑے بڑے ائمہ سے تحصیل علم کرتے رہے اور ابن خلاد (جو ابی العینا کے نام سے مشہور تھا) کے ساتھ بغداد میں عمر؎

؎ ابو محمد ہاشم سروانڑی کا نمونۂ کلام محترم حبیبی کی کتاب "تاریخ ادبیات پشتو" کے حوالے سے اس کتاب کی پہلی جلد میں نقل ہے۔

گذاری۔ اور اُنہی سے عربی بلاغت اور اشعار پڑھے اور ۲۹۲ھ قدسی سال میں واپس آئے کہتے ہیں کہ ابو محمد ہاشم عربی فارسی اور پشتو اشعار کہا کرتے تھے ... ابو محمد ہاشم نے عربی میں لکھنے کے ساتھ ساتھ پشتو میں بھی اپنے اُستاد کے بہت سے اشعار کے تراجم کئے ہیں۔

جنوبی ایشیا کی اسلامی تاریخ میں لودھی دور پشتونوں کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط سے انکی حکمرانی اور بادشاہی کی شہادتیں موجود ہیں۔ ان میں ایک قدیم حکمران خاندان شیخ حمید لودھی کا تھا جو ملتان پر حکمران تھا۔ اس خاندان کے دو نامور بزرگ شیخ رضی اور شیخ نصر بھی گذرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رضی حمید کا بھتیجا اور نصر کا بیٹا تھا۔ شیخ رضی مبلغ اسلام تھے۔ انہوں نے "کوہ کسُی" کے علاقے میں اپنی تبلیغ سے بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام کئے تھے۔ نصر حمید کا بیٹا تھا۔ جو والد کے بعد ملتان کا بادشاہ بنا۔ کہا جاتا ہے کہ راہ الحاد پر اُسکے گامزن ہونیکی جھوٹی خبر مشہور ہوگئی۔ جب شیخ رضی کو پتہ چلا تو اپنے اس چچازاد بھائی کو ایک منظوم خط بھیجا۔ اس خط کے جواب میں ملتان کے بادشاہ نصر لودھی نے شیخ رضی کو جو کچھ لکھا وہ بھی نظم میں تھا۔ یہ منظوم دستاویزات اب بھی موجود ہیں۔ جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ ملتان کے پشتون اپنی مادری زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔

ان قدماء کے علاوہ روشانیوں کے دور کے اچھے اچھے شعراء جیسے مرزا خان انصاری محمد علی مخلص۔ ملا ارزانی جو صاحب دیوان تھے ان سب کی بھی زیادہ تر زندگی دکن اور ہندوستان میں گذری ہے انہوں نے پشتو شاعری کے اچھے اچھے دواوین مرتب کئے ہیں۔ خود خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کی اپنی شاعری کا بیشتر حصہ رنتھمبور کے زمانہ نظر بندی سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح اشرف خان ہجری کے دیوان کا بیشتر حصہ بیجاپور کے علاقے میں لکھا گیا ہے اور قاسم علی افریدی نے اپنا دیوان فرخ آباد (ہند) میں مرتب کیا ہے۔ خواجہ محمد بنگش نے روہیل کھنڈ اور میراد قلندر کے دیوان دکن میں پایہ تکمیل تک پہنچے ہیں۔ روہیل کھنڈ کے نوابوں میں حافظ رحمت خان روہیلہ کا خاندان تعلق جنہوں نے پشتو زبان کے ادب اور پشتونوں کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کا جو قابل قدر کام کیا ہے وہ بھی انہوں نے اکثر یا تو روہیل کھنڈ میں اپنے دور حکومت میں کیا ہے۔ یا پھر لکھنؤ میں قید و بند کے زمانے میں۔

پشتو زبان کا نامور شاعر کاظم خان شیدا جو نواب حافظ رحمت خان روہیلہ کے زمانے میں سرائے اکوڑی سے روہیل کھنڈ تک مسافرت پر مجبور کیا گیا تھا۔ اور وہاں رامپور میں نواب فیض اللہ خان کے ہاں ملازم ہوگیا تھا اس نے بھی اپنا خوبصورت دیوان جو پشتو زبان و ادب کا سرمایۂ افتخار ہے رامپور ہی میں مرتب کیا ہے۔

پشتو شاعری میں شیدا کا مقام ایسا ہے جیسے اُردو زبان میں غالب۔ شیدا خوشحال خان کا پڑپوتا اشرف خان ہجری کا پوتا اور افضل خان خٹک کا بیٹا تھا۔ وہ اچھا خاصا عالم فاضل شخص تھا۔ کشمیر اور سرہند میں علوم ظاہری و باطنی حاصل کئے تھے۔ پھر سرہند شریف میں طریقۂ نقشبندیہ میں پیر غلام معصومؒ کا مرید بنا تھے اور اپنا روحانی رابطہ اُس سلسلے سے قائم کیا تھا۔ خود کہتا ہے۔

پیر مے شاہ د ولایت غلام معصوم دے
مقتدا د زمانے قطب الرجال

" میرا پیر شاہِ ولایت غلام معصومؒ ہے جو مقتدائے زمانہ اور قطب الرجال ہے "۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ پشتونخوا (خراسان) کے جن مؤلفین مفکرین شعراء اور مورخین نے شرقِ اوسط یا ماوراء النہر کے شہروں میں عربی فارسی علوم حاصل کئے تھے انہوں نے اکثر و بیشتر اپنے افکار اور خیالات کا اظہار عربی فارسی نظم یا نثر میں کیا ہے۔ بعض مقامی مشاہیر جیسے بایزید انصاری اور اخون درویزہ بابا بھی وقت کے اس تقاضے پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔ لیکن ہند میں مکین بعض پشتون شعراء مولفین اور مورخین ایسے تھے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اپنی زبان کو زیادہ موزون اور مناسب خیال کرتے تھے۔ ایسے ہی لکھنے والوں اور شعراء میں ایک شاعر شیدا بھی تھے۔ جو کہ آخر میں اپنے کلام کی نامقبولی کی وجہ سے اپنے اس عمل پر ایک گونہ نادم بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بھی فارسی زبان پر خاصا عبور رکھتے تھے اور اس زبان میں شاعری کے لئے طبع موزون رکھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ محقق ہمیش خلیل نے اپنے ایک تبصرے میں لکھا ہے کہ "شیدا نے اپنی زبان اور وطن کے ساتھ محبت اور خاندانی روایات کی برقراری کے لئے پشتو میں شعر و ادب کا ایک ایسا گلستان سجایا جو حسین بھی ہے اور رنگین بھی"۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

یہ احساس کہ ؎ مکل ے پہ لاس کښے مراوے کیږی
پردے وطن دے زڑہ ئے چاتہ او نیسمہ

"پھول میرے ہاتھ میں مرجھا رہا ہے۔ اس پرائے دیس میں میں اسے کس کی نذر کروں؟"

نیز پشتو زبان کی بے قدری (جس نے بہت پہلے سے اس زبان کے شعراء کی ساکھ اندر باہر گھٹا دی تھی) اسنے کاظم خان شیدا کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ؎

ترو قوع دواقعے علاج سابق وی | نفع نہ کا اوس زما پشیمانی
پہ تدوین د خپل زبان ځکہ نادم یم | چہ او نہ شوہ پہ محل مکل افشانی

"کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے اُس کا علاج ہونا چاہیئے اس لئے اب پچھتاوے سے کیا فائدہ؟"

"اپنی زبان کی تدوین پر میں نادم اس لئے ہوں کہ موقع اور محل کے مطابق گل افشانی نہ ہو سکی۔"

شیدا کا مقصد یہ تھا کہ اگر اُس نے یہ شاعری اپنی مادری زبان کی بجائے فارسی میں کی ہوتی تو قدر شناس کی قدردانی کرتے اور اُنکے یہ رنگین افکار دنیائے ادب میں لازوال مقام پیدا کر لیتے۔ کیونکہ ؎

د مرآت پہ شان ے کا صفاد طبع | هر نفس پہ خپل مضمون کښے حیرانی
مستعد یم د فارسئ پہ قیل وقال کښے | پہ د غہ لسان وی دا نکتہ دانی
سلاست یہ وو معلوم زما د طبعے | پہ هر ځائے بہ وہ زما شعر خوانی

اهل هند زما پہ ژبہ نہ پوهیږی
ورسرہ اهل ایران و تورانی

"چونکہ میری طبیعت شیشہ کی طرح صاف ہے اس لئے ہر گھڑی میں اپنے ہی مضمون کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں۔"

میں فارسی قیل وقال کی قدرت رکھتا ہوں اور پھر اُس زبان میں بھی مجھ میں اسی قدر نکتہ دانی کی استعداد ہے۔

"میری سلاستِ طبع معلوم ہو جاتی اور ہر جگہ میرے ہی اشعار پڑھے جاتے۔"

"اب تو نہ اہل ہند ایرانی اور نہ تورانی میری زبان سمجھتے ہیں۔"

شیدا کو اپنے ہموطنوں سے یہ شکایت تھی کہ ایک تو وہ سخن پرور اور قدر شناس نہیں اور دوسرے یہ کہ بدیع اور معانی کی باریکیوں کو اتنا نہیں سمجھتے جتنا کہ ہندی ایرانی اور تورانی اس سے واقف ہیں ؎

پښتانه د دوه محروم دي له دې فنه   خبر نه دي په بديع په معاني

" وہ کے پشتون اس فن سے بے بہرہ ہیں اور بدیع و معانی سے آگاہ نہیں "۔

شیدا نے حضرت میاں عمر صاحب کے بیٹے محمدی صاحبزادہ کی فرمائش پر اپنا دیوان مرتب کیا۔ اور اسکی ایک نقل انہیں موضع چمکنی بھیجی۔ اپنے دیوان کے دیباچے میں شیدا نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے :۔

" سبب تالیف یہ تھا کہ بعض مسترد دین کی زبانی یہ بات سنی گئی کہ مخدوم زادہ ولایت نژاد، نتیجۂ ہدایت وارشاد میاں محمدی سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق شیخ الاجل ولی الاکمل میاں عمر دامت برکاتہٗ طبع جید اور سخن شناسی کا کامل سلیقہ رکھتے ہیں۔ سخن آرائی کے دبدبے میں قصب السبق اپنے ہمسروں سے آگے ہے اور خوش سرائی کی شان و شوکت میں سرفہرست ہے اُس نے اسلاف کے اکثر دیوان اور مضامین عالی رنگین اور خوشخط لکھوا کے فراہم کئے ہیں "۔

شیدا آگے کہتا ہے : " میرے بھائی عابد خان کی طرف سے مجھے کہا گیا کہ چند اشعار تالیف کروں اور انہیں بھیج دوں۔ بھائی کے فرمان کو میں حکم سمجھ کر بجالایا۔ اور کام شروع کیا۔ اور جو کچھ ہاتھ آیا میں نے ردیف وار اس میں نقل کیا "۔

اس طرح کاظم خان شیدا نے اپنا دیوان خود مرتب کیا اور موضع چمکنی کے میاں محمدی صاحبزادہ کے دربار میں ارسال کیا۔ یہ واقعہ ۱۱۸۱ھ کا ہے۔

فارسی شعراء کے کلام کے دقیق مطالعے کے علاوہ شیدا نے اپنے اکثر پیشرو پشتون شعراء کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور اُنکے کلام کا مقام بھی اپنے اشعار میں متعین کیا تھا۔ ان میں سے شیدا نے بعض شعراء کے کلام پر تضمین بھی کی ہے۔ ان شعراء میں مرزا خان انصاری۔ دولت لوانڑی اور واصل کے علاوہ خوشحال خان خٹک اور اُنکے اپنے خاندان کے دوسرے شعراء کا تذکرہ

کرتے ہیں ۔ عبدالرحمان بابا اور عبدالحمید بابا کے بارے میں کہتے ہیں ؎

پہ دیار د تمام روہ کښې ۔۔۔ پہ دا قام پہ دا کروہ کښې
یو پہ سرائے زبان آور دے ۔۔۔ دویم ځائے پېښور دے
چہ مومند وقیل وقال کړو ۔۔۔ یعنې دوئ سحر حلال کړو

"روہ کے سارے دیار میں اِس قوم اور قبیلے میں سرائے اکوڑہ میں ایک زبان دان رہا ہے اور دوسرے کا مسکن پشاور ہے۔ مومندوں نے جب قیل وقال شروع کی تو گویا انہوں نے سحر حلال کی ترویج کی۔

لیکن پشتو کے شعرائے متقدمین کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ؎

د افغان د شعراء پہ شیدا ایاند دے ۔۔۔ د ادب پہ مقتضلی د خان شرف دے

"اے شیدا از روئے مقتضئے ادب تمام افغان شعراء پر خوشحال خان کو برتری کا شرف حاصل ہے۔"

شیدا نے اپنے کلام میں عشق ومحبت، زیست وروزگار، آلام وحوادث اور تصوف و اخلاقیات پر جو کچھ لکھا ہے اور زندگی اور کائنات کے معمول کی جو عقدہ کشائیاں کی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیدا شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی۔ اُنکی رنگین نوائی حمید بابا کی رنگین نوائی سے ایک قدم آگے تھی۔ شیدا نے پشتو شعر کو جو فنی رعنائی عطا کی ہے۔ وہ متقدمین کے کلام کے ارتقاء کا آخری پڑاؤ دکھائی دیتا ہے اور انکے کلام کی نزاکت ودلکشی، جدت اور رنگینی نے شیدا کو خود اپنے بارے میں یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ؎

پہ دا دور کہ شیدا دوارہ مهمند وے
ثنا خوان بہ وو هر دم ستا د وئیلو

"اے شیدا اگر اس دور میں وہ دونوں مهمند (عبدالرحمان بابا اور عبدالحمید بابا) ہوتے تو وہ ہر

دم تیرے کلام کے ثناخواں ہوتے "

شیدا کے کلام کے بارے میں عصرِ حاضر کے ایک تبصرہ نگار ہمیش خلیل لکھتے ہیں[۱]:-

" کاظم خان شیدا کی شاعری کا رنگ محل اور اس کی رنگین بیانی اور شاعرانہ عظمت کا شیش محل اُس کی نزاکت و لطافت بیان پر تعمیر ہوا ہے۔ اُس کا جہانِ شاعری شفقی رنگوں کی کہکشاں اور چاند کے انعکاس کا وہ امتزاج ہے جس نے جشنِ شاعرانہ میں فانوسِ خیال کی طرح ہر سخندان اور صاحب ذوق کو متحیر کر رکھا ہے "

شیدا بیحد بلند، دلاویز اور نازک تخلیقات کے مالک تھے۔ وہ فطری طور پر شاعرانہ استعداد کے حامل تھے اور جب راہ طریقت پر گامزن ہوئے تو خوبیٔ کلام میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس لئے کہ ہر زبان کی شاعری میں جب تصوف نے فروغ پایا تو اس میں ارفع اور پاکیزہ افکار نے جنم لیا۔ اور ادب کے ساتھ ساتھ زندگی اور انسانیت کی اصلاح اور طلبِ فلاح کی راہیں متعین ہوئیں یہ تمدنی ارتقاء، پاکیزگی، نفاست عالی ظرفی اور شخصی کردار کی تعمیر کا باعث بنی ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے اور وہ یہ کہ جب حسین محبوب کے حسین تصورات زندگی کے حسین پہلوؤں کی طرف عاشق کے خیالات منعطف کرتا ہے۔ اور جب کسی کا محبوب حُسن و جمال کا سرچشمہ بن جاتا ہے تو ایسے عاشق صالح کے افکار و خیالات کے حُسن و رعنائی پر پھر کیا شک ہو سکتا ہے! شیدا بھی عملاً میدانِ تصوف میں داخل تھے اور یہ اُن کا خاندانی ورثہ تھا جو بقول ڈاکٹر سید انوار الحق کے " اُنہیں اپنے مورثِ اعلیٰ خوشحال خان سے ملا تھا۔ اگرچہ خوشحال خان عملاً ایک کامل صوفی نہ تھے، لیکن وہ صوفی مشرب یا یہ کہ تصوف زدہ ضرور تھے"۔ خود کہتے ہیں کہ " طریقت میں شیخ رحمکار کا معتقد ہوں "

شیدا کے کلام میں عربی اور فارسی زبانوں کی اصطلاحات بہت زیادہ ہیں خصوصاً فارسی استعارے، تشبیہات، تلمیحات اور اشارے کنائے اس قدر زیادہ ہیں کہ جب تک فارسی ادب اور شاعری پر کسی کو پورا پورا عبور حاصل نہ ہو شیدا کے کلام سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتا۔ بے شک شیدا پشتو زبان

---

۱ مجلہ قند جنوری فروری ۱۹۷۲ء ص ۲۳ ۲ دیباچہ دیوانِ کاظم خان شیدا (اُردو ترجمہ) صفحہ ۲۴

کا غالب یا بیدل ہے۔

شیدا نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں اپنے ایک ہمعصر اور ہمنام کاظم خان شیدا کا تذکرہ کیا ہے جو اسکی (شیدا) جنم بھومی سرائے اکوڑہ میں مقیم تھا اور اُسکے نام سے کلام نشر کیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ بذاتِ خود کوئی ایسی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے ہمنامی کیوجہ سے اُسکے اشعار بھی کاظم خان شیدا کے ساتھ منسوب کئے گئے شیدا کہتا ہے کہ میں اپنے اشعار میں کاظم کا تخلص نہیں لاتا بلکہ شیدا تخلص سے یہ کام لیتا ہوں " اس لئے وہ غزلیں جو اُس زمانے میں خاص شہرت رکھتی تھیں شیدا انہیں اپنا کلام نہیں سمجھتے اور انہیں اپنے ہمنام کاظم خان کا کلام کہتے ہیں۔

استاد عبدالرؤف بینوا اِن سے ایک پُرلطف نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ " شیدا اُس دوسرے کاظم خان کے اشعار کو اپنے آپ سے منسوب کرنا غلط سمجھتے ہیں لیکن اتنا ہے کہ اِن تحریر سے پشتو ادب کی تاریخ میں ایک اور شاعر کا نام دریافت ہوا ہے۔ جو ان کا ہمنام بھی ہے اور ہمعصر بھی "۔

شیدا اپنے کلام کی خوبیوں اور رعنائیوں کے بارے میں کہتا ہے ؎

شیدا هار د شهوار دُر دے سفته شوے   چه په ژبه د تحسین دِ گفتار زیب کا
شیدا ور استوه دیوان د هند روه ته   چه لبریز ئے په صدا شی کوهستان هم
دکه زلفے په بیاض باریک مضمون بندم   زهٔ شیدا چه چرے ساز مسکین قائم کرم
شیدا ځکه کرم د خاطر لبریزیه وینو   زهٔ چه بند دکه غنچه رنگین مضمون کرم
رنگینی ئے د اشعار ترحنا زیب کا   د شیدا دیوان په لاس واخلئی نوبانو

شیدا تو نے بادشاہوں کے لائق ہار کے ایسے موتی پروئے۔ کہ بزبانِ تحسین یہ کہنا پڑتا ہے کہ تمھاری شاعری زیب و زینت سے مملو ہے "۔

شیدا اپنے دیوان کو ہند سے روہ کی طرف بھجواتا کہ اس کی آواز سے کوہستان بھی گونج اُٹھے۔

لہ دیوان کاظم خان شیدا چھاپ شدہ کابل صفحہ ک

میں (شیدا) سازِ شکن قائم کرنے کے لئے بیاض میں زلفوں کی طرح باریک مضمون تحریر کرتا ہوں:
" اے شیدا جب میں کسی رنگین مضمون کو غنچے کی طرح بند کرتا ہوں تو میرا خم دل خون سے بھر جاتا ہے۔"
اس کی رنگینئ اشعار حنا سے زیادہ دیدہ زیب ہے۔ اس لئے اے حسینو! شیدا کے دیوان کو ذرا اٹھا کر دیکھو۔"

روہ کا سادہ مزاج افغان ہندی معشوقوں کے ناز و ادا اور عشوہ طرازیوں سے یوں سرشار تھا کہ اپنے وطن سے بھی یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ بعض واقعہ نگار یہ کہتے ہیں کہ شیدا اپنے بھائی اسد اللہ خان کے خوف کی وجہ سے ہند گیا تھا لیکن واقعات کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ سرزمین روہیل کھنڈ سے اُسے ایسا دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ باوجود اسکے کہ ایک دفعہ اپنے ہندی احباب کے ساتھ سیر و تفریح کی خاطر حسن ابدال تک آیا بھی لیکن اپنے گاؤں اس لئے نہیں آیا کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں اُسے واپس رامپور جانے سے روک دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیدا اپنا دل روہیل کھنڈ میں دے آئے تھے۔ اور اپنے دادا اشرف خان ہجری کے اس بیان کے برعکس کہ ؎

زۀ هجري په بيجاپور، اشنا په روه کې — جدا ئي موسره زد هند و بار شو

"میں (ہجری) بیجاپور میں اور میرا محبوب روہ میں ہے اور ہمارے درمیان خطۂ ہند و بار حائل ہے۔" یا یہ کہ ؎

نیرنگي د جهان گوره ئ زمانیو — د هجري مکان دکن جان په کابل شو

" اے اہل زمانہ ذرا نیرنگئ جہان ملاحظہ کیجئے کہ ہجری کا مکان دکن میں اور اسکی جان کابل میں ہے۔"
شیدا کہتا ہے

؎ په هندي ادا ئې او کړې په ما چارې — زۀ شیدا په زړۀ ساده د روه افغان یم

" اُس نے ہندی اداؤں سے مجھ پر ظلم و ستم کئے ہیں۔ میں (شیدا) روہ کا ایک سادہ دل افغان ہوں۔"

شیدا کے رنگین کلام سے یہ غزل بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے۔ ؎

د شبنم دا نه که تخم شي د گلو — زړهٔ به سوړ په دیدن نشي د بلبلو
چه سے نشته لکه گل نیشه رخسارونه — څوک به څه کا تورے زلفے د سنبلو
په څه شان در ته سوے طالع کړم — لکه نمر زما جبین دے د داغلو
معطل په عارضه د شام غریب دے — کهٔ مے زړهٔ په حلقه بند شو د کاکلو
د آسمان په شان ئے تیز د فتنو تیغ کړی — صبح و شام گرځی ښکاره په سرو منگلو

د دریاب د سرد جوشئ د حباب زړهٔ چوی
شیدا قطع د امید بو یه له خپلو

"اگر دانۂ شبنم، تخم گل بن جائے تو اسکو دیکھ دیکھ کر پھر بھی بلبل کا دل ٹھنڈا نہ ہوگا۔"
"چونکہ پھول کی طرح سنبل کے خوبصورت رخسار نہیں ہیں اس لئے اسکی فقط زلف سیاہ کو کوئی لے کر کیا کرے گا؟"

"میں بخت سوختہ کا حال کیونکر بیان کروں؟ سورج کی طرح میری پیشانی داغنے کے قابل ہے۔"
"میرا بچارہ دل عارضۂ شام کیوجہ سے معطل ہو چکا ہے یا وہ پھر حلقۂ کاکل میں مقید ہے۔"
"آسمان کی طرح فتنوں کی تلوار تیز کر دیتا ہے پھر بھی وہ صبح و شام خون آلود ہتھیلیاں لئے کھلم کھلا پھرتا ہے۔"

"سمندر کی سرد مہری کیوجہ سے بے چارے حباب کا دل پھٹا جاتا ہے۔ شیدا ایسی صورتحال میں تمہیں بھی اپنے عزیزوں سے قطع تعلق کرنا چاہیئے۔"

اپنی ہمہ گیر خصوصیات کیوجہ سے شیدا کا کلام شاعرانہ عظمت کی وہ معراج ہے کہ سرزمین روہ کے شعراء میں شاید ہی کوئی دوسرا شاعر اسکی ہمسری کر سکے اسکے کلام کی جدت آفرینی خوبصورت انداز۔ زبان کی دلاویزی۔ خیالات کی عظمت۔ تراکیب و تشبیہات۔ استعاروں اور محاوروں کا استعمال انکی شاعرانہ اُفتادِ طبع کی ایک بیّن دلیل ہے۔ شیدا سرزمین روہ کا وہ خوشنوا بلبل ہے جس نے ساری زندگی دیار ہند

میں حُسنِ بہار آفرین کی رنگینیاں سمیٹیں اور خوبصورت اشعار کے گلدستے اِس آرزو کے ساتھ بنائے کہ یہ رنگینیاں کوئی باگرام پہنچائے ؎

ھمیشہ بہ ئے بهار په باغ وراغ وی   چې رنگین شعر مې یوسی تر باګرامه

اگر میرے رنگین شعر کو باگرام تک پہنچایا جائے تو وہاں کے باغ وراغ میں ہمیشہ کے لئے بہار آجائیگی

رومانی شاعر علی خان

محققین اور ناقدین کے مابین یہ بحث مدت مدید سے چلی آرہی ہے کہ علی خان کون تھا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ ایک پشتون شاعر تھے جو "پشتونخوا" میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں قیام پذیر تھے۔ علی عشق و رومان کے شاعر تھے۔ وہ شاعر جس نے پشتو زبان کو اپنے دور کی پُر لطف اور معیاری غزل دی ہے۔ علی خان مجاز کی سیڑھیاں چڑھ کر شاہراہِ حقیقت تک جا پہنچا اور اپنے حسنِ کلام کی برکت سے پشتو شاعری میں لازوال شہرت اور بقائے دوام حاصل کرلی۔

دوسرے پشتون شعراء کی طرح علی خان کی زندگی کے حالات بھی معلوم نہیں۔ پروفیسر محمد تقویم الحق کہتے ہیں[1]: کہ علی خان کا اصلی نام علی احمد خان تھا اور انہوں نے ہشتنگر کے دریائے جنیدی کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں زندگی کے شب و روز بسر کئے تھے۔ اس لئے انداز بیان اور لہجہ بھی غالباً ہشتنگری ہے۔ علی خان خود بھی اس علاقے کو اپنا وطن کہتا ہے اور اپنے اشعار میں بھی اسکے ساتھ زیادہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ کچھ مدت تک مسافرت بھی کی ہے۔ لیکن بیشتر زندگی یہیں گذاری ہے۔ اس کا محبوب بھی اِسی علاقے کا باسی تھا۔ اس لئے اُسکے کلام میں کسی اور علاقے یا وطن کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ہشتنگر کی تعریف اُسکے کلام کا ایک ایسا موضوع ہے جو قاری کو اس کا قائل کر دیتا ہے کہ وہ علی خان

[1] دیباچہ دیوان علی خان مطبوعہ ادارۂ اشاعت سرحد پشاور

اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اور اس سرزمین سے اُسے گہرا لگاؤ بھی تھا۔ لیکن اِس لگاؤ کا اصلی سبب اس کا محبوب تھا جو اُس علاقے میں قیام پذیر تھا۔ جیسا کہ کہتا ہے ؎

؎ هشتنغر شو کان د زلفو د دلبرو — ځکه نشته په دا ملک دکان د مشکو

که یار نهٔ وینم دلے په هشتنغر کښے — پټ شوم به له وطنه پسے سر مخ

ورک به علی خان شی د بے دردو له کبله — نور ئے باقی استو بهٔ نه کړانه په وطن شو

یو وصل د یار که ئے موندے په سل سفره

اور به مے هزار ځله په کور او لګاؤ

"ہشتنگر محبوبوں کی زلفوں کا معدن بن گیا ہے، اسی لئے تو اس ملک میں اب مشک کی کوئی دکان نہیں ہے۔"

"اگر یہاں ہشتنگر میں اپنے محبوب کو نہ دیکھوں تو سر اور منہ ڈھانپ کر اُسکی تلاش میں وطن سے نکل جاؤنگا۔"

علیخان ان بے دردوں کی وجہ سے کہیں روپوش ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس دیس میں اب اُس کا مزید قیام دوبھر ہو گیا ہے۔"

"اگر سینکڑوں سفر کرنے کے بعد بھی مجھے ایک دفعہ وصلِ یار نصیب ہوتا تو میں ہزار دفعہ اپنے گھر کو جلا کر نکل جاتا۔"

دیوان علیخان، سوز و گداز، درد و حرمان اور غم انگیز اشعار کا ایک ایسا پُر لطف مجموعہ ہے کہ ایک مغربی شاعر کا یہ بیان اُس پر صادق آتا ہے کہ ؎

هغه سندرے مو د هر څهٔ نه سیواوی تو بزے

چه پیدا شوی د غمونو انتهاسره وی

" ہمارے وہ نغمے سب سے زیادہ میٹھے ہیں جو غموں کی انتہا سے جنم لیتے ہیں۔"

راہِ عشق سے علی خان مجاز، حیرت، خود فراموشی اور پھر حقیقت کی منزل تک جا پہنچا ہے۔ اور آخر میں وہ سرمدی سرور اور خمار حاصل کیا ہے جو ایک سچے عاشق کی منتہائے نظر اور حاصلِ آرزو ہو۔ اس راہ میں جو واردات و کیفیات اُس پہ گذری ہیں اور جن ناکامیوں اور نامرادیوں سے وہ دوچار ہوا ہے، آتشِ عشق کی تپش، ہجر و فراق کے غم، رقیبوں اور غمازوں کی نازیبا حرکات، محبوب کی بے اعتنائی، بیم و رجا کی لامتناہی کشمکش، اِن تمام کیفیات نے علی خان کے کلام میں ایک سحر انگیز رعنائی اور رنگینی پیدا کی ہے۔ اِن رعنائیوں اور رنگینیوں نے اُسکے منازلِ عشق کے ساتھ ساتھ تدریجی ترقی کی ہے، اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ میلانِ تصوف ارفع اور پاکیزہ خیالات کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے اس لئے علی خان کے کلام میں بھی جب سے تصوف کا رنگ ظاہر ہونا شروع ہوا ہے، اس کی شعری رعنائی اور پاکیزگی نے بھی پیش رفت کی ہے۔ اس تدریجی ارتقا سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ علی خان کا مجازی محبوب اور پھر اُنکا پیرِ طریقت اور بعد ازاں معشوقِ حقیقی تینوں سے تخاطب اُس کے کلام میں سے اُسکے پیشِ نظر رہا تھا۔ اور اُس کے طرزِ تخاطب کے یہ تینوں انداز اُس کے کلام میں موجود ہیں۔

علی خان ایک بہت بڑا عالم دین تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تدریسِ علوم بھی کرتا تھا۔ تفسیر، حدیث، صرف و نحو، فلسفہ ہیئت، مناظرہ وغیرہ کے میدان میں خاصی دسترس اور عبور رکھتا تھا۔ جیسا کہ کہتا ہے ؎

آخر لوټ کړو علی خان سوړ د هجر ۔۔۔۔ که ئې ځو په ځان پوکلو "لایلاف"

وابتغوا الیه الوسیلة راپه یاد کړه ۔۔۔۔ راشه علی خانه ورته کوره و سیلے

څه د نیکو همرهان دی یو قرآن دویم حدیث ۔۔۔۔ چه و حق ته رهبران دی یو قرآن دویم حدیث

د غماز سپی په خله کله پلیتیږی ۔۔۔۔ سیند د عشق توضا کیږی کړو زما زړه

ستا د حسن د زکوٰة مصرف پیدا شوم ۔۔۔۔ چه هجران یتیم یسیر کړو زما زړه

هیڅ تمیز ئے چا اونۀ کړو له ابهامه   هسے زړهٔ زما له غمه مبهم اوچاود

هر مراد دِ ورم که نتیجه زما وصال شی   پوره په دواړه شرطه د صغرىٰ اود کبرىٰ یم

د وفا دپاره ډیره جفا یوسم   بارے نۀ شی د علت سره معلول پیش

عمده حکم دے روا ناروا کوت شی   پرے راځی معائنه نقصِ ممنوع

عادلان حکم هاله کاندی دبدو   چه سندئے هم اصول وی هم فروع

" علی خان کو آخر ہجر کی آہ و فغاں نے لوٹ لیا ہے وہ جتنا بھی اپنے اوپر "ایلاف" پڑھ کر پھونکتا رہا "

" وابتغوا الیہ الوسیلۃ " کو یاد کر اور اب اے علی خان آؤ اور اُسکے لئے وسیلہ تلاش کرتے ہو "
" قرآن و حدیث خدا کے نیک بندوں کے ہمراہی ہیں اور حق کی طرف رہبری کرتے ہیں "
" دریائے عشق نے میرے دل کو حوض کبیر بنا دیا ہے اب وہ کتے غماز کے ناپاک منہ سے بھلا کب پلید ہو سکتا ہے ؟"
" تیرے حسن کی زکوٰۃ کا لینے والا اس لئے بنا کہ ہجر نے میرے دل کو یتیم و اسیر بنا دیا ہے "
" میرے دل کے ابہام کو کوئی معلوم نہ کر سکا، اس لئے شدت غم کی وجہ سے میرا دل مبہم ہو کر پھٹ گیا "
" میں تمھاری ہر مراد پوری کرتا ہوں، نتیجتاً مجھے تمھارا وصال نصیب ہونا چاہیئے۔ ہر دو شرائط کی رُو سے میں صغریٰ اور کبریٰ کا مستحق ہوں "
" وفا کی خاطر بہت سی جفائیں برداشت کرتا ہوں، خدا کرے کہ علت کے ساتھ معلول پیش آئے "
" اور وفا کے بدلے میں وفا ہی ملے۔ حکم عمدہ میں روا اور ناروا دیکھا جاتا ہے "
" اور نقصِ ممنوع کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ اصول و فروع کی سند کا جائزہ لے کر ہی عادل بُرائی کا فیصلہ کیا کرتے ہیں "
قیاساً کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں موضع چمکنی کے حضرت میاں عمر صاحب پشتو نحو کے

روحانی پیشوا تھے اور وہ شعر و ادب کا ذوق و شوق بھی رکھتے تھے لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی خان نے طریقت کی بیعت بھی انہی سے کی تھی۔ وہ کہتا ہے ؎

دا هغه غزل دے چه صاحب وے   د خاطره مے آرام او فراغت لاړ

" یہ وہ غزل ہے جو میاں صاحب نے لکھی ہے اور جسے پڑھ کر میرے دل کا سکھ اور چین جاتا رہا "

میاں عمر صاحب کے کلام پر اس مصرعے کی تطبیق تب ہو سکتی ہے جب انکے کلیات میں اس غزل کی نشاندہی کی جائے۔ لیکن چونکہ کلیات موجود نہیں اس لئے یہ دعویٰ تصدیق طلب ہے۔

علی خان کی گھریلو زندگی اور عام حالات کے بارے میں پروفیسر سید تقویم الحق نے جو اندازے لگائے ہیں، وہ اُنکے کلام میں موجود اشاروں سے ماخوذ ہیں جیسے ؎

هجر د غیاث دے چه زما ترے الغیاث دے
پروت مے په زړهٔ پاس دے چه پرے سوزم پنجوخته

خپله لور خه چه لا زویه مے هم نشته   تو لیدهٔ او ریدهٔ شی غم محکم د لونړو
دا غزله به لیږم محمد اکبر ته   چه مے بنهٔ شی د خورئ په دا غزل زړهٔ
ستا د هجر محنتو نه به ئے زور کا   کړ لہ دیر شو کم سن وی لکه زهٔ
سن د هجر غر دو سر د کانړی ترے ملتی وو
ورځ وه دیار نسمه د ذی ابجی په تحریرکنے

" ہجر غیاث کچھ ایسا ہے کہ اُس سے میری توبہ ہے، وہ میرے دل پر ایسا اثر انداز ہوا ہے کہ اُس کی سوزش سے میں پانچوں وقت جلتا رہتا ہوں "

" بیٹی تو کیا میرا تو بیٹا بھی نہیں ہے لیکن دیکھنے سننے میں آیا ہے کہ بیٹیوں کا غم بڑا سخت ہوتا ہے "

" یہ غزل میں محمد اکبر کو بھیجوں گا تاکہ اس سے میرے بھانجے کا دل خوش ہو جائے "

"تمھاری جدائی کے صدمے اُسے بوڑھا کر دینگے چاہے کوئی میری طرح تیس سال سے کم ہی کیوں نہ ہو۔"

"سن ہجری کا تھا" کانڑی سے 'ک' گھٹادو۔ اور یہ تحریر شدہ ہے کہ ذوالحجہ کی تیرھویں تاریخ تھی۔ غیر نقطی تک ۱۲ - ۲۰ = ۱۱۸۰ ہجری

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تیمور شاہ کی پنجاب پر لشکر کشی کے زمانے تک بقید حیات رہے ہونگے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیریں کلام شاعر مذکورہ ہجری سال یعنی ۱۱۸۰ کے بعد بھی زندہ تھا۔ باقی رہ گیا تیمور شاہ کی لشکر کشی کا زمانہ تو یہ ۱۱۸۰ھ سے سینتالیس سال کے بعد کا ہے، اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت تک بھی زندہ ہونگے۔ جیساکہ پروفیسر سید تقویم الحق کہتے ہیں: "علی خان نے بڑھاپے کا دردناک زمانہ نہیں دیکھا اور علی خان کا یہ شعر ؎

ستا د هجر محنتونہ بہ ئے زوړ کا
کہ لہ دیرشو کم پہ سن وی لکہ زۀ

"تمھاری جدائی کی سختیاں اُسے بوڑھا کردیں گی چاہے کوئی میری طرح ۳۰ سال سے عمر میں کم ہی کیوں نہ ہو۔"

اگر اس وقت یعنی ۱۱۸۰ھ کو علی خان کی عمر ۳۰ سال سے ایک دو سال کم بھی شمار ہو تو پھر بھی ۱۲۲۹ھ میں چاہیئے کہ وہ ۷۵ سال تک پہنچ چکے ہوں اور یہ عمر بہر حال ضعیفی کی عمر ہوتی ہے، اس لئے اس تضاد کی روسے علی خان کی عمر کا لگایا گیا اندازہ درست دکھائی نہیں دیتا۔ جیساکہ کہا گیا ہے علی خان کے شعر کا ارتقاء اُسکے عشق کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ کلام کے ابتدائی حصے میں زیادہ شوخی اور بے اختیاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ عشق مجازی کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس حصے میں نوجوانی کی جذباتیت کو بڑا دخل ہے اور وہی کچھ کہتا ہے جو ایک عاشق ظاہر بین کے منہ پر آئے۔ چاہے اس میں ہجر و وصال کی کیفیات ہیں، وفا یا بیوفائی کی شکایتیں، دلِ مہجور کی طفل تسلیاں ہیں کہ کس طرح

لہ تفصیل کے لئے جناب سید تقویم الحق کا دیباچہ دیوان علی خان مطبوعہ ادارہ اشاعت سرحد پشاور

کے گلے شکوے، غمازِ روسیہ کو سخت سُست کہنا۔ یا ناصح کی ملامت، سبھی پر مجازی کیفیت حاوی ہے۔ کلام کے اس حصے میں میلانِ طبعی امرد پرستی کی طرف ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دور کا معشوق کوئی حسین و جمیل لڑکا ہے۔ جیسا کہ اس شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے ؎

دا امرد مرور لاړ له ما که دُر وو   کهٔ دا نور وو د محمود دارالسلام لاړ

"یہ جو مجھ سے روٹھ کر چلا گیا لڑکا تھا یا موتی یا کہ حور تھی جو دارالسلام محمود سے نکل گئی۔"

اس دور کے اشعار کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں ؎

د رقیب تیں ۀ وئیل ترحد تیں شول
ستا په مخ به ئے تیروم ولے ترکومه

د توبے پرهیز به مات په سینه خلکرم   کهٔ دوبارہ په رنځ د مینے شوم رنځورهٔ

انتګی ئے ئے په بوسه سره د غنمے شول   دا د موبیسو پیں وی دی کهٔ نهٔ دی

چه سُر شونډے سبز خط ئے را په زړهٔ کړم   سر تر پایه سره لمبه شم شنه دوده

چه وما ته په رموز کښے نصیحت کا   خبردار نهٔ دے د عشق له رموزه

چه زاهد دِ تنګے خلے ته وسواس وا   زور پښه سر لکه غنچه مراقبه کا خست

"رقیب کی تلخ ترش باتیں جو حد سے گذر گئیں۔ میں تمہاری خاطر برداشت کرتا رہوں گا لیکن آخر تا بہ کے"؟

"اگر دوبارہ مرضِ عشق کا مریض بنا تو توبہ کا پرہیز روئے سیمین کی خاطر توڑ ڈالوں گا"۔

"بوسے سے اُسکے گال داغدار ہو گئے یہ وہ بچے دودھ کی بالائی ہے یا نہیں"۔

"جب میں اُسکے لب سُرخ اور سبزۂ خط کو یاد کرتا ہوں تو سر تا پا شعلہ اور سبز دھواں بن جاتا ہوں"۔

"جو مجھے اشاروں کنایوں میں نصیحت کرتا ہے وہ عشق کے اسرار و رموز سے ناواقف ہے"۔

"جب زاہد تمہارے تنگ دہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا تو بے چارہ سر جھکا کر غنچے کی طرح مراقبے میں چلا گیا"۔

"اسکے بعد اس شاعر کے کلام نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ اُس نے خود یہ اعتراف کرتے ہوئے کہا:"

نۀ لا حقیقت سوم نۀ وصل په مجاز کښې ؎
مرم په مینځه لار کښې نۀ هورې شوم نۀ دلې

"میں ابھی تک نہ تو حقیقت کو پا سکا ہوں اور نہ مجھے مجاز کی وجہ سے وصلِ یار نصیب ہوا۔ میں بیچ راستے میں مرا جا رہا ہوں۔ نہ میں اِدھر کا رہا اور نہ اُدھر کا۔"

علی خان کی شاعری میں یہ بحرانی کیفیت ایک مدت تک قائم رہی۔ یہ وہی منزل تھی جہاں علیخان حقیقت سے آشنا ہو گئے۔ اور اس میں اُن کا اندازِ تخیل پختہ ہو گیا۔ اور جولانیٔ فکر حقیقت کی باریکیوں سے روشناس ہوئی۔ بیان میں سادگی اور روانی آئی۔ ہر چند کہ مایوسی اور نامرادی کے احساس نے انھیں بیقرار اور مشتعل کئے رکھا۔ پھر بھی ان میں ایک گونہ رجائیت موجود تھی۔ اس لئے کہ دُنیاوی لہو و لعب کی بجائے اُن کا میلان مذہب کی طرف ہوا اور یوں ایک روحانی کیف اور مزہ انکے کلام میں پیدا ہوا۔ ان کی یہ غزل اُنکے اس قسم کے کلام کا نمونہ ہے۔ ؎

خود به تېر شي دا دنیا سخته ضرور ه   له هغو سختو مې او ساته غفوره
دا دلې دنیاوي غم به مې هم پرېښود   کۀ دا چار د بې چاره زړۀ وي مقدوره
ستا د مخ په نور مې تنګ تیاره زړۀ نوروو   چه تۀ لا رې خو نه پلتې شو بې نوره
یا بلا د بېلتانۀ په هوره تۀ نیشته   یا خو دا اند ېښنه ېښنه ده حضوره
کۀ څوک مري د بې د فا طبیب په در کښې   هومره نۀ واڅې چه څۀ رنګ يې رنځوره
چه د ستور نۀ دا سلام وو نۀ د کفر   هسې چارې را او کړې بې دستوره
مېنه هله شي پخه چه دوه رخه شي   يک مخېزه مېنه نۀ وي بې فتوره
لا هالۀ خواري نصيب د علیخان وه
چه بوه خواري ئې يار نۀ کړه منظوره

"انجام کار دُنیا کی سختیاں ضرور گذر جائیں گی لیکن اے غفورٌ رحیم تو مجھے آخرت کی سختیوں سے بچائے رکھنا۔"

"اگر مجھ بیچارے کے دل کے بس کا روگ ہوتا تو دُنیا کے ڈھیروں غم بھی یہیں چھوڑ دیتا۔"

"تیرے روشن چہرے کی وجہ سے میرا ننگ اور تیرہ و تار دل منور تھا۔ جب تم چلے گئے تو یہ گھر بے نور ہو گیا۔"

"ہجر سے بڑھ کر یا تو کوئی بلا موجود نہیں ہے اور یا یہ تردّد محض مجھے ہی پریشان کئے جا رہا ہے۔"

"اس بے وفا طبیب کے در پر چاہے کوئی بھی مرے وہ آتا بھی نہیں پوچھتے کہ اے بیمار تمھارا کیا حال ہے۔"

"میرے محبوب نے مجھ پر وہ خلاف قاعدہ مظالم ڈھائے ہیں جو نہ تو اسلام میں کسی طرح جائز ہیں اور نہ کفر میں۔"

"محبت تب پختہ ہوتی ہے جب یہ دونوں جانب سے ہو۔ وہ محبت جو یک طرفہ ہو، وہ فتور کے بغیر نہیں ہوتی۔"

"علی خان کی قسمت میں ابھی اور بھی خواری لکھی ہے۔ اسی لئے تو محبوب نے اُسکی کوئی مشقت بھی قبول نہ کی۔"

اس درخشان دور پر تبصرہ

پشتو ادب کا گلستان رحمان بابا کے آسان رواں سادہ اور پُرسوز اشعار کی رنگینیوں سے مزین ہوا اور خوشحال بابا کے گھرانے نے اِس گلستانِ ادب کی مستقل آبیاری شروع کی نہ صرف یہ کہ عبدالحمید ماشو خیل، اشرف خان ہجری، افضل خان، علی خان، کاظم خان شیدا، مجیب سر بندی، سکندر خان خٹک عبدالقادر خان، کامگار خان، اور احمد شاہ ابدالی جیسے نامور شعراء اور مؤلفین ادب پشتو میں ایک دوسرے

کی ہمسری کرنے لگے۔ بلکہ دیگر بے شمار شعراء اور ادباء بھی اس زبان کی نوک پلک سنوارنے میں مشغول ہو گئے۔ اور خوشحال خان بابا کا وہ گلہ کہ

چا ئے پلو لہ مخہ وانخست پښتو لا هغسے بکرہ پرتہ دہ

"کسی نے بھی پشتو زبان کے چہرے سے پلو نہیں اٹھایا اس لئے وہ ابھی تک کنواری ہے۔"

جیسے کہ عملاً اختتام پذیر ہوا۔ اس دور کے سخنوروں کی پُرلطف اور شیرین غزلوں اور صاف ستھرے گیتوں نے پشتو کے تحریری ادب کو بھی اِس زبان کے عوامی ادب کی طرح لوگوں کے دلوں میں جگہ دی۔ یہ زندگی، روحانیت، اور حُریت و آزادی کا ترجمان ادب تھا اسمیں اکثر اِس قسم کے خیالات اور افکار کا اظہار کیا جاتا تھا۔ جو عام پشتونوں کے دلوں میں پہلے ہی سے موجود تھے لیکن ان کے اظہار کی راہ مسدود تھی۔

یہ ایک دور تھا بڑا شاندار اور مبارک دور، جس میں پشتو زبان نے ترقی یافتہ ہمسایہ زبانوں کے ساتھ ہمسری کے لئے قدم اٹھایا اور شعر و سخن کے اُس خزانے کو پالیا جس کی دورِ متقدمین میں کوئی مثال نہیں اور اسکے بعد آنے والے ادوار اس پر فخر و ناز کرتے رہیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دور پشتو ادبیات کی تاریخ میں دور عالیہ کے نام سے یاد رکھنے کا بجا طور پر مستحق ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس دور میں بھی پشتو ادب فقط عوام کا ادب تھا۔ اِس نے اِس دور کے کسی ایک شاعر بادشاہ، حاکم یا کسی امیر کی زیر سرپرستی زندگی نہیں گذاری۔ بلکہ اِسکے برعکس خوشحال خان بابا مغلوں کے زیر عتاب رہے اور اشرف خان ہجری بیجاپور کے زندان میں چراغ سحری کی طرح تھے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ رحمان بابا نے علی الاعلان کہا ہے

نہ شی د ملنگو د خانانو سرہ کلی چرتہ عزیز خان چرتہ ملنگ عبدالرحمان

" درویشوں اور امیروں کا آپس میں گذارہ نہیں ہو سکتا۔ کہاں عزیز خان (خان) اور کہاں عبدالرحمان (درویش)

حمید، مصری خان اور علی خان کس مپرسی کی آزاد دنیا میں اپنے محبوب گم گشتہ کے متلاشی تھے۔

روشِ زمانہ اور گردشِ حالات نے کامگار خان خٹک کو اپنا گھر بار چھوڑنے اور یوسفزیوں کے ہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا اور کاظم خان شیدا کو مسافر اور غریب الدیار بنا کر رامپور کے علاقے میں غیر معروف بنا دیا تھا۔ یہی حال قاسم علی خان آفریدی اور خواجہ محمد بنگش کا بھی تھا۔ ان سب میں ایک فرد ایسا تھا، جو خود تاج و تخت کا مالک تھا۔ لیکن اس بادشاہ نے بھی محض اپنے جذبات کے اظہار و تسکین کے لئے اپنی مادری زبان ہی کو استعمال کیا اور یوں تاریخ ادب میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا۔ ورنہ پشتو کے ساتھ شاہی گھرانوں کی دیرینہ روش یہاں بھی حسب سابق رہی۔

زمانے کی اس مخالفانہ روش اور نامساعد حالات کے باوجود پشتون عوام کے ہر طبقے کے سخنوروں نے اس دور میں اپنے اپنے رنگ میں اپنی مادری زبان کو اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ بعض اوقات ایک آدھ نے ناقدری کا شکوہ بھی کیا۔ جیسا کہ شیدا کہتا ہے۔

ع پہ تدوین د خپل ژبان ځکہ نادم یم   چہ اوندۂ شوہ پہ محل گل افشانی

"میں اپنی زبان کی تدوین پر محض اس لئے نادم ہوں کہ میرے افکار کی گل افشانی کے لئے یہ بے محل اور ساز گار نہیں تھی۔"

لیکن پھر بھی ان مشہور و معروف شعراء اور سخنوروں نے اس میں اس قدر لطف اور مزہ پیدا کیا کہ یہ سب اپنے اپنے مقام پر سزا وار تحسین و آفرین گردانے گئے۔

اس زبان میں رحمان بابا کا نغمہ فقر و درویشی کے لئے باعث افتخار بنا۔ خان اور ارباب نے بھی پشتو شاعری کا علم بلند کیا اور جیسا کہ کہا گیا ہے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بزرگ کبیر غازی بادشاہ احمد شاہ دُرّ درّان اور اس کے بیٹے تیمور شاہ بادشاہ نیز اسی شاہی گھرانے کے نامور آتالیق اور صاحب دیوان شاعر پیر محمد کاکڑ نے اسی زبان میں سخنوری کی جولانی دکھائی اور اسی زمانے میں دکن اور سرزمین روہیل کھنڈ کے نوابوں، سرداروں مثلاً حافظ رحمت خان شہید، نواب محبت خان، نواب اللہ یار خان اور نواب مستجاب خان، نواب ارتفضلی خان اور نواب افضل خان نے بھی پشتو میں اس زبان کے صرف و نحو، تاریخ نویسی، لغت سازی سیرت و سوانح اور تفسیر کے کام کا آغاز کیا اور شعر و ادب

کے میدان میں درخشاں ستاروں کی طرح چمکے، اِسی طرح نواب امان خان عمر خیل کے بیٹے محمد ارتضیٰ خان نے ایک پشتو فرہنگ نامہ لکھا جس کا تذکرہ اپنی جگہ آئے گا۔

اِس طرح دوسری صدی ہجری کے " لویکانوں" کے شاہی گھرانے کی سخنوری کی وہ روایت جس کی طرف محقق حبیبی نے اپنی تاریخ میں اشارے کئے ہیں از سرِ نو زندہ کی گئی۔ اگرچہ ان کا انداز شعر جہان پہلوان امیر کروڑ یا اُس دور کے دوسرے شعرا اور سخنوروں کی طرح نہیں تھا پھر بھی اِس زمانے میں اتنا ضرور ہوا کہ کچھ مدت کے لئے نسل افاغنہ کے چند ایک قومی بزرگوں نے بھی اپنی زبان کی خدمت کرنے میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ بایں ہمہ پشتو زبان کسی شاہی دربار کی زینت نہ بن سکی اور کچھ مدت کے بعد ایک دفعہ پھر اپنے صحرا نورد اور مرد کوہستان کی امان میں آگئی اور صدیوں سے جس نے اس امانت کو سنبھال رکھا تھا امانت اسی کے پاس مستقل طور پر رہ گئی اور آج تک وہی اسے سنبھالے ہوئے ہے۔

"پشتو میں قصیدہ"

خوشحال بابا نے پشتو شاعری میں قصیدے کا ایک ایسا انداز اپنایا جس نے پشتو اور پشتونولہ کو زندہ کیا۔ اس قصیدے کے انداز میں نہ تو شاہی درباروں کی وہ سُبکی تھی جو فارسی قصیدہ گو شعراء کے ہاں عام ہے اور نہ یہ مَنری پند و نصیحت تھی۔ خوشحال کا قصیدہ یقیناً اُس آزاد ماحول کا ترجمان تھا۔ جس میں پشتون شخصیت پروان چڑھ رہی تھی، ان قصائد کا معیار اس قدر بلند اور ارفع تھا کہ خوشحال خان کے بعد نہ تو کوئی اُس معیار کو برقرار رکھ سکا اور نہ کوئی اِس میدان میں دُور تک جولانی دکھا سکا۔ صرف ایک خوشحال خان کے بڑے بیٹے اشرف خان ہجری نے اُس روایت کو کسی حد تک برقرار رکھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول تک پشتو میں قصیدے کے ایسے نمونے مفقود ہیں جو کسی مادی منفعت یا بھلائی کی لالچ کے تحت تحریر کئے گئے ہوں۔ یا اُن سے خوشامد چاپلوسی یا درباری داری کی بُو آتی ہو۔

"حافظ الپوری"

شعر نۂ دے د حافظ د پند منشور دے
کۂ دانائے نظر اوکۂ والفاف تہ

"یہ حافظ کا شعر نہیں بلکہ پند و نصیحت کا ایک منشور ہے بشرطیکہ کوئی عقلمند اسکے در و بست پر غور کرے۔"

کہتے ہیں کہ رحمان بابا نے فصل کاٹی ہے اور حافظ صاحب نے اس کی خوشہ چینی کی ہے۔ مثبت تنقید کے اس جامع فقرے کی روشنی میں اگر حافظ الپوری کے کلام کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں اس پشتون شاعر کے اشعار کے اکثر موضوعات وہی ہیں جو رحمان بابا کے کلام میں عام ملتے ہیں۔ مقاماتِ جذب و سلوک، واردات و کیفیاتِ عشق، مسائلِ تصوف کا بیان اور خاص کر تعلیم اخلاقیات اور پند و نصیحت وہ مشترک قدریں ہیں جو پشتو زبان کے ان دو عظیم شعراء کے کلام میں ملتی ہیں۔ اگر کوئی نمایاں فرق ہے تو وہ ان دونوں کی زبان کا ہے۔ جس کی وجہ سے کلام رحمان کا اعجاز تسلیم کیا گیا ہے اور آج تک پشتو زبان کا کوئی شاعر بھی اِس معجز بیانی کے قابل نہیں بن سکا۔

حافظ الپوری کے کلام پر اُس کی علمیت اور لغت شناسی کی بہت گہری چھاپ ہے اس لئے وہ اپنے کلام میں آسانی اور روانی کی بجائے دقت پسندی کی طرف مائل ہے۔ بہت سے نامانوس اور بیگانہ عربی فارسی ہندی، سنسکرت اور ترکی الفاظ اُسکے کلام میں سقم اور گرانی کا سبب بنے ہیں۔ پھر بھی حافظ نے حقائق زیست سے جو تاثر قبول کیا ہے وہ اس نے اپنے علمی تبحر کے زور سے

ؔ دیوان حافظ الپوری۔ قند ۱۹۷۳ء مقالہ عبدالحلیم اثر اور سوات کے ایک عظیم شاعر و ادیب و مؤرخ محمد پرویش شاہین کا مقالہ قند جولائی ۱۹۷۳ء

بہت دلچسپ اور صاف ستھرے انداز میں قارئین کے لئے بطور یادگار چھوڑا ہے۔ حافظ کے کلام کا سب سے اہم موضوع اُسکی اخلاقی شاعری ہے جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر رکھی گئی ہے انہوں نے حوادثِ زیست سے جو بھی سبق حاصل کیا اسکے سارے نتائج اور عواقب اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے ترازو میں تولے ہیں اور انہیں اُنکے مطابق اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ حافظ کے کلام کی اِس بنیادی خصوصیت نے اُسے اِس قابل بنادیا ہے کہ ایک پشتون شاعر کی حیثیت سے اپنے معاشرے میں تقدس و مقبولیت کا وہ مقام حاصل کرے جو بہت کم پشتون شعراء کے حصے میں آیا ہے۔

محقق قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کے مطابق، دیوان حافظ میں بے شمار بیش قیمت موتی موجود ہیں اس کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حافظ نے زندگی کے ہر پہلو کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اور ان بنیادی حقائق کے راز بہت دلچسپ اور خوبصورت انداز میں ایک ضابطۂ حیات کی طرح پشتونوں کے لئے بطور وراثت چھوڑے ہیں۔

حافظ کی اخلاقی تعلیمات کے تمام تانے بانے انہی بنیادی حقائق پر استوار ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے طبقۂ متاخرین کا کوئی دوسرا پشتون شاعر اُسکی ہمسری نہیں کرسکتا۔ یہی سبب ہے کہ صوفیانہ اور اخلاقی موضوعات کی بدولت رحمان بابا کے بعد اگر کسی اور شاعر کو خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے تو وہ حافظ الپوری ہے۔ اُسکی اخلاقی شاعری کا انداز کچھ یوں ہے۔ ؎

نورئ د چارپایانو کړے جُثه دِ د سړو ده
شین د کے چه وینے له کړ نګه پسے رغړے

څلے د درو غژنو مُلا ماتے کړه یاکونګے ‏ ‏ ‏ واړئ پرے دروغ کړ په عصمت بي بي مریمهٔ
دسحر په بانګ خروس څهٔ فخر کاندی ‏ ‏ ‏ چه پردئ دانے یے یاکړ نوری هبانهٔ دے
مهٔ غولیږه حافظ دد ے دهر په یارانو ‏ ‏ ‏ زهر به پکښے وی که شربت در کا دګوړے

د تهمت ځاے له مهٔ ځه عصمت به بائلے
فرشتو عصمت یونهٔ دړو له بابله

"تمہاری شکل وصورت انسانوں جیسی ہے لیکن تمہارے طور طریقے ڈھور ڈنگروں جیسے ہیں جب بھی تمہیں کوئی سبز ٹہنی نظر آئے تو اُسے حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو کھڈ میں گرانے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہو۔"

" اے مولا! جھوٹ بولنے والوں کے منہ توڑ دے یا اُنکی زبان گنگ کر دے۔ جو جھوٹ بولکر عصمت مآب بی بی مریم علیہا السلام پر بھی بہتان لگانے سے نہیں چوکتے۔"

"مرغ سحر بانگ دینے پر کس قدر اتراتا ہے۔ کیوں نہ ہو جب یہ پرائے دانے بے روک ٹوک کھاتا ہے۔ اور پھر بھی لائق سرزنش اور گردن زدنی نہیں۔"

" اے حافظ اِس زمانے کے دوستوں سے دھوکہ نہ کھاؤ اگر یہ تمھیں گُڑ کا شربت بھی پیش کریں تو خبردار اُس میں بھی زہر ملا ہوگا۔"

"جو مقام بدنام ہو وہاں مت جاؤ، ورنہ اپنی ساکھ گنوا بیٹھو گے۔ فرشتے بھی بابل جاکر اپنی عصمت برقرار نہ رکھ سکے۔"

حافظ کے کلام میں تلمیحات[1] کی وسیع دُنیا موجود ہے۔ اسکی روشنی میں اگر اُس کا کلام پرکھا جائے تو اُس کی شاعرانہ عظمت کا صحیح مقام اُجاگر ہو جائے گا۔

"عمومی انتشار کا زمانہ"

کاروان ادب پشتو اسی طرح آگے بڑھ رہا تھا اور زندگی کے شب و روز آنیوالے کل کی اُمید لئے گذر رہے تھے۔ ادوار گذرتے اور زمانے بدلتے گئے ایک وقت ایسا آیا کہ ساری اسلامی دُنیا عمومی انحطاط اور پستی کی لپیٹ میں آگئی۔ اور مغربی دُنیا نے علمی اور مادی عروج اور سر بلندی

---

[1] بعض قارئین حافظ اسے تلمیحات کا سلطان کہتے ہیں۔

کی طرف رُخ کیا۔ معاشی، معاشرتی، علمی اور سیاسی تحریکوں نے یورپ کی قوموں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمسری کا جذبہ بیدار کیا ان تمام اقوام کا مذہب ایک تھا۔ اگرچہ فرقوں کے لحاظ سے ان کے عقائد ایک دوسرے سے تھوڑے بہت مختلف تھے مگر اسلام کے خلاف پھر بھی سب ایک تھے۔ آپس میں مقابلے اور مخاصمت کے باوجود اسلامی دُنیا کے حصے بخرے کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے شیر و شکر تھے۔ ساحلِ بحرِ اوقیانوس سے لے کر انڈونیشیا کے جزیروں اور جنگل بیلوں میں وہ ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ پوری اسلامی دنیا میں زندگی کے کسی میدان میں بھی کوئی اس مغربی تسلط کی پیش رفت سے اپنی مدافعت کا اہل نہیں تھا۔ مقابلہ جاری تھا لیکن برابری کا ہمسری اور مدافعت و مسابقت کا یارا کسی میں نہ تھا۔ اس لئے کہ علم و عمل دونوں کا محور اسلامی دنیا سے کھسک کر مغرب کی عیسائی دنیا کی طرف جھک گیا تھا۔

مغربی دنیا کی یورپی قوموں نے باقیماندہ دنیا میں تجارتی مراعات کے حصول کے لئے نو آبادیاں قائم کرنے اور علاقوں پر قابض ہونے کے لئے بے پناہ دوڑ دھوپ شروع کر رکھی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی آخری ہچکیوں کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب روہ یا ولایت کے لوگ گروہ در گروہ جنوبی ایشیا کے مختلف علاقوں خصوصاً روہیل کھنڈ کی جانب تلاش روزگار و معاش کے ارادے سے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ جن روہیلہ سرداروں نے ہند میں جاگیریں اور نوابیاں پائی تھیں۔ انکے اچھے سلوک نے روہ کے پشتونوں کو اس طرف راغب کیا تھا۔ روہیل کھنڈ کے نواب حافظ رحمت خان روہیلہ اس بارے میں لکھتے ہیں: "ولایت کے کئی شریف زادے رزق کے نصیبے کی تلاش میں اپنے وطن سے اُٹھ کر یہاں ہندوستان آئے ہیں اور آباد ہو گئے ہیں"۔

سرزمین روہ کی اپنی اقتصادی حالت عہد قدیم کی طرح بس گذارے کے قابل تھی، اور یہاں کے عام لوگ اب بھی مفلس و قلاش تھے۔ پردیس جانا اور غریب الدیاری کی زندگی اُن کا مقدر بن چکا تھا۔ شمال کی طرف سے حملہ آوروں کے زمانے میں وہ ہند میں لوٹ مار کے بعد بہت

سا مالِ غنیمت اپنے ساتھ لے آتے۔ لیکن اب حالت کچھ بدل سی گئی تھی۔ نادر شاہ افشار کے حملے کے بعد ہند کے خزانے خالی ہو چکے تھے۔ جنوب کی طرف سے پہلے مرہٹہ اور بعد میں فرنگی طاقتوں نے شمال کی جانب یورش کی۔ اس لئے نہ تو اس جانب سے انکی لشکر کشی کا کوئی مادی فائدہ تھا اور نہ ہی کسی عارضی مسافرت سے انہیں کچھ حاصل ہو سکتا تھا اس لئے اُس زمانے میں جو بھی رزق اور روزی کا متلاشی ہو کر سرزمین ہند کی طرف جا نکلتا وہ وہیں مستقل طور پر قیام پذیر ہو جاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شمالی ہند کے مسلمانوں میں پشتون ذات (افاغنہ) اور ایرانی نسل کے مابین مستقل رقابت کی جڑیں پوری طرح مضبوط ہو چکی تھیں اور دہلی کی سلطنت اس اندرونی انتشار و خلفشار کی وجہ سے یکسر کمزور اور ناکارہ ہو چکی تھی۔ نادر شاہ افشار نے حملہ آور ہو کر مرکزی حکومت کا سارا خزانہ سمیٹ لیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے تک دکن کے مرہٹہ دہلی کے دروازوں تک آن پہنچے تھے۔ لیکن مرکز کی طرف سے مقابلے اور مدافعت کا ارادہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس حالت میں روہیل کھنڈ کے پشتونوں کی کمک کے لئے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دعوت پر احمد شاہ بابا قندھار سے مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے چل پڑا اور پانی پت کے میدان میں ایک دفعہ پھر باطل قوتوں کو زیروزبر کیا اگر یہ شاہِ تاجستان چاہتے تو تختِ دہلی پر آسانی کے ساتھ قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور مغلیہ تسلط کو وہاں پر برقرار رہنے دیا۔ ہر چند کہ بعض مورخین مثلاً پروفیسر رشید، سردار گنڈا سنگھ، فقیر وحید الدین یا پروفیسر سمتھ وغیرہ احمد شاہ بابا کو موردِ الزام گردانتے ہیں۔ اور پروفیسر رشید تو اس حد تک اپنے بیان میں تجاوز کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ: ”احمد شاہ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے عمل کو سرعت بخشی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شاہ ولی اللہ اور نجیب الدولہ کے بلاوے پر آیا تھا۔ لیکن اُسے اِس قسم کے بلاوے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خود آیا اور مسلمانوں کی طاقت اور دبدبے کو اس قدر زیادہ نقصان پہنچایا کہ اس سلطنت کے دشمنوں نے بھی نہیں پہنچایا ہوگا۔

پانی پت کی تیسری لڑائی کو مسلمان انتہائی فخر کے ساتھ اسلام کی فتح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں لیکن

در اصل یہ عملاً ان کی شکست تھی اگر شاہ ولی اللہ نے ابدالی کو دعوت دی بھی ہو تو اس لحاظ سے بھی اُس نے اسلام کی سربلندی کی کوئی خاص خدمت نہیں کی۔" یہ آخری فقرہ مؤرخ سمتھ کی تحریروں سے پروفیسر رشید نے نقل کیا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔ قارئین کے ملاحظہ کے لئے اصل اقتباس پیش کیا جاتا ہے :۔

"Ahmad Shah Abdali's invasions accelareted the distntegration of the empire. It is said that he was invited by Shah Waliullah and Najibuddaula. He did not want an invitation but he came and did more damage to Muslim power and prestige than the enemies of the empire had done it. The third battle of Panipat is remembered with pride by the Muslims and the victor of Islam. It was a defeat in many senses of the word. If Shah Waliullah invited Abdali it proved, 'Hardly a contribution to the glory of Islam, Says Smith. It was an alian's participation in politics with a vengeance Decline of Muslim power and the crisis of Muslim civilization in India and Pakistan during the eighteenth century."

(All Pakistan History Conference, Islamabad)

لہ خلاصۃ الانساب مؤلفہ حافظ رحمت خان ص ۹۰ مطبوعہ پشتو اکیڈمی۔

پروفیسر رشید آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: یہ ایک غیر ملکی کا انتقامی جذبہ تھا جو اس علاقے کی اندرونی سیاست میں مداخلت کا سبب بنا۔"

پروفیسر رشید کا یہ بیان کس حد تک حقائق پر مبنی ہے؟ یہ مؤرخین کا کام ہے۔ یہاں صرف اس قدر کہا جائے گا کہ اُس وقت کا ایک مقامی مجاہد جو خود بھی ان معرکوں میں شریک تھا، اور انجام کار شہید ہو گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب خلاصۃ الانساب[1] میں لکھتا ہے کہ: "جب مرہٹوں کا غلبہ ہوا اور علاقۂ دکن کے کفار نے ملک پر یورش کی تو دکن سے لے کر پورب اور پنجاب تک سارے ہندوستان کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ اور بادشاہوں اور امیروں اور راجاؤں میں سے کسی کو بھی یہ یارا نہیں تھا کہ ان کو روک سکے وہ اس قدر بے لگام اور بے قابو ہو گئے کہ کٹھر کے پشتونوں پر بھی حملہ کیا، اور کئی سال تک اُس علاقے میں قتل مقاتلے اور لڑائی جھگڑے جاری رہے۔ لیکن جس وقت سلطانِ عالی کو اسکی اطلاع ملی اور وہ اسلام اور پشتونوں کے ننگ و ناموس کی خاطر کفار کے خلاف جنگ اور غزا کی نیت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ۱۷۶۳ء میں ہندوستان تشریف لائے تو وہ شاہجہان آباد کے نزدیک قیام پذیر ہوئے۔ ہندوستان کے اُمراء اور خوانین جو حمیت اسلام کی خاطر اُٹھ کھڑے ہوئے اُن سب سے پشتونوں کے اس بادشاہ کو اللہ پاک کی جانب سے ایک عظیم رحمت خیال کیا اور اپنے تمام لشکر سمیت وہاں اپنی انتہائی خوشی اور فخر و شکر کے ساتھ انکے حضور حاضر ہوئے اور چونکہ اللہ پاک کا فضل و کرم پشتونوں کے شاملِ حال تھا۔ اس لئے اُن کفار کو حدودِ شاہجہان آباد میں اپنے قہر و غضب سے تہ تیغ کر کے نیست و نابود کر دیا اور ان کفار کو پشتونی تلوار کا طعمہ بنا دیا۔ دوسری دفعہ اسکندر نامی شہر کے قریب بھی اُنہیں زبردست شکستیں دیں۔

تیسری بار جب تمام مرہٹے اور کفار پھر اکھٹے ہوئے اور دکن سے آکر پانی پت کے مقام پر شورش کا آغاز کیا تو اُس دفعہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پشتونوں نے وہ تمام کافر نیست و نابود

---

[1] خلاصۃ الانساب مؤلفہ حافظ رحمت خان ص ۹۰ مطبوعہ پشتو اکیڈمی۔

کر دیئے ۔ اور دیارِ ہند میں علمِ اسلام کو میں سربلند رکھا۔
حافظ الملک کا بیٹا نواب مستجاب خان گلستانِ رحمت میں رقمطراز ہے کہ " جب شاہی فوج دہلی پہنچی اور بادشاہ نے قندہار لوٹنے کی نیت کی تو بعض سرداروں کو رخصت کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہند آنے کا اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مرہٹہ طاقت کو توڑ کر ختم کر دیا جائے ۔ اور اسلامی سلطنت کو بحال کر دیا جائے اب جب یہ کام پورا ہوا تو تمہارے درمیان اتحاد و تعاون ہی تمہاری بالادستی کو قائم رکھے گا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ قندھار لیجائے ۔ لیکن حافظ الملک کی درخواست پر اُسے اس خیال سے چھوڑ دیا کہ اُس کے ہاتھوں ہند کے پشتون ہمیشہ بے آرام رہینگے ۔ اور امن و سکون مفقود ہو گا۔
ایک طرف یہ کیفیت تھی اور دوسری طرف مرہٹوں کے ارادوں میں اس قدر پیش رفت ہوئی تھی کہ مؤلف سید الطاف بریلوی تاریخ احمد کے صفحہ ۱۲ کے حوالے سے کہتا ہے کہ " غرور نخوت کا یہ عالم تھا کہ بھاؤ اور دوسرے مرہٹہ سردار یہ کہا کرتے کہ جنگ میں بادشاہ پر فتح پاکر اور پشتون سرداروں کو تہ تیغ کر کے انہدامِ سلطنتِ اسلامی کے بعد مسلمان نیست و نابود کر دیئے جائینگے اور بشواس راؤ کو تمام ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے گا ۔ اور پتھر کا یہ بڑا بُت جو ہم ساتھ لائے ہیں اسے جامع مسجد دہلی میں نصب کر دیا جائے گا اور اُسے ہندوؤں کا معبد بنا دیا جائے گا۔ اور وہاں اذان کی جگہ ناقوس (سنکھ) پھونکا جائے گا ۔ اسکے برعکس ایک پشتون شاعر برہان کہتا ہے ؎

احمد شاہ باچا یہ جار دا اوویلہ — د غزا یہ نیت اوځم لہ کابلہ
پښتنے مغلے لاندے کړے کفارو — دا خبرہ مے یہ زړہ اوګرځیدہ
یا بہ قتل کړم کفار یہ ھندوستان کښے — یا بہ پریکړمہ کلہ پرے باندے خپلہ

" احمد شاہ بادشاہ نے برملا طور پر یہ بات کہی ، میں غزا کی نیت سے کابل سے جا رہا ہوں۔ کافروں نے پشتون اور مغلانیوں کو زیر کر لیا ہے اور یہ بات میرے دل پر گراں گزرتی ہے یا تو میں ہند جا کر کفار کو قتل کر لوں گا یا پھر اپنا سر کٹواؤنگا ۔"
ایک طرف یہ کیفیت تھی اور دوسری طرف پروفیسر رشید کے مذکورہ استدلال سے یہ ۔ ترشح

ہے کہ بعض مسلمان مؤرخین یا تو اس قدیمی تعصب کے زیر اثر جو سرزمین ہند میں پشتون اور ایرانی نژادوں کے مابین چلا آرہا تھا یا برصغیر میں دو قومی نظریئے کے خلاف محاذ آرائی کے خیال سے ایسا لکھنے پر مامور کئے گئے لیکن اسکے باوجود کہ اُس دور کے تاریخی حوادث اور اُسکے نتائج اِس کتاب کا موضوع بحث نہیں ہیں۔ یہ کام پشتون مؤرخین کا ہے کہ وہ احمد شاہ بابا کے ہند پر حملوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور پروفیسر رشید کی طرح پرفتور مؤرخین کی تحریروں سے کیا تأثر اخذ کرتے ہیں؟ ہمارا موضوعِ بحث محض وہ عام عالمی صورتحال ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو ساری دنیا میں مسلمانوں پر انحطاط اور تنزل کا دور دورہ مسلط تھا اور دوسری طرف امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور ایشیا غرض یہ کہ بحروبر میں جہاں کہیں بھی یورپ کی کسی قوم کے سینگ سماتے اُسی طرف اپنا رُخ کر لیتے تھے۔ تجارتی کمپنیوں کے نمائندوں، تاجروں، سیاحوں، معالجوں، حکیموں، پادریوں اور سفیروں کے لباس میں جب یہ مہم جُو بحروبر میں ہر طرف پھیل گئے تو نو آبادیاتی استعمار نے اپنے دامن میں ساری دنیا کو سمیٹ لیا۔ یہ ہر ملک اور ہر وطن کے کونے کھدرے تک پہنچ گئے۔ ہر قوم کی دُکھتی رگ کو پہچانا اور اُنکی تاریخ، ادب تمدن اور طرز معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا اور کسی نہ کسی حیلے بہانے سے کچھ نہ کچھ مراعات حاصل کیں اور پھر دھیرے دھیرے اُن اقوام کے لئے بار دوش بن کر اختیار و اقتدار کو ہتھیالیا۔ اِس طرح یورپ والوں نے روئے زمین پر ایسی کوئی جگہ نہ چھوڑی جس پر ان کی بالادستی اور اُن کا تصرّف قائم نہیں ہوا۔

جب واسکوڈے گاما کا بادبانی جہاز کالی کٹ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اُس وقت سے لیکر سالہا سال تک جنوبی ایشیا میں پرتگیزوں، ولندیزوں، انگریزوں، اور فرانسیسیوں کی باہمی رقابت جاری رہی انہوں نے جنوبی ہند اور بنگال کی بندرگاہوں کے راستے دہلی کے مغلیہ درباروں کے دروازے دیکھ لئے اور معالج کے بھیس میں مراعات کی دریوزہ گری کی۔ پہلے اپنے قدم پانی سے نکال کر ساحل کی ریت پر رکھے۔ پھر پختہ زمین پر اپنے قدم جمائے پہلے قدم رکھنے کی جگہ بنالی گئی اور پھر دوکانیں کھول کر رفتہ رفتہ بازاروں کے مالک بن گئے۔ بعد ازاں حصار اور قلعے تعمیر کئے

مقامی لوگوں میں نفاق کے بیج بوکر فرقہ بندی شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ ہند کی سرزمین میں مغلوں کی میراث پر قبضہ جمالیا۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک شمالی ہند، پنجاب اور "پشتونخوا" کے علاقے میں یہ عمل دخل جاری رہا۔

دنیائے اسلام میں ان کا آخری ہدف پشتونخوا کی سرزمین تھی۔ یہ جنوبی ایشیا کے برصغیر کا شمالی علاقہ تھا جو ملک کے انتہائی شمال مغرب کی طرف واقع تھا۔ تاریخ کے طویل ادوار میں ہند میں یہ مسلمانوں کی وسیع سلطنت کا ایک اہم صوبہ تھا جو مرکز ختم ہو جانے کی وجہ سے خود مختار ہو گیا تھا۔ اور قبائلیوں کے ایک عارضی وفاق کے ذریعے اس میں اپنی خود مختار بادشاہت قائم ہوئی تھی۔ ایسی بادشاہت جس میں بہت سے قبیلے باج اور خراج سے آزاد تھے اور بادشاہ کی حاکمیت کو صرف زبانی تعلق اور رسمی ناطے کی حد تک تسلیم کرتے تھے۔ مضبوط مرکز کی عدم موجودگی گھر گھر کی مخاصمت اور شمالی اور جنوبی نوآبادیاتی طاقتوں کے حملوں، سازشوں، عمومی اندرونی خلفشار اور ہنگاموں نے ایسے طوفانی حالات پیدا کئے کہ پشتو ادب کی شمع پوری آب و تاب کے ساتھ جھلملانے سے قاصر رہی۔

نور و عرفان اور تعلیم و تعلم کے مراکز چاہے وہ بخارا، سمرقند اور ترکستان کے دوسرے شہروں میں تھے دہلی، لاہور، دیوبند، سرہند، اجمیر یا دور دکن کی سرزمین میں یہ تمام مراکز ایک طرف تو روسیوں کے تصرف اور دوسری طرف سکھوں اور فرنگیوں کے تسلط کی وجہ سے پشتون طلباء کے لئے مسدود ہو گئے۔

ایک وقت ایسا تھا جیسا کہ پروفیسر سید تقویم الحق لکھتے ہیں:۔ " انوں درویزہ صاحب کو جب مزید علم کا شوق پیدا ہوا تو ملا سید ناصر احمد ملازنگی پاپینی اور ملا سنجر پاپینی کے چشمۂ علوم سے اُن کی تشنگی دور نہ ہوئی اور مزید علم کی جستجو میں ہندوستان بھی گئے جو علوم کا مرکز تھا۔ موصوف علمائے ہندوستان میں ایک جمال الدین ہندوستانی کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی ضمنی طریقے سے خدا جانے کہ انکے علاوہ کتنے علماء اور صلحاء کو انہوں نے دیکھا ہوگا اور کس کس سے کسب علم کیا ہوگا اور اسی طرح انہوں نے بخارا کے ایک سفر کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً انہی دنوں کی بات ہے۔

وہ ایک اور جگہ یوں رقمطراز ہیں: "ہندوستانی طلباء کے ساتھ مجلس آرائی کی وجہ سے میرے دل سے خوف گھٹ گیا۔ اور روح کو قرار آنے لگا۔" اس دور سے بیشتر پشتون جوان علم، تجارت، سیر سپاٹے اور زندگی کے دیگر گرم و سرد سے دوچار ہونیکے اراد ے سے ان ممالک میں کھلم کھلا پھرا کرتے تھے۔ اس طرح ایک تو اُن کی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا۔ دوسرے تجربہ و نظر میں وسعت پیدا ہوتی۔ اسی طرح مشاہدہ، تجربہ اور اخذ کا یہ عمل مستقل طور پر جاری رہتا۔ اور وہ اپنے احساسات و جذبات بروئے کار لا کر اپنے دل کے خزانے سے خوبصورت اور بیش بہا افکار کے دُر مرجان "بھی باہر نکالتے۔ اور جیساکہ پہلے کہا گیا ہے۔ مرزا خان انصاری نے اس غریب الدیاری میں اپنا جامع الصفات دیوان مرتب کیا۔ محمد علی مخلص نے صوفیانہ شاعری کے ساتھ روشانی تحریک کا "حالنامہ" تحریر کیا۔ دیوان ملا ارزانی تصوف کے موتیوں سے مزیّن ہوا۔ خوشحال خان نے رنتھمبور کے قلعے میں شعر و ادب کا باغ تر و تازہ رکھا۔ اشرف خان ہجری نے بیجاپور کے قید خانے میں شعر و سخن کے شہپارے پشتونوں کو دیئے۔ میرا اور قلندر نے اپنے عشق کی روداد، واردات و کیفیات کو غزل کے پیرایہ میں قلمبند کیا۔ خواجہ محمد بنگش نے عشق و تصوف کا رنگین کلام پیچھے چھوڑا۔ رحمت داوی کشمیر میں۔ عبدالرحیم ہوتک بخارا میں۔ اور قاسم علی آفریدی فرخ آباد میں، صاحب دیوان بنے اور پھر آخر میں کاظم خان شیدا نے رامپور میں پشتو ادب کو اتنا کچھ دیا کہ وہ خود یوں گویا ہوا ؎

پہ دا وخت کښې کہ شیدا! دواړہ مهمند وے
ثنا خوان بہ وے هر دم ستا د ویلو

" اے شیدا اس وقت اگر دونوں مومند زندہ ہوتے تو وہ ہر گھڑی تیری شاعری کی تعریف کیا کرتے۔" اس سے اور ایسی کئی اور مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو ادب کے آسمان کے کئی ستارے ہند اور دکن کی مسافرت کی وجہ سے روشن ہو کر چمکے مگر جب یہ راستے اُن پر مسدود ہو گئے تو اُن خزانوں میں بھی جیسے تالے پڑ گئے اور پشتونخوا میں سالہا سال تک عوامی

ادب، منظوم داستان سرائی، رومان، افسانے، نغمے، اور ادبی قسم کے شعر و ادب کی تخلیق تک محدود رہا۔ اگرچہ ایک ادھ محمدی صاحبزادہ، رحمت داوی وغیرہ بھی گذرے ہیں جنہیں سخنوری کی دولی ہے مگر وہ نہ تو امیر کروڑ تیمنی، ملک یار غرشین، شکارندوئے، بابا ہوتک یا شیخ بیٹن کیطرح پشتو شاعری میں لطافت و رعنائی پیدا کرسکے اور نہ ہی خوشحال خان خٹک، عبدالرحمان بابا، عبدالحمید ماشوخیل، علی خان اور کاظم خان شیدا یا اُس زمانے کے دوسرے شعراء کے کلام کی ہمسری کر سکے۔ پھر بھی پشتو شعر و ادب کا کاروان آگے بڑھتا گیا اور نظم و نثر ہر دو میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔

محمدی صاحبزادہ" اس دور کی ایک اور اہم اور ادبی شخصیت یہ چمکنی کے حضرت میاں عمر صاحب کے بڑے صاحبزادے حضرت محمدی صاحبزادہ تھے۔ یہ ۱۱۰۹ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ دینی اور روحانی تربیت اپنے گھر میں اپنے والد سے پائی تھی۔ اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے۔ میاں عمر صاحب کی وفات کے بعد اُنکے جانشین ہوئے ایک بڑے روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے ادیب اور اونچے درجے کے شاعر بھی تھے۔ اور ساتھ ہی شعراء اور ادباء کی بڑی قدر بھی کیا کرتے تھے۔ اِن کا اپنا ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں ہر قسم کی فارسی، عربی اور پشتو کی علمی کتابیں دیوان اور دیگر خوشخط قلمی نسخے جمع کئے گئے تھے۔ بیشتر کاتب اور نقاش جو اِس سجادے کے مُرید تھے اور ان کے حضور حاضری دیا کرتے وہ اِس کتب خانے کے لئے علوم و فنون کی کتابیں نقل کیا کرتے۔ اِن کا قبول نے پشتو زبان کے قدیمی شعراء کے بیشتر دیوان جمع کئے تھے۔ ان میں اب بھی بعض نسخے کہیں نہ کہیں دستیاب ہیں جن میں سے چند نسخے پشتو اکیڈیمی پشاور کے کتب خانے میں محفوظ کئے گئے ہیں یہ نسخے اِس علاقے کی خطاطی اور قلمکاری کے بہت دلکش اور دلاویز نمونے ہیں۔ انہی سے محمدی صاحبزادہ کے اچھے ذوق اور علم پروری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

محمدی صاحبزادہ خود بھی زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف کے کاموں میں بسر کرتے۔ ڈاکٹر

خیال بخاری نے انہیں صف اول کے پشتو شعراء میں شمار کیا ہے۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ لیکن اس کے باوجود کہ وہ دوسرے شعراء کے دیوان جمع کیا کرتے اور انکی نقل و کتابت کا خصوصی اہتمام بھی کرتے تھے ان کا اپنا دیوان چند سال پہلے تک ناپید رہا صرف چند غزلیں اور رباعیاں دستیاب تھیں۔ یہی حال اُنکی دوسری تصانیف کا بھی ہے۔ ان میں صرف ایک کتاب "مقاصد الفقہ" جو ۱۱۹۷ھ میں لکھی گئی ہے اور دوسری "درود محمدی" موجود ہے۔ درود محمدی چھوٹی بحر کا مخمس ہے۔ محمدی صاحبزادہ نے ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی ان کا مزار اپنے والد بزرگوار حضرت میاں عمر صاحب کے پہلو میں ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔ ؎

هیچ په عقل په تدبیر نهٔ دے نصیب — چا ترلے په زنځیر نهٔ دے نصیب
ستوری والوزی که هر څو نمر به نشی — د بادشاه بخت د فقیر نهٔ دے نصیب
په سینه کښے ے زړهٔ نښته درته تل دے — د کړو بڼړو ستا تیر نهٔ دے نصیب
ستا د زلفو دُرے ډیر ډیر کا بهٔ بسم کړهٔ — لا د سپی غماز تعزیر نهٔ دے نصیب
پتنګ هسے ځانے د شمعے بلے او سو — چه د چا د خُلے ویر نهٔ دے نصیب
چا ته اووایم د غم د بدهٔ حال له — چه د مرهٔ د خُلے تقریر نهٔ دے نصیب
باد خنهٔ دوره ده په موتی کښے راوړے — د حباب د کور تعمیر نهٔ دے نصیب
ستا په زلفو کښے دا بند زړهٔ څو اوس لا چا کا — چه خلاصے دده اسیر نهٔ دے نصیب
د بڼړو قلم زما په او ښکو لوند دے — لا د غم د حال تحریر نهٔ دے نصیب
ستا د نوم اخستنهٔ خُله د تصویر غواړی — څو دا کار ے ته تقدیر نهٔ دے نصیب
کوم یو سیخ ده د لالا سینه دا غلے — چه مرهم ے د ضمیر نهٔ دے نصیب
محمدی او ښکے ے غم په مخ جاری کړے
او د دیدن دده ے بهیر نهٔ دے نصیب

"نصیب کا انحصار عقل و تدبیر پر نہیں اور نہ اسے کبھی کسی نے زنجیر سے باندھا ہے۔"
"ستارے چاہے لاکھ جتن کریں سورج نہیں بن سکتے۔ بختِ شاہی فقیر کو نصیب نہیں ہوتا۔"
"میں نے اپنے سینے میں دل کو ہمیشہ ہدف بنا رکھا ہے مگر تمہاری ترچھی پلکوں کا تیر بھلا میری قسمت میں کہاں۔"
"تیری زلفوں کے کوڑوں نے کتنی کج رووں کو سیدھا کیا مگر ابھی غماز کتے کو یہ سزا نصیب نہیں ہوئی۔"
"بیچارے پروانے کو شمع نے ایسی کس مپرسی کی حالت میں جلا ڈالا کہ ہمدردی میں کسی کا اس کے لئے بین کرنا بھی مقدر میں نہیں تھا۔"
"اپنی زبوں حالی غم میں کیونکر کسی کو سناؤں! بیچارے مردے کی قسمت میں تقریر کرنا کہاں؟"
"ہوا اپنی مٹھی میں کچھ گرد اٹھا لائی ہے۔ اب حباب کی قسمت میں تعمیر خانہ کہاں؟"
"تمہاری زلفوں میں پھنسا ہوا یہ دل بھلا کس سے مدد طلب کرے جب کہ اس قیدی کی قسمت میں رہائی لکھی ہی نہیں گئی۔"
"میرے آنسوؤں سے کلکِ مژہ تر ہے اور ابھی تو میں نے حالِ غم تحریر کرنا شروع ہی نہیں کیا۔"
"تمہارا نام لینے کے لئے ذہنِ تصویر وزکار ہے۔ لیکن تقدیر نے اسے یہ کام سونپا ہی نہیں گیا۔"
"گُلِ لالہ کا سینہ کس سلاخ نے داغا ہے کہ اسے اپنے لئے مرہم بھی میسر نہیں۔"
"اے محمدی! غم نے میرے چہرے پر آنسو جاری کر دیئے اب سیلاب کی قسمت میں تھمنا نہیں لکھا۔"

محمدی صاحبزادہ کا دربار ویسے بھی مرجع خاص و عام تھا لیکن جب ملک میں بد امنی پھیل گئی اور لوگوں کی زندگی نعل در آتش کے مترادف ہو گئی تو کئی لوگوں نے ان کے آستانے کو اپنا دارالامان بنایا، اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ عبدالعظیم رانڑیزئیؒ کی ایک غزل میں اس کا ذکر یوں آیا ہے ؎

چار چاپېره په هر ځائے کښے ظلم زور شو
شو راټول په ټوکنو کښے غریبان
د دے ځوان صاحبزاده له برکته
ټمکنی شو دا په ټول دارالامان

دد آس پاس ہر جگہ ظلم وجور کا بازار گرم ہوگیا۔ تمام غرباء اور مساکین ٹھکنی میں اکٹھے ہوگئے۔ اور اس جوانمرد صاحبزادہ کی برکت سے سارا ٹھکنی گاؤں دارالامان بن گیا۔

عوامی ادب کا دور

انیسویں صدی عیسوی پشتو عوامی ادب کے احیاء اور فروغ کا زمانہ تھا۔ اِس زمانے میں برصغیر پاکستان اور ہند کے بیشتر حصے پر انگریزوں کا تسلط اور غلبہ قائم ہوچکا تھا۔ دہلی کا برائے نام مغلیہ دربار اُس وقت تک باقی تھا ابھی سال ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی برائے نام بادشاہی کا خاتمہ نہیں کیا تھا۔ اس دوران میں پنجاب، کشمیر اور پشاور پر سکھوں کی بالادستی قائم ہوچکی تھی۔ اور اُنکے جبر و تشدد نے اس علاقے کے باسیوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یہ ظالمانہ راج ابھی تک "سکھا شاہی" کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ پشاور پر سکھا شاہی چند سالوں تک مسلط رہی اور اس مختصر سے عرصے میں بھی اسکے خلاف پشتونوں کی جدوجہد شدت سے جاری رہی، اس دوران پشتون غازیوں نے سکھوں کے خلاف کئی جنگیں اور جہاد کئے۔ جنگ وجہاد کی اس عملی جدوجہد کی غرض سے لوگوں کو ابھارنے اور انہیں جدال و قتال میں شامل کرنے کے لئے محراب و منبر کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی وہ عوامی گیت خصوصاً "چار بیتہ" تھے۔

یہ حجرہ، بیٹھک اور چوپال میں رخون شعراء اور گلوکار سنایا کرتے قومی حمیت، ننگ، جسارت، دلیری، پشتون بھائی چارہ، اسلام کیخاطر قربانی دینے کا جذبہ اور اغیار کی غلامی سے حصولِ آزادی

کے لیے عملی جدوجہد ان گیتوں اور چار بیتوں کے بنیادی موضوعات تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ امیر دوست محمد خان اور سردار محمد اکبر خان کی اسلامی جنگوں، سید احمد شہید بریلوی اور اسمٰعیل شہید کی تحریک اور انکی لڑائیوں اور جنگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فرانسیسی مستشرق ڈارمیسٹیٹر کے مطابق چار بیتے پشتونوں کی تحریر شدہ تاریخ ہے۔ جن میں انکی لڑائیوں اور اسلامی جنگوں کی روداد کو محفوظ کیا گیا ہے۔ لیکن چار بیتہ کے ساتھ ساتھ ٹپہ۔ لوبہ اور نیمکٹی میں بھی کسی حد تک یہ خصوصیات پیدا کی گئی ہیں۔ اور ان میں بعض تاریخی معرکوں یا غازیانِ سرفروش کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ پھر بھی اس سلسلے میں پشتو چار بیتہ کو لوک گیتوں کی دوسری ہر صنف پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اسی صنف میں غاصب دشمن کے خلاف پشتونوں کی عملی جدوجہد کی وہ مکمل تصویر موجود ہے جس میں پشتون عوام کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے۔

اس قسم کے چار بیتوں کا ایک دلچسپ حصہ مذکورہ فرانسیسی مستشرق ڈارمیسٹیٹر نے "پشتو نخوا کے گیتوں کا ملر و بہار" CHANTS POPULAIR DES AFGHANS نامی کتاب میں نہایت عمدہ طریقہ سے اکٹھا کیا ہے۔ یہ کتاب اُس نے ۱۸۸۸ء میں پیرس سے شائع کی ہے۔ روداد غزا جنگ کے منظر اور غیور شمشیر زن نوجوانوں کی قربانیوں کے مثالی قصے ان چار بیتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ بعض چار بیتے ایسے بھی ہیں جن میں ملت فروشوں پر طعن و تشنیع کی گئی ہے اور ان کی بے حمیتی کا رونا بھی اس میں رویا گیا ہے۔ ملی نغموں کا یہ دور عوامی گیتوں میں تاریخ سازی کا دور ہے جیسے کہ ان چار بیتوں میں ایک مشہور چار بیتہ پیر سباق کے جہاد کا ہے۔ اس جہاد کا تاریخی پس منظر سکھوں کے دور کے ایک واقعہ نگار مفتی عزیز الدین ولد مفتی خیر الدین لاہوری نے یوں بیان کیا ہے[1]

جب خبر آئی کہ چند یوسفزئی درویش، علماء اور عوام پانچ چھ ہزار افراد غزا کی نیت سے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو سرکار نے یہ خبر سنتے ہی لشکر کو جمع کیا اور خود جانب اٹک یلغار کی۔

---

[1] عبرت نامہ صفحات ۶۵ء، ۶۶ء

جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نوشہرہ کیطرف یوسف زئی فیروز خان کے زیر کماں جمع ہوئے ہیں اور پشاور میں عظیم خان، یار محمد خان اور سلطان محمد خان لشکر جمع کر رہے ہیں۔ اِس وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کُوچ کا ارادہ کیا اور ایک ٹڈی دل لشکر دریائے سندھ سے پار اُتارا اور اکوڑہ پر حملہ آور ہوئے راجہ گلاب سنگھ۔ دیوان کرپا سنگھ۔ الٰہی بخش گولہ انداز اور شام سنگھ اٹاری والا خیرآباد کے قریب پار ہوئے انہیں حکم ہوا کہ جہاں سرکار (رنجیت سنگھ) ڈیرے ڈالیں اُس کے بالمقابل دریا کے دوسرے کنارے تم بھی پڑاؤ کرو۔ مامورین اس پر عمل کرتے رہے۔ خبر رساں یہ خبر لائے کہ غازی نوشہرہ میں جمع ہوئے ہیں۔ تیسرے دن وہاں غازیوں کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی۔ سردار عظیم خان وغیرہ بھی جو دریائے لُنڈا کے اس طرف مہاراجہ گلاب سنگھ کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر تھے جب اِس سے آگاہ ہوئے کہ غازیوں کے ساتھ مقابلہ شروع ہو چکا ہے تو دریا پار کرنیکی نیت کی لیکن جب چند افراد پہلی کشتی میں دریا پار کرنے کی نیت سے بیٹھے تو عین دریا کے بیچ کشتی اُلٹ گئی اور وہ ڈوب گئے۔ سرداروں نے اِسے بدشگونی پر محمول کیا اور پار ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن سکھوں کا جو لشکر دریا کے اس طرف بالمقابل موجود تھا اس کے ساتھ بھی مقابلہ نہ کیا۔ عام غازیوں نے اس قدر دلیری اور بہادری دکھائی کہ دو زبانوں والا قلم اُن کی جوانمردی اور بہادری کا بیان لکھنے سے قاصر ہے۔ اور پچیس ہزار کا لشکر جو مہاراجہ انکے مقابلے کے لئے پار کر اچکے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک خواہ اعلیٰ تھا یا ادنیٰ، سردار تھا یا سپاہی کوئی بھی ایسا نہ تھا جو فرار ہونے کو غنیمت نہیں سمجھتا تھا۔

مہاراجہ خود ہاتھی پر سوار نیزہ ہاتھ میں لئے اُنہیں دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اور اُنہیں کہتا تھا کہ "دیکھو لاہور دور ہے اور غازی تمہیں وہاں تک پہنچنے نہیں دینگے"! مجبوراً فوج نے پیش قدمی کی، لیکن غازیوں کے ساتھ مقاومت کی نہ تو وہ طاقت رکھتے تھے اور نہ اُن کا دل چاہتا تھا غازی ہاتھیوں کے اوپر ہودوں میں بیٹھے ہوئے سکھوں تک پہنچتے اور انہیں وہیں ڈھیر کر دیتے۔ چنانچہ پھولا سنگھ اکالی جو دلیری اور بہادری میں اپنا جواب

آپ تھا۔ اور لڑائی میں دو تلواریں، دو کمانیں اور دو بندوقیں پھرایا کرتا تھا۔ اسکو بھی ایک جوان مرد غازی نے ہاتھی کے اوپر چھرا گھونپ دیا۔ اور مار ڈالا اور ساتھ کمیدان منہا سنگھ ایک نوخیز لڑکے کے ہاتھوں زخمی ہوا۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی حال تھا۔

اسی حالت میں جب شام ہوئی اور دونوں فوجیں اپنے اپنے ڈیروں میں واپس آئیں تو پشتونوں کے حوصلے اتنے بلند تھے۔ کہ وہ کہا کرتے کہ سکھ اب ٹھہرنے کے نہیں اور سکھ اتنے خوف زدہ تھے کہ ساری رات اپنے گرودوں کی منتیں ملنتے رہے کہ یہاں سے ہم صحیح سلامت پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھیں اور اس رات کی طوالت کے لئے دست بہ دعا تھے کہ تاحشر کبھی صبح ہی نہ ہو۔ صبح کی روشنی تاقیامت دکھائی نہ دے۔"

جنگ وجہاد کی یہ کیفیت اور یہ جذبہ یوسف زئی غازیوں میں کیونکر پیدا کیا گیا تھا؛ اس کا اندازہ قاضی عطاء اللہ کی تاریخ میں موجود اُس زوردار چار بیتہ سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس دور کے ایک عوامی شاعر مویتزی نے کہا ہے چار بیتہ یہ ہے:۔

قاصد د باچا راغے یوسفزے او لړزیدهٔ
په نیت د غزا لاړ و په نوښار اوړزیدهٔ

قاصد د باچا راغے را لیږلے عظیم خان — د اولسے جرګه کړل ملایان او ملکان
دا رو کولئی په مادی د رکوم به خرخ تاوان — الفاظ ئے تور شکه وو په هر چا به لګیدهٔ
الفاظ ئے تور شکه وو پرے راضی یوسف نا شوهٔ — را تلل به ځائے ترځایه نه ئے تور نه ئے دمه شوهٔ
خیل کوم په هر چا او شو بیبنه د ئے علاشوهٔ — توکل دعائے او کړه سیلا یونه بهیدهٔ
قاصد د باچا راغے یوسفزے او لړزیدهٔ — په نیت د غزا لاړو په نوښار اوړزیدهٔ

توکل دعائے او کړه اکوزی وو په زدکو نه — را تلل ئے مشران د سیند په غاړه لکه غر و نه
د زغرو ئے ځلکے وے دوشالے ئے په سرونه — د حُسن په صفت ئے بادشاهان هوسیدهٔ
قاصد د باچا راغے یوسفزے او لړزیدهٔ — په نیت د غزا لاړو په نوښار اوړزیدهٔ

د پیښے نه جاروزی نورزی دی اژدران
مدام ئے صف جنګی وی د و ښکلو په میدان

د الله نوم چه به ئے واخیست تو به ماتولو ښکان
د ښځو د ګنډه ئے رنجیت او ویریده

قاصد د باچا راغے یوسفزے اولړزیده
په نیت د غزا لاړو په نوښار اوډزیده

د ښځو په ګنډو کښے شهید شوے ډیرخان
د تام په مخکښے مړه شو فیض طلب اولطاف خان

شیرداد محب الله وردړه پرے میراشوسرورخان
سمٰعیل زی د لوے ملا سره لالونه تونیده

قاصد د باچا را غے یوسفزے اولړزیده
په نیت دغزا لاړو په نوښار اودزیده

اسمٰعیل د لوی ملا په مخکښے مړشو امانت
معصم او عدل شاه دے الله کاندی په جنت

د و ښکلو جنګ ئے اوکړو په میدان کښے نیم ساعت
په مرګ ئے په اسمان کښے ملائک اوډزیده

قاصد د باچا راغے یوسفزے اولړزیده
په نیت د غزا لاړو په نوښار اوډزیده

په زمکه ژاړی بونه ملائک پاس په آسمان
یو چړک په ناوه پر یوت اخون خیل شو ندیوان

د مرګ پورے پلار د حضرت دین کوی ارمان
میراتے پالنګونه په میدان خاورے کیده

قاصد د باچا راغے یوسفزے اولړزیده
په نیت د غزا لاړو په نوښار اوډزیده

میراتے پالنګونه په میدان شولو یواځے
ژاړی نو ښدے میندے کلے ئے کړے اغاړے

د خاورو نه شوے لاندے هغه ښے پګړی درازے
په صفت ئے موږے دکه فولاد او ویشیده

قاصد د باچا راغے یوسفزے اولړزیده
په نیت د غزا لاړو په نوښار اوډزیده

صفت د یوسفزو کوم چه قتل ئے کړو خان
په مخکښے ئے تمام شو بیں ملا او صابزادګان

په دوزخ کښے به کفار په جنت کښے مومنان
هر بیت د موتی لکه مرجان بیه کیده

قاصد د باچا راغے یوسفزے اولړزیده
په نیت د غزا لاړو په نوښار اوډزیده

"جب بادشاہ کا قاصد آیا تو تمام یوسف زئی مشتعل ہو گئے۔ اور غزا کی نیت سے نوشہرہ جاکر (میدان میں) پھیل گئے۔"

" بادشاہ کیطرف سے عظیم خان نے قاصد بھیجا۔ پہلے ملاؤں اور ملکوں سے صلاح مشورہ کر کے کہا کہ تمام گولہ بارود اور خرچ اخراجات میرے ذمہ ہیں "

" اس کی بات پسندیدہ تھی اس لئے تمام یوسف نامہ اس پر راضی ہو گیا "

" وہ مختلف مقامات سے آتے نہ وہ سوتے اور نہ ستاتے۔ کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے کہ کسی کو اپنے گھر میں قرار نہ آیا اور توکل کی دعا کر کے افواج کے سیلاب میں رواں دواں ہوئے۔ اکوزی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان کے سبھی سردار آرہے تھے جو دریا کے کنارے مضبوطی سے قائم پہاڑوں کی طرح کھڑے تھے۔ انہوں نے زرہ بکتر کی قمیضیں پہن رکھی تھیں۔ اور سر سے کفن باندھے ہوئے تھے۔ بادشاہ بھی انکے حسن کی ستائش سے خوش ہوتے تھے۔

ذرا دیکھو تو! اس حادثے سے دو گمر داتی ذکر کرتے ہوئے یہ نوری زئی ان اژدھوں کی طرح ہیں جو بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ تلواریں نیام سے نکالے ہوئے میدان جنگ میں صف آرا ہوتے ہیں۔ جب یہ لوگ اللہ کا نام لیتے تو سکھ سورما ہر طرف مات کھا جاتے۔ نشانہ بازی پر انکا یقین کامل دیکھ کر رنجیت سنگھ بھی خوف زدہ ہے۔ بہادر پیر خان داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گیا۔ فیض طلب اور لطاف خان قوم کے سامنے قربان ہو گئے۔ شیرداد اور محب اللہ جو آپس میں بھائی تھے کام آئے اور ان کا والد سرور خان لاولد ہو گیا۔ اسمٰعیل زئی بمعہ " لوئے ملا " کے موتیوں کی طرح بکھر گئے ہیں۔ اسمٰعیل اور امانت " لوئے ملا " کے سامنے چل بسے۔ معظم اور عدل شاہ کو اللہ جنت نصیب کرے وہ کافی دیر تک بہترین جنگ لڑے اور انکی وفات پر آسمان کے فرشتے رو پڑے۔ زمین پر دوشیزائیں اور فلک پر ملائک رو رہے ہیں۔ نارہ پر ایک بجلی ٹوٹ پڑی۔ جب اخون خیل دشمن کے نرغے میں آگئے۔ حضرت دین کا باپ تادم واپسین بیٹے کی موت کا تماشا دیکھتا رہا۔ لاوارث ہو کر انکے پلنگوں پر میدان کی دھول اڑ رہی تھی۔ انہوں نے کلمے پڑھنے شروع کر دیئے۔ وہ اچھی اور اونچی پگڑیاں مٹی کے نیچے دب گئیں۔ اور انکی تعریف میں موبیزی فولاد کی طرح جوش کھانے لگا۔ میں یوسف زئیوں کی

تعریف کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی جانیں گنوائیں۔ میدان جنگ میں اُنکی قیادت کرتے ہوئے پیر، مُلّا اور صاحبزادوں سبھی نے جام شہادت نوش کیا۔ کفار دوزخ میں اور مومن جنت میں ہونگے اور مویزی کے ہر شعر کی قیمت موتیوں کے مول چکالی جائیگی۔"

عوامی گیتوں کا یہ دور جس میں حریت اور آزادی کی آرزوئیں انگڑائی لے رہی تھیں۔ اور گھر گھر قومی استقلال اور حمیت کو بیدار کرنے کے لئے عملی پراپیگنڈے کا کام سرانجام دے رہی تھیں۔ پیر سباق کی غزا کے بعد ظہور پذیر ہوا جسے مویزی شاعر نے" د ڈیرو غزا " کا نام دیا ہے۔"

اس دور کے شعراء اور اساتذۂ فن نے اپنے عوام کو بیدار کرنے اور اُنکے کارناموں کی ستائش کو گویا اپنا ایک مقدس قومی اور مذہبی فریضہ سمجھ رکھا تھا یہ اس لئے کہ اسلام کی اشاعت کے سینکڑوں سال بعد پہلی بار پشتونخوا پر کفر کی تاریکیوں کے چھا جانیکا خطرہ لاحق ہوا تھا اس علاقے کے لوگوں نے اپنی طول طویل تاریخ کے ہر دور میں فاتحین بن کر دوسری قوموں اور ممالک کو اپنا مطیع و منقاد بنا دیا تھا۔ انکے لئے یہ بالکل ایک نرالی سی بات تھی۔ انکے طرۂ تفاخر اور دستارِ فضیلت کو خطرہ لاحق تھا۔ یہی سبب تھا کہ حساس طبیعت رکھنے والے شعرا اخوند اور ملاؤں نے انہیں اِن کا فرض اور اقوام و ملل میں انکے مقام کی نشاندھی کے لئے شعر کا یہ میدان منتخب کیا۔

مساجد، گھروں اور حجروں میں مواعظ اور دیگر محفلوں میں باطل کی قوتوں کے خلاف صف آرائی اور اپنی مٹی کے تحفظ اور آزادی کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کا موضوع پشتونخوا کے اِس دور کی شاعری کی بنیادی خصوصیت بن گئی۔ اس قسم کی شاعری عملاً پوری انیسویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ لیکن اسے زیادہ نمایاں اور عمومی مقبولیت ۱۸۲۳ء کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اسکے بعد اکثر شعراء نے ملی اور قومی تقاضوں کی خاطر اِس میدان میں اپنے زور بیان کے فطری جوہر دکھائے جو سکھوں کے خلاف پشتونوں کی لڑائیوں اور جہاد بالاکوٹ کے معرکے تک پوری شدت کے ساتھ جاری رہے۔

ہندوستانی مجاہدین کا جو گروہ سید احمد شہید بریلوی کی سرکردگی میں پشتونخوا کی طرف آیا تھا اس

کے ساتھ اس علاقے کے پشتون آخری وقت تک ہر معرکہ اور ہر جہاد میں مذہبی فریضے اور قومی ننگ وناموس کیخاطر کمک اور امداد کرتے رہے۔ ان جنگوں اور جہادوں کے بارے میں جو سکھوں کے خلاف ہوئے بہت سے چار بیتے لکھے گئے جن میں ان مجاہدین کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض چار بیتے ایک زمانے تک زبان زد عوام وخواص رہے۔ مثلاً یہ کہ ؎

لہ هندہ دی راغلی پہ غزا پسے سفر کا

. . . .

لہ هندہ دی راغلی تو وطن ئے بریلیٔ
اوس ناست دی پہ ملکا کښے بورپوی دارو کولیٔ
پہ ډاګہ ورتہ ناست دی تل ثنا د پاک اکبر کا
لہ هندہ دی راغلی پہ غزا پسے سفر کا

ہند سے آکر انہوں نے جہاد کے لئے سفر اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ان کا وطن بریلی ہے مگر اب ملکا میں بیٹھ کر کارتوس بنا رہے ہیں وہ کھلے میدان میں بیٹھے اللہ پاک کی ثنا کرتے ہیں۔ ہند سے آکر انہوں نے جہاد کے لئے سفر اختیار کیا ہے۔ یا یہ کہ

سید احمد باچا دِ بولی بہرام خان مولوی
پہ کنہار جنګ دے کنہار شو پہ تا بوستان مولوی

" اے بہرام خان مولوی[1] تجھے سید احمد باچا نے طلب کیا ہے کنہار پر جنگ ہو رہی ہے۔ یہ کنہار تجھ ہی سے گلستان بن گیا ہے۔

یہ اسلامی جنگیں پشتونخوا میں ۱۸۲۳ء کے بعد پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے خلاف جاری تھیں۔ ان میں شریک ہونے کے لئے دشت ودمن میں ہر طرف سے حریت وآزادی کے پروانے دین و

---

[1] ارباب بہرام خان شہید جو موضع تہکال کے رہنے والے تھے۔

وطن کی شمع پر قربان ہونے کے لئے چلے آتے اور وقتاً فوقتاً اپنے علاقے میں استعماریت کی مزاحمت کیا کرتے اس مزاحمت کا ذکر اُن ملّی شعراء نے اپنے نغموں اور چار بیتوں میں بڑے زوردار اور پُر لُطف انداز میں کیا ہے۔

امیر دوست محمد خان کے جہاد وزیر اکبر خان یا پیر سباق کی اسلامی جنگوں کے علاوہ پشتو کے عوامی شعراء نے سوات کے اخون صاحب کے جو تحریک نے پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے خلاف کیئے ۔ ۱۔ ہزہ کے غازی دلاسہ خان کا سکھوں کے خلاف جہاد ۔ بریلی کے مجاہدین کے معرکے جو ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ پر جا کر ختم ہوئے۔ اسی طرح امبیلہ اور بونیر کی اسلامی جنگیں جو سوات کے اخون صاحب کی سرکردگی میں ہوئی تھیں اور باجوڑ اور اسمار سے لے کر کیا کبل تک سبھی پشتون ان میں شریک تھے۔ ان میں قتل گڑہ کے معرکے کی رُوداد خصوصیت کے ساتھ اُن چار بیتوں کا ایک مقبول مضمون رہا ہے۔ اس طرح انگریزوں کے خلاف کابل، ڈکہ، اُرناوی، گداؤ ملاکنڈ، چکدرہ، کامرانی، تیراہ، یا ہڈے مُلا صاحب، چکنور کے مولوی اور عمرا خان کے جہادوں پر بہت سارے عمدہ، پر لطف اور زوردار چار بیتے اس دور کے شعراء نے کہے ہیں جو پشتو ادب کے اوراق میں محفوظ کئے گئے ہیں۔

غالباً جب فلسفۂ جہاد نے اِس علاقے کے غازیان سرفروش کو استعماریت کی راہ میں سنگ گراں بنا دیا تو انہی سیاسی شاطروں نے اُسی صدی میں جہاد کی روح کو کچلنے کی خاطر مفسدوں، فتنہ پردازوں اور دینِ اسلام میں رخنہ پیدا کرنے والوں کو اس پر مامور کیا کہ جس طرح بھی ہو اِس خطے کے لوگوں کی فطرت سے اِس قوت ایمانی کو نکال باہر کیا جائے۔ لیکن پشتو چار بیتہ نے ملّی طور پر اِس اسلامی اور ملّی جذبے کو مزید قوت بخشی۔

چار بیتہ کے علاوہ یہ کیفیت پشتو ٹپہ، مدلہ، غاڑے اور نیمکئی میں بھی عام ہوگئی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ اِس قسم کی شاعری سیاسی اسٹیج تک پہنچی اور سیاسی تحریکوں کو زندہ رکھنے اور انہیں ترقی دینے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اِسی طرح پشتو کے اِس دور کی عوامی شاعری نہ صرف یہ کہ پشتو ادب کا ایک دلچسپ باب رہی ہے۔ بلکہ یہ اِس خطے کی تاریخ، سیاست اور شخصیات کے بارے میں

بھی بہت معلومات فراہم کرتی ہے ۔ یہ فعال اور متحرک ادب کا ایک ایسا دور تھا کہ قلم اور کاغذ کی بجائے لوحِ حافظہ پر اس کا انحصار زیادہ تھا۔ اِس دور کے کئی شعراء مثلاً برہان اخون، نوردین اخون، گل محمد، احمد گل، حمید اخون، علی خان، مقصود گل، محمد دین، اکبر شاہ، نواب خان، نور شاہ علی، طالب گل، بابا داؤ، میاں عنوان الدین، عبداللہ اخون، غریبے، محمود، غازالدین، ارسلا اخون، عبدالغفار، عیسیٰ اخونزادہ، توکل، شاہ گل، ناصر، سکیا، گل محمد، ڈوڈیال والے، میرا فضل، علی خان اخون، امانت اخون، بہرام، برآمد، دوستم، عجم بنیری۔ حمید گل، مجید شاہ، میرا، باجی۔ میر عبداللہ۔ میاں رجب، محمد جی، محمد جان، پیر محمد، قاسم، سید احمد، سید کمال، یاسین، محمود جان۔ کریم۔ ظریف خان پشاوری، سراج منول والے۔ اور اسی عصر کے کئی اور شعراء نے عصری موضوعات مثلاً اسلامی جنگیں جو وسیع و عریض پشتونخوا میں پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے خلاف ہوئیں۔ اور ہر وہ جہاد جو کسی خاص تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ ان شعراء اور اساتذہ کے پُر لطف چار بیتوں کی برکت سے پشتونوں کے اِس دور کے تاریخی مہمات کے فخر و ناز کا باب بن گیا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کرنا چاہیئے کہ اِس دور کے شعراء کی نظر میں فقط یہی ایک موضوع تھا۔ یہ دراصل رزم و بزم ہر دو موضوعات کے وہ نامور شاعر تھے جو عوامی زبان میں اپنے عوام کے دل کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ انکی شاعری بہار کے اُن پھولوں کی مانند تھی جن سے باغ و راغ اور دشت و دمن سبھی رنگین ہوتے ہیں۔ یہ بیاضوں اور دواوین کی شاعری نہیں تھی۔ مگر روح پرور اور وجد آور ضرور تھی۔ اِس میں حُسن و عشق اور راز و نیاز کی باتیں بھی تھیں۔ اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی۔ اِس دور کے ٹوپی (نامی گاؤں) کے ایک شاعر سید عمر نے اپنے علاقے کے اکثر مقبول لوک گیت، ٹپے، غزلیں، چاربیتے، لوبے اور نیمکٹی وغیرہ "گلشن اشعار افغانی" کے نام سے جمع کیئے ہیں۔ اس مجموعے کا ایک حصہ قلمی اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس مجموعے سے اُس وقت کی عوامی شاعری کے معیار اور عوامی طبع کے میلان اور رجحان کا پورا پورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اگر ایک طرف یہ جنگی چار بیتوں اور نغموں کا زمانہ تھا جو جوش اور جذبے کو بیدار کرتے تھے، تو دوسری

طرف یہ رومان اور افسانے کے فروغ کا بھی دور تھا۔ ان سو سالوں میں پشتو مثنوی یا "بدلہ" نے جتنی وسعت پائی ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے چند سالوں میں پشتو مثنوی کی پینسٹھ سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں احمد، اکبر شاہ، گل احمد عبدالحمید۔ کانجو سوات کے محمد اکرم، گل محمد۔ عبدالکبیر۔ تنگی (اشنغر) کے عبدالرحمان، سید ابو علی شاہ۔ احمد قادری۔ تنگی اشنغر کے مولوی احمد۔ ملا احمد تیراہی۔ اڈے باجوڑ کے احمد گل۔ حاجی منظفر پشاوری۔ ملا بہادر۔ فیاض، فقیر محمد، شاہ فاضل۔ گل احمد بنوی، حیدر جان۔ ملا احمد، سید حسین۔ ملا نعمت اللہ۔ محمد عاصم۔ محمد اسمٰعیل خان ڈوڈیالی بو علی شاہ۔ صالح محمد اور سید عمر وہ شعرا ہیں جنہوں نے پشتون داستانیں لکھی ہیں۔ انکے تحریر کردہ منظوم افسانے۔ داستان اور جنگ نامے۔ حجروں کی محفلوں، ادبی مجلسوں اور گھروں میں بہت زیادہ شوق سے پڑھے اور سنے جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس دور کے پشتو ادب کے اصناف میں اگر ایک طرف چار بیتہ کو پروپیگنڈا کا ایک فعّال ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تو دوسری طرف بدلہ یا مثنوی کو معاشرتی اصلاح اور شخصی کردار کی تعمیر کے لئے بروئے کار لایا جاتا رہا۔

چھاپہ خانے کی آمد

برصغیر جنوبی ایشیا میں چھاپہ خانہ غالباً انگریزوں کے نو آبادیاتی عمل دخل کے ساتھ ہی آیا ہے۔ لیکن چونکہ انگریز مشرق اور جنوب کی طرف سے برصغیر میں داخل ہوئے تھے۔ اور پشتونخوا کی سرزمین، برصغیر پاک و ہند کے شمال مغرب کی جانب ایسے مقام پر تھی جو عملاً مرکزی ایشیا کے زمرے میں آتی تھی۔ اور تمام برصغیر کو عبور کرنے کے بعد ہی اس سرزمین کے لوگوں کے ساتھ اُن مغربی استعماریوں کا سامنا ممکن تھا۔ اس لحاظ سے چھاپہ خانہ کی آمد اور پشتونوں سے اس کا متعارف ہونا بھی اسی کیفیت کا حامل تھا۔ لیکن چونکہ مغلیہ دورِ حکومت کے زوال پذیر زمانہ میں بہت سے پشتون روہیل کھنڈ میں آباد ہوئے

تھے۔ اور برصغیر ہند میں انہوں نے جگہ جگہ اپنی مستقل ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ اس وجہ سے انگریزوں نے بہت پہلے سے ولایتِ روہ کی اہمیت محسوس کرلی تھی۔ اور پشتون قوم اور پشتو زبان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ بہت سے مستشرقین اور پادری اِس کام میں مشغول تھے۔ اس سلسلے میں انہی لوگوں کو اپنا جمع کردہ مواد شائع کرنے اور اپنے مذہبی عقائد کے پرچار کے لئے پشتو میں کتابیں چھاپنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور جس وقت انگریز ابھی آگرہ اور دہلی کے قرب و جوار میں اپنی عملداری کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اُنہی دنوں انکے مبلغین، واعظین اور پادریوں نے پشتو زبان میں انجیل مقدس کا ترجمہ سیرامپور کے پادریوں کی طرف سے ۱۸۱۸ء میں شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب پر سکھوں کی عملداری تھی اور انگریزی استعمار کے پھیلنے کا خطرہ ابھی پشتونوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ ایک طرف غفلت کا یہ عالم اور دوسری طرف وہ دور اندیشی!

یہ وہ دور تھا جس میں پہلے ہندو اور پھر سکھ رفتہ رفتہ کاروباری نفع اندوزی اور تجارتی لین دین میں انگریز کے ساتھ حصہ دار بن گئے اور انہوں نے تجارت کے نئے اُصولوں اور نئے راستوں پر گامزن ہونا شروع کیا۔ اور سرمایہ کاری اور صنعت کے مشینی دور میں آہستہ آہستہ داخل ہوگئے۔ اس طرح برصغیر کی دولت کے وسائل پر قبضہ کرنے یا ان میں حصہ دار بننے کے قابل ہوگئے۔

صنعتی دور کے اس ابتدائی زمانے میں تجارتی پیمانے پر چھاپہ خانے کا کاروبار بھی تھا بلکہ اسکے ذریعے سے وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنے عوام کی خدمت کرسکتے تھے پریس اور ذرائع ابلاغ پر قابض ہونیکے ساتھ ساتھ وہ اپنا نقطۂ نظر چاہے وہ سیاسی ہو۔ یا مذہبی، معاشی ہو۔ یا تمدنی نہایت آسانی کے ساتھ ہر کسی تک پہنچا سکتے تھے۔ اِن کا یہ عمل بعینہٖ "ہم خرما و ہم ثواب" کے مصداق تھا۔ اگر ایک طرف یہ نفع بخش تجارت اور سُود مند کاروبار تھا تو دوسری طرف اپنے ہر قسم کے مفادات کے تحفظ اور دوسروں کے حقوق کو پائمال کرنے اُنکے خلاف پروپیگنڈا کرنے یا اُنکے مابین نفاق اور نفرت پیدا کرنے کا یہ ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ القصد پریس پر قبضہ اُنیسویں صدی کے ہندوؤں کی ہندی مسلمانوں پر   پہلی معاشی، معاشرتی اور

سیاسی فتح تھی ۔

تاریخ کے اس ہنگامی دور میں پشتو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام بھی سب سے پہلے عیسائی مذہب کی تبلیغ کی غرض سے اور پھر رفتہ رفتہ تجارتی پیمانہ پر شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے جو دو کتابیں ۱۸۱۸ء میں چھپی تھیں اُنکے بارے میں بلوم ہارٹ (J. F. BLUMHERT) لکھتا ہے کہ ان میں پہلی کتاب انجیل مقدس کا ترجمہ تھا جو اصل سے پشتو میں ہوا تھا۔ اور پانچویں جلد یعنی عہد نامہ جدید پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ کتاب صرف ایک دفعہ شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتاب جو اسی سال سیرامپور کے پادریوں کی طرف سے شائع ہوئی وہ بھی عہد نامہ جدید کا ترجمہ تھا۔ کتاب کا نام تھا " خدا کی ساری باتیں کتاب مقدس اُس کا آخری حصہ" اسکے بعد ۱۸۲۴ء میں " عہد نامہ قدیم" جس کا نام مقدس کتاب تھا کا پہلا حصہ اسکے ساتھ چار حصے " موسیٰ کی توریت" الخ یہ کتاب بھی سیرام پور کے پادریوں نے شائع کی تھی ۔

بعد ازاں ۱۸۴۷ء تک پشتو میں کوئی اور کتاب شائع نہیں ہو سکی ۔ لیکن اچانک اُسی سال تجارتی پیمانے پر پشتو کتابوں کے چھاپنے کے کاروبار کا آغاز ہو گیا۔ اور قیام پاکستان سے پورے سو سال قبل پشتو میں پہلی بار دس مذہبی اور ادبی کتابیں شائع کی گئیں۔ ان میں بابو جان کی دعائے سُریانی، رحمان بابا کے دیوان سے انتخاب ۔ افضل خان خٹک کے علم خانہ دانش کا انتخاب اخون درویزہ کے " مخزن اسلام" کا کچھ حصہ۔ ڈورن کی کرسٹومیتھی کا انتخاب یوسف زلیخا (جو سینٹ پیٹرز برگ موجودہ لینن گراڈ سے شائع ہوا) مرزا خان انصاری کے دیوان سے انتخاب اور ڈورن کی کتاب میں عبیداللہ شاعر کی ایک غزل چھپ گئی۔ اسکے بعد پشتو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ایک دفعہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ اور ۱۸۶۰ء میں پھر ایک ہی سال میں اکیس[21] پشتو کتابیں ہندوستان کے مختلف چھاپہ خانوں سے چھپ کر نکل آئیں۔ اسکے بعد مطبوعہ کتابوں کے الگ الگ سالوں کا اندازہ کچھ یوں ہے ۔

سال اشاعت	تعداد مطبوعات	سال	تعداد	سال	تعداد	سال	تعداد
۱۸۱۸	۲	۱۸۷۱	۳	۱۸۷۹	۵	۱۸۸۷	۶
۱۸۲۴	۱	۱۸۷۲	۱۴	۱۸۸۰	۱۷	۱۸۸۸	۱۴
۱۸۴۷	۱۰	۱۸۷۳	۲	۱۸۸۱	۳۱	۱۸۸۹	۴
۱۸۶۰	۲۱	۱۸۷۴	۸	۱۸۸۲	۳۲	۱۸۹۰	۱۴
۱۸۶۲	۱۰	۱۸۷۵	۱۰	۱۸۸۳	۴۱	۱۸۹۱	۱۴
۱۸۶۵	۱	۱۸۷۶	۹	۱۸۸۴	۱۶	۱۸۹۲	۵
۱۸۶۹	۲	۱۸۷۷	۱۳	۱۸۸۵	۱۶		
۱۸۷۰	۳	۱۸۷۸	۱۲	۱۸۸۶	۱۰		

اس طرح ۱۸۱۸ء سے ۱۸۹۲ء تک ۷۴ سال میں ۳۰ سال ایسے ہیں جن میں پشتو زبان کی علمی ادبی اور مذہبی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں نثر کے مقابلے میں منظوم کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نظم میں مثنوی اور "بدلہ" پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ان میں قصے، افسانے، عشقیہ داستانیں جنگ نامے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اُنیسویں صدی میں جو مثنویاں وقتاً فوقتاً شائع کی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ	نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ
۱	داستان امیر حمزہ	احمد	۱۸۸۲	۵	نیرنگ عشق (قصہ شاہد و عزیز)	محمد اکرم	۱۸۸۲
۲	قصہ محبوبہ جلات			۶	قصہ پیرہ ذن	گل محمد نوری	۱۸۸۱
۳	قصہ شہزادہ رت پدمن	اکبر شاہ	۱۸۸۲	۷	قصہ لقمان حکیم	عبدالکبیر	۱۸۸۲
۴	قصہ دگدا افغانی	عبدالحمید	۱۸۸۲	۸	قصہ یوسف زلیخا	عبدالقادر خان	۱۸۷۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ
۹	داستان گربہ وموش	علارحمان تنگی	۱۸۸۰
۱۰	قصہ قیس ولیلی مشہور بہ لیلی مجنون	ابو علیشاہ	۱۸۸۲
۱۱	قصہ بختیار ابن شاہ ایران	سید ابو علیشاہ	۱۸۸۱
۱۲	قصہ الیپ خان حکیم زنش)	میجر راورٹی	۱۸۷۱
۱۳	داستان امیر حمزہ معہ قصہ بلقیس زوجہ سلیمان	احمد	۱۸۸۲
۱۴	غل قاضی (چور اور قاضی)	احمد	۱۸۷۱
۱۵	قصہ گنبد (افغانی)	احمد	۱۸۸۲
۱۶	قصہ منصور حلاج معہ حکایت	سلطان محمود غزنوی	۱۸۷۸
۱۷	قصہ ابراہیم[1]	احمد	۱۸۸۲
۱۸	سیف الملوک	احمد	۱۸۸۲
۱۹	طوطی نامہ	محمد احمد قادری	۱۸۸۳
۲۰	قصہ آدم درخانئ	مولوی احمد تنگی	۱۸۷۲
۲۱	قصہ شہزادہ بینظیر و بدر منیر	ملا احمد تبریزی	۱۸۸۲
۲۲	قصہ بہرام و گل اندام	"	۱۸۹۰
۲۳	قصہ گل بکاؤلی	"	۱۸۸۱
۲۴	گلشن راحت یعنی گل بکاؤلی معہ تصویرات	"	۱۸۹۰
۲۵	جمجمہ (افغانی)	"	۱۸۷۷

نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ
۲۶	قصہ جمجمہ بادشاہ	ملا احمد تیراہی	۱۸۸۱
۲۷	جمجمہ (تیسری اشاعت)	"	۱۸۸۷
۲۸	جمجمہ (چوتھی اشاعت)	"	۱۸۷۸
۲۹	لیلی مجنون (افغانی)	"	۱۸۸۸
۳۰	قصہ کوتوال بزبان افغانی	احمد گل بڑے	۱۸۸۳
۳۱	قصہ آدم خان درخانئ	اکبر شاہ	۱۸۸۰
۳۲	قصہ محبوب با حیلات مشہور بہ مسلم خونکار	حاجی مظفر شاہ	۱۸۸۲
۳۳	حملہ حیدری	حاجی مظفر شاہ	۱۸۸۰
۳۴	جنگ نامہ زقوم		۱۸۸۰
۳۵	قصہ تمیم انصاری	ملا بہادر	۱۸۸۱
۳۶	من کتاب عیار دانش، آغاز داستان نثر رائے دابشلیم حکیم بیدپائے	افضل خان خٹک	
۳۷	کلیلہ دمنہ یا عالم خانہ دانش سے ماخوذ	"	
۳۸	قصہ شہزادہ بہرام و گل اندام	فیاض	۱۸۸۱
۳۹	قصہ شہزادہ بہرام و گل اندام (دوسری اشاعت)	"	۱۸۸۱
۴۰	قصہ شہزادہ بہرام و گل اندام (تیسری اشاعت)	"	۱۸۸۲
۴۱	قصہ شہزادہ بہرام و گل اندام (چوتھی اشاعت)	"	۱۸۹۰
۴۲	جنگ نامہ میر ختم	فقیر محمد	۱۸۸۲

[1] اسے مثنوی احمد بھی کہتے ہیں۔

نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ
۴۳	قصۂ گنبد شہزادی پشاور	شاہ افضل	۱۸۸۶
۴۴	گل بکاؤلی افغانی (جدید)		۱۸۸۴
۴۵	قصہ چہار یار	گل احمد بجگی پشاوری	۱۸۸۱
۴۶	قصہ شاہ روم (افغانی)	″	۱۸۸۱
۴۷	قصہ طوطی مینا	″	۱۸۷۹
۴۸	قصہ حاتم بن طے	حیدخان	۱۸۷۳
۴۹	قصہ یوسف زلیخا		
۵۰	جنگ نامہ امامین	سید حسین	۱۸۷۷
۵۱	جنگ نامہ امامین (اشاعت دوم)	″	۱۸۸۱
۵۲	جنگ نامہ امامین (اشاعت سوم)	″	۱۸۸۸
۵۳	جواہر الانبیاء معروف بہ قصص الانبیاء تصنیف مولوی احمد بجگی		
۵۴	قصص الانبیاء کلاں	ملا نعمت اللہ	۱۸۹۲
۵۵	قصہ یوسف زلیخا	عبد القادر خان خٹک	۱۸۷۷
۵۶	″ ″ زیر حاشیہ بدر منیر	ملا احمد	۱۸۸۲
۵۷	متن کتاب یوسف زلیخا	عبد القادر خان خٹک	۱۸۷۷
۵۸	قصہ بافندگان و چہار یار	محمود گل احمد	۱۸۸۱
۵۹	قصہ نیمبولا	مقصود گل	۱۸۸۵
۶۰	محمد عالم	قصہ لیلیٰ مجنوں	۱۸۸۸
۶۱	قصہ برنی بزبان افغانی	محمد اسمٰعیل (دوڈیالوی)	۱۸۸۳

نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ
۶۲	حملہ حیدری معروف بہ جنگنامہ علی رض	حاجی مظفر پشاوری	۱۸۸۴
۶۳	قصہ شاہجہان شہزادہ ملتان و ماہ جبین گلفام	″	۱۸۸۴
۶۴	قصہ فتح خان قندہاری بالتصویر	ملا نعمت اللہ	۱۸۸۶
۶۵	قصہ نیمبولا افغانی	″	۱۸۸۵
۶۶	قصہ شیرین و فرہاد افغانی بالتصویر	″	۱۸۸۸
۶۷	قصہ گل صنوبر افغانی	طالب رشید	نامعلوم
۶۸	حکایات رسول پاک صلعم	مولوی صالح محمد	۱۸۷۴
۶۹	قصہ شہزادہ بہرام گور و پری حسن بانو	سید عمر ٹوپی	۱۸۸۴

ان کے علاوہ نور نامہ غلام محمد۔ عقائد المؤمنین عبد الوہاب صاحب مانکی۔ مناقب سوات ولی محمد پچ حضرو قصیدہ بُردہ شریف جس میں تینوں الگ الگ مؤلفین کا متن موجود ہے۔ ایک عبد القادر خان خٹک دوسرا اشرف اخون اور تیسرا عماد الدین خٹک کا ہے پہلے دو متن کے ہر ایک کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تیسرے کا متن مسدس ہے۔ جمجمۂ افغانی ایک مثنوی ملا احمد تنگی نے بھی تحریر کی ہے جو انیسویں صدی عیسوی میں طبع ہو چکی ہوں۔ حضرت میاں عمر صاحب کی کتاب توضیح المعانی

بھی اُسی زمانے میں شائع کی گئی ان کتابوں میں جن خصوصی موضوعات پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔

شمارہ	موضوع	تعداد	شمارہ	موضوع	تعداد
۱	علم نجوم اور غیب گوئی	۲	۸	نظمیات (عمومی شعروشاعری)	۲۴
۲	انتخاب نظم ونثر	۱۵	۹	تاریخی نظمیں	۴
۳	تاریخ وسوانح	۵	۱۰	مذہبی نظمیں	۴۳
۴	فقہ وقانون	۱	۱۱	عیسائیت کی مذہبی کتابیں	۸
۵	خطوط نویسی	۱	۱۲	اسلامی کتابیں	۴۹
۶	طب	۴	۱۳	قصے (نثر میں)	۱۴
۷	منتخب منظوم کلام	۳	۱۴	قصے (نظم میں)	۴۷

یہ تمام کتابیں انگلستان کے مشہور عجائب خانے برٹش میوزیم کے کتب خانے کی پشتو کتابوں کی اُس فہرست میں مذکور ہیں جو جیمز ایف بلوم ہارٹ نے ۱۸۹۳ء میں مرتب کی ہے۔ اسکے بعد اس صدی کے باقی سات سالوں میں پشتو کی مطبوعہ کتابوں کا حساب معلوم نہیں۔ مذکورہ پشتو مثنویوں کے علاوہ جو درسی، ادبی اور مذہبی کتابیں ان تیس سالوں میں شائع کی گئی ہیں انکے نام یہ ہیں۔

شمارہ	نام کتاب	مصنف	سنہ
۱	دعائے سریانی	مطبوعہ دہلی	۱۸۷۷
۲	کنزالدقائق افغانی	″	۱۸۸۴
۳	ہزار مسائل	″	۱۸۷۶
۴	ہزار مسائل	″	۱۸۸۱
۵	ہزار مسائل	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۶
۶	مجربات افغانی (ترجمہ طب شہابی)		۱۸۸۳
۷	قواعد تجوید		۱۸۷۸
۸	چہل حدیث		۱۸۹۱

شمارہ	نام کتاب	مصنف	سنہ
۹	دیوان عبدالحمید	مطبوعہ بمبئی	۱۸۷۸
۱۰	دُرّ و مرجان، گلشن روہ کا حصہ	میجر راورٹی	۱۸۶۰
۱۱	POEMS OF ABDUL HAMID عبدالحمید کی نظمیں مع ترجمہ انگریزی	میجر راورٹی	۱۸۶۲
۱۲	دُر مجالس افغانی		۱۸۸۰
۱۳	دفع الفقر	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۱
۱۴	معجزات	"	۱۸۷۸
۱۵	معجزات	"	۱۸۸۰
۱۶	مناجات حافظ عبدالکبیر (مناجاتی بابا گلہ)		
۱۷	فوائد شریعت		۱۸۸۰
۱۸	مناجات عبدالکریم		۱۸۸۵
۱۹	ہفت ہیکل		۱۸۷۸
۲۰	نصیحت البیان		۱۸۷۸
۲۱	مقدمہ جذری		۱۸۷۸
۲۲	ترجمہ دقائق الاخبار المعروف بہ ترسنامہ افغانی	مطبوعہ دہلی	
۲۳	سیر السالکین		۱۸۷۷
۲۴	من دیوان عبدالرحمان ڈورن کرسٹو میتھی مطبوعہ سینٹ پیٹرز برگ		۱۸۷۷
۲۵	دیوان عبدالرحمان	مطبوعہ پشاور	۱۸۷۷

شمارہ	نام کتاب	مصنف	سنہ
۲۶	دیوان عبدالرحمان	مطبوعہ بمبئی	۱۸۸۳
۲۷	دیوان عبدالرحمان	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۲۸	دیوان عبدالرحمان (انتخاب گلشن روہ)		۱۸۶۰
۲۹	پوئمز آف عبدالرحمان مع انگریزی ترجمہ راورٹی		۱۸۶۲
	SELECTION FROM THE POETRY OF AFGHANS		
۳۰	انتخاب دیوان عبدالرحمان ٹی پی ہیوز (کلید افغانی)		۱۸۷۳
۳۱	کنز المصلی (نماز مترجم)	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۰
۳۲	رشید البیان	مطبوعہ پشاور	۱۸۷۷
۳۳	رشید البیان	"	۱۸۷۶
۳۴	رشید البیان	مطبوعہ بمبئی	۱۸۸۳
۳۵	رشید البیان	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۳۶	انیس الواعظین (افغانی)	"	۱۸۹۱
۳۷	انتخاب تاریخ مرصع	راورٹی	۱۸۶۰
۳۸	انتخاب تاریخ مرصع	پادری ہیوز	۱۸۷۲
۳۹	انیس الواعظین افغانی		۱۸۹۱
۴۰	خواب نامہ مع فالنامہ	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۴۱	" "	"	"
۴۲	مناجات رسولؐ		۱۸۸۳

شمارہ	نام کتاب	مصنف	سنہ
۴۳	مناجات صاحب سوات		۱۸۸۳
۴۴	ناصر المحسنین فی وفات سید المرسلین	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۸
۴۵	نور نامہ	مطبوعہ بمبئی	۱۸۹۰
۴۶	نور نامہ سرور کائنات	مطبوعہ دہلی	۱۸۹۲
۴۷	قیامت نامہ افغانی	"	۱۸۷۹
۴۸	پہلی افغانی	"	۱۸۸۵
۴۹	دوسری افغانی	"	۱۸۸۵
۵۰	تاریخ سلطان محمود غزنوی		۱۸۷۴
۵۱	دُرِّ مرجان تحریر مولوی احمد تنگی بفرمائش پادری ہیوز	مطبوعہ پشاور	۱۸۷۴
۵۲	دُرِّ مرجان اشاعت دوم		۱۸۷۴
۵۳	گنج پشتو		۱۸۷۲
۵۴	گنج پشتو مع مختصر لغت نامہ پادری ہیوز	مطبوعہ لندن	۱۸۸۴
۵۵	مشکلات الفقہ معروف بہ خیرات الفقہ	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۷
۵۶	مشکلات الفقہ مذکور بار دوم		۱۸۸۸
۵۷	قدوری	مطبوعہ دہلی	۱۸۸۵
۵۸	قدوری ترجمہ افغانی	"	۱۸۸۸
۵۹	انتخاب از دیوان احمد شاہ ابدالی دُرِّ دُرّان از میجر راورٹی گلشن روہ		۱۸۶۰

شمارہ	نام کتاب	مصنف	سنہ
۶۰	نور نامہ ملا اکرم اخون	مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۶۱	وصیت نامہ حضرت علیؓ		۱۸۸۰
۶۲	الف نامہ		۱۸۹۱
۶۳	غزلیات اخون علی خان		۱۸۸۶
۶۴	مناجات اخون علی خان تمہ فوائد شریعت		۱۸۸۷
۶۵	مناجات امیر صاحب "		
۶۶	شمائل آنحضرتؐ (ر پنج گوہر)		
۶۷	انتخاب از دیوان اشرف خان ہجری راورٹی در گلشن روہ		
۶۸	انتخاب از کلام بابو جان میجر راورٹی در گلشن روہ		
۶۹	انجیل مقدس	مطبوعہ سیرامپور	۱۸۱۸
۷۰	کلام اللہ یعنی کتب عہد قدیم وجدید	مطبوعہ لندن	۱۸۹۰-۱۸۹۱
۷۱	کتاب مقدس حصہ اول مع چار ابواب تورات موسیٰ الخ	مطبوعہ سیرامپور	۱۸۲۴
۷۲	اللہ تعالیٰ کی ساری باتیں آخری حصہ		
	کتاب مقدس مطبوعہ سیرامپور		۱۸۱۸
۷۳	زبور داؤد مطبوعہ ہارٹ فورڈ لندن		۱۸۸۲

شمارہ	نام کتاب	سنہ
۷۴	تعلیم حضرت موسیٰؑ مطبوعہ لاہور	۱۸۸۴
۷۵	انتخاب از کلام خوشحال خان و ترجمہ سی ای بڈلف	۱۸۹۰
۷۶	سیر السالکین ترجمہ ٹی جی ال ماٹرو عبدالرحمان مطبوعہ امرتسر	۱۸۷۷
۷۷	چمن بینظیر۔ کلید افغانی میں پادری ہیوز نے پشتو شعراء کے کلام سے انتخاب پیش کیا	۱۸۷۲
۷۸	ابنیت حضرت علیؓ مطبوعہ پشاور	۱۸۶۰
۷۹	مخزن الاسلام اخون درویزہ م دہلی	۱۸۸۵
۸۰	مخزن پشتو سے ڈورن کی کرسٹو میتھی میں صفحہ ۴۲ سے ۸۷ تک مطبوعہ سینٹ پیٹرز برگ	
۸۱	گلشن روہ میں انتخاب راورٹی مخزن صفحہ ۱۳۳ سے ۱۵۰ تک	۱۸۶۰
۸۲	شرائط و احکام ایمان	۱۸۸۵
۸۳	ڈورن کی کرسٹو میتھی	۱۸۴۷
۸۴	فوائد بو علی سینا	۱۸۸۳
۸۵	شرح اسماء الحسنیٰ	۱۸۸۴
۸۶	کیمیائے سعادت	۱۸۸۴

شمارہ	نام کتاب	سنہ
۸۷	وفات نامہ کلاں افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۱
۸۸	عقد النجات و میثاق الحیات مطبوعہ پشاور	۱۸۷۲
۸۹	مناجات اخون گدا	۱۸۸۰
۹۰	تفسیر والضحیٰ	۱۸۸۰
۹۱	لویہ ربڑا معراجنامہ	۱۸۸۳
۹۲	لویہ (بڑا) معراجنامہ وڑہ (چھوٹا) معراجنامہ مطبوعہ دہلی	۱۸۸۴
۹۳	معراج نامہ نبویؐ مطبوعہ دہلی	۱۸۸۶
۹۴	جنت النعیم	۱۸۸۳
۹۵	پشتو بات چیت	
۹۶	مناجات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	۱۸۸۷
۹۷	مناجات پیر صاحبؒ	۱۸۸۳
۹۸	مناجات پیر صاحبؒ و مناجات صاحب سوات	۱۸۹۲
۹۹	جواہر الانبیاء	۱۸۸۴
۱۰۰	نصیحت نامہ ملا گل احمد	۱۸۸۱
۱۰۱	رسالہ ردّ وہابی	۱۸۸۸
۱۰۲	منہاج العابدین افغانی	۱۸۸۹
۱۰۳	ذخیرۃ القراء	۱۸۷۸
۱۰۴	کلام اللہ پشتو ترجمہ انجیل شریف ٹی جے ال ماٹر و ڈبلیو جوکس	۱۸۹۰

شمارہ	نام کتاب	سنہ
۱۰۵	گلزار افغانی مطبوعہ امرتسر	۱۸۷۸
۱۰۶	کلید افغانی پادری ہیوز مطبوعہ پشاور	۱۸۷۲
۱۰۷		
۱۰۸	انشاء پشتو پادری ہیوز در کلید افغانی	۱۸۷۲
۱۰۹	جواہر الانبیاء معروف بہ قصص الانبیاء مطبوعہ دہلی	۱۸۸۴
۱۱۰	قصص الانبیاء کلان معروف بہ جواہر الانبیاء مطبوعہ دہلی	۱۸۹۲
۱۱۱	شرح ابیات شرح ملا جامی بزبان افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۱۱۲	پشتو بات چیت مطبوعہ لاہور	۱۸۹۱
۱۱۳	جنت الفردوس برحاشیہ معراج نامہ کلان مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۱۴	ترجمہ دقائق الاخبار	۱۸۸۱
۱۱۵	فتاوی تحفۃ الحانی الخ مطبوعہ دہلی	۱۸۸۵
۱۱۶	فوائد شریعت در کرسٹو میتھی ڈورن	۱۸۴۷ / ۱۴۸-۷۹
۱۱۷	انتخاب فوائد شریعت در گلشن روہ راورٹی	۱۸۶۰ / ۵۵ تا ۷۹
۱۱۸	دیوان محمد کاظم خان شیدا در گلشن روہ راورٹی	۱۸۶۰ / ۱۳۲ تا ۱۴۸
۱۱۹	فوائد شریعت مطبوعہ دہلی	۱۸۸۷
۱۲۰	سلسلہ افغانی د شجرہ نسب سلطان بابر مطبوعہ لاہور	۱۸۸۷
۱۲۱	دیوان خوشحال خان خٹک مطبوعہ پشاور	۷۰ - ۱۸۶۹
۱۲۲	انتخاب از دیوان خوشحال خان خٹک راورٹی صفحہ ۳۱ تا ۷۲	۱۸۶۰
۱۲۳	انتخاب دیوان خوشحال خان خٹک پادری ہیوز در کلید افغانی صفحہ ۳۲۹ تا ۳۶۰	۱۸۷۲
۱۲۴	تفسیر یسیر بزبان افغانی اول سورہ سے اٹھارویں سورہ تک	
۱۲۵	تفسیر بے نظیر پشتو ترجمہ یوسف جرخی سورہ ۶۷ تا ۱۱۴ سورہ	
۱۲۶	تفسیر یسیر افغانی - نسب نامہ رسولؐ تواریخ بیت اللہ و مدینہ قصہ ابراہیمؑ قصہ لقمان حکیم مطبوعہ دہلی	۱۸۸۲
۱۲۷	تفسیر والضحیٰ بزبان افغانی وصیت نامہ حضرت علیؓ معراج نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطبوعہ دہلی	۱۸۸۰
۱۲۸	قانون القراء مطبوعہ دہلی	۱۸۸۵
۱۲۹	ذخیرۃ القراء در متن و برحاشیہ قواعد تجوید مطبوعہ دہلی	۱۸۷۸

شمارہ	نام کتاب	سنہ
۱۳۰	معجزات کلان افغانی	۱۸۸۱
۱۳۱	خلاصہ کیدانی مع ترجمہ افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۳۲	خلاصہ مع شرح میر ترجمہ افغانی کے ساتھ ۔ مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۱۳۳	خلاصہ کیدانی با ترجمہ افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۱۳۴	خلاصہ افغانی مع مناجات پیر صاحب مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۳۵	مجموعۂ مناجات مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۳۶	مجموعہ مناقب میاں محمد عمر صاحب چمکنی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۲
۱۳۷	از دیوان خواجہ محمد بنگش داوڑی کے گلشن روہ میں	۱۸۶۰
۱۳۸	منہاج العابدین افغانی مطبوعہ بمبئی	۱۸۸۹
۱۳۹	مقدمہ جذری بزبان افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۷۸
۱۴۰	قصیدہ بردہ افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۴۱	افغانی کی پہلی کتاب المعروف بہ چمنستان مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳

شمارہ	نام کتاب	سنہ
۱۴۲	ارشاد العباد الی سبیل الرشاد شرح تطہیر الاعتقاد من ادران الالحاد مطبوعہ لاہور	۱۸۷۷
۱۴۳	آئینۂ الفاظ و معانی مطبوعہ ایبٹ آباد	۱۸۸۳
۱۴۴	گفتگو افغانی یا ترجمہ ہندوستانی مطبوعہ ایبٹ آباد	۱۸۸۳
۱۴۵	سوال وجواب افغانی مطبوعہ لاہور	۱۸۹۰
۱۴۶	روضۃ النعیم افغانی مطبوعہ لاہور	۱۸۸۸
۱۴۷	مجربات اکسیر الطب افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۷
۱۴۸	شرح ابیات مستخلص الخ مطبوعہ پشاور	۱۸۷۶
۱۴۹	مناجات شیخ عمر صاحبؒ	۱۸۸۱
۱۵۰	مناجات مطیع اللہ صاحب	۱۸۷۴
۱۵۱	مجموعہ مناجات	۱۸۸۳
۱۵۲	جنت النعیم المشہور بہ پختہ ڈوڈئی (پکی روٹی) مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۵۳	ترجمہ نماز	۱۸۷۹
۱۵۴	نماز مترجم ... کنز المصلی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۲
۱۵۵	قصص الانبیاء کلاں	۱۸۹۲
۱۵۶	آداب النساء ۔ اکساب النساء مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۱۵۷	مجمع الاکساب افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۳
۱۵۸	افغانی کی پہلی کتاب مطبوعہ امرتسر	۱۸۸۹
۱۵۹	افغانی جنڈا (پرچم) اشاعت دوم مطبوعہ پشاور	۱۸۶۹

شمارہ	نام کتاب	سنہ	شمارہ	نام کتاب	سنہ
۱۶۰	دیوان پیر محمد قندہاری مطبوعہ دہلی	۱۸۸۵	۱۶۴	چہل حدیث مترجم المسمی بہ وثیقۃ الآخرہ مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۱۶۱	منیتہ المصلی یا ترجمہ افغانی مطبوعہ دہلی	۱۸۸۵	۱۶۵	فراق نامہ	۱۸۸۰
۱۶۲	صد وسی [۱۳۰] مسئلہ	۱۸۷۴	۱۶۶	نور نامہ ملا اکرم اخون مطبوعہ دہلی	۱۸۹۱
۱۶۳	کتاب الدر النظم فی احوال علوم التعلیم مطبوعہ پشاور	۱۸۶۰			

یہ تمام دوسو بیس کتابیں ہیں جن میں بعض کئی دفعہ طبع ہو کر شائع کی گئی ہیں مذکورہ اعداد و شمار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انیسویں صدی ہر چند کہ زوال اور انحطاط کا زمانہ تھا پھر بھی اُن دنوں لوگوں میں اپنی مادری زبان پشتو میں علم و ادب کا شوق اچھا خاصا تھا۔ یہی سبب تھا کہ کاروباری مطبعوں نے پشتو کی کتابیں بڑے شوق سے شائع کیں۔

"جدید پشتو نثر کا آغاز"

ان کتابوں کے موضوعات سے یہ بات عیاں ہے کہ اُس زمانے میں ابھی جدید علوم کی طرف میلان اور رغبت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں پشتو ادب میں نہ تو اس وقت تک جدید نثر نگاری کی ابتدا ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اس میں افسانہ، ناول یا ڈرامہ متعارف ہوئے تھے۔ البتہ ایک آدھ کتاب ایسی ملتی ہے کہ اُس رجحان کی غمازی کرتی ہے جیسے کہ مولوی احمد کی کتاب "گنج پشتو" راورٹی کا قصہ د ایسپ الحکیم۔ یا سلطان محمود غزنوی کی تاریخ۔ ڈاکٹر سید خیال بخاری، میجر راورٹی کی اس کتاب کو نئے دور کی پشتو نثر کی پہلی کتاب خیال کرتے ہیں۔ یہ پادری جیمز کے ایسپ فیبلز نامی کتاب کا پشتو ترجمہ ہے مترجم راورٹی مغربی انداز میں اِس کتاب کا سادہ اور رواں ترجمہ کرنا چاہتے تھے اور اُس میں کسی حد تک کامیاب

بھی ہوئے ہیں دوسری کتاب گنج پشتو مولوی احمد نے پادری ہیوز کے لئے لکھی ہے ۔ جو انکی کلید افغانی میں بھی شامل کی گئی ہے ۔ " گنج پشتو " پُر لطف اور سبق آموز قصوں کا ایک دلچسپ نمونہ ہے جو پشتو کے روزمرہ اور محاورہ میں سادہ آسان اور رواں انداز میں لکھی گئی ہے جناب خیال بخاری کہتے ہیں کہ غالباً مولوی احمد نے نثر نگاری کا یہ انداز پادری ہیوز یا اپنے دوسرے یورپین شاگردوں کی وساطت سے انگریزی ادب کے ساتھ متعارف ہونے کے بعد اختیار کیا تھا ، یہ کتاب ۱۸۷۵ء میں انگریزی میں ترجمہ ہوئی ۔ مولوی احمد کی ایک اور نثری کتاب جسے سلطان محمود غزنوی کی تاریخ کہا جاتا ہے تاریخ فرشتہ کے ایک حصے کا ترجمہ ہے ۔ یہ کتاب بھی پشتو کی جدید نثر نگاری کی ایک ابتدائی شکل ہے جس کا انداز بیان کلاسیکی پشتو نثر کی کتابوں یعنی بایزید انصاری کی خیر البیان ، اخون درویزہ کی مخزن افضل خان خٹک کی تاریخ مرصع اور اخون قاسم کی فوائد شریعت سے مختلف ہے ۔ مولوی احمد کے بعد نثر نگاری کی اس طرز کو منشی احمد جان نے مزید ترقی دی ۔ وہ پشتو نثر کی دو مشہور کتابوں " ھغہ دغہ " اور " د قصہ خوانئ گپ " کے مصنف ہیں ان دونوں کتابوں میں جدید نثر نگاری کے خواص بہت نمایاں ہیں ۔ پشتو ادب میں طنز و مزاح کی ابتدا بھی انہی کتابوں سے ہوئی ہے ۔ " د قصہ خوانئ گپ " ۱۸۹۱ء میں لندن میں چھپی ۔ خان بہادر منشی احمد جان بھی ' مولوی احمد کیطرح انگریزوں اور اہل یورپ کے پشتو زبان کے اُستاد تھے ۔ اکثر تذکرہ نگار ان کا شمار بیسویں صدی کے مصنفین میں کرتے ہیں ۔ انہوں نے کرنل میلس کی تاریخ افغانستان کا پشتو ترجمہ بھی کیا ہے ۔ اس کتاب کی نثر بھی خاصی آسان اور رواں ہے ۔ طرز بیان ایسا ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا ۔ ایک افغان تذکرہ نگار صدیق اللہ خان رشتین نے مولوی احمد اور منشی احمد جان دونوں کو ایک ہی سمجھ رکھا ہے اس لئے مولوی احمد کی تمام تصانیف بھی منشی احمد جان کے کھاتے میں ڈال دی ہیں اور یوں اسے پشتو کی جدید نثر نگاری کا بانی خیال کیا ہے ۔ مزید برآں مولوی احمد کی ایک مشہور نظم " زبان " کو بھی منشی احمد جان کا کلام سمجھ لیا ہے اور اپنی کتاب میں اُن کا کلام نمونے کے طور پر پیش کیا ہے ۔

جدید نثر نگاری کے پیشواؤں میں شمس العلماء میر احمد شاہ رضوانی کا نام بھی خاص اہمیت رکھتا

ہے ۔ غالباً "پشتونخوا" میں یہ پہلے عالم تھے ۔ جنہیں اُنکے تبحّرِ علمی کی وجہ سے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا تھا ۔ انہوں نے اگر ایک طرف اپنی دو کتابوں "شکرستان" اور "بہارستان" میں قدیم اور جدید نظم و نثر کے نمونے دیئے ہیں تو دوسری طرف خود بھی سادہ اور روان نثر کا انداز اپنا لیا ہے ۔ اور اسمیں اچھے اور عمدہ مضامین لکھے انمیں بعض مزاحیہ انداز میں بھی تھے ۔ ڈاکٹر خیال بخاری لکھتے ہیں کہ
" اس لحاظ سے رضوانی نے منشی احمد جان سے بھی پہلے پشتو میں مزاحیہ طرزِ نگارش کا اُسلوب اپنا لیا تھا ۔"

غرضیکہ تنگی کا مولوی احمد پہلا آدمی تھا جس نے پشتو نثر کو قافیہ اور سجع کے سقم اور عربی فارسی الفاظ کے تکلف سے آزاد کیا ۔ اور اسے ایک نئی نہج پر ڈالدیا ۔ انہوں نے فطری انداز میں رواں سادہ نثر اور روزمرہ کے محاورے کے استعمال کو رواج دیا ۔ مولوی احمد کی نثر نگاری کے اس اسلوب میں رضوانی نے مزاح کی ملاحت کا اضافہ کیا ۔ اور یوں پشتو نثر نے جدید راہ اختیار کرلی ۔

پشتو زبان کا ادب اس وقت تک اپنی قدیمی روایات کا پابند تھا ۔ یہ زبان فارسی اور عربی کی کلاسیکی ادبیات سے اس قدر زیادہ متأثر ہوتی تھی ۔ کہ اس کی نظم و نثر دونوں انہی روایات کی پابند ہو چکی تھیں ۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری عشرے میں جب پنجاب پر سکھوں کی عملداری کا قلع قمع کیا گیا اور برطانوی تسلط نے اُس کی جگہ لے لی ۔ اور سارے کا سارا جنوبی ایشیا نوآبادیاتی نظام کی غلامی میں آگیا ۔ تو ہند اور دکن کے راستے ایک بار پھر کھل گئے ۔ اور پشتون طلباء برِ صغیر کے مدارس، مکتبوں اور جدید علمی درسگاہوں میں داخل ہونا شروع ہوگئے ۔ اس زمانے میں کلکتہ سے لے کر دہلی اور لاہور تک ہر بڑے شہر میں انگریزی اسکول اور کالج قائم ہو چکے تھے ۔ بہت سے لوگوں نے یورپ خصوصاً برطانیہ کے اعلیٰ تعلیمی مراکز جیسے آکسفورڈ، کیمبرج اور لندن کی یونیورسٹیوں میں حصولِ تعلیم کے بعد جدید علوم کی سندیں حاصل کی تھیں ۔ دکن اور شمالی ہند کے ماحول میں اسکے زیرِ اثر ایک نئے سیاسی شعور اور عمومی بیداری نے انگڑائی لینی شروع کی تھی ۔ اور زندگی کے ہر میدان میں ہندو، مسلمانوں سے آگے تھے ۔ لیکن ہندی مسلمانوں نے بھی آہستہ آہستہ اپنی راہ متعین کرنی شروع کی تھی ۔ ویسے بھی بحیثیت مجموعی بالواسطہ یا بلاواسطہ برصغیر کے عوام پر جدید مغربی علوم کا اثر جاری تھا ۔ مغربی سیاسی طرزِ فکر، آئین و قانون کے معاشرتی اور تمدنی اثرات انگریز حاکمیت کے زیرِ سایہ جنوبی ایشیا

کے ماحول میں داخل ہوئے تھے۔ پریس اور نشر و اشاعت کے فروغ کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے دفتری اور کاروباری غلبے نے آہستہ آہستہ فارسی کو اُس کی درباری حیثیت سے محروم کر دیا تھا۔

ملازمت پیشہ افراد بڑے بڑے کاروباری اداروں میں کام کرنے والوں اور وکلا نے اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنیکی خاطر انگریزی زبان کا ادب اور قانون سیکھنا اپنے لئے لازمی سمجھا تھا اور جب انگریزی زبان ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنی تو برِصغیر پاکستان اور ہند کے ہر علاقے کے طلبا جو ایسے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے وہ تمام مغربی علوم اور ادبیات سے آشنا ہو گئے۔ قدرتی طور پر اس کا اثر ملکی زبانوں کی ادبیات پر بھی لازماً ہونا تھا۔

جب ہندی مسلمانوں کی زیادہ تر آبادی فارسی کی بجائے اپنی مقامی زبان اُردو کی طرف راغب ہوئی اور چونکہ یہی زبان اُنکے تلی بندھن اور علم و ادب کی ترویج کے لئے موزون بھی تھی۔ تو اس لحاظ سے انیسویں صدی کے اس دوسرے حصے میں مسلمانوں کی ادبیات کی تجدید کا اولین سنگ بنیاد بھی اسی زبان میں رکھا گیا۔ اور ہندی مسلمانوں کے نوزائیدہ احساسات کی ترجمانی سب سے پہلے اُردو میں شروع ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندی مسلمانوں کی زندگی نئے حالات سے دوچار ہوئی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول[۱]: "جس وقت ان حالات کے نتیجے میں نئے احساسات نے انگڑائی لی، شعور نے آنکھیں کھولیں۔ اور نئے نئے معاملات اور مسائل پیدا ہوئے تو ایک نئی دُنیا کے نئے نظام کے ساتھ ساتھ ایک نئے معاشرے کی داغ بیل ڈالی گئی اور ایک نئی تہذیب کے جنم لینے کے آثار ظاہر ہوئے۔"

یہ تبدیلی ہندی مسلمانوں کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی تھی جس نے زندگی کے ہر شعبے کو ایک نیا رنگ اور نیا روپ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اُردو نظم و نثر بھی اس جدیدیت سے نہ بچ سکی۔ اس لئے شعر و شاعری کے موضوعات بھی بدل گئے۔ پھر ان موضوعات کی ترجمانی کے لئے نئے سانچے اور نئی طرزیں بنائی گئیں۔

---

[۱] جدید اردو شاعری صفحہ ۱۲

موصوف آگے لکھتے ہیں کہ "اِس تبدیلی کی اولین نشانیاں انجمن پنجاب کے اُن مشاعروں میں دیکھی جا سکتی ہیں جو اس غرض سے لاہور میں منعقد ہوا کرتے تھے اور حالی اور آزاد اُنکی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ اِن مشاعروں میں مصرعہ طرح کی بجائے نظموں کے لئے عنوان پیش کئے جاتے اور خاص موضوعات پر طبع آزمائی ہوتی۔ اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو یہ اُس دور کا تقاضا تھا کہ بدلتے ہوئے حالات کا احساس اور شعور اس کا باعث بنے"۔

سرسید احمد خان کی تحریک نے اِس ادبی رجحان کے لئے دہلی اور علی گڑھ میں راہ ہموار کی۔ کہتے ہیں کہ جب حالی لاہور سے دہلی گئے تو وہاں سرسید کی تحریک سے اُنہیں دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ آپ سرسید سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی ساری علمی اور ادبی قوتیں سرسید کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دیں۔

اُردو ادب کے اِس دور کی سب سے زیادہ مشہور نظم حالی کی مدّ و جزرِ اسلام" (مسدس حالی) ہے۔ یہ نظم ۱۸۷۹ء میں مکمل ہوئی۔ جو حالی کے قومی شعور کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ قومی شعور کے یہ احساسات نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی پیدا ہوئے۔ اور اِس طریقے سے شمالی ہند کا ماحول ایک نئی فکری اور ادبی دنیا سے متعارف ہوا۔

فکر و نظر کے زاویے آہستہ آہستہ بدلنے شروع ہوئے۔ باشعور لوگوں کو ماضی کی حالتِ زار پر اشک فشانی کی بجائے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ یاد۔ نامہ بر اور بوس و کنار کی آرزوؤں کے طلب گار خارزارِ زیست سے دوچار ہوئے اور اس میں بود و باش کرنیکی تلقین کرنے لگے جیسے کہ وہ خوابِ غفلت سے جاگ اُٹھے ہوں۔ اور روبہ ترقی دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے اہل ہو گئے ہوں اِن مفکرین کی تحریروں اور افکار نے آہستہ آہستہ تمام ہندی مسلمانوں کو بیدار کر دیا۔ ہندی مسلمانوں کیطرح سرحد کے پشتون بھی اِس شعوری انقلاب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

سرسید احمد خان کی علمی تحریکوں اور علیگڑھ کالج کے قیام نے اس عمل کو اور بھی شہ دی اور اسے تیز تر کر دیا۔ حالی کی نظم مدّ و جزرِ اسلام"، ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح مرأۃ العروس اور اِس قسم

کی دوسری علمی ادبی اور اصلاحی کتابوں کی طباعت کو ابھی ایک آدھ سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اُس وقت کے پشتون علماء اور شعراء مثلاً غلام محمد خان پوپلزئی۔ میاں حبیب گل کاکاخیل سرخ ڈھیری کے میاں محمد یوسف کاکاخیل اور بعض دوسرے علماء اور شعراء نے اِن کتابوں کا اپنے مخصوص طرز و انداز میں ایسا ترجمہ کیا کہ ایک طرف تو وہ کتابیں ترجمہ کی بجائے اصل دکھائی دینے لگیں اور دوسری طرف یہ پشتو نظم و نثر میں تجدید کے حسین نمونے ثابت ہوئے۔

جیسا کہ کہا گیا ہے اس قسم کے تراجم تمام ہندی مسلمانوں کے افکار اور خیالات کو ایک مربوط اور منظم تحریک میں یکجا کرنے کا باعث بنے۔ سرحد کے نوجوان پشتون مسلمان بھی اس زمانے میں جدید تعلیم کے حصول کی غرض سے اُن بڑی بڑی درسگاہوں میں داخل ہونے لگے جو جدید علوم کے مراکز تھے۔ اِس لئے نہ صرف بالواسطہ بلکہ براہ راست بھی اُن کا فکری میلان اور رغبت اِس طرف بڑھ رہی تھی۔ اِس بارے میں پروفیسر محمد ادریس صاحبزادہ لکھتے ہیں:۔

"اِس دور کی قومی تحریکات کیوجہ سے پشتو شعر و ادب میں ایک ایسا عظیم انقلاب بپا ہوا جو بیک وقت قدماء کے کلام اور تحریر کے مزے، خوبیوں اور عظمت و جلال کا حامل بھی تھا اور عصر نو کے فکر و نظر کی ترجمانی بھی کرتا تھا۔"

جیسا کہ اِس کتاب کے پہلے حصے میں ذکر آیا ہے۔ جناب میاں نعمان الدین کاکاخیل پشتو کی جدید نثر نگاری کے اُن پیشواؤں میں سے ہیں جنہوں نے جدید پشتو ادبیات پر بے حد و حساب احسان کئے ہیں۔ آپ سرخ ڈھیری کے میاں امیرالدین کے صاحبزادے تھے۔ اور پنجاب کی سول سروس میں ای۔ اے۔ سی کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ میاں صاحب موصوف پشتو زبان کی ترقی کے بڑے آرزومند تھے۔ خود بھی ایک اچھے پائے کے ادیب اور اہل قلم تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس طرف راغب کیا کرتے تھے انہوں نے "ظفر النساء" نامی ایک کتاب لکھی جس میں علم کی ضرورت اور اہمیت پر بڑا زور دیا۔

میاں نعمان الدین کی حوصلہ افزائی کی بدولت اُنکے خاندان کے بعض دوسرے افراد نے

بھی پشتو میں کتابیں لکھیں۔ انکی رفیقۂ حیات زینت جہاں بیگم کونڑ کے ایک معزز گھرانے سے بیاہ کر آئی تھیں انہوں نے بھی پشتون خواتین کے فائدے کے لئے اُردو زبان کی "رفیقِ عروس" نامی کتاب پشتو میں ترجمہ کی اور اپنے ماحول کے مطابق اس میں مناسب ترمیم بھی کی۔ اِس کتاب کی زبان بہت سہل سادہ اور عام پڑھنے والوں کے مزاج کے مطابق ہے یہ کتاب ۱۳۲۲ھ میں چھپی ہے۔

میاں نعمان الدین احمد کے ایک عزیز میاں مشیر الدین نے فارسی زبان کی ایک کتاب "خجستہ بہار" جو اخلاقی موضوع پر ہے پشتو میں "مشیر الاخلاق" کے نام سے ترجمہ کی۔ یہ کتاب ۱۳۲۰ھ میں ترجمہ ہونے کے بارہ سال بعد طبع کی گئی ۔ انکے ایک اور عزیز میاں عنوان الدین کاکاخیل نے اخلاقِ محسنی کا ترجمہ "عنوان النصائح" کے نام سے شائع کیا ۔ میاں عنوان الدین کی ایک نظم جس میں اُس نے سوات کے یوسفزئی قبائل کا سلسلہ وار ذکر کیا ہے۔ فرانسیسی مستشرق ڈارمیسٹر کی کتاب "نارو بہار" کے صفحہ ۲۱ پر "حال و ملک و سوات" کے عنوان کے تحت موجود ہے۔ میاں صاحب موصوف نے یہ نظم ۱۸ مارچ ۱۸۸۲ء میں لکھی ہے۔ اس نظم میں سوات کا جغرافیائی تذکرہ بھی ہے۔ میاں عنوان الدین محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔

میاں نعمان الدین کے بیٹے نظیر احمد نے اپنے محترم والد کے فرمان کے مطابق شیخ فریدالدین عطار اور دیگر بزرگوں کے اقوال و نصائح ایک مجموعہ میں اکٹھے کئے اور ۱۳۲۵ھ میں شائع کئے۔

میاں نعمان الدین کے سب اعزا کی پشتو نثر بڑی سادہ اور بے تکلف ہے۔ جگہ جگہ موزون اشعار۔ رباعیاں اور قطعات بھی دلچسپی بڑھانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔ جناب خیال بخاری کہتے ہیں۔ کہ "ان کتابوں کی نثر اگرچہ مولوی احمد، رضوانی اور منشی احمد جان کی نثر کی ہم پلہ نہیں مگر ان میں سب سے زیادہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ اِس دور میں اگر ایک طرف سرسید حالی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے محبان قوم نے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اُنکی اخلاقی تربیت کے لئے مضامین اور کتابیں لکھنی شروع کی تھیں تو دوسری طرف ضرورتِ وقت کے اِس احساس کی بدولت احمد میاں کے دل میں بھی یہی جذبہ تلاطم

نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کی کتابوں کو پشتو میں لکھنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی تھی۔

اور جیساکہ ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے جو بھی کوئی کتاب لکھتا صرف یہ کہ میاں نعمان الدین اسے شائع کرنے کی حامی بھرتا۔ بلکہ کم و بیش ہر کتاب کے ساتھ اس کی عبارت کا ایک اعلامیہ بھی دیا جاتا کہ "علم مادری زبان میں آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیئے چاہیئے کہ ہر قسم کی علمی اور ادبی کتابیں ہماری مادری زبان میں لکھی جائیں۔ جو کوئی بھی علمی یا فنی کتاب پشتو میں لکھے گا تو میں اسکی سعی و کاوش اور مضمون کی اہمیت کے مطابق اُسے اپنی طرف سے انعام دوں گا۔ اور یہ بھی کوشش کروں گا کہ اس کتاب کو شائع کرنے میں اُسکی مقدور بھر اعانت کروں گا"۔ اس اعلامیہ سے میاں نعمان الدین کی نیک نیتی، خلوص اپنی زبان اور اپنے عوام کے ساتھ پیار اور محبت کے علاوہ اُسکی نظر میں حصول علم کی اہمیت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

اسکے بعد پشتو کی جدید نثر نگاری اُس دور میں داخل ہوتی ہے جس میں افسانہ، ناول، ڈرامہ مضمون نویسی اور مقالہ نگاری صحافت، رپورتاژ اور کردار نگاری وغیرہ پشتو ادب میں متعارف ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ سب بیسویں صدی کی پشتو ادبیات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیئے مناسب ہے کہ پہلے پشتو میں مستشرقین کے کام کا مختصر جائزہ لیا جائے اور بعد ازاں اس زبان میں لغت سازی کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے۔

مستشرقین

اس دور کی پشتو زبان کے ادبی خدمتگاروں کا ایک اہم گروہ اُن مستشرقین[1] کا ہے جنہوں نے اُنیسویں اور بیسویں صدی میں پشتو زبان، ادب، صرف و نحو، لغات اور لسانی روابط کے سلسلے میں تحقیقات کی ہیں۔ اور اِس زبان کے علمی اور ادبی

---

[1] مغربی دنیا کے وہ عالم اور محققین جنہوں نے مشرقی زبانوں اور علوم کے میدان میں علمی اور تحقیقی کاوشیں کی ہیں مستشرقین کہلاتے ہیں۔ یعنی مشرقی علوم کے علماء اور محققین۔

آثار کو مغربی دنیا سے متعارف کیا ہے۔ اگرچہ انکی یہ تمام تگ و دو بنیادی طور پر سیاسی اور مذہبی مقاصد کی حامل رہی اور فی الحقیقت انکی اِس علمی خدمت کا منشاء اور مقصد بھی یہی تھا جو انکی سیاسی برتری کا متقاضی تھا۔ تاہم السنہ اور ادب کے ان علماء نے پشتو زبان و ادب کے سلسلے میں تحقیق و تدقیق کا جو کام کیا ہے وہ بیشک قابل قدر ہے۔ یورپ کے ان مستشرقین کا کام عملاً تین بنیادی مقاصد یعنی سیاسی اور فوجی برتری کے حصول، عیسائیت کی تبلیغ کے کام کو آسان بنانے اور علمی بصیرت میں اضافہ کرنے کا حامل تھا۔ اس ضمن میں درج ذیل انگریزی عبارت کا ترجمہ قابل غور ہے۔

It will be hardly believed that before the year 1857 there was no grammar to be had in England or in India, from which an English officer might acquire the need of the language of Afghanistan. Nor can it be too often reported that even before the beginning of the Afghan, Wars, the Russian Government had appointed a Professor of pashto, the language of Afghans, at St. Petersburg. There in the northern capital of Russia an Afghan grammer and teaching book was published by Professor Dorn at the expense of the Emperor's Government, before our government even knew that the Afghans had a language of their own. There at St. Petersburg young officers and diplomats had to pass examinations in the dialects of the warlike mountaineers of Roh, while our generals and Ambassadors employed on mission of the highest importance in the very heart of the country had to depend for information on the interest of interpreters, Afghan Chiefs were able to talk treason in Pashto before the noses of our Generals assuring them fidelity in high flown strains of Persian colloquiaum. (Army and Navy Gazette, June, 1864).

"یہ ایک عجیب وغریب سی بات ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل انگلستان یا ہندوستان میں گرامر کی کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو برطانوی افسروں کے لئے پشتو زبان سیکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی۔ اور نہ اس بات کو کوئی تشہیر ملی تھی کہ افغانستان کی جنگوں سے قبل روسی حکومت نے افغانوں کی زبان (پشتو) کا ایک پروفیسر سینٹ پیٹرز برگ میں اس کام پر مامور کیا تھا۔ روس کے اس شمالی دارالحکومت میں پروفیسر ڈورن نے پشتو سیکھنے اور گرامر کی کتابیں شاہی خزانے کے اخراجات سے شائع کی تھیں، یہ وہ وقت تھا کہ ہماری حکومت کو ابھی یہ بھی معلوم نہ تھا کہ افغانوں کی ایک اپنی زبان بھی ہے۔ وہاں سینٹ پیٹرز برگ میں نوجوان افسر اور سفارتی کارکن اسی روہی زبان (پشتو) کا امتحان پاس کیا کرتے جس سے ہمارے وہ جرنیل اور سفارت کار بالکل ناواقف تھے، جو اس سرزمین میں کئی ایک اہم ذمہ داریوں پر مامور ہوتے۔ اور عین ملک کے اندر متعین کئے جاتے۔ اطلاعات و معلومات کے لئے وہ ترجمان کی دیانتداری پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ افغان سردار انکے سامنے پشتو میں سازش کی باتیں کیا کرتے اور ان پر چکنی چپڑی زبان میں یہ ظاہر کیا کرتے کہ وہ انکے ساتھ انتہائی وفاداری دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔"

یہی سبب ہے کہ اس گروہ میں اکثر و بیشتر حکومتی مامورین پادری، ڈاکٹر یا اہل علم پروفیسر ہیں۔ پہلے طبقے میں میجر راورٹی پنجاب آرمی کی بمبئی ڈویژن سے وابستہ تھے۔ میجر لیسّح بمبئی کے میجر ٹی سی پلاوڈن، کپتان واگان وغیرہ شامل تھے۔ دوسرے گروہ میں پادری ہیوز زیادہ قابل ذکر ہے۔

مستشرقین کا تیسرا گروہ ایسے فضلا کا ہے جو بظاہر اور بنیادی طور پر علمی مقصد رکھتے تھے جیسے پروفیسر ڈارمسیٹر پروفیسر ڈورن۔ سی اے بڈلف ڈاکٹر ٹرومپ، ان کے علاوہ سرپرستی کاکس۔ ٹوما نوویچ۔ گولڈن شاٹ، گیگر، روس کیمبل۔ مورگن سٹائن۔ کلپرآت۔ لارڈ ایمرا۔ الفنسٹن مالیون۔ اوالڈ۔ گریئرسن، ولیم ہنری۔ موگس لیح۔ لانگ ورتھ ادبرٹن۔ دابرٹسن۔ اور

پادری انزلڈسن وغیرہ شامل ہیں۔

ان مستشرقین نے اپنی اپنی جگہ پشتو زبان کی علمی و ادبی نضہت کی راہ میں بہت قابل قدر کام کیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے پشتو میں تخلیقی اور تحقیقی کام کیا ہے بلکہ ایک اور اہم کام جو غالباً نہیں سوچا گیا تھا۔ یا پھر انہوں نے اور اُنکے دوسرے رفقاء نے اپنے ذاتی ذوق و شوق سے پورا کیا تھا وہ پشتو زبان و ادب کی قلمی کتابوں کے زمرے میں آئیگا۔

میجر راورٹی:- ان مذکورہ مستشرقین میں جیسے کہ انکی نوعیت کار اور صاف ستھرے افکار سے عیاں ہے۔ میجر راورٹی کا نام سرفہرست ہے یہ ایک فوجی افسر تھا جس نے دیار ہند میں کلکتہ، آگرہ، بمبئی، جالندھر اور پشاور میں ملازمت کی اور فوجی خدمات سرانجام دی ہیں۔ محترم قاضی عبدالحلیم اثر اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ "روہیل کھنڈ کی پشتون قوم کی ریاستوں کی تباہی کی وجہ سے نجیب آباد کے حافظ رحمت خان کے گھرانے کے چند صندوق جو پشتو زبان کے قلمی نسخوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جو لوٹ مار میں انگریز فوج کے ہاتھ آئے تھے وہ آخر کار انجہانی میجر راورٹی کے ہاتھ لگے۔" محترم قاضی اثر کہتے ہیں: ان کتابوں کا تذکرہ راورٹی اور ناروے کے مستشرق مارگن سٹائن دونوں نے کیا ہے۔ مارگن سٹائن نے تو یہ بھی کہا کہ یہ پورے چالیس صندوق تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے فساد میں ضائع ہوگئے اور ان میں سے چند بچ گئے تھے وہ میجر راورٹی کے ہاتھ لگے تھے وہ لکھتا ہے کہ انہی کتابوں میں پشتو زبان کی لغت کی ایک کتاب بھی تھی جسکی بنیاد پر راورٹی نے اپنی پشتو انگریزی کی مشہور لغت تیار کی ہے۔ یہ کتاب ۱۱۵ صفحوں پر مشتمل ہے محترم اثر کے خیال کے مطابق اس کتاب کا ماخذ نواب اللہ یار خان کی مرتب

لہ اولس کوئٹہ نومبر، دسمبر ۱۹۷۲ صفحہ ۱۱

کردہ "عجائب اللغات" نامی پشتو فارسی لغت تھی[1]۔ راورٹی عملاً پہلا مستشرق ہے جس نے نہ صرف یہ کہ پشتو انگریزی کی پہلی لغت مرتب کی ہے۔ بلکہ اِس زبان کی گرامر اور ادب کے متعلق بھی بہت اہم کتابیں لکھی ہیں۔

جناب خیال بخاری لکھتے ہیں کہ میجر راورٹی پشتو کے قندہاری اور یوسفزئی لہجوں کے فرق کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ یہ اِس لئے کہ جن اشخاص نے ان علمی کاوشوں میں اُن کی اعانت کی ہے۔ ان میں سے ایک ہشتنگر کا رہنے والا اخونزادہ تھا۔ اور دوسرا قندہار کے ایک قاضی کا بیٹا تھا۔ میجر راورٹی نے خود جسطرح اِن دونوں کا ذکر کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے[2]

"اس تمام عرصے میں مجھے غلزئی قبیلے کے ایک مولوی کا تعاون حاصل تھا۔ جو قلات غلزئی کا باشندہ تھا۔ اور اُس کا باپ کچھ مدت تک قندہار کا قاضی رہ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مولوی ہر لحاظ سے پشتو زبان پر علمی اور عملی عبور رکھتا تھا۔ اُس کی عربی دانی جس پر اسلامی زبانوں کی اساس اُستوار

---

[1] اس بارے میں راورٹی خود لکھتے ہیں کہ:۔

"This work includes the result of my own research during the last twelve years together with the whole of the words contained in the very rare, though not extensive, lexicographical works existing on the Pashto language - The Ajaib-ul-loghat of Nawab Allah Yar Khan of Barach Tribe and the Riazu-ul-Mohabbat by Nawab Hafiz Mohabat Khan both explained in Persian."

[2] ڈکشنری راورٹی ص ۲۱

ہے' اس کام کے لئے بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ۔ مجھے کئی سال تک پشاور کے محمدزئی قبیلے کے ایک بزرگ اہل علم اخونزادہ کی رفاقت بھی حاصل تھی ۔ جو عربی اور پشتو دونوں زبانوں پر خاصا عبور رکھتا تھا ۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ باجوڑ، پنجکوڑہ، سوات اور بونیر کے علاقوں میں بھی رہ چکا تھا ۔ اور ان علاقوں کے لوگ اب بھی خالص پشتو بولتے ہیں"۔

راورٹی نے پہلی بار پشتو ٹائپ وضع کی اور اُس کے لئے ایک الگ فاونڈری ہارٹ فورڈ میں بنالی تھی ۔ اس ٹائپ کے حروف اس قدر واضح اور عمدہ تھے کہ اب تک ٹائپ کے لئے وضع شدہ دوسرے حروف ان کا مقابلہ نسخ ٹائپ میں نہیں کر سکتے ۔ کہتے ہیں کہ راورٹی نے پشتو کا اپنا یہ ٹائپ داؤد خان بڑیخ کی نواسی گوہر رقم بی بی کی پشتو نسخ پر بنایا تھا"۔

محقق قاضی اثر لکھتے ہیں کہ اگر کوئی مسٹر راورٹی کے تالیفات کی پشتو نسخ کی خوبصورتی کی تعریف کرنا چاہتا ہے تو چاہیئے کہ وہ پشتون خطاطہ گوہر رقم بی بی کو بھی فراموش نہ کرے جو روہیل کھنڈ میں نواب حافظ الملک کے بڑے بیٹے نواب محبت خان کے حرم کی ایک محترمہ بی بی تھیں ۔

میجر راورٹی نے پشتو زبان کی ایک گرامر بھی لکھی ہے ۔ اس کتاب کا پس منظر اور ماخذ بھی نواب محبت خان روہیلہ کی گرامر ہے ۔ یہ گرامر سنہ ۱۸۵٦ء میں طبع کی گئی ہے ۔ اس کتاب میں گرامر کے موضوعات کے علاوہ پشتو کی دوسری قدیمی زبانوں کے ساتھ لسانی روابط پر بھی تحقیقی بحث کی گئی ہے ۔ میجر راورٹی کی ایک اور مشہور کتاب "گلشن روہ" ہے یہ کتاب بڑے سائز میں ۲۹۸ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں پشتو کے مشہور شعراء اور ادباء کی نظم و نثر کا انتخاب اکٹھا کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب ۱۲۷۷ھ بمطابق سنہ ۱۸٦۰ء میں چھپی ہے اور سرورق پر یہ عبارت لکھی گئی ہے : "تالیف کپتان راورٹی ملکہ زمان وکٹوریہ کی فوج کی تیسری پلٹن احاطہ بمبئی"۔ یہ عبارت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کتاب کے دیباچہ کی تالیف کے دنوں میں راورٹی بمبئی میں تھے اس کتاب کے دیباچے میں موصوف لکھتا ہے کہ "بہرطور جب یہ کتاب چھپ جائے گی تو حروف کے لحاظ سے ایک غلط نویس اور بدزیب کاتب کے خط کے مقابلے میں بہتر ہوگی"۔

میں نے چھ نثری اور دس نظم کی کتابوں سے انتخاب کیا ۔ گلشن روہ کے خط کی درستی اور خوبصورتی

واقعی قابلِ تعریف ہے۔"

راورٹی کی دوسری دو کتابیں pashto manual پشتو قاعدہ اور ایسپ الحکیم کے قصے بھی ہیں۔ "نمیں" قصہ د ایسپ الحکیم" نامی کتاب ۱۸۷۱ء میں چھپی ہے اور پشتو قاعدہ ۱۸۸۰ء میں لندن میں چھپا ہے۔

پروفیسر برنرڈ ڈورن (۱۸۰۵ء۔ ۱۸۸۸ء) یہ جرمن نژاد محقق روس کے خارکاف نامی شہر میں ۱۸۲۶ء میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر مقرر ہوا۔ نو سال بعد وہ سینٹ پیٹرز برگ (موجودہ لینن گراڈ) میں اورنیٹل انسٹی ٹیوٹ کا پروفیسر بنا۔ ۱۸۴۲ء میں ایشیاٹک میوزیم کا ڈائرکٹر اور دوسرے سال امپیریل لائبریری کا چیف لائبریرین مقرر کیا گیا۔ انہوں نے قفقازی اور خراسانی زبانوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ بعض درسی کتابوں اور پشتونوں کی تاریخ کے علاوہ اس مستشرق نے ۱۸۴۵ء میں ایک پشتو روسی لغت اور ۱۸۴۷ء میں پشتو ادبیات سے انتخاب شائع کی۔

پشتو زبان کی گرامر کے علاوہ انہوں نے مشہور افغان مؤرخ نعمت اللہ ہروی کی تاریخ بھی ترجمہ کی ہے۔ اور اس پر اپنے حاشیے بھی لکھے ہیں۔ یہ نامور مستشرق سینٹ پیٹرز برگ میں آخری عمر تک قیام پذیر تھا۔ اور وہیں چل بسا۔ اس کا پورا نام برنرڈ ڈورن (BERNHARD DORN) تھا۔ اس مستشرق سے قبل دو مزید اشخاص ایسے گذرے ہیں جنہوں نے پشتو زبان کی لغت اور گرامر کے میدان میں کام کیا ہے۔ ان دونوں مستشرقین کی کتابیں سینٹ پیٹرز برگ (موجودہ لینن گراڈ) میں چھپی تھیں۔ ان میں سے پشتو کی ایک لغت کے مؤلف مستشرق گولڈن شیٹ تھے۔ ان کی کتاب چھپنے کا سال ۱۷۹۱ء ہے دوسرے کا نام کلپراٹ تھا۔ انہوں نے پشتو زبان کی گرامر کی ساخت پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ڈورن نے اس گرامر کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ اس کتاب میں بہت سی غلطیاں تھیں۔ پشتو گرامر کی یہ کتاب ۱۸۱۰ء میں چھپی ہے۔

"ہنری والٹر بیلیو" :- ایک اور مشہور مستشرق ہنری والٹر بیلیو (H.W. BELLEW) تھے۔ جو بنگال آرمی کے اسسٹنٹ سرجن تھے انہوں نے بھی پشتو زبان کی ایک گرامر (انگریزی پشتو) اور انگریزی سے پشتو میں ایک مشترکہ ڈکشنری لکھی تھی۔ جب یہ گرامر اور لغت مکمل ہو گئی تو بیلیو نے انکی اشاعت کے لئے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کو ایک درخواست بھیجی۔ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کی طرف سے گائیڈ کور کے بریگیڈیر جنرل وائیلڈ کو جو وضاحت طلب مراسلہ بھیجا گیا تھا اس کا متن یہ ہے :-

General Department

Abstract of proceedings of the honourable the Lieutenant Governor of the Punjab. 12th February, 1866 No. 4.

From:- Military Secretary, Punjab,

No.........Dated...........

Transfer for disposal a letter from Dr Bellew of the Guide Corps regarding a Pashto Grammar and Dictionary which he proposes to publish

No 5

To

Brigadier General Wild

Returns Dr. Bellew's letter and requests that Dr Bellew be asked to send the manuscripts for inspection, also to state in what respect they are superior to existing works on the subject

Besides the cost of the publication of each seperately, as His Honour considers this publication in one volume an inconvenient arrangement.

(Copied from Record Officer, Peshawar)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بیلیو اور حکومت پنجاب کے مابین خط و کتابت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یہ دونوں کتابیں ۱۸۶۷ء میں لندن میں چھپیں دوسری دفعہ ۱۹۰۱ء میں مسٹر بیلیو کی خواہش پر رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اس پر آمادہ ہوئے کہ اس گرامر اور لغت کو دوبارہ شائع کرے ۔ بیلیو نے اپنی لغت کی کتاب کی خصوصیت کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں پشتو الفاظ کے ماخذ اور اشتقاقات کی معلومات فارسی اور ہندی زبانوں میں اجاگر کی گئی ہیں ۔

"ڈار میسٹیٹر" انیسویں صدی کا ایک مشہور سہودی النسل مستشرق فرانس کے پروفیسر جیمز ڈار میسٹیٹر تھے یہ کالج ڈی فرانس میں مشرقی علوم کے استاد تھے اور ۱۸۸۶ء میں ایک خصوصی مشن پر برصغیر آئے تھے[۱]۔

ان کے مشن کا مقصد پشتو زبان کے لوک گیت جمع کرنا اور پشتونوں کے ادب کا مطالعہ کرنا تھا ۔ انہوں نے نغمے اور ادبی نمونے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ اپنی مشہور کتاب Chants Populair-Des Afghans پشتونخوا کے شعر کا "ہارو بہار" میں شائع کئے ۔ اس مجموعہ میں پشتو کی عوامی غزل بدلے ۔ چار بیتے ۔ متلونہ ۔ مصرعے ۔ اللہ ھو (لوری) اور اسم ذات وغیرہ جمع کئے گئے ہیں ۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا ہے :

" د پښتنو د شعرونو ہارو بہار" ۔ غزلوں ۔ چار بیتوں ۔ محاوروں ۔ مصرعوں اور گیتوں کا ایک مجموعہ جو پشاور شہر اور ایبٹ آباد چھاؤنی میں فرانس سرکار کے حکم اور فرمائش پر ۱۳۰۳ھ میں جمز ڈار میسٹیٹر صاحب نے مرتب کیا ہے ۔

یہ کتاب فرانس کی مشرقی انجمن پیرس کے خرچ پر سرکاری چھاپہ خانے میں ۱۸۸۸ء میں چھپی ہے ۔ یہ کتاب کل ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں زبان کی ساخت اور اصول کے بارے

---

[۱] ڈار میسٹیٹر کی پشتو تحقیق دیباچہ صفحہ ۲۰۱

میں بھی ضروری معلومات جمع کی گئی ہیں ۔ اس سلسلے میں ضلع ہزارہ کے ڈوڈیال نامی گاؤں کے محمد اسمٰعیل خان سواتی نے پروفیسر موصوف کی خاطر خواہ طور پر مدد کی ۔

ڈارمسٹیٹر کے حالاتِ زندگی کے بارے میں محقق جیبیؔ نے اپنی کتاب "ڈارمسٹیٹر کی پشتو تحقیق" میں لکھا ہے : " وہ ۱۸۴۹ء مارچ کی ۲۸ تاریخ کو الزاس کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام سرف (........) اور بھائی کا ارس ڈارمسٹیٹر تھا ۔ یہ بھی بڑے عالم تھے کہتے ہیں کہ جیمز ڈارمسٹیٹر رنگ اور ناک نقشے کے لحاظ سے خوش شکل نہ تھے انھوں نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی ۔ اور ۱۸۷۷ء میں ادبیات میں ۔ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ مشرقی ادبیات سے انکا لگاؤ زیادہ تھا اور اس میدان میں تحقیق و تدقیق میں بہت سعی و کاوش سے کام لیا کرتے تھے ۔ جیبیؔ کہتا ہے کہ اس سے پہلے انہیں اُستادِ زبان کا معاون مقرر کیا گیا اور پانچ سال بعد خود اُسی شعبے کے سربراہ مقرر ہوئے ۔ ۱۸۸۵ء میں وہ کالج ڈی فرانس میں فارسی ادبیات کے اُستاد بنے ۔ وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے اہل قلم میں سے تھے موسیو رینان کے بعد وہ اس سوسائٹی کے سیکرٹری بھی تھے ۔ جیمز ڈارمسٹیٹر نے سال ۱۸۸۳ء میں ایرانیوں پر ایک کتاب لکھی ۔ یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قدیم ایرانی زبان میں ادب کی ایک دلچسپ معلوماتی کتاب تھی ۔ ۱۸۸۶-۸۷ء میں انہیں ہندی زبانوں کی تحقیق پر مامور کیا گیا ۔ کچھ عرصے کے لئے بمبئی میں پارسی علماء سے ژند، اوستا اور زردشتی ادب کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے ۔ اور پھر ایبٹ آباد اور پشاور میں پشتو ادب کے بارے میں وہ تاریخی اور ادبی مواد اکٹھا کیا جس کی برکت سے اِس محقق نے اُن یورپی مستشرقین میں نمایاں مقام حاصل کیا جو پشتو زبان و ادب کے میدان میں تحقیق و تدقیق میں خاص شہرت کے مالک رہے ہیں ۔ اُنکی مشہور کتاب پشتو لوک شاعری کا مجموعہ "ہارد بہار" ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے ۔ مستشرق ڈارمسٹیٹر کی دوسری تحقیقی کاوشیں درج ذیل ہیں :-

۱ ژند اوستا کا مکمل ترجمہ ۱۸۹۲ء (فرانسیسی میں)
۲ ایرانی زبانوں کا مطالعہ
۳ منتخب مقالات ۱۸۹۵ء
۴ اہرمن ۔ (مشرقی علوم پر مقالات) ۱۸۷۷ء
۵ یہودیوں پر تحقیق ۱۸۸۳ء
۶ بنی اسرائیل کے انبیاء ۱۸۹۲ء
۷ فسانۂ الہی ۱۸۹۰ء
۸ انگریزی ادب پر تحقیق ۱۸۸۳ء

انکے علاوہ وہ ایک رسالے کے مدیر بھی تھے جس میں ادبیات پر تنقید اور تبصرے شائع ہوتے تھے ۔ اور اسکے ذریعے سے عمدہ تحقیقی اور علمی مواد قارئین اور محققین کو فراہم کیا جاتا تھا ۔

مستشرق ڈارمیسٹیٹر نے اپنی کتاب "بہار و بہار" کا جو مقدمہ لکھا ہے اُس مقدمے کا ترجمہ سید قاسم رشتیا نے (فارسی میں) کیا ہے جسے پروفیسر حبیبی نے پشتو میں منتقل کیا ہے ۔ اُس کا مضمون کچھ یوں ہے " ۱۸۸۶ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں فرانس کی وزارتِ تعلیم نے ہند کے علمی مطالعات کے لئے میری تقرری کی اور میں نے افغانستان کے ساتھ متصل سرحد پر پشتو میں بعض ادبی ضرب الامثال اکٹھے کئے اور اِس کتاب میں ترجمہ کرکے پیش کئے ۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ پشتو کے لئے اُسی طرح کا علمی کام کروں جیسے فوریل نے موجودہ دور کے یونانیوں کے لیئے کیا ہے ۔ یعنی علم السنہ کے ماہرین اور مورخین کے لئے زبان اور ملی تفکر کے مثالی نمونے یکجا کروں "۔

"پادری ہیوز" :۔ انہوں نے بھی ڈورن کے کرسٹو میتھی اور راورٹی کے گلشن روہ کی

طرح پشتو نظم کا انتخاب کلید افغانی کے نام سے مرتب کر کے ۱۸۷۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے بعض حصے مثلاً گنج پشتو۔ تاریخ سلطانِ محمود غزنوی وغیرہ مولوی احمد کی تالیفات ہیں جو پادری موصوف کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اسکے علاوہ اِس میں رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ اس کا ایک حصہ چمن بے نظیر کے نام سے موسوم ہے۔ اسی حصے میں معز اللہ خان مومند، کاظم خان شیدا، عبدالحمید ماشوخیل، محمدی صاحبزادہ، صدیق یونس، فتح علی پیر محمد کاکڑ، خواجہ محمد بنگش، غفور، علیم صدر خان، اشرف۔ خوشحال شہید، قلندر، کامگار، فاضل، دولت، ہجری، صمد، ابوالقاسم۔ احمد شاہ ابدالی، عصام، مرزا خان انصاری، عبدالقادر خان، سکندر خان، حسین ابراہیم، عبدل، عثمان، مبین، فنیس وغیرہ شعراء کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ایک حصے میں پشتو نشاپردازی کے کچھ نمونے بھی موجود ہیں۔ یہ سب اپنے دور کے نامور شعراء تھے ان میں سے بعض کا کلام ملا ہے۔ مگر ابھی تک بعض ایسے ہیں کہ انکے کلام کے نمونے دیوان یا حالاتِ زندگی منظرِ عام پر نہیں آئے۔

پادری ہیوز ادبیاتِ پشتو کے بہت بڑے رسیا تھے۔ انہوں نے کئی قلمی دیوان اور کتابیں اکٹھی کی تھیں۔ اور جو کتاب وہ حاصل نہ کر سکتے اُس کی خوشخط نقل حاصل کر لیتے اور اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ اِس طرح اس محقق نے پشتو زبان کی کئی نادر کتابیں اپنے ملک لے جا کر برٹش میوزیم میں محفوظ کر لی ہیں۔

سی ای بڈلف

Cuthbert Edward Bidulph

سی ای بڈلف کیمرج یونیورسٹی کے ٹرینیٹی کالج میں تھے انہوں نے ۱۸۹۰ء میں اپنی کتاب Afghan poetry of the 17th century (افغانوں کی سترھویں صدی کی شاعری) شائع کی۔ یہ خوشحال خان خٹک کی بعض نظمیں اور اُن کا انگریزی ترجمہ تھا۔

کپتان واگان Wagan

بنگال آرمی کا افسر تھا۔ ان کا تذکرہ راورٹی کی گرامر میں ہو چکا ہے۔ راورٹی کہتا ہے کہ واگان نے بھی پشتو کی مختصر سی گرامر لکھی تھی جو ۱۸۶۰ء میں لندن میں چھپی تھی۔ اسی طرح ہوکس نامی ایک اور مستشرق نے بھی پشتو زبان کی گرامر لکھی تھی جس کا ذکر بڈلف نے کیا ہے۔ گرامر کی یہ دونوں کتابیں اب نایاب ہیں۔ ایک اور مشہور مستشرق ڈاکٹر آرنسٹ ٹرومپ Dr. Earnest Trumpp تھا۔ یہ بھی پشتو گرامر کا مؤلف تھا۔ اسکی کتاب ۱۸۷۳ء میں لندن میں چھپی تھی۔ ویانا کی امپیریل اکیڈمی نے اس کے ساتھ مالی تعاون کیا تھا۔ ڈاکٹر ٹرومپ نے اپنی یہ کاوش بصد احترام پروفیسر ڈورن کے نام نسے منسوب کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ٹرومپ نے اپنی اس گرامر کا دیباچہ ٹیوبنگن میں لکھا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ٹیوبنگن کے کتب خانے میں موجود پشتو کتابیں اس مشہور و معروف مستشرق کی وساطت سے پہنچی ہیں۔ ان کتابوں میں سے ایک اہم کتاب خیر البیان بھی ہے جس کا تفصیلی تذکرہ اس کتاب کی جلد اول میں گذر چکا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں جن مستشرقین نے پشتو زبان و ادب پر تحقیقات کی ہیں۔ یا تصنیف و تالیف کے ذریعہ اس زبان کی خدمت کی ہے اُن میں ایک جناب روس کیپل بھی ہیں جو بانیان اسلامیہ کالج پشاور میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۰۲ء میں ایک پشتو قاعدہ لندن سے شائع کرایا۔ دوسرا مستشرق لاریمر ہے جنہوں نے "پیشتر" (ہم) کے نام سے وزیری لہجے کی گرامر لکھی ہے۔ اور ۱۹۰۲ء میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب بھی لندن میں چھپی تھی۔ اسی مستشرق کی ایک اور کتاب "پشتو کی ترکیب نحوی" Syntax of Colloquial Pashto کے نام سے چھپی ہے۔ ایک روسی مستشرق ٹومانوچ Tumanvitch نے ۱۹۰۹ء میں پشتو گرامر اور فرہنگ نامہ طبع کیا ہے۔ میجر کاکس Maj. A.D. Cox کی کتاب (NOTES ON PASHTO GRAMMAR) ۱۹۱۱ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ میجر کاکس پنجاب رجمنٹ میں ملازم تھے۔ اس کتاب کی تالیف میں میاں سمیع الدین بیرسٹر اور منشی عجب خان نے اُن کا ہاتھ بٹایا ہے۔ ایک اور برطانوی نژاد

مستشرق گلرٹسن تھا۔ یہ بھی برطانوی فوج میں میجر تھا۔ بنارس سے شائع شدہ انکی پہلی کتاب "پشتو قاعدہ" ہے اور دوسری پشتو زبان ہے جو ۱۹۲۹ء میں برڈ فورڈ سے شائع ہوئی انکی ایک اور کتاب پشتو محاوروں کی ڈکشنری The Pashto Idioms (A Dictionary) ہے

یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی اس کتاب کی تیاری میں عارف اللہ یوسفزئی، محمود افریدی اور علی اکبر قندہاری نے ان کی مدد کی تھی۔ اس کتاب کے ہر جلدوں کے کل صفحے ۹۶۲ ہیں۔ ان مستشرقین کی فہرست میں علم الالسنہ کے مشہور ماہر جناب سر جارج ابراہام گریرسن Sir George Abraham Grierson. بھی شامل ہیں۔ یہ نوے سال زندہ رہے۔ انھوں نے ٹرینٹی کالج ڈبلن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں انڈین سول سروس میں آئے اور برطانوی ہند میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک Linquistic Survey of India. کے اہم کام کا اہتمام انکے حوالے تھا۔ ساتھ ہی برصغیر کی زبانوں اور ادب پر مختلف قسم کی تحقیقی اور مطالعاتی کتابیں انہوں نے شائع کیں۔ جب ہندی زبانوں کے بارے میں تحقیقات کے اس اہم کام کا آخری مرحلہ Linguistic Survey of India. کے نام سے انیس ضخیم جلدوں میں ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تو اس بڑے کارنامے کے اعتراف کے طور پر انگریز سرکار کیطرف سے انھیں Order of Merit. کا اعزاز دیا گیا۔ اس کتاب کی دسویں جلد پشتو کا لسانی مطالعہ اور اس زبان کے مختلف لہجوں کی بحث پر مشتمل ہے۔ مالیون نامی ایک مستشرق نے پشتو کے عام عوامی قصے یکجا کر کے کلکتہ سے شائع کئے تھے۔

ڈاکٹر / پروفیسر / جارج مورگنسٹائن

Dr. George Morganstriene.

یہ فاضل مستشرق ناروے اوسلو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ کچھ عرصے تک افغانستان میں بھی رہے اور اپنی تحقیقات "افغانستان کو لسانی تحقیقاتی مشن پر" کے نام سے کتابی شکل میں اوسلو سے شائع کیں پھر دوسری دفعہ صوبہ سرحد آکر دوسری رپورٹ "شمال مغربی ہندوستان کو لسانی مشن" کے

نام سے ۱۹۳۳ء میں اُس شہر سے شائع کی۔ انہوں نے ایک اور کتاب "د پشتو کے اشتقاقات" کے نام سے اور ایک کتاب "خوشحال خان اور اس کا کلام" کے نام سے بھی لکھی۔ ڈاکٹر مورگنسٹائن پہلا آدمی تھا، جس نے سر ریتمن راس کی وساطت سے پشتو کی مشہور قدیم نثری کتاب خیرالبیان کے نثری نمونے ڈھونڈھ نکالے تھے اور یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچائی تھی۔ کہ خیرالبیان کا جو نسخہ برطانیہ یا یورپ میں موجود ہے وہ غالباً وہی نسخہ ہے جو "ٹیوبنگن" کے کتب خانے سے ۱۹۶۰ء میں مولانا عبدالقادر کے ہاتھ آیا تھا۔ یوں مورگنسٹائن کا دعویٰ تصدیق تک پہنچا اور چار سو سال سے پشتو نثر کی یہ نایاب قدیمی کتاب ایک دفعہ پھر ہاتھ آئی۔

ڈاکٹر ہربرٹ پینزل

Doctor Herber Penzl

امریکہ کی میشیگن یونیورسٹی میں جرمن زبان کے پروفیسر تھے بعد میں کیلیفورنیا چلے گئے۔ موصوف کافی مدت تک افغانستان اور خصوصاً قندھار میں رہے اور پشتو زبان کی ساخت اور گرامر پر عبور حاصل کیا نئے لسانی قواعد کی روشنی میں انہوں نے پشتو کی ایک گرامر لکھی۔ اِس گرامر میں پشتو زبان کے قندھاری لہجہ کو بنیاد قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر خیال بخاری، پروفیسر جہانزیب نیاز اور افغانستان کے ایک آدھ دانشور کی ہمکاری میں پشتو سیکھنے کے لئے بعض ابتدائی اور ثانوی کتابیں لکھیں اور ایک پشتو انگریزی لغت پر بھی کام شروع کیا لیکن وہ کام کسی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ مستشرق پینزل نے پشتو زبان کے بارے میں چند ایک رسالے انگریزی میں شائع کئے ہیں۔ اور امریکہ کے جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لئے پشتو کا درس بھی دیتے رہے ہیں ان کی ایک کتاب A GRAMMAR OF PASHTO کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہے۔

"ڈاکٹر میکنزی"

ان کا تعلق لنڈن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز سے رہا ہے اور مرکزی ایشیائی زبانوں کے عالم ہیں۔ انہوں نے خوشحال خان خٹک کی بعض منتخب نظمیں یونیسکو کی مالی

امداد سے ترجمہ کر کے شائع کی ہیں ۔ یہ منظوم ترجمہ بہت پُر لطف اور رواں ہے ۔ انہوں نے برٹش میوزیم کے ٹرسٹ اور دولت مشترکہ کے دفتر تعلقات کے مالی تعاون سے برطانوی کتب خانوں میں پشتو قلمی کتابوں کی ایک فہرست بالکل نئی طرز میں مرتب کی ۔ اِس فہرست میں بوڈلین ۔ برٹش میوزیم ، کیمبرج یونیورسٹی ۔ انڈیا آفس جان ریلنڈ ، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز اور ٹرینٹی کالج ڈبلن کے کتب خانوں کے قلمی ذخائر میں پشتو کی قلمی کتابوں کی تفصیلات درج کی گئی ہیں اور وہ اشخاص جنکی وساطت سے یہ کتابیں اِن کتب خانوں تک پہنچی ہیں اُن کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں انگلستان سے شائع ہوئی ہے ۔ ڈاکٹر میکنزی[1] کی اِس فہرست کے علاوہ جیمز فولر بلوم ہارٹ James Fuller Blumhardt. " ہرمن ایتھ Herman Ethe ای جی براؤن E.G. Browne نے بھی کتابوں کی جو فہرست شائع کی ہے اُس میں بھی پشتو کی قلمی کتب اور انیسویں صدی عیسوی میں پشتو کی شائع شدہ کتابوں کا تذکرہ موجود ہے ۔ بیسویں صدی کے مشہور مستشرقین میں سر اولف کیرو اور سر ایولن ہاول بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں ۔ کیرو نے اپنی مشہور تاریخ " THE PATHANS " کے علاوہ سر ایولن ہاول کے ساتھ مل کر خوشحال خان کی بعض نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے یہ منظوم تراجم کتابی شکل میں پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے Poems of Khushal Khan Khattak کے نام سے شائع ہوئی ہیں اسی طرح پروفیسر سکالماسکی نے بھی پشتو لسانیات پر کام کیا ہے ۔ آپ پولش نژاد ہیں اور آج کل بلجیم میں مقیم ہیں ۔

"مستشرق جنز الولڈسن"

۔۔ ڈینش پٹھان "مشن سے وابستہ یہ عالم اور محقق کچھ

---

[1] ۱۹۸۳ء کو منعقدہ شدہ قراقرم پر بین الاقوامی ثقافتی کانفرنس کے موقع پر پاکستان آئے تھے اور پشاور میں بھی کچھ دن مقیم رہے ۔

عرصے تک پشاور میں رہا ہے۔ یہ اپنے ذاتی ذوق و شوق اور علم و تحقیق کے ساتھ محبت، کی برکت سے پشتو زبان و ادب کے مطالعے کیطرف متوجہ ہوا۔ اچھی خاصی روان پشتو سیکھی اور "پشتونخوا" کی عوامی زندگی میں ایسا گھل مل گیا۔ کہ لباس ظاہری وضع قطع اور نشست و برخاست تک کے لحاظ سے مقامی لوگوں کیطرح ہو گیا۔ پشتو زبان و ادب کے بارے میں اس نے جو کتابیں تحریر کی ہیں انکے نام یہ ہیں (۱) خوشحال خان خٹک اور انکے کلام کے کچھ حصوں کا ڈینش ترجمہ (۲) "سپوږمۍ کړنګ وهه را ځیږه" پشتو کے بعض ٹپے اور ضرب الامثال ڈینش ترجمہ کے ساتھ، یہ باتصویر کتاب ہے۔ یہ تصویریں پٹھانوں کی معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اور ایک جواں سال فنکار سعید سلطان نے بنائی ہیں "سپوږمۍ کړنګ وهه را ځیږه" انگریزی ترجمہ کے ساتھ، یہ منظوم ترجمہ بھی پادری اکولڈسن نے خود کیا ہے۔ (۳) An introduction to Pashto.. پشتو کی درسی کتاب ہے اس میں ۲۹ اسباق ہیں اسکے علاوہ پشتو حروف اور انکی ادائیگی اور اس زبان کی گرامری ساخت پر ۴۸ صفحوں پر مشتمل قواعد بھی دیئے گئے ہیں۔ انگریزی جاننے والے پشتو کے مبتدیوں کے لئے یہ ایک بڑی اچھی ابتدائی کوشش ہے۔

۱۹۶۶ء میں خوشحال خان خٹک کے تراجم ۱۹۶۷ء میں سپوږمۍ کړنګ وهه را ځیږه" اور ۱۹۶۸ء میں An Introduction To pashto چھپی ہیں۔ جن پشتون محققین اور ادیبوں نے انکے ساتھ اس کام میں اعانت کی ہے۔ ان کے اسماء انکی کتابوں میں موجود ہیں۔

اس مستشرق کی ایک اہم کتاب رحمان بابا کے منتخب کلام کا منظوم انگریزی ترجمہ ہے۔ اس میں ایسی پچاس غزلیں ہیں جن سے اسلامی تصوف کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ موصوف نے یہ ترجمہ نہایت عرق ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ اور مدت مدید تک اسکے لئے اس موضوع کا عمیق مطالعہ کرتے رہے۔ وہ تمام اصطلاحات، استعارے اور تشبیہات جو اس قسم کی شاعری میں عہد قدیم سے بروئے کار لائی جاتی رہی ہیں۔ سب کے سب ظاہری اور اصطلاحی معانی کے ساتھ زیر نظر ہیں۔ اور ان پر بہت بحث و تمحیص بھی کی ہے۔ اسی طرح رحمان بابا کے دیوان میں بعض اشعار

جو ایک مدت سے غلط پڑھے جاتے تھے وہ بھی بڑی کاوش کے ساتھ کئی قلمی دواوین کے موازنہ اور تقابل کے بعد صحیح کئے جیسا یہ شعر جو اکثر مطبوعہ دواوین میں یوں آیا ہے۔ ؎

پہ عیسیٰ او پہ دجال کښے گناہ نشتہ

دا مکرونہ دی د نفس او د شیطان

انہوں نے اس شعر کی تصحیح یوں کی ہے ؎

پہ عیسیٰ او پہ جمال کښے گناہ نشتہ

دا مکرونہ دی د نفس او د شیطان

اس شعر کا پتی پہلی شکل میں جمال خان اور گل خان کے تاریخی المیہ کے سیاق وسباق کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں تھی۔ لیکن دوسری شکل میں یہ اس المیہ سے اخذ شدہ مکمل نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ اور رحمان بابا کی شاعرانہ عظمت اور متصوفانہ روح پر دال ہے۔ اسکے علاوہ اس مستشرق نے بعض علمی اور تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں جو مقالے "ڈنمارک کا خوشحال" اور "رحمان بابا کی پہچان" پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کے تحقیقی مجلہ پشتو میں شائع ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ انکے بعض دوسرے مقالے اور تحقیقی مضامین "PESHAWAR TIMES" "جنن خیبر" کے کتابچے اور ڈنمارک کے مختلف اخباروں اور جرائد میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ جو بیشتر پشتو ادب اور پشتون تاریخ کے بارے میں ہیں۔ پادری جنز انولڈسن، کوپن ہیگن یونیورسٹی میں کچھ مدت کے لئے پشتو زبان کے اُستاد بھی رہ چکے ہیں۔

اس مستشرق کا دوسرا اہم کام "پشتو لٹریچر سروس" کا قیام تھا۔ اسکے ذریعے سے اُنہوں نے پشتو کتابوں کی دُکان ایک ویگن میں کھول رکھی تھی۔ یہ دکان تمام صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہ خود چلایا کرتے اور پشتو کتابیں فروخت کرتے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ارباب روڈ پشاور صدر میں اسی نام سے ایک دُکان کھولی۔ مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ کاروبار آخر بند کرنا پڑا۔

جنز انولڈسن کی اپنے ملک کو واپسی کے بعد ایک نوجوان لارنس ہیڈلینڈ پشتو لٹریچر سروس کا منیجر مقرر ہوا۔ اس ادارے نے تورات کا خلاصہ، زبور اور دیگر صحائف سمیت چھاپے، اور

پشتو زبان سیکھنے والوں کے لئے پشتو کلاسوں کا اجراء بھی کیا۔ ان مذکورہ مستشرقین کے علاوہ روس کی مشرقی زبانوں کے تحقیقی اداروں اور ملی مراکز میں پشتو زبان اور ادبیات کے بڑے بڑے محققین اور مدرسین نے جنم لیا ہے۔ جنہوں نے نہ صرف اس زبان اور اسکی ادبیات کی تحقیق اور تدقیق کی ہے۔ بلکہ اس میں لغت سازی اور گرامر جیسے بڑے اہم کام سرانجام دیئے ہیں۔ ان مستشرقین نے پشتو کے جدید وقدیم ادب کلاسیکی اور عوامی نغموں پشتونوں کے لوک گیتوں اور تاریخ کے ضمن میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور پشتو کی بعض کتابوں یا انکے چیدہ چیدہ حصوں کے تراجم بھی کئے ہیں۔ روس کے موجودہ دور کے نامور مستشرقین میں جناب نکولائی دور یانکوف جناب عارف عثمانوف۔ م۔گ اسلانوف۔ منانوف۔ محترمہ گراسیموا۔ جی۔ بیچیکاف اور محترمہ گ۔د۔ لبیدیوا خاص شہرت رکھتی ہیں۔ امریکہ کے مشیگن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی سی ایڈورڈز نے پشتو ضرب الامثال کے مجموعے کے انگریزی ترجمے میں مؤلف کتاب ہذا مدد کی ہے۔

پشتو میں لغت سازی

پشتو میں لغت سازی کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں ہوا ہے۔ اس وقت تک پشتو کلاسیکی ادب نے اپنے تمام ارتقائی منازل طے کرلئے تھے۔ اونچے درجے کے صاحب دیوان شعراء کے کلام کی بیاضیں اور دیوان اس زبان میں کافی زیادہ ہوگئے تھے۔ منظوم داستانیں اور افسانے بدلہ اور مثنوی کی صنف میں خاص طور پر خاصی تعداد میں لکھے گئے تھے۔ پشتو شعراء اپنی فکری وفنی خوبیوں اور زبان کی رنگینی اور تاثیر کے ساتھ پشتونوں کی ذہنی نشو ونما کے لئے بروئے کار لایا جاتا تھا۔ نثر نویسی کا رواج بھی شعر وشاعری کے ساتھ متوازی جاری تھا۔ اگر ایک طرف روشانیوں اور اخون درویزہ بابا کے مسلک کی الگ الگ جماعتیں دو الگ مکاتب فکر کے اچھے اچھے شعراء کے افکار کی ترقی و پرورش کا باعث بنی تھیں۔ اور صوفیانہ شاعری نے پشتو کے چمن کو گل وگلزار بنا رکھا تھا،

تو دوسری طرف پشتو نثر میں بھی ایسے علوم کو رواج دیا گیا تھا کہ بحیثیت پشتون و مسلمان ہر مرد و زن کے لئے اُن کا حصول لازم تھا۔ خیر البیان اور مخزن کے مکاتب فکر آج بھی "پشتونخوا" کے مذہبی عقائد کے دو واضح راستے شمار ہوتے ہیں ان کی رو سے پشتو میں فن تاریخ اور اخلاقیات پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن خوشحال خان خٹک کے گھرانے نے (اپنی جگہ) اِس لحاظ سے سب سے ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پشتو زبان و ادب پر خان علیین مکان خوشحال خان خٹک اور اُن کی اولاد نے سب سے زیادہ احسان کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اُس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ؎

کہ د نظم کۀ د نثر کہ د خط دے
پہ پښتو ژبہ مے حق دے بے حسابہ

"نظم، نثر اور خط کے لحاظ سے میں زبان پشتو پہ بہت زیادہ حق رکھتا ہوں"۔ تو اُن کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف درست ہے۔ اس لئے کہ یہ نہ تو محض شاعرانہ تعلّی ہے اور نہ یہ کہ انہوں نے فقط شاعری کی حد تک پشتو زبان کی خدمت کی ہے حقیقت یہ ہے کہ اُنکے خاندان نے نظم و نثر کے میدان میں پشت در پشت یہ عمل جاری رکھا۔ اور پشتو زبان کے لئے ان اکثر مروجہ علوم کے راستے وا کئے ہیں جو اس زمانے میں فارسی اور عربی زبانوں میں مقبول اور رائج تھے۔ شعر و شاعری کے تمام رائج اصناف سخن اور افسانوی ادب کے علاوہ تصوف، اخلاقیات، تاریخ سوانح، طب، سیاست اور سفرنامہ وغیرہ نظم و نثر کے بہت سے موضوعات پشتو میں منتقل کئے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ خوشحال بابا کی موجودگی میں کچھ علمی اور ادبی قسم کی بحث جاری تھی۔ خان کے ایک بیٹے صدر خان خٹک نے اِس مباحثے کے بارے میں کہا ہے۔ ؎

"یوہ ورځ پہ اشتغال وو | دا اشعار پہ قیل و قال وو
ھغہ دم لہ عاشقا نو | لہ ریښتونو صادقانو
مذکورہ پیش شو ناگہانہ | ما عرض اوکړو لہ زبانہ
دیر اشعار لہ هرہ بابہ | کتابت شو بے حسابہ

د عشّاقو افغانانو د ماضیو عاشقانو
کتاب بویه چه نکاږشی ورو ستو یا تو یو یادگارشی"

" ایک دن عام محفل میں شعر و شاعری کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اس بحث میں عاشقانِ صادق کے بارے میں بھی تذکرہ چھڑ گیا۔ تو میں نے عرض کیا کہ عشق کے ہر باب کے متعلق بہت سے اشعار لکھے گئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ماضی میں گذرے ہوئے افغان عشاق کے احوال پر بھی کوئی کتاب لکھی جائے تاکہ پسماندگان کے لئے ایک یادگار باقی رہ جائے"

اسی طرح بہت سے وہبی اور کسبی علوم کو پشتو نظم و نثر ہر دو میں متعارف کر دیا گیا۔ پشتو زبان کے ساتھ اس خاندان کا علمی اور ادبی تعلق پشت ہا پشت سے چلا آرہا تھا۔ لیکن اس سارے زمانے میں شعر و شاعری کی طرف عمومی رجحان اور میلان عملاً زیادہ رہا۔ اور جیساکہ گذشتہ مبحث میں کہا گیا ہے غازی بادشاہ احمد شاہ ابدالیؒ "دُرِ دُران" کے زمانے تک بھی اسی قسم کے بیاض، دیوان اور مثنویاں لکھنے اور مرتب کرنے کو زیادہ فوقیت حاصل رہی۔

اس سارے زمانے میں جب سے پشتو ادبیات کی معلوم شدہ تاریخ کا آغاز ہوتا ہے یعنی امیر کروڑ پہلوان کے زمانے سے لے کر احمد شاہ بابا کے زمانے تک پشتو میں لغت نویسی کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوا اور پشتون اہل علم کی لغت دانی کا محور محض عربی فارسی لغات اور قاموس رہا گویا ان کتابوں سے اخذ اور استفادہ اُنکے لئے کافی تھا۔ اس لئے کہ فقط یہی دونوں انکی نگاہ میں علمی زبانیں تھیں اور پشتو جیسے کہ اُن کے خیال کے مطابق اُس علمی معیار کی حامل نہ تھی جو معیار لغت سازی کے لئے لازمی تھی۔

اس قدر طویل دور کے باوجود کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ پشتو زبان کا ایک فرہنگ نامہ تیار کرنا ایک اہم ترین علمی و ادبی کام ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمانے کی بے اعتنائی اور بے خبری کی وجہ سے پشتو زبان کے وہ اکثر نادر اور صاف ستھرے الفاظ جو اس زبان میں مدت مدید سے موجود تھے۔ عربی فارسی اور دوسری غیر زبانوں کے متبادل لغات کی وجہ سے آہستہ آہستہ نیست و نابود ہو گئے۔ تاریخ کے المیہ نے پشتو زبان پر ایسا اثر کیا کہ اس زبان کے اپنے وجود کی طرف بھی شک و گمان کی انگلیاں اٹھائی گئیں اور یوں

بات اس حد تک پہنچی کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے ماہرین لسانیات اور تاریخ ادبیات کے محققین کو یہ زبان ایک الجھی ہوئی گتھی کے مانند نظر آئی اور اگر اس میں کسی ایک کو آریائیت دکھائی دی تو دوسرے کو سامیت۔ بعض نے اگر یہ خیال کیا کہ یہ زبان پہلوی زبان کی بیٹی یا بہن ہے تو کسی نے ژند اور اوستا کا ناتا اس سے جوڑ دیا۔ اگر کبھی کسی نے اسکے ساتھ سنسکرت کا رشتہ استوار کیا تو کبھی یہ شینائی اور کشمیری زبانوں کی صف اور قرابت داری میں شامل کر لی گئی۔ مختصر یہ کہ پشتو کا اپنا وجود اور اس کی اپنی انفرادیت ایسی معدوم ہو گئی جیسے کہ اس زبان کی کوئی اپنی خصوصیت اور اصلیت تھی ہی نہیں۔

خوشحال بابا واقعی ایک عظیم فرہنگ دان تھے اس لئے کہ کوئی بھی آج تک نہ تو انکی طرح پشتو زبان میں طرح طرح کے لغات استعمال کر سکا اور نہ شاید آئندہ کوئی کر سکے گا۔ انکے پائے کا عظیم فرہنگ دان مشکل سے پیدا ہوگا۔ لیکن اسے پشتو زبان کی بدقسمتی ہی کہیئے کہ اس زبان کی شعر و شاعری کے عروج کے اس زرین دور میں جبکہ اس میں ایسا نابغۂ عصر پیدا ہوا تھا اس زبان کے قاموس یا لغت نامہ تحریر کرنے کی طرف کسی کو خیال تک نہ آیا۔ یوں متقدمین کے دو مکمل دور گذر گئے۔ لیکن پشتو زبان کا ایک لغت نامہ بھی کسی نے مرتب نہیں کیا۔

میجر راورٹی نے یوسفزئی کی قدیم ترین کتابوں میں دفتر شیخ ملی اور تواریخ خان کجو کے ساتھ اخون درویزہ کے تذکرے کے حوالے سے صراح نامی ایک کتاب کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن یہ معلومات ہم نہ پہنچا سکے کہ اس کتاب کا اصل موضوع کیا تھا! اخون درویزہ صاحب نے بھی اس کتاب کے موضوع کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ اور نہ ہی یہ وثوق سے معلوم کیا کہ وہ کتاب پشتو میں تھی یا کسی دوسری زبان میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انکی معلومات محض حوالے کی حد تک تھیں۔ صراح کے نفس مضمون پر خود اخون درویزہ کی خاموشی اور پھر میجر راورٹی کے استدلال کے فقدان کی وجہ سے یہ کتاب محض قیاساً یوسفزئیوں کی قدیمی کتابوں میں سے ایک خیال کی گئی ہے۔ شاید مذکورہ صراح "صحاح جوہری" سے اخذ شدہ عربی لغت نامہ ہو۔ جس کی توضیح الفاظ اور تشریح فارسی میں ہوئی ہے۔ یہ ابوالفضل محمد بن عمر بن خالد المعروف جمال قریشی کی تالیف ہے جس کا پشتو زبان سے کوئی تعلق نہیں[1]۔

---

[1] اسلامیہ کالج مکتبہ شرقیہ کی فہرست میں ملاحظہ کیجئے صراح۔

"گولڈن شیٹ کی لغت"

یوں تو پشتو میں لغت نامے لکھنے کا رواج انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا لیکن ایک ڈکشنری اُن میں ایسی بھی ہے جسے روسی علوم شرقیہ کے مرکز کے لئے ایک مستشرق گولڈن شیٹ نے تیار کی تھی۔ اور ۱۹۶۸ء میں سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) سے شائع کی گئی۔ غالباً یہی پشتو زبان کی اولین شائع شدہ لغت ہے۔

"ریاض المحبت"

مقامی لوگوں میں یا پھر یوں کہیئے کہ ہندی النسل پشتونوں میں اس میدان میں روہیل کھنڈ کے پشتو محققین نے پہلے پہل کوشش کی ہے۔ اور اُنہی روہیلہ نوابوں کے گھرانے کی لغت سازی کا کام مستقبل کی لغت نویسی کی بنیاد گردانی گئی ہے[1]۔ اس میدان میں نواب حافظ الملک رحمت خان روہیلہ شہید کے دولڑکے نواب محبت خان روہیلہ اور نواب اللہ یار خان روہیلہ ایسے گذرے ہیں جو پشتو لغت نویسی کی تاریخ میں تمام مقامی لغت نویسوں سے پہلے ذکر کے قابل ہیں۔ انکے تالیف کردہ دو لغت نامے ریاض المحبت جو نواب محبت خان کی تالیف ہے ۱۲۲۱ھ مطابق ع ۱۸۰۶ء میں تالیف ہوئی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں یہ فارسی قطعہ لکھا گیا ہے ؎

این تحفہ نسخۂ نو تصنیف شد چو از من — آمد ندا زہر سو صد آفرین و رحمت

اتمام سال آن را ہر گہ ز غیب جستم — تاریخ گفت ہاتف "نو نسخۂ محبت"

"اس نئے نسخے کا تحفہ جب میں نے تصنیف کیا تو ہر طرف سے شاباش اور رحمت سینکڑوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جب میں نے غیب سے اُسکے اختتام کے سال کے بارے میں پوچھا تو ہاتف غیبی نے تاریخ "نو نسخہ محبت" بتائی (نو نسخۂ محبت سے ۱۲۲۱ھ کی تاریخ نکلتی ہے اور یہ تاریخ ۱۸۰۶ء پر منطبق ہوتی ہے۔

---

[1] راورٹی کی لغت کا دیباچہ دیکھئے

کہتے ہیں کہ نواب محبت خان نے سر جارج هلارد بارلو کی خواہش پر یہ لغت نامہ تالیف کیا تھا۔ سر جارج بارلو ۱۸۰۵ء میں برطانوی ہندوستان کے قائم مقام گورنر جنرل تھے۔ اگرچہ نواب محبت خان روہیلہ نے خود اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسکے برعکس ان کے چھوٹے بھائی نواب اللہ یار خان نے عجائب اللغات کے نام سے جو اُردو لغت نامہ لکھا ہے اس میں یہ صریحاً درج ہے کہ یہ جارج بارلو کے لئے دوستی کی سوغات ہے۔

ریاض المحبت کے تین نسخے انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں فہرست کے نمبر یہ ہیں ۲۵۴ - ۵۳ - ۲۵۲ اس کتاب کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ برٹش میوزیم کے نسخے کی فہرست نمبر ۱۰۴ ہے۔ انمیں پہلا نسخہ ۱۸۰۸ء میں نقل ہوا ہے اور دوسرا ۱۸۱۲ء میں نواب علی اکبر خان کے لئے نقل کیا گیا ہے۔

نواب محبت علی خان روہیلہ، فارسی، اُردو اور پشتو زبانوں کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہوں نے اُردو زبان میں ایک مثنوی "اسرار محبت" کے نام سے لکھی ہے اور عربی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ عربی اشعار کے نمونے بھی موجود ہیں۔ ریاض المحبت کے پہلے حصے میں تمہید یا تعارف ہے جسے مؤلف نے "فائدہ" کہا ہے۔ پھر کتاب کے بارہ ضخیم حصے ہیں پہلے حصے میں مشتقات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مشتقات حروف تہجی کے حساب سے ترتیب وار لائے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں متفرقات ہیں۔ اس میں پشتو کے عام اور مروجہ الفاظ کی توضیح و تشریح کی گئی ہے یہ بھی حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں۔ ریاض المحبت بڑی ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب عملاً دو کتابوں پر مشتمل ہے۔ صفحوں کی کل تعداد ۱۰۵۲ ہے۔ اس میں ابتدائی ۱۹۰ صفحات تمہید اور مشتقات کے ہیں۔ اور آخری ۲۶۲ صفحے فرہنگ نامے کے ہیں۔ کتاب کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔ "بیحد تعریف اس ذات بے ہمتا کے لئے ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ جس نے اس دنیا کو رنگارنگ پھولوں اور طرح طرح کے درختوں سے آراستگی و پیراستگی بخشی۔"

ریاض المحبت کے مؤلف اور مصنف نواب محبت خان، نواب حافظ رحمت خان شہید کے

فرزند تھے۔ اپنے والد کی وفات کے وقت چوبیس سال کے تھے۔ صفر کی تیرہ تاریخ ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں ۷۵ سال کی عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اِن کا مزار کشور گنج نامی مقام پر وزیر باغ کے قریب ہے۔ اپنے والد کی خصوصی توجہ کی برکت سے عربی فارسی علوم پر خاصا عبور حاصل کیا۔ وہ سنسکرت اور ہندی زبانوں کے بڑے عالم تھے۔ بہت ذہین اور طبع موزوں کے مالک تھے اور متقدمین کے کلام پر اچھا خاصا عبور اور دسترس رکھتے تھے۔ عربی فارسی، اُردو اور پشتو میں بہت سا کلام بطور یادگار چھوڑا ہے۔ لیکن اس کا زیادہ تر حصہ ۱۸۵۷ء کے دار وگیر کے ہنگاموں میں تلف ہوا۔ پھر بھی بعض تذکروں میں کلام کے نمونے دستیاب ہیں مثنوی اسرار محبت فارسی آمدنامہ۔ اور ریاض المحبت اُنکی تصانیف ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی کلام کے نمونے درج ذیل ہیں[1] ؎

ہوتا ہے ابھی حاصل سب کام محبت کا
دے اُس کو خدا و ندا تو جام محبت کا
بیٹھے نہ ایک ساعت گھر کو چلے ابھی سے
اتنا تو جلد مت تم گھبراؤ میرے صاحب
کاکل میں ہے کہ خط میں پیارے دلِ محبت
کس جا چھپا رکھا ہے بتلاؤ میرے صاحب

"عربی کلام": ؎

اذا لم یبق فی الاسلام آثار — جری من مقلتی دمع کانهار
فقلت لهاتف من یظهر الدین — فجاء الصوت سلطان الجهاندار

اور جب مذہب اسلام میں اثر باقی نہ رہا تو میری آنکھوں سے آنسو نہروں کی طرح بہہ گئے۔ میں نے ہاتف غیبی سے پوچھا کہ دین کو کون غالب کر سکے گا۔ تو مجھے سلطان جہاندار (احمد شاہ ابدالی)

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے حیات حافظ رحمت خان مصنفہ سید الطاف علی بریلوی ص ۳۰۲

کی آواز سنائی دی ۔"

فارسی کلام :۔

ز سوزِ اندرونم دیدۂ گریان شود پیدا
تعجب زین تنورم ہست گر طوفان شود پیدا
بہ صحرائے محبت از تو در دیوانگی افزون
کہ می دانست اے مجنون محبت خان شود پیدا

"اندرونی جلن دیدۂ گریان کو جنم دیتی ہے ۔ یہ محبت تندور ہے کہ جس سے طوفان پیدا ہوتا ہے۔ محبت خان صحرائے محبت میں تجھ سے بڑھ کر نکلا ۔ اے مجنون یہ کون جانتا تھا کہ ایک روز محبت خان بھی پیدا ہوگا۔"

عزیزم دارد آن یوسف کہ گوید
کسے شاید کہ خوابے دیدہ باشد

"کون کہتا ہے کہ وہ یوسف مجھے عزیز رکھتا ہے ۔ شاید کہ کسی نے خواب دیکھا ہوگا۔"

قلندر بخش جرأت :۔ اپنے وقت میں اردو زبان کے مشہور شاعر اور نواب محبت خان کے استاد تھے ۔ ہمیشہ انکی صحبت میں رہا کرتے تھے ۔ وہ کہتے ہیں

بسکہ گلچین تھے سدا عشق کے ہم بستان کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خان کے

میجر راورٹی نے اپنی پشتو انگریزی ڈکشنری اور پشتو گرامر کی تالیف میں انکی کتابوں سے خصوصی استفادہ کیا ہے ۔

"عجائب اللغات" نواب محبت خان کی ریاض المحبت کی تالیف سے لگ بھگ چودہ

سال بعد انکے چھوٹے بھائی نواب اللہ یار خاں نے "عجائب اللغات" کے نام سے ایک اور لغت نامہ لکھا۔ پہلی کتاب کیطرح اسکی تشریح بھی فارسی میں ہے۔ لیکن ہندی مترادفات بھی ساتھ لائے گئے ہیں۔ برٹش میوزیم میں اس کتاب کا جو قلمی نسخہ موجود ہے اس پر یہ عبارت لکھی گئی ہے۔ "عجائب اللغات اللہ یار خان ابن نواب حافظ الملک نواب حافظ رحمت خان نوشتہ ۱۲۲۲ھ اور سہواً یہ بات بھی بڑھائی گئی ہے کہ " درعلم لغت اردو را فارسی کردہ" لیکن اوپر یہ عبارت لکھی گئی ہے "کتاب عجائب اللغات زبان پشتو تالیف رحمت خان بہادر مرحوم معرفت نواب محمد ابراہیم خان خلف نواب صاحب موصوف بہ نظر حضور درآمد بپاس دوستی فی مابین حضور و نواب صاحب کتاب مسطور قبول افتادہ بتاریخ سیوم ماہ جولائی داخل کتب خانہ سرکار شد (محررہ سیوم شہر رجب ۱۲۳۷ھ "[1]

۱۱۷۴ء میں اپنے والد کی شہادت کے وقت نواب اللہ یار خان اکیس سال کے تھے بعد ازاں کچھ مہینے اوپر ساٹھ سال مزید زندہ رہے۔ نو شعبان، ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء کو اسی (۸۰) سال کی عمر میں وفات پائی بڑے نیک اور خوش خلق انسان تھے۔ ظرافت بھی انکی طبیعت کا ایک حصہ تھی۔ کہتے ہیں کہ اگر اللہ یار خان کے لطائف جمع کئے جائیں تو انکی ایک الگ کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ موصوف ایک بلند پایہ عالم اور محقق انسان تھے۔ عجائب اللغات نامی پشتو فارسی لغت ہندی مترادفات کے ساتھ انکا ایک علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے آپ اردو پشتو اور فارسی زبانوں کے شاعر بھی تھے۔ کلام کا کچھ نمونہ عجائب اللغات کی تمہید میں نواب حافظ رحمت خان شہید کی تاریخ شہادت کے سلسلے میں موجود ہے۔ پشتو قطعہ یہ ہے ؎

چہ حافظ رحمت شہید شو پہ ژړا شو هر سړے
افزون لہ ډیره درده پہ نارو شو پہ هئ هئ

---

[1] عجائب اللغات فوٹو سٹیٹ کتب خانہ پشتو اکیڈیمی۔

ــه زړهٔ په فکو دتاریخ کښے مستغرق وم ناګهانه
هاتف غږ کړو چه "رحمت وو دنبیٔ امت د ے" ۱۱۸۸ھ

"جب حافظ رحمت شہید ہوا تو ہر شخص رونے لگا - اور شدّتِ غم سے آہ فغاں کرنے لگا۔ میں تاریخ وفات کے فکر میں مستغرق تھا کہ ہاتف نے اچانک آواز دی کہ نبی کی اُمت کے لئے اُنکی ذات باعث رحمت تھی۔ (۱۱۸۸ھ)

نواب اللہ یار خان خود لکھتے ہیں کہ جب ۱۲۲۳ھ میں اُنکے بڑے بھائی نواب محبت خان نے وفات پائی۔ تو اُس علاقے میں ایسا کوئی اور نہیں تھا۔ کہ جو میرا دل اُسکے ساتھ بہلتا اور زندگی کے شب و روز مصروفیت کے ساتھ گذار سکے۔ اس لئے یہ بہتر سمجھا کہ خود اپنے آپ کو بہلائیں اور ایک ایسا کام شروع کریں۔ کہ مصروفیت بھی ہو اور یادگار بھی۔ یوں اس مثنوی کی تعلیم پر عمل پیرا ہوا۔

به شغلے میتوان کوشید بارے — که هم شغلے بود هم یادگارے
برد نفعے از و هر کس که جنبد — ز گلزارش گل اُمید چیند

"کبھی تو انسان ایسے شغل میں بھی مصروف رہے کہ شغل بھی ہو اور یادگار بھی، جو بھی کوشش کرے اُس سے فائدہ اُٹھائے اور اُسکے باغ سے گلِ اُمید چُنے۔"

یہ تھا پشتو زبان اور لُغت نامے کی تالیف کا سبب جو اسی گھرانے کے ایک اور محقق نے تالیف کیا تھا، اور جو عجائب اللغات کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کتاب کے دو قلمی نسخے فہرست نمبر ۵۱۷ اے۔ او۔ آر ۱۹۰۴ پر برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں۔ ان دونوں مذکورہ کتابوں کی مائیکرو فلم اور فوٹوسٹیٹ منقول پشتو اکیڈیمی پشاور نے برٹش میوزیم کے کتب خانے سے حاصل کی ہیں۔

خیالات زمانی:- پشتو فارسی کی ایک اور لُغت کی کتاب خیالاتِ زمانی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب بھی نایاب ہے۔ لیکن اِس کا ایک قلمی نسخہ نمبر ۲۴۵۰۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ کتاب "خیالات زمانی" میں کل تین مقالے ہیں۔ تیسرے مقالے کے

موضوع کے بارے میں تمہید میں لکھا ہے "مقالہ سوم از کتاب خیالاتِ زمانی در لغاتِ زبانِ افغانی بہ ترتیب حروف تہجی کہ از حرف اول باب مراد و از ثانی فصل باشد"۔

یہ لغت نامہ لفظ آوارہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں کئی صفحے خالی یا نامکمل ہیں۔ ڈاکٹر میکنزی لکھتا ہے کہ "یوں لگتا ہے جیسے یہ قلمی نسخہ اس کتاب کا پہلا مسودہ ہو اس میں ترتیبِ الفاظ حروفِ تہجی کے لحاظ سے ہے۔ اور اس موضوع پر دو فصلیں ہیں (۱) فصل در حروفِ تہجیّ (۲) فصل در تجویز رد کردن حروف ہجانہ بہ اصل خود ہا"

پشتو حروف اور رسم الخط کے سلسلے میں اس کتاب کے مؤلف کریم داد ابن اخوند درویزہ کا سارا بیان نقل کیا ہے اور بعض حروف کی متروک شکلوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جیسا کہ یہ مؤلف لکھتا ہے "مرزا خان انصاری کے دیوان میں ځ یا څ لفظ ډ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں عربی زبان میں بعض سوالات اور اسکے جواب بھی لکھے گئے ہیں۔ اس بارے میں لکھا ہے "یہ شیخ احمد کے فرمودات ہیں۔ کتاب لکھنے کی تاریخ یا لکھنے والے کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس سبب سے اس کی قدامت کے بارے میں رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ یہ نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں انیسویں صدی سے محفوظ ہے[۱]

"آئینۂ الفاظ و معانی"

یہ محمد اسمٰعیل کی تالیف ہے، جو ہزارے میں ڈوڈیال نامی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس کتاب میں پشتو مصطلحات مع اردو ترجمہ اکٹھے کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سال ۱۸۸۳ء میں پہلی بار ایبٹ آباد میں چھپی ہے۔ ایک شائع شدہ نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے[۲] اور بلوم ہارٹ کی فہرست میں اس کا ذکر آیا ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل کے بارے میں جو

۱۔ دیکھئے فہرست ڈاکٹر میکنزی ص ۵۲۔ ۲۔ فہرست نمبر ہے (۱۰) - ۶۰ - ع - ۱۶۳ ۱۴ ہے۔

معلومات میسر آئی ہیں اُنکے مطابق وہ بہرام خان کے بیٹے تھے۔ بہرام خان مکلف خان ابن حسام الدین ابن رحیم الدین ابن محمد گل نجابت خیل ٹُل علی خان خیل، غریب شاہی ملکال تاجک سواتی تھا جس زمانے میں محقق اور مستشرق پروفیسر ڈارمیسٹیٹر ایبٹ آباد میں علمی مشن پر مامور تھا۔ اس زمانے میں محمد اسمٰعیل خان کی ملاقات ان سے ہوئی تھی۔

جیسا کہ کہا گیا ہے مولوی محمد اسمٰعیل خان پنجاب یونیورسٹی کے فیلو، آنریری مجسٹریٹ اور وائسرائے کے درباری تھے۔ یہ پشتو زبان کے ادیب شاعر اور مؤلف تھے۔ آئینۂ الفاظ و معانی کے علاوہ اِنکی دوسری کتابیں (۱) " خزینۂ افغانی " (پشتو انگریزی) (۲) "سوال وجواب افغانی" پشتو کا ذخیرۂ الفاظ اور پشتو بات چیت مطبوعہ لاہور ۱۸۹۰ء (پشتو انگریزی) (۳) گفتگوئے افغانی با ترجمۂ ہندوستانی ۱۸۸۳ء مطبوعہ ایبٹ آباد (۴) قصہ ہرنی بزبان افغانی یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ہرنی کا قصہ۔ یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں بمقام ایبٹ آباد چھپی ۔ قاضی عبدالحلیم اثر افغانی[1] کے مطابق ان کی کچھ اور کتابوں مثلاً افغانی کی پہلی اور دوسری کتاب، (جو اُنکی وفات کے بعد ۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ میں چھپی ہیں) کے علاوہ دو کتابیں اور ہیں جن میں ایک قواعد صرف ونحو پشتو، گرامر کی کتاب ہے۔ اور دوسری پشتو بول چال سیکھنے کی کتاب ہے۔ محقق اثر کہتے ہیں کہ مولوی محمد اسمٰعیل کی اِن علمی اور ادبی کاوشوں سے اُنکی علمیت اور پشتو زبان و ادب کے ساتھ اُنکی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے "۔

مستشرق جیمز ڈارمیسٹیٹر نے اُنکے تبحر علمی سے اپنی تحقیقی کاوشوں میں بڑی مدد لی ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل خان گیارہ جون سال ۱۸۹۵ء میں فوت ہوئے۔

"آمدنامۂ افغانی" یہ پشتو مصادر افعال و لغات کا مجموعہ ہے اس کتاب کی ایک نقل انڈیا آفس کے کتب خانے کے قلمی نوادرات میں موجود ہے۔ یہ رامپور میں لکھی گئی ہے۔ موجودہ

---

[1] مقالہ قاضی عبدالحلیم اثر ماہوار رسالہ "اولس" نومبر دسمبر ۱۹۶۲ء

نسخہ اُنیسویں صدی عیسوی کا ہے۔ ابواب حروف تہجی کے حساب سے ہیں اور آغاز یوں ہے[1]۔
باب الف۔ مصدر۔ اچول۔ ماضی واچو (واچاو)۔ ھغہ یا ھغے واچاؤ ھغہ واچاؤ۔
تا واچاؤ۔ تاسو واچاؤ۔ موبزہ واچاؤ۔ مضارع وابہچوی وغیرہ۔

افعال کو حصوں کو تقسیم کرکے حروفِ تہجی کی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ ہر حصے کے آخر میں مزید الفاظ جو اُسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہید کے طور پر ترتیب دیئے گئے ہیں۔ مصدر۔ ماضی مضارع۔ فاعل۔ مفعول امر و نہی کی تفصیل بھی ہر فعل کے سلسلے میں دی گئی ہے۔ اور ساتھ ساتھ فارسی مترادفات بھی سرخ سیاہی سے لکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ التزام صرف کتاب کے پہلے پانچ ابواب میں برقرار رکھا گیا ہے۔ اسکے بعد ترتیب اسماء ہے ان میں خاندان، قرابت داری، اساسی شمار، جانوروں، پرندوں کے نام۔ اعضائے جسمانی۔ کپڑے جوتے۔ زیورات وغیرہ کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے تحریر ہیں پھر فصلی مہینوں اور انکے فارسی مترادفات کے ناموں کی فہرست ہے۔ کتاب کے آخر میں خاتمے کے کلمات کچھ یوں ہیں: "تمت تمام شد۔ آمدنامۂ افغانی در قصبۂ مصطفیٰ آباد عرف رامپور بوقت دوپہر روز شنبہ اتمام رسید"۔

اس قلمی نسخہ کے آخر میں منصور اور گل میر نامی دو شعراء کی غزلیں بھی ہیں۔ ان دونوں شعراء کا ذکر پشتون شعراء کے تذکروں میں نہیں آیا۔ غالباً یہ دونوں شاعر رامپور یا روہیل کھنڈ کے کسی دوسرے مقام پر قیام پذیر تھے۔ "آمدنامہ" دراصل پشتو لغت نامہ اور گرامر کا مشترکہ مجموعہ ہے۔ اُس وقت کے تقاضوں اور ضرورت کے مطابق اُس میں الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔

"فارسی۔ پشتو لغت" اسی طرح پشتو الفاظ اور اصطلاحات کی ایک اور فہرست PERSIAN PASHTO GLOSSARY فارسی مصادر کے معنوں میں پشتو مصادر اور دیگر

---

[1] ڈاکٹر میکنزی کی تیار کردہ پشتو کی قلمی کتابوں کی فہرست ص ۵۱

افعال لائے گئے ہیں۔ یہ بھی حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں۔ ان میں اکثر وہ مصادر ہیں۔جو عام استعمال میں بہت آئے ہیں۔ اس کتاب کا کوئی خاص نام نہیں ہے اس لئے اسی نام سے یاد کی گئی ہے۔ یہ کتاب انڈیا آفس کی قلمی کتابوں میں ایس ۲۸۹۵ کی نمبر پر موجود ہے۔ یہ بھی انیسویں صدی عیسوی کی کتاب ہے۔ لیکن مؤلف کا نام معلوم نہیں۔

"فرہنگ ارتضائی" اس دور کے پشتو لغت ناموں میں ایک اور اہم کتاب جو غالباً ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ فرہنگ محمد ارتضی خان عمر خیل ولد نواب امان خان عمر خیل کی تالیف ہے۔ جو امیر الامراء نواب نجیب الدولہ بہادر عمر خیل کے چچازاد بھائی تھے اور نسب کے لحاظ سے یوسفزئی پشتون تھے وہ ہندوستان میں مقیم ہو گئے تھے۔ محمد ارتضی خان اپنی اس قاموس کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ "یوں تو عربی فارسی زبان میں بہت اچھے فرہنگ اور صرف و نحو کی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس میدان میں پشتون زبان میں کسی نے بھی کوئی کام نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ نواب محبت خان نے الہ آباد کے قلعے میں قید و بند کے دوران "ریاض المحبت" کے نام سے جو فرہنگ مرتب کی تھی ارتضی خان مؤلف فرہنگ ارتضائی کو اُس کا علم نہیں تھا۔ اس لئے یہ کہا ہے کہ اس سے قبل کسی ایک مؤلف نے بھی پشتو لغت نامہ مرتب نہیں کیا۔ محمد ارتضی خان کہتا ہے کہ "اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میں نے یہ کتاب لکھی۔"

اگرچہ ارتضی خان کی یہ آرزو تھی کہ پشتو زبان کی ایک ایسی قاموس مرتب کر لیا۔ جو ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ مگر وقت کے نامساعد حالات نے اُنکی یہ خواہش کافی عرصے تک پوری نہ ہونے دی۔ اور ناسازگار حالات کی وجہ سے اس اہم کام نے طول پکڑا۔ آخر جب کچھ عرصے کے

لہ فہرست کتب بانکی پور پبلک لائبریری مطبوعہ ۱۹۲۵ء (پشتو اکیڈمی کتب خانہ)

کے بعد ارتضیٰ خان دہلی میں رہائش پذیر ہونے کے لئے آئے تو راجہ پیارے لال کے مشورے پر وہ ایک دفعہ پھر اسی کوشش میں لگ گئے۔ اور پشتو الفاظ، مشتقات اور محاوروں کو جمع کرنے انہیں ترتیب دینے اور انکی صحیح تشریح کرنے میں مشغول ہوگئے جب یہ ادھورا کام مکمل ہوگیا تو اس کا انتساب مسٹر ادجیبالڈ سٹین کے نام اِن الفاظ میں کیا" صاحب سیف والقلم ناظم الدولہ سیف الملوک دوستدار خان مسٹر ادجیبالڈ سٹین بہادر شہامت جنگ"۔

یہ کتاب ۱۶۶ ابواب پر مشتمل ہے اور شروع میں پشتو کے اسماء ترتیب وار لائے گئے ہیں۔ مثلاً سرتاپا انسان کے اعضائے جسمانی کے نام جانوروں اور مویشیوں کے اسماء۔ غلہ پودوں اور پھولوں کے نام وغیرہ۔ کتاب کے چوبیسویں باب سے مصادر اور مشتقات کی بحث کا آغاز ہوا ہے۔ مصدر۔ ماضی مضارع۔ فاعل۔ مفعول۔ امر و نہی زیر بحث آئے ہیں۔ یہ اصول آمدنامہ افغان میں بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ مشتقات کے استعمال کے لئے جگہ جگہ موزون جملے اور اصطلاحات کو استعمال کرنے کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں اور درمیان میں کئی جگہوں پر فارسی اردو تشریح بھی کی گئی ہے۔ فارسی الفاظ کے لئے "ف" ہندی کے لئے "ہ" اور پشتو کے لئے "پ" کا حرف علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔ پشتو الفاظ موٹے خطِ نسخ میں ہیں اور تشریح خطِ نستعلیق میں کی گئی ہے۔ بانکی پور کی پبلک لائبریری میں فرہنگ ارتضائی کا جو قلمی نسخہ موجود ہے وہ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کا نقل شدہ ہے۔ کاتب عبدالرحمان ہے۔ کتاب کی ابتداء ان الفاظ میں ہوئی ہے" تمہید کہ مقدسان ملائے اعلیٰ بادائے حرفے از طورش بلا احصلی ثناء علیک اختصار نماید"

"راورٹی اور بیلیو کی ڈکشنریاں"

برطانوی دورِ حکومت میں پشتو لغت سازی کی ضرورت مقابلتاً زیادہ محسوس ہونے لگی۔ انیسویں صدی عیسوی میں جن مشہور برطانوی مستشرقین نے اس کام میں پہل کی تھی اُن میں ایک میجر ایچ۔ جی راورٹی اور دوسرا ہنری والٹر بیلیو تھا۔ ان دونوں فاضلوں کا ذکر مستشرقین کے باب میں آیا ہے۔ ان

دونوں نے ضخیم پشتو انگریزی لغت نامے بھی مرتب کئے ہیں۔ بیلیو کی ڈکشنری کا ایک حصہ انگریزی پشتو کا بھی ہے۔ مستشرق راورٹی کی لغت کا سنِ تالیف ۱۸۶۰ء ہے اور بیلیو کی لغت کا سالِ تالیف ۱۸۶۷ء ہے۔ یہ دونوں لغات اگرچہ چھپ چکی ہیں۔ مگر اب بہت کمیاب ہیں اور دوبارہ چھاپی جانی چاہئیں۔[۱]

"فرہنگ آفریدی"

یہ فرہنگ نامہ قاسم علی آفریدی کی تالیف ہے۔ فارسی۔ مصادر اور چند اسماء جامدہ کے ساتھ اس میں پشتو اُردو کشمیری اور انگریزی زبانوں کے ہم معنی الفاظ یکجا کئے گئے ہیں اِس فرہنگ نامے کی ایک نقل اسلامیہ کالج پشاور کی اورینٹل لائبریری میں قاسم علی خان کے کلیات کے ساتھ ایک جلد میں محفوظ کی گئی ہے۔ یہ کتاب میر کلیم الدین نے مصنف کے ساتھ اپنی عقیدتِ خاص اور محبت کی بنا پر نقل کی ہے۔ اسکی نقل کی تاریخ ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء ہے اور جگہ جگہ اس پر مؤلف کی مُہر بھی لگی ہے۔

بیسویں صدی میں لغت سازی کے کام کو مقابلتاً زیادہ توجہ دی جانے لگی اس صدی کی ابتدائی پشتو ڈکشنریوں میں ایک خیر اللغات پادری خیر اللہ کی تالیف ہے۔ دوسری ڈکشنری مرحوم راحت زاخیلی کی جو لغات افغانی "کے نام سے تالیف کی گئی ہے۔ لغت کی یہ دونوں کتابیں اب نہایت کمیاب ہیں۔

"انوار اللغات کا مسوّدہ"

شیدو کے جناب سید انوار الحق نے ایک پشتو لغت مرتب کرنی شروع کی تھی اور وہ "انوار اللغات" کے نام سے شائع ہونے ہی والی تھی۔ مگر جس وقت پشتو اکیڈمی پشاور کے لئے اُنکی خدمات حاصل کی

---

[۱] راورٹی کا لغت اب چھپ کر بازار میں آچکا ہے۔

گئیں تو لغت کی اشاعت کی جگہ اس کا مسودہ پشتو اکیڈیمی کی لغت سازی کے لئے بروئے کار لایا گیا۔

"گلبرٹسن کے محاورے"

۱۹۲۲ء میں میجر جارج والڈ گلبرٹسن نامی مستشرق نے عارف اللہ یوسفزئی۔ محمود آفریدی اور علی اکبر خان آفریدی کی مدد سے پشتو محاوروں کا ایک مجموعہ PASHTO IDIOMS کے نام سے شائع کیا۔ یہ ڈکشنری دو جلدوں میں ہے اسکے کل ۹۶۲ صفحے ہیں۔

"افغانی لغت نامے"

افغانستان میں پشتو لغت سازی کی ابتداء پشتو کی نشاۃ ثانیہ کی ایک نامور شخصیت محمد گل خان مومند نے کی تھی انکی تالیف "پشتو سیند" پشتو کے عام مروجہ لغات کا ایک عمدہ نمونہ ہے اسکے علاوہ کابل کے "پشتو ٹولنہ" کیطرف سے پشتو قاموس۔ پشتو محاورات۔ پشتو اصطلاحات پشتو ضرب الامثال اور بعض لغات و محاورات کے مجموعے شائع کئے گئے ہیں۔ افغانی لغات میں ایک خاص خصوصاً قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ ان میں بھی جدید ایرانی لغت ناموں کیطرح عربی زبان کے ساتھ تعصب اور غیریت کا سلوک روا دکھایا گیا ہے۔ یہ خامی اس حد تک قبول کی گئی ہے کہ انکی لغات سے اللہ، رسول، اسلام، رب، قرآن، حلال و حرام، حدیث، حق کعبہ اور اسطرح ر، ت، ح، ع، ف، ق جیسے حروف والے سبھی الفاظ کو جو پشتو میں مستعمل ہیں۔ خارج کر دیا ہے۔ اس قسم کا عمل نہ صرف پشتونوں کو اپنے مذہب اور عقیدے سے بیگانہ کرنے کے مترادف ہے بلکہ اسکے ساتھ ان لوگوں کی صدیوں پرانی ثقافتی اور تمدنی زندگی کا جو بندھن ہے۔ وہ اس طریقے سے عمداً ختم کیا جا رہا ہے۔ ایرانی النسل لغت نویسوں کے اس قسم کے رویے کا تاریخی پس منظر تو ہر کسی کو معلوم ہے۔ اور جیسے کہ مولانا شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں لکھا ہے کہ فردوسی کے شاہنامے کی ایک خصوصیت اسکی عرب دشمنی تھی، اور اُن کا یہ جذبہ اس حد تک پہنچا تھا کہ یہ کہے بغیر بھی رہ نہیں سکے کہ۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسیداست کار
کہ تخت کیان را کند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

او نٹنی کا دودھ پینے اور گوہ کھانے والے عربوں کی جرأت اس حد تک پہنچ گئی کہ اب وہ تخت کیان کے خواہش مند ہیں۔ اے گھومنے والے آسمان تجھ پر لعنت ہو۔
لیکن اسکے برعکس تاریخ کے کسی دور میں بھی پشتونوں کے دلوں میں عربوں کے خلاف ایسا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ پشتونوں نے ہمیشہ سے اسلام ہی کو اپنی منزل اور اپنا حصار سمجھا ہے اسلام نے ان کی پشتون ملیت اور قبائلی چارے کو فنا کرنے کی بجائے اس کو عظمت و وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔ عربوں کی طرح پشتون بھی آزاد قبائلی زندگی گذارنے کے عادی تھے۔ مساوات اور برابری ان کا شخصی افتخار تھا۔ وہ تخت کیانی اور شخصی حکمرانی کے عادی نہیں تھے۔ اور نہ ہی کبھی ایرانی نسل کیطرح شہنشاہیت کی روایات کو انہوں نے اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھا پشتون عوام نے تمام عربی فارسی الفاظ، مذہب، عقیدے اور حصول علم کے لئے اپنائے ہیں۔ وہی عربی فارسی الفاظ پشتو کی مستقل اصطلاحات بنی ہیں۔ یہ انکی عبادات، دعاؤں غم و شادی اور ان کے دیگر تمام معاشرتی رسوم میں اس قدر عام استعمال ہوتے ہیں، کہ اگر انہیں کوئی لغت کی کتابوں سے خارج کرنیکی کوشش بھی کرے تو عام پشتونوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ان الفاظ و اصطلاحات کو نابود کرنا اس قسم کے ارادے رکھنے والوں کے لئے سعی لاحاصل کے مترادف ہوگا۔

"ظفر اللغات"

یہ مذکورہ بدعت جناب بہادر شاہ ظفر کاکاخیل نے بھی اپنی کتاب میں ایک حد تک برتی ہے۔ مزید برآں اُردو کے بعض الفاظ کے تتبع میں پشتو الفاظ کی تذکیر و تانیث کے اصول بھی ان الفاظ میں عموماً پامال کئے گئے ہیں۔ اجرت۔ احادیث۔ آخرت۔ حمایت۔ صحت رحلت۔ رحمت۔ صداقت۔ حروف وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کا ماخذ عربی ہے لیکن اردو پشتو دونوں میں استعمال ہوتے ہیں، بجائے اسکے کہ جناب ظفر وہ الفاظ پشتو قواعد کے اصول کے

مطابق تذکیر کے صیغے میں لاتے وہ اپنی تالیف ظفر اللغات میں ہندی قواعد کے تتبع میں اس قسم کے الفاظ تانیث کے صیغے میں لائے ہیں۔ بہر حال ۱۹۵۹ء میں سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ عمومی استعمال کے لئے پشتو کی ایک عمدہ لغت ظفر اللغات کے نام سے لکھی۔ اس میں پشتو کے علاوہ اردو میں بھی الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ جناب ظفر کاکاخیل کے بیان کے مطابق یہ لغت ۲۰ ہزار (۲۰۰۰۰) الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال پر مشتمل ہے۔ اور ہر لفظ محاورے اور ضرب المثل کے معانی اور تشریح پہلے پشتو اور پھر اردو میں لکھی گئی ہے۔ لغت کی یہ کتاب پورے ایک ہزار صفحوں پر مشتمل ہے اس لغت میں جگہ جگہ بعض اشعار بطور سند لائے گئے ہیں۔ اور اس طریقے سے لفظ کے معانی و استناد دونوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

"اردو پشتو لغت" ۱۹۶۰ء میں ترقی اردو بورڈ پاکستان کی جانب سے اردو پشتو کی ایک ضخیم لغت دو جلدوں میں شائع کی گئی۔ یہ دراصل اردو کی ایک لغت نسیم اللغات کا پشتو ترجمہ ہے جو جناب سید انوار الحق، قاضی عبدالحلیم اثر، فقیر محمد عباس، جناب سیف الرحمان سید، اور مولانا محمد اسرائیل کی کوشش کا نتیجہ ہے ترتیب و تدوین کا زیادہ تر کام سید انوار الحق جیلانی نے کیا ہے۔

"پشتو نامہ" اسی ادارے کی طرف سے پشتو کے مخصوص الفاظ کا ایک مختصر سا مجموعہ "پشتو نامہ" کے نام سے تیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح اور مطلب اردو میں دیئے گئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مخصوص الفاظ آہستہ آہستہ اردو میں رائج کئے جائیں اور یوں اردو کو علاقائی زبانوں کے الفاظ سے شناسا کیا جائے۔

اسکے علاوہ پشتو اکیڈمی کی طرف سے پاکستان کی مرکزی وزارت تعلیم کے لئے " ایک مختصر

---

۱ ظفر اللغات

لغت "، بنیادی پشتو او د کارکسب تمکی " بھی ۱۹۷۵ء میں شائع کی گئی ہے۔

"پُشتو دائرة المعارف" افغانستان میں پشتو دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا پر بھی کچھ عرصے سے کام جاری ہے اس کا نام "پشتو آریانا" ہے۔ اسکی چند جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں ۔جناب جیلانی جلال ۔عبدالرؤف ترتر ۔حفیظ اللہ میدانی ۔گل باچا الفت ۔محمد ابراہیم ثابت ۔قیام الدین خادم ۔عزیز الرحمان سیفی ۔عبدالشکور بیکس ۔ نور محمد ترکی ۔صدیق اللہ خان رشتین پائندہ محمد زہیر ۔محمد شریف ۔عبداللطیف جلالی ۔ عبد القدوس پرہیز عبد الغفور دیانذ ۔محمد موسیٰ شفیق ۔محمد گلاب ننگرہاری، عبداللہ بختانی محمد یونس مراد ۔ غلام رحمان جرار ۔ اور عبد الاحد عارض نے اس اہم کام کی ابتدائی جلدوں میں حصہ لیا ہے ۔یوں پشتو زبان کو علوم جدیدہ کے ہر فن اور ٹیکنیک سے متعارف کرانے کی کوشش کر کے اس زبان میں اس اہم علمی کام کی ابتداء کی ہے ۔اگرچہ زبان اور طرز تحریر کی رُو سے بالائی "پشتونخوا" کی اس قسم کی علمی کاوشیں پائین پشتونخوا کے پڑھنے والوں کے لئے نامانوس انداز کی حامل ہیں، اور یہاں کے پڑھنے والے اس سے زیادہ رغبت نہیں رکھتے پھر بھی زبان کی خاطر انکی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"پُشتو روسی قاموس" ۱۹۶۶ء کے لگ بھگ ایک ضخیم پشتو روسی قاموس تیار کی گئی ہے۔ اس میں پشتو کے کم و بیش ۵۰ ہزار الفاظ ہیں ۔ یہ لغت پشتو زبان کے تمام مذکورہ لغت کی کتابوں سے زیادہ مکمل اور جامع ہے اسے مرتب کرنے والے پروفیسر دوریانکوف اور جناب اسلانوف ہیں ۔ اسکے علاوہ کچھ عرصہ پہلے دو مختصر لغت بھی لکھی گئی ہیں یہ تمام لغت ماسکو میں واقع روس کی مشرقی زبانوں کے مرکز سے شائع کی گئی ہیں [1]

[1] چین کے بیرونی زبانوں کے نشریاتی ادارے کی جانب سے بھی ایک پشتو چینی لغت پر کام جاری ہے۔

"لغت سازی پشتو اکیڈمی میں"

پشتو اکیڈمی پشاور کے مقاصد میں ایک اہم مقصد پشتونوں کے تمام قبیلوں اور علاقوں کے مخصوص لغات اور محاوروں کی ایک ایسی جامع قاموس تیار کرنا ہے جس میں پشتو کے ہر لہجے کو نمائندگی حاصل ہو۔ اس نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھ کر پشتو اکیڈمی کی زیر تالیف لغت پر کام جاری ہے۔ اسکی تیاری میں پشتو زبان کے تمام کلاسیکی، عام مروجہ اور جدید علمی لغات، اصطلاحات، مترادفات اور محاورے مناسب اسناد کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ اسکی وسعت اور تفصیل کی رو سے اس لغت نامے کا نام بھی "پشتو ژبہ" یعنی پشتو زبان منتخب کیا گیا ہے۔

"تمام پشتونخوا" کی ایک مشترک زبان کی اس لغت کو تیار کرنیکا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ وہ تمام الفاظ اور محاورے جن کا بعض قبیلوں میں تو رواج تھا۔ لیکن پشتو لغت ناموں میں شامل نہیں کئے گئے تھے۔ وہ اکثر لغات اسمیں درج کئے گئے۔ بعض اس قسم کے الفاظ مثلاً اشر بلندرہ۔ بگاڑہ۔ ٹینگہ۔ بسکہ ہم معنی ہیں۔ اور خٹکوں کے بارک شاخ، بنوں کے باشندوں، کرم والوں، مروت اور گنڈاپور قبائل کی روزمرہ کی بول چال میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ان لغات میں صرف اشر کی لغت ایسی تھی۔ جو لغت کی کتابوں میں لائی گئی تھی اور باقیماندہ مذکورہ مستعمل لغات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہی کیفیت بڑستن۔ نالئی۔ نہالئی۔ کنجڑ۔ شیرک وغیرہ کی تھی۔ اس طرح سے وہ بہت سے لغات اور محاورے جو اس لغت نامے میں یکجا کئے جارہے ہیں ایک طرف تو زبان کی فراخی اور وسعت کا سبب بنیں گے۔ اور دوسری طرف پشتو زبان، قبیلوں اور خیلوں کی حدبندیوں سے باہر نکل آئے گی۔ اور تمام پشتونخوا میں لہجے کی یکسانیت اور یک رنگی کا باعث بنیگی۔ اس لغت کی تکمیل سے پشتو کی کوتاہ دامنی کا شکوہ باقی نہیں رہے گا۔ اور اس میں شامل شدہ اصطلاحات و مترادفات علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے کام آسکیں گے۔

"پشتو ژبہ" پہلے جناب سید انوار الحق جیلانی کی زیر ادارت ۱۹۵۸ء میں سہ لسانی لغت کی شکل میں شروع کی گئی تھی۔ جناب پریشان خٹک۔ میر شرف خان وزیر اور مولوی محمد اسحاق بھی پشتو اکیڈیمی کی لغت سازی کے اس شعبے سے منسلک تھے۔ لیکن ادارت کے یہ مذکورہ افراد وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہے۔ اس کام میں پیش آنے والی مشکلات کی رو سے ۱۹۶۸ء میں سہ لسانی لغت سازی کا ارادہ ترک کیا گیا۔ اور اسکی جگہ ایک ایسا لغت نامہ تیار کرنیکا آغاز ہوا جو محض پشتو میں ہو۔ اُس وقت کے اکیڈیمی کے ڈائریکٹر اور نئی نہج پر لغت سازی کے کام کے بانی میاں سید رسول رسا اس لغت نامے کی پہلی جلد کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ " میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہزار سال کی مضبوط اور پائیدار حیات کے بعد پشتو زبان کو یہ حق حاصل ہے اور یہ قدیمی زبان اب اس قدر سن بلوغت کو پہنچی ہے کہ قید و بند سے آزاد زندگی کی دعویدار ہو سکے نہ کہ کدو کی بیل کی طرح چنار کی شاخ کا سہارا لے۔ بلکہ اپنی قوت بازو کے بل پر آسمان پر تھگلی لگائے"۔ آگے چل کر رسا صاحب لکھتے ہیں " ہماری لغت کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے۔ کہ ہم نے خالص پشتو سے پشتو میں لغت سازی کی بنا ڈالی ہے اور اگر یہ بدعت ہے تو اس بدعت کی ذمہ داری بحیثیت ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی، میں اپنے سر لیتا ہوں۔ کیونکہ یہ بدعت میرا خیال اور میری ایجاد ہے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب سید انوار الحق نے اس سلسلے میں بڑی محنت کی ہے اور پشتو لغت کے لئے الفاظ کا ایک بہت ذخیرہ اکٹھا کیا ہے۔ اور پھر خصوصیت کے ساتھ "آ" اور "ب" کی پٹی میں بنیادی اور اساسی کام اُنکے رفقائے کار کا تھا۔ جو وقتاً فوقتاً اُنکے ممد و معاون رہے ہیں۔ انہوں نے جانفشانی سے کام کیا لیکن اُنکی سبکدوشی کے بعد میں نے اِس کام کے لئے پُردل خان خٹک کو موزوں اور اہل جانا اور یہ اہم اور ضروری کام اُنکی تحویل میں دیا۔ یہ اس لئے کہ موصوف کافی عرصے تک سید انوار الحق کے معاون رہ چکے ہیں اور لغت سازی کے کام سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ پشتو اکیڈیمی کی لغت "پشتو ژبہ" حرف "خ" تک چھ جلدوں میں مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

اس کی ساتویں جلد پر کام اُن کمر رک گیا ہے ۔ اگرچہ ایک مکمل اور جامع لغت کو تیار کرنے کے لئے بہت سے وسائل اور بڑا عملہ درکار ہوتا ہے ۔ اور باوجود اسکے کہ پشتو اکیڈیمی میں اِس قسم کے اہم کام کا ارادہ کرنا موجودہ برائے نام وسائل اور ذرائع کے پیشِ نظر فرہاد کے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔ پھر بھی اِس ادارے نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے ۔ جو وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے ۔ اور پشتو زبان کے تحفظ کے لئے بہت ضروری ہے ۔ امید واثق ہے کہ اس ادارے میں پشتو زبان کی لغت سازی کا کام اِس ادارے کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر روبہ ترقی ہوگا ۔ اور وہ دن دور نہیں کہ آنے والی نسلیں اپنی مادری زبان کی ایک جامع اور مکمل لغت کی مالک بن جائیں گی ۔ اور وہ اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے بیسویں صدی کے اُن نامور اور جفاکش محنت کشوں کی سعیٔ مسلسل و کاوشِ پیہم کا اقرار کرینگے جنہوں نے رات دن انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنے اِس مقصد کے حصول کے لئے کسی قسم کے لیت و لعل اور کوتاہی سے کام نہیں لیا ۔

مذکورہ لغات اور ڈکشنریوں کے علاوہ زراعت اور جغرافیائی اصطلاحات کی مختصر ڈکشنریوں کا کام بھی پشتو اکیڈیمی پشاور میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے ۔ پشتو ضرب الامثال کی ایک ڈکشنری اُردو ترجمے کے ساتھ دو جلدوں میں تیار کی جا چکی ہے ۔ پشتو کے بنیادی اور پیشہ ورانہ الفاظ کا ایک مجموعہ حکومت پاکستان کی وزارتِ تعلیم کے لئے مرتب ہوا ہے ۔ اسی طرح بنیادی الفاظ کا ایک اور مجموعہ پشاور کے ثانوی تعلیم کے بورڈ کے لئے تیار کیا گیا ہے ۔

اِس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پشتو زبان میں لغت سازی کے میدان میں تھوڑی سی مدت میں خاصا قابلِ قدر کام ہوا ہے ۔ یہ کام اگر مناسب رفتار کے ساتھ جاری رہے تو وہ دن دور نہیں کہ پشتو زبان نہ صرف یہ کہ اپنے اکثر مروجہ الفاظ کے ذخیرے کے مناسب الفاظ کے استعمال کی اہل ہو جائیگی ۔ بلکہ جدید تقاضوں کے مطابق تمام علمی سائنسی اور فنی اصطلاحات کی تشکیل کے لئے بھی راہ ہموار ہو سکے گی اور یہ زبان اپنے بولنے والوں میں جدید علوم کی ترویج و ترقی کا ذریعہ ثابت ہوگی ۔

"پشتو کے قلمی آثار"

پشتو ادب کے دو بڑے حصوں میں ایک حصہ تو عوام کے حافظے میں محفوظ ہے جسے عوامی یا لوک ادب کہتے ہیں ۔ یہ پشتو کے روزمرہ اور محاورے کا جزو بھی ہے۔ اور پشتو ادب کا وہ عظیم اور گرانقدر ذخیرہ بھی جو قصوں اور گیتوں کی شکل میں پشتونوں کی ملی ثقافت اور قومی کردار کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ یہ عہد سے لحد تک پشتونوں کی زندگی کے ساتھ ہر مرحلے پر ان کا ساتھ بھی دیتے ہیں اور اعانت بھی کرتے ہیں ۔ ادب کا یہ حصہ جیسے کہ اس کتاب کی ابتدائی حصے میں وضاحت کی گئی ہے ۔ پشتونوں کے سبھی اقدار و روایات کا امین اور محافظ ہے ۔ اور عہد قدیم سے اس زبان کے تن بدن میں رچا اور بسا ہوا ہے ۔

ادب کا دوسرا اہم حصہ اس زبان کا کتابی ادب ہے جو اس کتاب کا اصل موضوع رہا ہے ۔ تاریخی شواہد کی رو سے تحریر شدہ پشتو ادب کے سب سے پرانے نمونے غالباً نقش رستم کے پتھر کی تحریریں ہیں ۔ لیکن عام طور پر پشتو ادبیات کی تاریخ کے اکثر محقق اور دانشور امیر کروڑ کی حماسی نظم کو جو ۱۳۹ھ مطابق ۷۵۶ء کے لگ بھگ لکھی گئی ہے ، پشتو کے معلوم تحریری ادب کا قدیم ترین نمونہ خیال کرتے ہیں ۔

آٹھویں صدی عیسوی یعنی امیر کروڑ پہلوان کے زمانے سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک پشتو کا تحریری ادب بھی اس زبان کے عوامی ادب کی طرح عام لوگوں کی سرپرستی اور ان کی ذاتی کاوشوں کا مرہون منت رہا ہے ۔ دونوں کے درمیان اگر کچھ فرق ہے تو صرف اس قدر کہ کتابی ادب کے لئے لکھے پڑھے اور اہل قلم درکار تھے اور عوامی ادب کو اس کی ضرورت نہیں تھی اسی وجہ سے پشتو کے بعض علمی اور ادبی گھرانے اس خصوصیت کے ساتھ ممیز ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی دور میں بھی کسی سلطان، امیر یا وزیر نے پشتو ادبیات کی سرپرستی اور پرورش کے لئے حکومتی طور پر کوئی ایسا عملی اقدام نہیں کیا کہ وہ بالفعل اس زبان کی ترقی اور علمی اور ادبی نشوونما کے لئے کوئی مثبت ذریعہ ثابت ہوا ہو یا پشتو زبان و ادب کی کوئی کتاب یا دستاویز

کسی شاہی کتب خانے کے نوادرات یا علمی ذخیرہ میں خصوصی اہتمام کے ساتھ شامل کی گئی ہو۔

بالائی پشتونخوا کے ایک محقق استاد عبدالرؤف بینوا نے ۱۹۷۲ء میں اپنے ایک تحقیقی مقالہ[1] میں اُس وقت کے سیاسی تقاضوں کے پیش نظریہ کوشش کی ہے کہ بعض پشتون بادشاہوں اور امراء کی ادب نوازی اور پشتو پروری کے بارے میں کچھ معلومات دنیا کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اُس مقالے میں جو تقریباً انتیس صفحات پر مشتمل ہے کسی ایک جگہ بھی یہ شہادت نہیں ملتی کہ فلاں بادشاہ یا سلطان نے اپنے زمانے میں اِس زبان کو اپنی درباری یا سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا ہو۔ یا اُسکے شاہی کتب خانے میں پشتو کتابوں کے کچھ نادر نمونے موجود رہے ہوں۔ اور اُس اثناء نے اس زبان کی ادبیات کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے کوئی خاص مواد فراہم کرنے میں مدد دی ہو۔ یا ان سلاطین اور اُمراء میں سے کسی ایک سلطان یا امیر کے زمانے میں پشتو میں کسی ایک دارالتصنیف یا دارالترجمہ کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ یا اپنے دربار میں کسی پشتون شاعر یا ادیب کی اس وجہ سے سرپرستی کی ہو کہ وہ پشتو زبان کا شاعر یا ادیب ہے۔

اپنی جگہ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ پشتو بہت سے بادشاہوں اور امیروں کی مادری زبان تھی اور انہوں نے کبھی کبھار اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی شعر کی زبان میں کیا ہوگا یا اُس نے پشتو شعر و ادب کے ساتھ ذاتی طور پر اپنی قبائلی روایات اور اپنے ماحول کے فطری تقاضوں کے پیش نظر کچھ محبت اور تعلق بھی روا رکھا ہوگا، لیکن پھر بھی تاریخی شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک نے بھی اپنے دور اقتدار میں اس زبان کو کما حقہ اپنی نظر التفات سے نہیں نوازا

سچ تو یہ ہے کہ پشتون سربراہوں نے عموماً اقتدار کے حصول سے قبل یا اقتدار سے محرومی کے بعد ہی اپنی زبان و ادب کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہی سبب تھا کہ خود تو انہوں نے بہت

---

[1] سالنامہ "کابل" ۱۹۷۲-۷۳ء پشتو شاہوں کے دربار میں صفحہ ۲۰۷

عمدہ شعری تخلیقات اور علمی و ادبی اثاثہ پشتو کو دیا ہے لیکن سرکاری سطح پر اس زبان کے اجراء اور ترقی کے لیے کوئی اقدامات نہیں کئے۔ شنسبانیوں، خلجیوں، لودھیوں کے شاہی گھرانے ہوں یا میرویس خان اور احمد شاہ ابدالی کے خاندان، ان سب نے خود اس زبان کو فارسی زبان کے مقابلے میں ثانوی مقام اور حیثیت دی تھی۔ حتیٰ کہ جب ایک دو پشتیں گذر جاتیں تو انکی اولاد اپنی اس مادری زبان کو بھی بھلا بیٹھتی۔ مقامی اُمراء میں خوشحال خان بابا کے نواسے افضل خان خٹک کا نام ایک واحد استثنا ہے۔ ورنہ باقی تمام ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

یہاں ایک دفعہ پھر اس بات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پشتو کے کتابی ادب نے بھی اس زبان کے عوامی ادب کی طرح اپنے عوام کے ہاتھوں ترقی اور نشوونما پائی ہے اور انہی کے ذریعے محفوظ اور مامون رہا ہے۔ اس لحاظ سے "پشتونخوا" کے پانچ بڑے علمی گھرانے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ گرانقدر اور عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ ان میں پہلا گھرانہ روشانیوں کا ہے۔ جن کے پہلے سربراہ روشانی تحریک کے بانی بایزید انصاری پیر روشان تھے۔ دوسرا اخون درویزہ کا خاندان۔ تیسرا خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کا گھرانہ۔ چوتھا گھرانہ چمکنی کے حضرت میاں عمر صاحبؒ کا ہے۔ اور پانچواں خاندان روہیل کھنڈ کے نواب حافظ رحمت خان شہید بڑیچ کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی تک پشتو کی قلمی کتابوں اور علمی نوادرات کے زیادہ تر حصے نے انہی پانچ گھرانوں کی وساطت سے جنم لیا ہے اور انہی کی بدولت محفوظ رہا ہے۔ ان میں سے پہلے تین خاندانوں نے ادب کے بعض مورخین اور تنقید نگاروں کے نقطہ نظر سے اپنے خصوصی اسالیب اور طرز ہائے نگارش وضع کئے ہیں۔ حافظ رحمت خان کے گھرانے نے پشتو تواریخ، نسب ناموں، پشتو زبان کی لغت سازی اور گرامر کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور حضرت میاں عمرؒ کے خاندان نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ پشتو زبان و ادب کے قلمی مخطوطے جمع کرنے اور دواوین کی نقول تیار کرنے کا اہتمام کیا۔ محقق قاضی عبدالحلیم اثر افغانی نے پشتو زبان کے مستشرق راورٹی کے بارے میں اپنے ایک

تاریخی اور تحقیقی مقالے میں لکھا ہے [1]: " ہند کے روہیل کھنڈ میں پشتون قوم کی ریاستوں کی تباہی کیوجہ سے نجیب آباد کے حافظ رحمت خان کے گھرانے کے چند صندوق جو پشتو زبان کے قلمی نسخوں سے بھرے ہوئے تھے ۔ اور مال غنیمت کے طور پر انگریزوں کے ہاتھ لگے تھے ، آخر میں آنجہانی میجر راورٹی کے ہاتھ آئے ان کتابوں کی روداد راورٹی اور ناروے کے مستشرق مارگن سٹرائن دونوں نے بیان کی ہے ۔ موسیو مارگن لکھتے ہیں کہ یہ کل چالیس صندوق تھے اور ان میں سے اکثر لکھنؤ کے فساد میں تلف ہو گئے تھے ۔ اور جو چند ایک بچے وہ میجر راورٹی کے ہاتھ لگے ۔

اگر یہ بیان اصل راوی کی زبانی صحیح ہو اور جناب اثر نے اُس اقتباس کا صحیح ترجمہ کیا ہو ۔ تو اس سے یہ بات بخوبی اُجاگر ہوتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس مقتدر روہیلہ خان نے بذاتِ خود پشتو زبان و ادب کی قابل ستائش خدمت کی تھی بلکہ اپنے کتب خانے میں بھی اس زبان کے علمی اور ادبی فن پارے بہت بڑی تعداد میں اکٹھے کئے تھے ۔

مشہور پشتون مؤرخ پیر معظم شاہ . جنہوں نے تواریخ حافظ رحمت خانی تلخیص و تالیف کی ہے ، روہیلوں کے شاہی کتب خانے کے مہتمم اور لائبریرین تھے ۔ وہ روہیل کھنڈ میں پشتو کی قلمی کتابوں کے ضمن میں اشارتاً کہتے ہیں کہ " حافظ رحمتؒ خان بہ اشتغال کتب متنوعہ و نسخ ہر قسم اُلفتے تام و رغبتے تمام میداردہ ۔ اتفاقاً روزے کتابِ تواریخ افاغنہ مسودہ طریق مشعر بر حوال اقوام شنجے و غوری غالباً بر احوال یوسفزیٔ بہ زبانی افغانی فارسی آمیز مطابق تذکرۂ عارفِ بے بدلِ سالکِ شاہراہِ علم و عمل اخوند درویزہ علیہ الرحمۃ از کتب خانۂ عالیہ خاصۂ شریفۂ سرکار فیض آثار معلی القاب خان بہادر خان قوم افغان عرف غوریا خیل خصوصاً داود زئی خط انداز رونق افزای بلدۂ شاہجہان پور طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ بہم رسیدہ . منظر کیمیا اثر ورآمد ۔

---

[1] " اولس " کوئٹہ نومبر دسمبر ۱۹۷۲ء مقالہ قاضی اثر " د پښتو ادب رویاتی لیکوال ص ۱۰

[2] تواریخ حافظ رحمت خانی دیباچہ صفحہ ۲

غالباً یہ اُن کتابوں اور قلمی مسودات میں سے ایک مسودہ تھا جو روہیل کھنڈ کے امراء کے کتب خانوں میں محفوظ تھے اور قاضی اشرف نے راورٹی اور مارگسٹائن کے حوالے سے جن کا ذکر کیا ہے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ روہیل کھنڈ کے خاندان کی علم دوستی کی برکت سے بہت سے پشتون شعراء، ادباء، علماء اور اہل قلم اُنکی سرپرستی کے زیر سایہ روہیل کھنڈ ہی میں جا بسے تھے۔ ان شعراء میں ایک خوشحال بابا کے پوتے کاظم خان شیدا بھی تھے۔ جنہوں نے اپنا دیوان رامپور میں مرتب کیا تھا۔

حضرت میاں عمر صاحب چمکنی کے خاندان میں خاص طور پر محمدی صاحبزادہ نے پشتو شعر و ادب کو جمع کرنے اور اُن کی قلمی نقول کو محفوظ کرنیکا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا تھا یہاں تک کہ ہند اور دکن میں قیام پذیر پشتون شعراء اور ادباء بھی اپنے دواوین کی نقلیں پشتو شعر و ادب کی اس قدردان ہستی کو ارسال کیا کرتے۔ کاظم خان شیدا کے دیوان کا جو قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ وہ اس نسخے کی نقل ہے جو روہیل کھنڈ سے شیدا نے محمدی صاحبزادہ کو بھیجا تھا۔

جس طرح محمدی صاحبزادہ علم و ادب کے قدردان تھے اسی طرح وہ شعراء اور علماء کو بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس وقت کا ایک مشہور شاعر عبدالعظیم رانڑیزی کہتا ہے۔

۵ بیا رحمت په محمدی صاحبزاده شه	چې یې غزل دی ده ساز کړی په بنه شان
په ګلشن د چمکنو کښې مه شه مړاوې	دا خوشبویه معطر ګل د ریحان
چار چاپیره په هر ځائی کښې ظلم زور شو	شو راتول په چمکنو کښې غریبان

دا زمونږ دیر اخلاصی مینه اشنا وو
دیر بے حده دے په مونږ وو مهربان

"پھر محمدی صاحبزادہ پر رحمت ہو۔ انہوں نے نہایت عمدہ طریقے سے غزلیں کہی ہیں۔ خدا کرے گلشن چمکنی میں یہ خوشبودار اور معطر گل ریحان مرجھا نہ جائے۔ آس پاس ہر جگہ ظلم و تعدی میں اضافہ

ہوا ہے اور تمام غزہائے چمکنی میں اکٹھے ہوئے ہیں وہ ہمارا بڑا مخلص اور چہیتا دوست تھا۔
اور بہت زیادہ ہم پہ مہربان تھا۔"

اسی طرح کاظم خان شیدا اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ:۔ "اور سبب تالیف
یہ تھا کہ مسترد دین کیطرف سے یہ افواہ سننے میں آئی کہ ولایت نژاد مخدوم زادہ نتیجۂ ہدایت
وارشاد میاں محمدی سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق شیخ الاجل ولی الاکمل میاں محمد عمر دامت برکاتہٗ
طبع جید کا حامل ہے۔ سخن شناسی اور سخن آرائی کے دبدبے کیوجہ سے انہیں اپنے ہمسروں پر
فوقیت حاصل ہے۔ اور خوش سرائی کی شان و شوکت سے اپنے رفقاء میں پیش پیش ہے۔
انہوں نے اسلاف کے متعدد دواوین اکٹھے کئے ہیں جن کا مطالعہ انکے لئے باعث تفریح و
انشراح صدر ہے۔ اگرچہ ہماری ایک دوسرے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ دلالتِ قرینہ
سے معلوم ہوا ہے کہ میرا کلام انکی سمع شریف تک پہنچا ہے۔ ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

"ہمارا افسانہ پوری دنیا میں موجود ہے مگر خود ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے"......
اشتیاق شوق کی بنا پر بھائی محمد عابد خان (طال اللہ عمرہٗ) کی وساطت سے انہوں نے مجھے دیوان
مرتب کرنے کا حکم دے کر اشعار ارسال کرنے کے لئے حکم فرمایا۔ میں اور بھائی جو درحقیقت
"کنفسِ واحد" کے مصداق ہیں اس حکم کو کما حقہٗ بجالانے اور اس اہم کام کو ترتیب دینے کے
بارے میں سوچ بچار کرنے لگے۔ اس لئے کہ برادر عزیز گرامی کا پاس خاطر ملحوظ تھا۔ اس لئے میں
نے اس کام میں سعئی و کاوش کی۔ اشعار کو ترتیب دینے میں غور و خوض سے کام لے کر جلد کام نمٹایا۔
منقولات و مسودات متفرقہ اور منقولات و منشیات منظومہ جو کچھ بھی ہاتھ آئے قید ردیف
میں لاکر تین جریدے تحریر کئے۔ اور حاشیہ میں وہ الفاظ بھی جو ربط و ضبط کے قابل تھے، مگر ان
اشعار کو جو اپنی نو صحبت آموزی اور نو مشقی کیوجہ سے پڑھنے سے قاصر رہا، الگ کیا۔ شائع
اور غیر شائع جو کچھ بھی تھا، معانی و الفاظ کیوجہ سے چاہے جو کچھ ادنیٰ بھی تھا دیوان میں شامل کیا۔"

ع گر قبول افتد زہے عزو شرف[1] "

پشتون مورخین نے پشتو اور فارسی زبان میں پشتون قوم کی تاریخ وقتاً فوقتاً مرتب کی ہے۔ ان میں سلیمان ماکو کے تذکرۃ الاولیاء سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے اوائل تک کہ جمال الدین افغانی نے عربی زبان میں افغانستان کی مختصر تاریخ لکھی تقریباً سینتالیس[4] پشتون مورخین ایسے گذرے ہیں، جنہوں نے پشتو تاریخ اور نسب ناموں پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں شیخ کٹہ کا "لرغونی پښتانہ" شیخ قاسم کا تذکرۃ الاولیاء افغانی۔ محمد بن علی بستی کی تاریخ سوری محمد سعید اللودی کا اخبار اللودی۔ دوست محمد کاکڑ کا غورغشت نامہ شیخ بستان بڑیچ کی" بستان الاولیاء"۔ علی محمد مخلص روشانی کا "حالنامہ" حضرت اخون درویزہ کا تذکرۃ الابرار والاشرار"۔ کامران خان سدوزئی کی" کلید کامرانی"۔ اللہ یار خان کا "تحفۂ صالح"۔ نعمت اللہ ہروی کی" مخزن افغانی"۔ شیخ عباس سروانڑی کی" تاریخ شیر شاہ سوری"۔ مولانا محمود کی" تاریخ ابراہیم شاہی" "افسانہ شاہان اور" مجمع التواریخ" احمد خان مولانا مشتاق کی" واقعات مشتاقی"۔ ملامست زمند کی " سلوک الغزوات" غلام حسین سلیم کی" ریاض السلاطین"۔ شیخ ملی ابن بیر کے کا "دفتر شیخ ملی" خواجو کی" تواریخ افاغنہ" یا " تواریخ خان کجو" مراویوں کے نسب نامے۔ پیر معظم شاہ کی " تواریخ حافظ رحمت خانی" حافظ رحمت خان کا خلاصۃ الانساب"۔ نواب مستجاب خان بڑیچ کی " گلستان رحمت"۔ سعادت یار خان کا " گل رحمت" ۔ نیاز احمد خان کی "تاریخ روہیل کھنڈ"۔ حافظ مرعز کا " شاہنامۂ احمد شاہی"۔ شیر محمد خان گنڈاپور کی " تاریخ خورشید جہاں"۔ محمد حیات خان کی " حیات افغانی"۔ سید محمد الطبا طبائی الاصفہانی کا " نسب نامۂ افاغنہ" اور محمد شریف صاحبزادہ کی تصنیف " شریفیہ" اور ایسی کئی مستند کتابیں اور پشتونوں کی تاریخیں اکثر و بیشتر پشتون مورخین نے لکھی ہیں۔ ان مذکورہ کتابوں میں صرف" نسب نامۂ افاغنہ " ایک غیر پشتون مورخ کی تالیف

---

[1] کاظم خان شیدا کے دیوان کا دیباچہ۔

ہے ۔ باقی تمام تواریخ کے مؤرخین خود پشتون ہیں ۔ ان میں بعض کتابیں تو بالکل نایاب ہیں اور بعض شائع بھی ہو چکی ہیں ۔ لیکن ساری ایسی ہیں کہ انکے قلمی نسخے یورپ، برصغیر یا افغانستان کے ایک آدھ مقام کے قومی کتب خانوں یا اہل علم کے ذاتی ذخیروں میں ملتے ہیں ۔ محمد ہوتک کی کتاب "پٹہ خزانہ" کے منابع بھی وہی قدیم کتابیں ہیں جنکے نام اس کتاب کے حوالے سے ہم تک پہنچے ہیں اور اور جن کے اصل نسخے اب نایاب ہیں ۔

رامپور کے نوابزادہ سلیم خان نے ایک دفعہ اس کتاب کے مؤلف سے کہا کہ اگر کوئی واقعی پشتونوں کی تاریخ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ رامپور کے شاہی کتب خانے سے استفادہ کرے اس لئے کہ اس کتب خانے میں اس موضوع پر تقریباً سبھی نایاب کتابیں موجود ہیں ۔ جن میں اکثر قلمی نوادرات اور دستاویزات ہیں"۔ میجر راورٹی نے گلشن روہ کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "پشتو کی قلمی کتابیں خود پشتونوں میں جن کی یہ مادری زبان ہے کم ہوتی جارہی ہیں ۔ اس کی اصل وجہ گذشتہ ۶۰ سالوں سے افغانستان کا اندرونی انتشار ہے جس کے دوران اس زبان کی آبیاری مقابلتاً کم ہوگئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جو ایک آدھ کتاب اب دستیاب ہے ۔ اس میں اکثر غلطیاں ہیں ۔ کیونکہ انکے نقل کرنے والے یا کاتب اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہ تو پشتو بولتے ہیں اور نہ پشتون ہوتے ہیں ۔ اس لئے عموماً لاپرواہی سے کام لیتے ہیں چند مشہور کتابوں کے علاوہ جو "ایسٹ انڈیا ہاؤس لندن" میں محفوظ کی گئی ہیں اور گنتی میں کل ۷۰ ہونگی ان میں بعض کی دو دو تین تین منقول بھی موجود ہیں ۔ یہ کتابیں اور کہیں تو کیا خود افغانستان میں بھی بہت کمیاب ہیں"۔[۱]

میجر راورٹی کے اس بیان اور جناب عبدالحلیم اثر کے گذشتہ ذکر شدہ بیان کے درمیان جو انہوں نے مستشرق راورٹی اور پروفیسر مارگنسٹائن کے حوالے سے اپنے مقالے میں درج کیا ہے ایک نمایاں تضاد دکھائی دیتا ہے اس لئے کہ راورٹی خود پشتو کتابوں کی کمیابی کے شاکی رہے ہیں ۔ اور

---

[۱] گلشن روہ مقدمہ صفحہ ا

جناب اثر نے پشتو قلمی کتابوں کے پورے چالیس صندوق صرف روہیل کھنڈ کے پشتونوں کی پیاستوں کی تباہی کے موقع پر بطور غنیمت ہم پہنچائے ہیں یہ صحیح ہے کہ پشتو کی قلمی کتابیں اگر ایک طرف اس قدر زیادہ نہ تھیں کہ ڈھیروں کی صورت میں کسی کے ہاتھ آئیں تو دوسری طرف اس قدر نایاب بھی نہ تھیں جیسے کہ راورٹی نے کہا ہے۔ راورٹی کے بیان کا صرف یہ جواز ہو سکتا ہے کہ انکے دور کے پشتون پشتو کتابوں کو اس قدر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ انہیں تقدس کی حد تک پہنچا دیتے۔ اس لئے غیر مذہبی شخص کے سامنے اس کی رونمائی کرانے کو بھی بدعت خیال کرتے تھے۔ شاید کہ اس کی وجہ ایک مغربی اہل قلم کا یہ بیان ہو۔ (ترجمہ)

"اسلامی مشرق میں گذشتہ چند صدیوں میں ادب اپنے آزاد میدان میں اس لئے ترقی نہ کر سکا کہ اسے بھی مذہب اور دینیات کی خدمت کے لئے بروئے کار لایا جاتا رہا"

پشتو کی علمی کتابوں کو جمع کرنے کا شوق ذاتی طور پر پہلے سے علم دوست پشتونوں میں موجود تھا۔ کچھ لوگ اچھے اچھے شعراء کے دیوان، تاریخ و ادب کی کتابیں اور علمی مسودے کاتبوں کے ذریعے نقل کراتے اور علم و ادب کے رسیا انہیں اپنے پاس جمع کرتے، جو پشتون دکن روہیل کھنڈ اور راجپوتانہ کے علاقوں میں مقیم ہو چکے تھے۔ ان کا یہ ذوق و شوق مقابلتاً زیادہ تھا، شاید ایک تو سرزمین روہ سے دوری اور پردیس میں رہنے کی وجہ سے اور دوسرے اس علاقے میں فارسی یا دوسری زبانوں سے مقابلہ اور ہمسری کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے انہوں نے اپنی آبائی زبان کو کچھ نہ کچھ توجہ دینی مناسب سمجھی اور تبرکاً، اس زبان کی بعض قلمی کتابیں اپنے کتب خانوں میں رکھیں ۔ یہ لوگ اپنے اسلاف کی زبان کے شعر و ادب کے ساتھ اس وقت تک زیادہ محبت کرتے جس وقت تک انکی اولاد سے ایک آدھ پشت گذرنے کے بعد یہ زبان کلی طور پر فراموش نہ ہو جاتی۔ لیکن پھر بھی اس زمانے میں رامپور، بریلی بیت، شاہ جہان پور، فرخ آباد، جاوڑہ، ٹونک، بہار اور دکن میں بعض پشتونوں کے ذاتی کتب خانوں میں پشتو شعر و ادب کی بعض بڑی نادر اور نایاب کتابیں محفوظ کی گئی ہیں۔

جب برصغیر جنوبی ایشیا پر انگریزوں نے تسلط جمالیا۔ تو ملک کے اِن نئے حاکموں نے زرو جواہر کے انبار کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا تمام خزانہ بھی لوٹ لیا اور جس قدر عمدہ اور کارآمد چیزیں اُن کو ہاتھ آسکیں اپنے ساتھ سمیٹ کر اپنی ولایت کو لے گئے اور اِس طریقے سے ان ممالک کے لوگوں کو کمتری اور محرومی کے ایک لامتناہی احساس میں مبتلا کر دیا۔

علوم و ادبیات کے اس عظیم خزانے کو سمیٹنے اور انگلستان یا یورپ کے دوسرے ممالک کو لے جانے میں انہوں نے کسی سے زبان کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں برتی۔ بنگال کے جنگلات سے لے کر دریائے آمو تک ہر قوم اور ہر زبان کا جتنا بھی ادبی اور علمی سرمایہ اُنکے ہتھے چڑھ سکا اُس کا زیادہ تر منتخب اور چیدہ حصہ سمندر پار پہنچا دیا صرف برٹش میوزیم میں برصغیر کی بعض زبانوں کی قلمی کتابوں کے مندرجہ ذیل خاکے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ عمل کس انداز کے ساتھ جاری رکھا گیا تھا[1]۔

مرہٹی	گجراتی	بنگالی	اسامی	اڑیا	پشتو	سندھی
۴۷	۵۷	۲۰	۶	۱۰	۶۰	۱۱

برٹش میوزیم کی قلمی کتابوں کے یہ اعداد و شمار ۱۹۰۵ء میں جناب بلوم ہارٹ کی تیار کردہ فہرست سے لئے گئے ہیں۔ یہ فہرست بڑی بڑی ہندی اور آریائی زبانوں کے مقابلے میں پشتو کی علمی حیثیت اور مقام فضیلت کی ایک روشن دلیل فراہم کرتی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں پشتو بنگالی سے تین گنا اور سندھی سے چھ گنا آگے تھی پھر یہ کہ دوسری زبانوں کی اکثر کتابوں کا تعلق ہندی دیومالا اور ہندو مذہب سے تھا اور پشتو میں کوئی بھی ایسی کتاب نہ تھی

[1] برٹش میوزیم کی قلمی کتابوں کی فہرست، جو بلوم ہارٹ کی مرتب کردہ ہے۔ مطبوعہ لندن ۱۹۰۵ء

جو اسلامی عقائد کی تاریخ یا ادب سے متصادم ہوتی ہو یا کسی دوسرے مذہب کے فرد کی تصنیف ہو۔
جیساکہ کہا گیا ہے مستشرق راورٹی اور اُنکے دوسرے ہمعصروں نے جو نوادرات اِس علاقے سے حاصل کیے ہیں اُن میں ایک بہت بڑا حصہ پشتو کی قلمی کتابوں کا ہے۔ اُس وقت اِس علاقے میں طباعت کا رواج نہیں تھا۔ کتابوں کی نقول ہاتھ سے تیار کی جاتیں اور محدود شمار میں تقسیم ہوتیں۔ ایسی کتابوں کا زیادہ تر حصہ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی عیسوی میں یورپین مستشرقین نے حاصل کرکے ان سے اپنے ذاتی کتب خانوں کو مزیّن کیا۔ اس لئے آج تک وہ کہاتہ گم شدہ میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا تھوڑا سا حصہ عجائب خانوں اور گرجاگھروں کو سوغات کے طور پر بطور نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ اور کچھ نسخے انکے ملکی کتب خانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ پڑے ہیں اور یوں یورپ اور برطانیہ کے ہر مرکزی شہر کے علمی اداروں اور مؤسسوں میں ہماری قومی بے بسی کا رونا رویا جاتا ہے۔

یورپ اور برطانیہ کے ان علمی اداروں کے کارکنوں محققین اور مستشرقین کے استفادہ کے لئے ان کتابوں کی خاص جامع فہرستیں مرتب کی گئی ہیں اور اِن کے مضامین اور موضوعات کا مختصر جائزہ اور تحریر و بیان کی خصوصیات کی تفصیل بھی ساتھ لکھی گئی ہے۔ اِن ہی فہرستوں کی برکت سے شائقین کو ایک خاص علاقے کے علمی و ادبی نوادرات کے ذخیروں کے بارے میں مناسب معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک مغربی دنیا کے سیاست مدار اور علماء اِن مذکورہ فہرستوں کے ذریعے اُن دستیاب کتابوں سے سیاسی لسانی۔ ثقافتی، عمرانی اور بالخصوص فوجی مصلحتوں کے لئے استفادہ کرتے رہے۔ علمی لحاظ سے اگرچہ پشتو زبان اس قدر ترقی یافتہ نہ تھی۔ کہ وہ مشرقی دنیا کی بعض زبانوں مثلاً عربی فارسی کا مقابلہ کرسکتی لیکن پھر بھی شعر و ادب کی کتابوں کے ایک عمدہ اثاثے کی حامل ضرور تھی۔ ان کتابوں کا ایک بڑا حصہ یا تو دارو گیر افرنگ کی نذر ہوا۔ اور یا حشرات الارض اور دیمک کی خوراک بنا۔ اور جو حصہ باقی بچا اس کا چیدہ اور پسندیدہ حصہ مغربی دنیا کے کتب خانوں تک پہنچا دیا گیا۔

اس قسم کی کتابوں کا ذخیرہ جو برطانیہ کے علمی اداروں یا کتب خانوں میں محفوظ کیا گیا ہے۔ اُن کی الگ تفصیلی فہرستیں بھی وقتاً فوقتاً تیار کی گئی ہیں، ان میں ایک فہرست مشہور روسی مستشرق پروفیسر ڈورن نے مرتب کی ہے۔ یہ فہرست کرسٹو میتھی CHRESTOMETHY کے نام سے سینٹ پیٹرز برگ میں جسے اب "لینن گراڈ" کہتے ہیں ۱۸۷۵ء میں چھپی ہے۔ دوسری جناب ایچ ایتھ H-ETHE کی فہرست ہے جو فارسی، ترکی، ہندی اور پشتو کی اُن قلمی کتابوں پر مشتمل ہے جو بوڈلین کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۱۹۰۳ء میں شائع کی گئی تھی۔ تیسری فہرست جناب بلوم ہارٹ BLUMH HART کی ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس میں مرہٹی۔ گجراتی۔ بنگالی۔ آسامی۔ اڑیا۔ سندھی اور پشتو زبان کی قلمی کتابوں کی تفصیل درج ہے۔ چوتھی فہرست جناب E.G.BROWN کی ہے۔ اس فہرست کو کہتے ہیں۔

"A hand list of Mohammadan manuscripts, including all those written in Arabic character, preserved in the library of the University of Cambridge"

۱۹۰۰ء میں یہ فہرست کیمبرج سے چھپی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کا ضمیمہ بھی یہیں شائع ہوا۔ ایچ ایتھ کی فہرست کی دوسری جلد آکسفورڈ میں ۱۹۳۰ء میں چھپی۔ ان سے فہرستوں کی اشاعت سے صرف برطانیہ میں مشرقی زبانوں خصوصاً اسلامی دنیا کے علمی نوادرات کے بیش بہا خزانے کے بارے

میں بہت زیادہ معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کی روسے پشتو کتابوں کے اس بڑے ذخیرے کا پتہ چلا ہے۔ جو اب برطانوی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

پروفیسر ڈورن کی کرسٹومیتھی میں صرف پشتو زبان کی قلمی کتابوں کی تفصیل درج ہے۔ اور وہ باقی فہرستیں بعض دوسری مشرقی زبانوں اور پشتو کے قلمی نوادرات کی مشترک تفصیل رکھتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک ان سب میں آخری مگر ان سب سے اہم اور کارآمد فہرست آنجہانی بلوم ہارٹ اور ڈاکٹر میکنزی کی مرتب کردہ ہے۔ یہ فہرست جس کا نام Cataloque of Pashto manuscripts ہے خالص پشتو کی قلمی کتابوں پر مشتمل ہے۔ وربرٹش میوزیم اور دولت مشترکہ کے مرکزی تعلقات کیطرف سے ۱۹۶۵ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ یہ فہرست ۲۰×۳۰/۸ تقطیع (کاغذ) ۱۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس میں برطانیہ کے بوڈلین کے کتب خانے۔ برٹش میوزیم، کیمبرج یونیورسٹی۔ انڈیا آفس۔ جان رینلڈ۔ سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز اور ٹرینٹی کالج ڈبلن کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کا ذکر ہے کتاب کے بارے میں ایک تعارفی نوٹ میں جناب گارڈنر لکھتے ہیں (ترجمہ) "پہلی مشترکہ فہرست کے بارے میں جس میں ایک ایشیائی زبان کے ان تمام قلمی نسخوں کا ذکر موجود ہے جو برطانوی کتب خانوں میں محفوظ کئے گئے ہیں۔ یہ لائبریریوں کے مابین باہمی تعاون کا ایک نیا انداز ہے۔"

یہ فہرست علی الترتیب مذہبیات، تاریخ، لسانیات، شعروسخن اور نثری قصوں وغیرہ کے پانچ مفصل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ۴۲ صفحے ہیں اس میں مذہبی کتابوں کے ۵۹ قلمی نسخوں کا تذکرہ ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔

نام کتاب	تصنیف	نسخے
مخزن الاسلام	اخوند درویزہ	۲
دیوان بابوجان		۲

نام کتاب	تصنیف	نسخے
فوائدالشریعت	اخون قاسم	۵
کلیات فتح شاہ		۱
رشید البیان	اخون رشید	۱۰
جنت الفردوس	حافظ عبدالکبیر	۲
نافع المسلمین	اخون گدا	۱
قیامت نامہ		۱
حفظ الادب		۱
ترجمہ انجیل شریف		۱

تاریخی کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

نام کتاب	مصنف یا مؤلف	نسخے
تاریخ مرصع	افضل خان خٹک	۵
شاہنامہ احمد شاہ ابدالی	حافظ مرغزی	۱
تواریخ حافظ رحمت خانی	تالیف پیر معظم شاہ	۲

لسانی میدان میں تحریر شدہ کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

آمدنامۂ افغانی (پشتو گرامر)		۱
خیالات زمانی (پشتو فارسی لغت)		۱
عجائب اللغات	نواب اللہ یار خان	۲

ریاض المحبت	نواب محبت خان	۴
غنچۂ روہ	مولوی نور محمد افغانی	۱
ننگوسٹک نوٹس	(جناب ادسکن)	۱

اس فہرست کے چوتھے باب میں شعروسخن کے چوالیس دوا وین اور منظومات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں تمام قلمی نسخوں کا شمار ۹۲ رہے۔ یہ پشتو زبان کے بڑے بڑے شعراء کے دیوان اور منظوم شہ کار ہیں۔ ان میں ارزانی، مرزا خان انصاری۔ مخلص۔ کریمداد، خوشحال خان خٹک۔ اشرف خان ہجری، عبدالقادر خان خٹک، نجیب سربندی۔ عبدالرحمان بابا، عبدالحمید بابا۔ احمد شاہ ابدالی۔ کاظم خان شیدا۔ کامگار خان خٹک۔ محبت خان روہیلہ۔ قاسم علی آفریدی، اکبر۔ امیر خان۔ معزاللہ خان۔ ابوالقاسم اور گلچین کے دیوان اور فضل نامہ (خوشحال خان خٹک) یوسف زلیخا۔ (عبدالقادر خان خٹک) آدم خان درخانئ (صدر خان خٹک) دلے شہئ (صدر خان خٹک) نیرنگ عشق (عبدالحمید مہمند) قصۂ شاہ وگدا (عبدالحمید مومند) معراج نامہ (غلام محمد گگیانڑی) معجزات (حافظ عبدالکبیر) قصۂ سیف الملوک (غلام محمد گگیانڑی) قصۂ جمجمہ۔ تولانامہ (غلام محمد گگیانڑی) قصیدۂ بردہ (عبدالقادر) نور نامہ (خان محمد) قصہ بہرام او گل اندامہ (فیاض) داستان امیر حمزہ (احمد) عذرا وامق (معین الدین) غل او قاضی (مولوی احمد) قصہ فتح خان (ملا نعمت اللہ) شامل ہیں۔

نثری قصوں میں افضل خان خٹک کے "علم خانہ دانش" کے دو نسخے۔ عبدالقادر خان کا گلدستہ (ترجمہ گلستان سعدی) کے تین نسخے۔ امیر محمد انصاری کے گلستان سعدی کا ترجمہ ایک نسخہ آدم درخانئ کے افسانے کے تین نسخے (میکنزی کے خیال کے مطابق یہ فخرالدین ساجزادہ کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ کتاب زقوم (تالیف ابراہیم) کا ایک نسخہ۔ نقلونہ (تالیف مولوی احمد جان) کا ایک نسخہ اور مولوی سعید احمد کے ضرب الامثال کی کتاب "روضۃ الامثال" کا

ایک نسخہ - ان کتب خانوں میں موجود ہے ۔

مذکورہ کتب خانوں کی یہ قلمی کتابیں تین بڑے ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں :۔ ذخیرۂ دہلی جو حکومتی مامورین اور فوجی افسروں نے اکٹھا کیا تھا - (۲) پیرس کی نمائش میں خریدی گئی کتابیں۔ (۳) مستشرقین اور پادریوں کی وساطت سے جمع کی گئی کتابیں ۔

انگریزی فوج اِس علاقے میں جنگ و جدال کے علاوہ نوادرات اور علمی اثاثے کو باقاعدہ طور پر جمع کرنے کا کام بھی کیا کرتی اور اُن نوادرات کو دہلی بھیج دیتی ۔ اُن کا کچھ حصہ تو مقامی عجائب خانوں یا محافظ خانوں میں رکھ دیا جاتا اور عمدہ اور کارآمد اشیاء کو انگلستان ارسال کر دیا جاتا۔ اس طرح قلمی نوادرات اور کتابوں کا ایک گرانقدر ذخیرہ بھی "DELHI COLLECTION" کے نام سے برطانیہ کے مختلف کتب خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیرس کی نمائش میں عہد حاضر سے قبل عہد قدیم میں بھی آرٹ ۔ مصوری ۔ خطاطی اور قلمی نوادرات کی نیلامی ہوا کرتی تھی - اور یورپ اور امریکہ کے شائقین خریدار اپنے ذاتی ۔ ملی ۔ علمی اور فنی مراکز کے کتب خانوں اور عجائب خانوں کے لئے بھاری رقوم دے کر اُن نوادرات کا سودا چکاتے ۔ اسی طرح دنیا کے ہر خطے ، ہر ثقافت تہذیب و تمدن اور معاشرہ کی چیدہ اور نمائندہ اشیاء یورپ اور امریکہ کے مختلف مراکز تک پہنچ جاتیں۔ اور وہ جہاں پیما لوگ جو ان نوادرات کے حصول کے لئے دیس دیس پھرا کرتے وہ اس قسم کی بین الاقوامی نمائشوں کی برکت سے اپنی سعی و کاوش کا بھرپور صلہ پاتے ۔ یہی نمائش ایک بہت بڑا ذریعہ تھی جس کی وساطت سے دنیا کی مختلف زبانوں کے قلمی نوادرات کی طرح پشتو قلمی کتابیں بھی یورپ کے کئی ایک مقامات تک پہنچیں جنہیں اب تلاش کرنا مشکل ہو گیا ہے ۔

پیرس کی نمائش میں حضرت اخون درویزہ کے "مخزن اسلام" اور عبدالرشید کی رشید البیان کے دو دو نسخوں کے علاوہ "فوائد الشریعہ" (اخون قاسم) دیوان مرزا خان انصاری ۔ کلیات فتح شاہ دیوان خوشحال خان خٹک ۔ دیوان عبدالحمید ۔ دیوان امیر خان فضل نامہ ۔ یوسف زلیخا۔

معراجنامہ۔ قصہ بہرام وگل اندام، اور آدم درخانی کے افسانے کا ایک ایک نسخہ صرف مذکورہ برطانوی کتب خانوں کے لئے خریدا گیا ہے۔ اس ضمن میں مشہور کتاب "خیر البیان" کی دریافت کا تذکرہ بھی بیجا نہ ہوگا۔ یہ کتاب جو کافی عرصے سے ناپید تھی اور صرف اوسلو یونیورسٹی کے مستشرق پروفیسر مارگنسٹائن نے سر ڈینسن راس کی وساطت سے حاصل کی گئی تھی۔ بقول جناب مارگنسٹائن یہ ایک فوجی کرنیل کی ملکیت تھی جسے سر ڈینسن راس نے اس کے لئے عاریتاً مانگی تھی اور مارگنسٹائن نے اس سے کچھ اقتباسات نقل کئے تھے۔

لیکن اسکے بعد پھر کافی عرصے تک اس کتاب کا کوئی اتا پتا نہ چلا سر ڈینسن راس بھی چل بسے تھے اس لئے توسط کا وہ رشتہ بھی منقطع ہو چکا تھا، جن سے مذکورہ فوجی کرنیل کی جو غالباً کوئی انگریز تھا جائے سکونت کا پتہ چل سکتا۔ آخر ۱۹۵۹ء میں جب مرحوم مولانا عبدالقادر بیرونی ممالک کے دورے پر گئے تو اس نایاب کتاب کی ٹوہ مغربی جرمنی کے ٹیوبنگن یونیورسٹی کے کتب خانے میں جاکر لگائی۔ یہ بھی محض ایک اتفاقیہ بات تھی۔ اسکے ساتھ ایک ہی جگہ چار اور قلمی کتابیں تھیں۔ جن میں ایک کاظم خان شیدا کا دیوان تھا۔ کتب خانے کے منتظمین کا بیان ہے۔ کہ جب دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں کیطرف سے برلن شہر پر حملے کے خطرات بڑھ گئے تو دوسرے ہزاروں قلمی نوادرات اور علمی کتابوں کے ساتھ "خیر البیان" اور کئی دوسری کتابیں بھی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کی نیت سے وہاں سے لائی گئیں۔ لیکن یہ بات اب بھی پردۂ اخفا میں ہے کہ برلن کے کتب خانے تک یہ کتاب کیسے پہنچی تھی؟ اس لئے کہ جب پروفیسر مارگنسٹائن نے یہ نسخہ دیکھا تو کہا کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے سر ڈینسن راس نے اسکے لئے عاریتاً حاصل کیا تھا۔

جن مستشرقین اور فوجی افسروں نے پشتو قلمی کتابیں برطانیہ کے کتب خانوں اور افسروں عجائب خانوں تک پہنچائی ہیں اُنکے اسماء یہ ہیں:۔

۱۔ سر چارلس ولکنس — 1. Sir Charles Wilkins

۲۔ ڈاکٹر فوربس — 2. Dr. Forbes

3 H. Beveridge	۳۔ ایچ بیورتج
4. Prof D.S. Robertson.	۴۔ ڈی۔ ایف۔ ایس رابرٹسن
5. Col. Appleby	۵۔ کرنل ایپلیبی
6. Dr. W. Bellew.	۶۔ ڈاکٹر بیلیو
7. J. F. Blumhardt.	۷۔ بلوم ہارٹ
8. W.P.M. Erskine	۸۔ ارسکن
9. R. Johnson	۹۔ بی جانسن
10. General Sir Bindon Blood	۱۰۔ سر بنڈن بلڈ
11. Col. G.W. Hamilton	۱۱۔ کرنل جی۔ ڈبلیو ہملٹن
12. Prof A.A. Bevan	۱۲ پروفیسر اے۔ اے۔ بیون
13. Sir M. Aural Stain.	۱۳۔ ایم اورل سٹین
14. Col. H.F. Smyth	۱۴۔ کرنل ایف ایچ سمتھ
15. R.B. Couchman.	۱۵۔ آر بی کوچ مین
16. R. Jhons.	۱۶۔ آر جونز
17. J. Darmesteter.	۱۷۔ جے ڈارمیسٹٹر
18. L. Bowring.	۱۸۔ ایل باورنگ
19. Prof. E.G. Browne	۱۹۔ ای جی براؤن[1]
20. Mr. Moncton.	۲۰۔ مانکٹن
21. J. Cotton	۲۱۔ جے۔ کاٹن
22 Maj. H.G. Raverty	۲۲۔ میجر ایچ جی راورٹی
23. The Revd T.P. Hughes.	۲۳۔ پادری ٹی۔ پی ہیوز

لہ E.G. BROWNE وہ نامور مستشرق ہے جس نے مشہور کتاب A LITERARY HISTORY OF PERSIA

ان میں کرنیل ہیملٹن نے ۱۶ نسخے پادری ہیوز نے ۴۱ کتابیں پروفیسر ڈارمیسٹر نے ۹ اور میجر راورٹی نے ۲۷ نسخے ان مذکورہ اداروں کو دیئے ہیں۔ اس حساب سے صرف انگلستان کے سات کتب خانوں میں پشتو زبان و ادب کی ۱۶۹ قلمی کتابیں موجود ہیں جو تقریباً سو ڈیڑھ سو سال قبل وہاں لائی گئی تھیں۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے اصلی نسخے دستیاب نہیں۔ ان کتابوں میں ۴۹ نسخے برٹش میوزیم میں ۶۰ انڈیا آفس میں ۱۶ نسخے جان رائلنڈ میں ۱۰ اسکول آف اورنیٹل اینڈ افریکن سٹڈیز کی لائبریری میں۔ ۵ بوڈلین کی لائبریری میں۔ ۲ ٹرینٹی کالج ڈبلن کے کتب خانے میں پڑی ہیں۔ ان میں تقریباً ۴۴ کتابوں کی مائیکروفلمیں ۱۹۶۰ء میں پشتو اکیڈیمی پشاور نے اپنے کتب خانے کے لئے حاصل کی ہیں۔

انگلستان کے ان مذکورہ کتب خانوں کے علاوہ روس، یورپ اور امریکہ کے بعض مرکزی شہروں جیسے واشنگٹن۔ لینن گراڈ۔ ماسکو، تاشقند۔ برلن۔ ٹیوبنگن۔ ویانا۔ اوسلو لائیڈن اور پیرس وغیرہ کے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں بھی پشتو کی قلمی کتابیں موجود ہیں۔

رامپور کی رضا لائبریری رحمان بابا کے دیوان کے چند قلمی نسخے موجود ہیں جن میں سے ایک باتصویر ہے یہ نسخے زمان شاہ درانی کے بیٹے ابراہیم شاہ کے کتب خانے سے حاصل کئے گئے تھے دو دو نسخے خوشحال بابا اور کاظم خان شیدا کے دیوان کے ایک تفسیر فضیلہ تین جلدوں میں اور فوائد الشریعہ۔ رشید البیان۔ مخزن الاسلام اور اختیاراتِ بدیعی کا ایک ایک نسخہ۔ قاسم علی خان افریدی کے دیوان کا ایک نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ محقق خان غازی کابلی جو اس کتب خانے کو دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ کہتا ہے کہ "ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سے قلمی پشتو نوادرات اس کتب خانے میں محفوظ ہیں[۱]"

جناب پینشتین[۲] کی تحقیقات کے مطابق ہندوستان کے بعض بڑے کتب خانوں میں بھی

---

[۱] مجلہ کابل مئی ۱۹۵۶ء۔ [۲] پوہاند رشتین ہند کے مشہور کتب خانے مجلہ کابل اکتوبر نومبر ۱۹۶۶ء

پشتو کے بعض قلمی نوادرات اور کتابیں موجود ہیں ۔

"پشتونخوا" میں پشتو کی قلمی کتابیں جمع کرنے کا شوق ویسے تو کئی علمی گھرانوں میں بہت قدیم زمانے سے رہا ہے جیسے کہ چمکنی کے محمدی صاحبزادہ کا خاندان جنکا تذکرہ گذر چکا ہے ۔ ان میں بعض ذاتی کتب خانے مثلاً ہوتی (مردان) کے نواب صاحب محمد اکبر خان مرحوم کا کتب خانہ ۔ اکوڑہ کے خان محمد زمان خان کے قلمی نوادرات نواب آف ٹیری (کوہاٹ) کا کتب خانہ ۔ عبدالمالک خان کا فورڈیری (پشاور) کا کتب خانہ فضل صمدانی بہادر ماڑی (پشاور) کا (جو اب پشاور یونیورسٹی میں ہے) خان روشن خان نواں کلی ضلع مردان) کی کتابوں کا ذخیرہ ۔ ان علم پروروں کے علاوہ ان جیسے دیگر علم دوست اشخاص کے پاس پشتو زبان کے بعض بہت نادر قلمی نسخے جو ادبی اور تاریخی مواد کے حامل ہیں ، دستیاب ہیں ۔ لیکن سرکاری سطح پر یا کسی ادارے کی طرف سے ان مخطوطات اور قبالوں کے علاوہ جو ہمارے اس علاقے کی تاریخ کے لحاظ سے دستاویزی مواد یا معلومات لئے ہوئے ہیں ، پشتو کے قلمی دیوان اور علمی اور مذہبی کتابوں کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے کا کام شاید سب سے پہلے پشاور کے ریکارڈ آفس پشاور میوزیم اور اسلامیہ کالج پشاور کی اورینٹل لائبریری نے شروع کیا ۔ ان میں ریکارڈ آفس اور پشاور کے عجائب گھر میں مخطوطات اور قبالوں کی تعداد زیادہ ہے اور پشتو کے چند نایاب دیوان اور نثری کتابیں بھی وہاں موجود ہیں لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ غالباً ان اداروں کے سربراہوں نے پشتو ادبی اثاثے کو جمع کرنے کیطرف کوئی خاص توجہ نہیں دی

۔ اسلامیہ کالج پشاور کے علوم شرقیہ کے کتب خانے میں ایک اندازے کے مطابق ۱۰۳۸ھ نادر قلمی کتابیں محفوظ ہیں ۔ لیکن یہ اکثر عربی یا فارسی میں ہیں ان میں معدودے چند کتابیں پشتو کی بھی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے ۔

۱۔ غلام محمد خان کی تالیف تفسیر سورۃ والضحیٰ

۲۔ قصیدہ بردہ منظوم

۳۔ قاسم علی خان افریدی کا دیوان کلیات آفریدی ۔

۴۔ فرہنگ آفریدی اس میں پشتو۔ اُردو۔ کشمیری۔ اور انگریزی زبان کے مترادفات کو ترتیب دیا گیا ہے۔

۵۔ رباعیاتِ خوشحال خان خٹک۔ اس مجموعہ میں خوشحال بابا کی سترہ سو سے زیادہ رباعیاں طلائی جدولوں میں بڑی خوشخطی کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

دیوان عبدالرحمان بابا جو ۱۲۲۹ھ کا ایک نایاب نسخہ ہے اور دیوان کاظم خان شیدا کا ایک بہت واضح اور خوشخط تحریر شدہ نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ اسی دیوان کی نقل جناب بینوا نے "پشتو ٹولنہ کابل" کیطرف سے شائع کی ہے۔ گلشنِ اشعار افغانی پشتو لوک شاعری کا دوسرا مجموعہ جو کہ تحصیل صوابی کے کوٹھہ نامی گاؤں کے سید عمر نے جمع کر کے مدوّن کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ بظاہر ضائع ہو چکا ہے۔ لیکن تاریخی چاربیتوں اور شفاہی ادب کے دلچسپ نمونوں کا صرف یہی ایک دوسرا نسخہ ہے جس میں مستشرق ڈارمیسٹر کی کتاب "نارو بہار" کے علاوہ انیسویں صدی عیسوی کی عوامی شاعری یکجا کی گئی ہے اس کتب خانے میں ایک نسخہ میاں احمد قاضی کے دیوان کا بھی ہے۔ یہ نسخہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا ہے۔ اور مصنف کے اپنے ہاتھ کی تحریر ہے۔ ایک دوسرا اہم دیوان جو بہت خوبصورت قلم سے لکھا گیا ہے، مولوی محمد رفیق کا ہے۔ جس کا نام دیوانِ "شمس الفلک" ہے۔ مولوی محمد رفیق کے کلام کے اِس مجموعے کے تین حصے ہیں پہلا حصہ بیان اخلاقیات، دوسرے میں قصیدہ امالی کی شرح ہے اور تیسرا خالص غزلیات کا ہے یہ مردان کے محمد اسلم خان کمالی کے ہاتھ کا نقل شدہ ہے۔ بالائی پشتونخوا میں سرکاری سطح پر پشتو کے قلمی آثار کو یکجا کرنے کا کام کچھ عرصے سے کابل کے "پشتو ٹولنہ" کے ذمے ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ وہاں کے کتب خانے میں پشتو قلمی نوادرات اور کتابوں کا کس قدر ذخیرہ جمع ہے! بہر حال "پٹہ خزانہ"، جیسی نادر کتابیں جن کا اصل ناپید ہے وہاں جمع کی گئی ہیں "پٹہ خزانہ" نامی کتاب بقول فضل احمد قاضی کوئٹہ بلوچستان کے مرحوم عبدالعلی خان اخون زادہ کے کتب خانے سے دانشور عبدالحئی حبیبی کے ہاتھ آئی اور اُس ادارے کی جانب سے حبیبی کی تحقیق و حواشی کے

ساتھ شائع کی گئی ہے۔ ذاتی طور پر بھی جیبیبی نے پشتو کے بعض قلمی آثار اور دواوین کافی تعداد میں جمع کئے تھے۔ جیبیبی کہتے ہیں۔ موصوف نے اپنے اُن قلمی نوادرات کا کچھ حصہ کراچی کی سنٹرل لائبریری کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ کوئٹہ بلوچستان کے علاقے میں بھی بعض پشتون بزرگ اور پشتو شعر و ادب کے شائقین اور محققین نے اس زبان کی قلمی کتابیں اکٹھی کرنے میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ ان میں مرحوم عبدالعلی اخون زادہ اور عبدالصمد خان اچکزئی ذاتی کتب خانوں کے مالک تھے۔ پروفیسر ولی محمد سیال کاکڑ کے پاس ۸۰ سے زیادہ قلمی نسخے ہیں۔ اب کوئٹہ کی پشتو اکیڈیمی نے بھی اس سلسلے میں کام شروع کیا ہے اور بلوچستان کے عوامی اور کتابی ادب کا اچھا خاصا قابلِ قدر اثاثہ یکجا کیا ہے۔ صوبہ بلوچستان کے ایک دوسرے محقق سلطان محمد بانی مرحوم نے اس بارے میں اپنی ذاتی کاوش اور محنت کی بدولت کافی کچھ معلومات کی ہیں۔ بعض نادر قلمی کتابیں بھی موصوف کے ہاتھ آئی ہیں

صوبہ سرحد میں قلمکار و محقق ہمیش خلیل اور قاضی عبدالحلیم اثر کو بعض پشتو قلمی نسخوں کا علم ہے۔ اور چند ایک حاصل بھی کئے ہیں۔ جن سے پشتو ادب اور پشتونوں کی تاریخ کے میدان میں بڑا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جناب نصراللہ خان نصر مرحوم بھی اسی ارادے سے تمام پشتونخوا میں قریہ قریہ اور نگر نگر گھومے، اور بہت سے آستانوں اور علمی گھرانوں کے قدیمی علمی اثاثوں کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ نوجوان محقق محمد پرویش شاہین نے پشتونخوا، پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں پشتونوں کے قدیم خاندانوں کے ذاتی کتب خانوں سے بعض بہت نادر علمی و ادبی دستاویزات کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کے علم نباتات کے شعبے کے پروفیسر ڈاکٹر سلیم نے بھی بعض اچھی پشتو قلمی کتابیں یکجا کی تھیں۔ اب نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد نے بھی اس مہم کا آغاز کیا ہے۔ اور یہ ادارہ اپنے کتب خانے کے لئے پاکستان کی دوسری زبانوں کی طرح پشتو

لے نہ معلوم موصوف وہ کتابیں اپنے ساتھ کہاں لے گئے؟

زبان کی قلمی کتب بھی جمع کر رہا ہے۔

پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈیمی جب سال ۱۹۵۵ء میں قائم ہوئی تو اس علمی اور تحقیقی ادارے کے اغراض و مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں سے بھی پشتو کی قلمی کتابیں اور دیگر تحریریں دستیاب ہوں اُنہیں محققین اور مورخین کے استفادے کیخاطر جمع کیا جائے اور پشتو ادب اور تاریخ کے طلباء کے لئے یہ آسانی خود اپنے ہاں پیدا کی جائے کہ وہ اس قسم کے مواد اور معلومات کی تلاش و تجسس کیخاطر در در کی خاک نہ چھانیں اور اسی طرح اگر بعض کتابوں کی چھپائی اور اشاعت ضروری ہو تو یہ ادارہ مناسب وقت اور موقع پر جامع تحقیق اور تنقید کے ساتھ اُنہیں شائع بھی کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پشتو اکیڈیمی کی مہم کا آغاز بہت ہی حوصلہ افزا رہا۔ اس لئے کہ اس ادارے کے قیام کے پہلے ایک آدھ سال میں بڑی نایاب کتابیں ہاتھ آئیں ان میں (۱) دیوان خوشحال خان خٹک (۲) دیوان سکندر خان خٹک (۳) دیوان مصری گگیانڑی۔ (۴) دیوان اشرف خان ہجری۔ (۵) دیوان رحمان (۶) دیوان میر عبداللہ الائی کوہستانی (۷) دیوان شاہ نواز (جو دراصل پیر محمد کاکڑ کا دیوان ہے لیکن تخلص شاہ نواز کا ہے) (۸) مثنوی آدم خان درخانئ صدر خان خٹک۔ (۹) مثنوی دلے شہئی صدر خان خٹک۔ (۱۰) فوائد الشریعت اخوند قاسم (۱۱) دُرِ مجالس (۱۲) نزنامہ افغانی (۱۳) مقاصد الفقہہ میاں محمدی صاحبزادہ چمکنی (۱۴) اجبیلہ کی لڑائی کا چار بیتہ (۱۵) مروت قبیلہ کے ضرب الامثال۔ (۱۶) دیوان احمد شاہ ابدالی (خط نسخ) (۱۷) دیوان احمد شاہ ابدالی (خط نستعلیق) (۱۸) دیوان معز اللہ خان مومند (۱۹) دیوان میاں نعیم (۲۰) دیوانِ خادم کاکاخیل۔ (۲۱) مجموعہ کلام قاسم علی افریدی۔ (۲۲) مثنوی یوسف زلیخا مصور عبدالقادر خان خٹک۔

(۲۳) گلدستہ (گلستان سعدی کا ترجمہ) عبدالقادر خان خٹک۔ (۲۴) مخزن اخون درویزہ۔ (۲۵) رشید البیان اور (۲۶) طوطی نامہ وغیرہ جمع کئے گئے۔ آج کل ان قلمی کتب کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے اور یہ میجر راورٹی کے اُس بیان کی نفی کرتی ہے جو انہوں نے اپنے لغت نامے

کے دیباچے میں لکھا ہے ۔کہ "پشتو قلمی کتابیں پشتونخوا میں ناپید ہونیوالی ہیں"۔

پشتو اکیڈیمی کی قلمی کتابوں میں بعض ایسی ہیں جو ان کے مالکوں نے خود پشتو اکیڈیمی کو بطور تحفہ دے دیں ۔مثلاً سعادت آباد کے خواجہ محمد خان خٹک نے اشرف خان ہجری کا دیوان اور صدر خان خٹک کی دو مثنویاں (۱) آدم خان درخانئ اور (۲) توردے شہئ اس ادارے کو بطور تحفہ پیش کی ہیں ۔اسی طرح ایف سی کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر ایونگ نے دیوان میاں نعیم کا ایک نسخہ پشتو اکیڈیمی کو بھیجا ہے ۔خان ثمین جان خان مرحوم کے بڑے بیٹے شوکت علیخان نے بھی مخزن اخون درویزہ بطور تحفہ دی ہے ۔کتاب تذکرۃ الابرار والاشرار اخون درویزہ، کا ایک نسخہ پورن چکیسر (سوات) سے شیر محمد خان نے ارسال کیا ہے ۔ ۱۹۷۳ء میں صوبہ سرحد کے محکمہ زراعت کے ایڈیشنل سیکرٹری جناب حاجی عبدالمنان خان بنگش نے اپنے دادا باز محمد خان عرف باز گل کا دیوان اس ادارے کو پیش کیا ۔

پشتو اکیڈیمی کے قلمی نوادرات کے اس گرانقدر اثاثے میں شعر و ادب، علمی اور مذہبی کتابوں کے نادر نمونوں کے علاوہ خوش نویسی اور خطاطی کے ایسے بیش بہا نمونے موجود ہیں جو پشتونوں کے علمی ذوق اور فنی کمال پر دال ہیں ۔نسخ اور نستعلیق دونوں کے خطی نمونے اس ذخیرے میں موجود ہیں ۔محقق حبیب اللہ رفیع نے پشتو اکیڈیمی کے ان قلمی نوادرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور انکی ایک مبسوط فہرست بھی تیار کر لی ہے ۔

اس ادارے نے بیرونی ممالک کے کتب خانوں میں محفوظ پشتو کی کوئی چالیس قلمی کتابوں کی نقلیں فوٹو سٹیٹ کاپیاں اور مائیکرو فلمیں بھی حاصل کر لی ہیں ۔

فالحمد للّٰہ بتوفیقہ ۔

کے دیباچے میں لکھا ہے۔ کہ "پشتو قلمی کتابیں پشتونخوا میں نایاب ہونیوالی ہیں"۔

پشتو اکیڈیمی کی قلمی کتابوں میں بعض ایسی ہیں جو ان کے مالکوں نے خود پشتو اکیڈیمی کو بطور تحفہ دے دیں۔ مثلاً سعادت آباد کے خواجہ محمد خان خٹک نے اشرف خان ہجری کا دیوان اور صدر خان خٹک کی دو مثنویاں (۱) آدم خان درخانئی اور (۲) توردلے شہٹی اس ادارے کو بطور تحفہ پیش کی ہیں۔ اسی طرح ایف سی کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر ایونگ نے دیوان میاں نعیم کا ایک نسخہ پشتو اکیڈیمی کو بھیجا ہے۔ خان ثمین جان خان مرحوم کے بڑے بیٹے شوکت علیخان نے بھی مخزن اخون درویزہ بطور تحفہ دی ہے۔ کتاب تذکرۃ الابرار والاشرار اخون درویزہ کا ایک نسخہ پورن چکیسر (سوات) سے شیر محمد خان نے ارسال کیا ہے۔ سن ۱۹۷۳ء میں صوبہ سرحد کے محکمہ زراعت کے ایڈیشنل سیکرٹری جناب حاجی عبدالمنان خان بنگش نے اپنے دادا باز محمد خان عرف باز گل کا دیوان اس ادارے کو پیش کیا۔

پشتو اکیڈیمی کے قلمی نوادرات کے اس گرانقدر اثاثے میں شعر و ادب، علمی اور مذہبی کتابوں کے نادر نمونوں کے علاوہ خوش نویسی اور خطاطی کے ایسے بیش بہا نمونے موجود ہیں جو پشتونوں کے علمی ذوق اور فنی کمال پر دال ہیں۔ نسخ اور نستعلیق دونوں کے خطی نمونے اس ذخیرے میں موجود ہیں۔ محقق حبیب اللہ رفیع نے پشتو اکیڈیمی کے ان قلمی نوادرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور انکی ایک مبسوط فہرست بھی تیار کرلی ہے۔

اس ادارے نے بیرونی ممالک کے کتب خانوں میں محفوظ پشتو کی کوئی چالیس قلمی کتابوں کی نقیس فوٹو سٹیٹ کاپیاں اور مائیکرو فلمیں بھی حاصل کرلی ہیں۔

فالحمد للہ بتوفیقہ۔

کتابیات

۱- ارمغان خوشحال . مطبوعه یونیورسټي بک ایجنسي

۲- انوار سهیلي — ملا کاشفي

۳- بلوغ الارب (څلور جلدونه) — محمود شکري الوسي

۴- پښتو متلونه — کابل چاپ

۵- پښتو ادب — عبدالحلیم اثر

۶- پښتو شاعري — فارغ بخاري، رضا همداني

۷- پلوشې — عبدالغني خان

۸- تاریخ مرصع — افضل خان خټک (فوټوسټیټ)

۹- تذکرة الابرار والاشرار — اخون درویزه"

۱۰- تواریخ حافظ رحمت خاني — پیر معظم شاه

۱۱- ټپه او ژوند[له] — جرنل آف دی یونیورسټي آف پشاور

۱۲- جاوید نامه — علامه اقبال

۱۳- جنګنامهٔ حسین — سیّد بوعلي شاه

۱۴- چاربیته د صاحبزاده غلام قادر (قلمي)

۱۵- خلاصة الانساب — چاپ پښتو اکیډیمي

۱۶- خیرالبیان — بایزید انصاري

[له] مقاله د مؤلف د دې کتاب.

۱۷۔	د پښتو ادبیاتو تاریخ	آقای عبدالحی حبیبی
۱۸۔	د پښتو نخوا د سند وهار و بهار	جیمز دارمستیټر
۱۹۔	دستار نامه	خوشحال خان خټک
۲۰۔	د مرونتو کسرونه	چاپ پښتو اکیډیمی
۲۱۔	دیوان د حافظ الپوری	
۲۲۔	دیوان د مخلص روښانی	
۲۳۔	دیوان د عبدالرحمٰن بابا[1]	
۲۴۔	دیوان د عبدالعظیم رانړیزی۔	
۲۵۔	دیوان د مرزا خان انصاری	
۲۶۔	دوهی متلونه	مطبوعه پښتو اکیډیمی
۲۷۔	سیور میه کرنک وهه راخیزه	ریورنډ جنز انولډسن
۲۸۔	سوات نامه	خوشحال خان خټک (قلمی)
۲۹۔	علم خانهٔ دانش	افضل خان خټک (نقل د برټش میوزیم دنسخې)
۳۰۔	غاړې ساندې	جرنل آف دی یونیورسټی آف پشاور
۳۱۔	قصه د فتح خان قندهاری	ملا نعمت الله
۳۲۔	کابل کالنۍ ۱۹۴۳ء	
۳۳۔	کلیات خوشحال خان خټک	(ترتیب تدوین د کامل صاحب)
۳۴۔	لنډ کۍ پښتو	محمد گل خان مهمند
۳۵۔	مثنوی آدم درخانۍ	صدر خان خټک
۳۶۔	مثنوی	امان گجراتی
۳۷۔	مثنوی یوسف زلیخا	عبدالقادر خان خټک

[1] مقاله د مؤلف دده کتاب۔

۳۸۔ مثنوی یوسف زلیخا عبدالقادر مھمند

۳۹۔ مجلہ اولس۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء

۴۰۔ مجلہ پښتو کال ۱۹۶۰ء

۴۱۔ مخزن الاسلام اخون درویزه

Afghanistan Vol. II by Wilber.

A history of classical Greek literature by T. A. Sinclair.

Catalogue of Pashto Manuscripts by Dr. Mackenzie.

Notes on Vedic literature by Dr. Upal.

کلیات خوشحال خان خټک

ننګیالے پښتون

تاریخ مرصع (فوتوسټیټ)

دیوان اشرف خان هجری (قلمی)

د پښتو ادبیاتو تاریخ د عبدالحئ حبیبی

میاشتنئ اولس (اکتوبر، نومبر ۱۹۶۶ء)

میاشتنئ اولس (دسمبر ۱۹۶۶ء)

پښتو ز رحمان نمبر اپریل، مئی ۱۹۷۱ء

دستارنامه د خوشحال خان خټک

رحمٰن بابا د کامل مومند۔

دیوان عبدالرحمٰن۔

در و مرجان (دیوان عبدالحمید)

دیوان د مصری خان ګګیانړی (قلمی)

دیوان معز الله خان مهمند۔ (قلمی)
دیوان کامګار خان ختټک۔
دیوان سکندر خان ختټک۔
آدم درخانۍ د صدر خان ختټک۔ (قلمی)
دیوان کاظم خان شیدا۔ (قلمی)
دیوان خواجه محمّد بنګش۔ (قلمی)
دیوان علی خان۔
دیوان احمد شاه ابدالی (قلمی)
دیوان عبد القادر خان ختټک۔
دیوان پیر محمّد کاکړ۔
ګلشن روه۔
دراورتی ګرائمر۔
اسوهٔ علیؓ د رئیس احمد جعفری۔
ګلدسته د عبد القادر خان ختټک۔
عبد الرحمٰن بابا" مؤلفه خیال بخاری۔
خلاصة الانساب تالیف د نواب حافظ رحمت خان روهیله۔
مجله قند جنوري۔ فروري ۱۹۷۲ء۔
دیوان د کاظم خان شیدا (کابل چاپ)
دیوان د حافظ الپوریٔ۔
مجله قند جولائی، اګست ۱۹۷۲ء
هارو بهار د دارمستیتر۔

تاریخ احمد مؤلفه مفتی انتظام الله شهابی۔
عبرت نامه۔ (دوه جلده)
د پښتو تاریخ د قاضی عطاء الله۔
جدید اُردو شاعری۔
اولس کوټه (نومبر، دسمبر ۱۹۷۲ء)
د هارمستیټر پښتو څیړنه (کابل چاپ)
مکتبهٔ شرقیه دارالعلوم اسلامیه پشاور کی فهرست کتب۔
حیات حافظ رحمت خان د سیّد الطاف علی بریلوی۔
عجائب اللغات (فوټوسټیټ)
فهرست کتب بانکی پور پبلک لائبریری مطبوعه ۱۹۲۵ء
ظفر اللغات۔
د کابل کالنۍ ۴۴-۱۹۴۳ء
تواریخ حافظ رحمت خانی۔
ګلشن روه۔
مجله کابل مئی ۱۹۵۶ء
مجله کابل اکتوبر، نومبر ۱۹۶۶ء